تذکرۃ المحدثین

آسمان علم کے روشن ستاروں اور گلستان حدیث کے
مہکتے گلابوں کا روح پرور دل آویز
اور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ

تالیف: ضیاء الدین اصلاحی

تقریظ: فضیلۃ الشیخ ابو الحسن مبشر احمد ربانی حفظہ اللہ تعالیٰ

DARULIBLAGH

دارالابلاغ

کتاب وسنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ

تذکرۃ المحدثین

جلد اول

تالیف .... ضیاء الدین اصلاحی

اہتمام .... محمد طاہر نقاش

اشاعت اول .... مئی 2014ء

پاکستان میں ہماری کتب مندرجہ ذیل اداروں سے مل سکتی ہیں

لاہور۔ البلاغ (جیل روڈ 35717842 گلبرگ 35717842 ماڈل ٹاؤن 35942233)

راولپنڈی۔ تجلیات طیبہ کشمیری بازار 5535168، دار الفکر اسلامی 0321-5216287 مکتبہ عائشہ 0321-5075075

اسلام آباد۔ المسعود اسلامک سنٹر 2261356 البلاغ 2281420 دارالسلام شوروم 0321-5370378

الھدیٰ انٹرنیشنل 4434615، 0321-8014008۔ کراچی۔ فضلی سنز 32212991 علمی کتب خانہ 32628939

فیصل آباد۔ مکتبہ اسلامیہ بیرون امین پور بازار، 631204۔ مکتبہ اہلحدیث امین پور بازار 0300-6628021

پشاور۔ معراج کتب خانہ 214720۔ واہ کینٹ البلاغ 051-4541148

دارالابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز

رحمٰن مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

0300-4453358, 042-37361428

ضروری نوٹ: اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم اور انسانی بساط وطاقت کے مطابق ہم نے اس کتاب کی کمپوزنگ، پروف ریڈنگ خاص طور پر عربی عبارات میں تصحیح اغلاط میں پوری طرح احتیاط کی ہے۔ لیکن پھر بھی بشری تقاضے کے تحت اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ازراہ کرم مطلع فرمائیں۔ آئندہ ایڈیشن میں اس کا ازالہ کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ (ادارہ)

تذکرۃ المحدثین
آسمان علم کے روشن ستاروں اور گلستان حدیث کے
مہکتے گلابوں کا روح پرور دلآویز
اور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ
جلد اول
ضیاء الدین اصلاحی
قال قال رسول اللہ ﷺ
دار الابلاغ
DARULIBLAGH
دار الابلاغ پبلشرز اینڈ ڈسٹری بیوٹرز لاہور پاکستان
فون: 4453358 -0300

کے نام سے شروع کرتا ہوں
جو بڑا ہی مہربان
نہایت رحم کرنیوالا ہے

فہرست مضامین

حصہ اول

حصہ دوم

1
امام عبدالباقی بن قانع

2
امام سعید بن السکن

3
امام ابوبکر شافعی

4
امام ابن حبان

5

امام ابوبکر آجری

6

امام ابوالقاسم طبرانی

7
امام ابوعمرو بن نجید

8
امام ابوبکر اسماعیل

9

امام ابوالحسن دار قطنی

10

امام ابوسلیمان حمد خطابی

11
امام ابن جمیع

12
امام ابوعبداللہ حاکم

13
امام ابوالقاسم تمام رازی

14
امام ابوبکر بن مردویہ الکبیر اصبہانی

15
امام ابوبکر احمد بن محمد برقانی خوارزمی

16

امام ابونعیم اصفہانی

17
امام ابو محمد حسن خلال

18
امام ابو عبداللہ قضاعی

☆.....☆.....☆

انتساب

دین اسلام کے ہر داعی و مبلغ
کے نام

- کہ جو اشاعت دین میں سرگرم عمل ہے
- محدثین سے محبت کرتا ہے
- طلبِ علم حدیث کے لیے سرگرم، سرگرداں اور کوشاں ہے
- دنیا میں ہر سو علم حدیث کے فروغ کی خواہش رکھتا ہے
- اور حدیث رسول، فرمانِ رسول اور حکم رسول کا بول بالا اس کی زندگی کا محور و مرکز اور مقصد ہے۔

مالک کائنات سے دعا ہے کہ

- قال اللہ اور قال الرسول کے دلنواز ترانوں میں اس کی صبحیں اور شامیں گزریں۔ آمین یارب العالمین

خُطبہ مسنونہ

إِنَّ الْحَمْدَ لِلّٰهِ نَحْمَدُهُ وَنَسْتَعِيْنُهُ، وَنَسْتَغْفِرُهُ، وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ أَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ أَعْمَالِنَا، مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلاَ مُضِلَّ لَهُ، وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلاَ هَادِيَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنْ لاَّ إِلٰهَ إِلاَّ اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيْكَ لَهُ، وَأَشْهَدُ أَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُوْلُهُ

أَمَّا بَعْدُ: فَإِنَّ خَيْرَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ وَخَيْرَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرَّ الأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلاَلَةٌ وَكُلَّ ضَلاَلَةٍ فِي النَّارِ

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ○ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ○ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ○ يُّصْلِحْ لَكُمْ اَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيْمًا ○

---

① ((مسلم' الجمعة' باب تخفيف الصلوة و الخطبة' حديث ٨٦٨ و ٨٦٧، والنسائي' ٣٢٧٨))

② ((رواه الاربعة واحمد والدارمي و روى البغوي في شرح السنة مشكوٰة مع تعليقات الالباني' النكاح' باب اعلان النكاح.... وقال الالباني حديث صحيح۔))

تنبیہات:

- صحیح مسلم، سنن نسائی اور مسند احمد میں ابن عباس اور ابن مسعود رضی اللہ عنہم کی حدیث میں خطبہ کا آغاز ((ان الحمد لله)) سے ہے لہٰذا ((الحمد لله)) کی بجائے ((ان الحمد لله)) کہنا چاہیے۔
- یہاں ((نومن به و نتوكل عليه)) کے الفاظ صحیح احادیث میں موجود نہیں ہیں۔
- یہ خطبہ نکاح، جمعہ اور عام وعظ و ارشاد یا درس و تدریس کے موقع پر پڑھا جاتا ہے۔ اسی خطبہ حاجت کہتے ہیں اسے پڑھ کر آدمی اپنی حاجت و ضرورت بیان کرے۔

10-Feb 2013(5x7)

''بلاشبہ سب تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم اسی کی تعریف کرتے، اسی سے مدد مانگتے اور اسی سے بخشش طلب کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی شرارتوں اور اپنے برے اعمال سے اللہ کی پناہ میں آتے ہیں۔ جسے اللہ راہ دکھائے اسے کوئی گمراہ نہیں کرسکتا اور جسے وہ دھتکار دے اسے کوئی راہ راست پر نہیں لاسکتا۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہی معبود برحق ہے، وہ اکیلا ہے، کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔''

''حمد وصلوۃ کے بعد! یقیناً تمام باتوں سے بہتر بات اللہ کی کتاب اور تمام طریقوں سے بہتر طریقہ محمد ﷺ کا ہے اور تمام امور میں سے برے کام (دین میں) خود ساختہ (بدعت والے) کام ہیں، ہر بدعت گمراہی اور ہر گمراہی کا انجام جہنم ہے۔''

''اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں اس حال میں موت آئے کہ تم مسلمان ہو۔ لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا، (پھر) اس سے اس کی بیوی کو بنایا اور (پھر) ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا کیں اور انہیں (زمین پر) پھیلا دیا۔ اللہ سے ڈرتے رہو جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور قطع رحمی سے (بچو)۔ یقیناً اللہ تم پر نگران ہے۔ اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو اور سیدھی (سچی اور کھری) بات کہو۔ اللہ تمہارے اعمال سنوار دے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف فرما دے گا۔ جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی، یقیناً اس نے عظیم کامیابی حاصل کرلی۔''

حرف تمنا

ہیروں و جواہرات کی دریافت

قارئین محترم! محدثین کرام کی حیاتِ مبارکہ اور ان کے علمی کارناموں پر لکھی گئی ایک محقق کی کتاب ''تذکرۃ المحدثین'' کو دارُالابلاغ کی ٹیم نے مولانا اشرف جاوید صاحب آف فیصل آباد کی معاونت سے تحقیق کے بعد مکمل کیا تھا۔ میں جب میں اسے شائع کرکے منظر عام پر لانے کے لیے تحقیقی نظروں سے دیکھتا، اور جائزہ لیتا تو مجھے اس میں بڑی حد تک تشنگی محسوس ہوتی۔ میں نے اس میں حک و اضافہ کے لیے مولانا اسلم گھلوی اور قاری ذکاء اللہ صاحب آف لاچپت روڈ شاہدرہ لاہور کی خدمات حاصل کرنے کے لیے ان سے رابطہ کیا...... لیکن وہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر اسے مکمل نہ کر سکے۔ تحقیق وریسرچ کا کام ابھی جاری تھا کہ مجھے علم ہوا کہ اس موضوع پر محقق دوراں مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے بہت عمدہ تحقیقی کام کیا ہے۔ میں اس کی جستجو اور تلاش میں لگ گیا۔

اس تحقیقی کام کو حاصل کرنے کے لیے میں نے بیرون ممالک رابطے کیے۔ جدہ اور ریاض سعودی عرب میں بھی احباب سے اسے حاصل کرنے کے لیے رابطے کیے لیکن ناکامی ہوئی۔ آخر اپنے دو جاننے والوں کی ڈیوٹی لگائی جو پندرہ دن کے ٹور پر بیرون ملک جارہے تھے۔ انہوں نے کافی بھاگ دوڑ اور محنت شاقہ سے تلاش بسیار کے بعد محدثین کی حیات مبارکہ اور ان کی علم حدیث کے لیے خدمات اور عظیم کارناموں پر مشتمل یہ کام مرتب شدہ شکل میں حاصل کرلیا۔ فللّٰہ الحمد. میں اسے دیکھ کر اس قدر مسرور و مسحور ہوا کہ مت پوچھئے۔ اس سے پہلے آج تک میں نے ہیروں اور جواہرات کو اس قدر نفاست اور قرینے سے ایک تاج میں جڑے ہوئے جگمگاتے نہ دیکھا تھا۔ میں اسے ترتیب وتہذیب نو کے بعد طباعت کے مراحل سے گزار کر اب آپ کی خدمت میں پیش کرسکا ہوں۔ امید ہے اس عظیم تصنیف کی پیشکش پر آپ خوشی سے پھولے نہ سمائیں گے۔ اللہ کریم ہمیں ان رجال عظیم کی سیرت کی ضیا پاشیوں سے اپنی زندگیوں کو منور کرنے کی توفیق بخشے، آمین۔

محدثین کے حالات زندگی اور ان کی پاکیزہ و مثالی سیرت و کردار اور روشن عظیم کارناموں اور تلاش علم کی جستجو پر مبنی داستانوں پر مشتمل یہ برصغیر کی مفصل و جامع کتاب ہے۔ اب تک اس موضوع پر شائع ہونے والی اور لکھی جانے والی کتب میں اسے ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اس کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کتاب متقدمین و متاخرین محدثین کرام کی سیرت کے مہکتے علمی گوشے اور ان کی حیات مبارکہ کی تفصیلات بھی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ خاص طور پر اس کا تیسرا حصہ پاک و ہند کے محدثین ان کی خدمات، کارناموں اور دعوتی و علمی سرگرمیوں کی تفصیلات پر مبنی ہے، اس سے قبل یہ مفید علمی معلومات ہم تک نہ پہنچ سکی تھیں۔ اس کا مقدمہ برصغیر کے مشہور سکالر جناب مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی نے لکھا ہے اور اس موضوع کی افادیت کو اجاگر کیا ہے۔

اس کتاب کے تین حصے ہیں:

① حصہ اول:...... اس میں دوسری صدی کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالاتِ زندگی، سوانح اور ان کی خدمات حدیث کی ایمان افروز اور روح پرور تفصیل بیان کی گئی ہے۔

② حصہ دوم:...... اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی علمی و حدیثی خدمات کی دلآویز و روح پرور تفصیل بیان کی گئی ہے۔

③ حصہ سوم:...... اس میں چھٹی صدی ہجری سے خانوادہ شیخ عبدالحق دہلوی تک کے ممتاز اور صاحب تصانیف ہندوستانی محدثین کرام کے حالات و سوانح اور ان کی علمی و دینی اور محدثانہ خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے مجاہد اور صوفی دو متضاد شخصیات ہیں یعنی مجاہد کبھی صوفی نہیں ہوسکتا اور صوفی کبھی مجاہد نہیں بن سکتا۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاتا ہے کہ محدث کبھی صوفی نہیں ہوسکتا اور صوفی کبھی محدث نہیں بن سکتا۔ لیکن اس کتاب میں تذکرۃ المحدثین کی تیسری جلد چونکہ ہندوستانی محدثین پر مرتب کی گئی ہے۔ اس لیے اس میں اس خطے کے خاص مزاج کے مطابق ایسے علماء کا تذکرہ بھی کیا گیا جو تصوف کی طرف مائل تھے۔ یوں ان کی زندگی کی

تصویر کو مکمل طور پر قارئین کے سامنے رکھ دیا گیا ہے۔ ایسا نہیں کہ ان کی زندگی کے ایک گوشہ کو زیر بحث نہ لا کر قارئین کو کسی بھی پہلو سے لاعلم رکھا گیا ہو۔ البتہ مرتب کرنے والے حضرات چونکہ حنفی المسلک ہیں اس لیے کہیں کہیں وہ اس کی نشاندہی ہو جاتی ہے، وہ اپنا جھکاؤ اسی کی طرف رکھتے ہوئے اس مسلک کا دفاع کرتے ہیں اور اس مسلک کے موقف کو فوقیت دیتے نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب کے حصہ سوم میں شیخ علی متقی اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کے ابواب میں ایسی جھلک ہمیں نظر آتی ہے۔

یہ کتاب ہر اسلامی لائبریری، ہر مدرسہ و تعلیمی ادارہ کی اولین اور بنیادی ضرورت ثابت ہوگی۔ حدیث رسول مقبول اور علم حدیث سے شغف ودلچسپی رکھنے والے متلاشیان علم کے لیے یہ ایک گرانقدر تحفہ اور مینارہ نور ثابت ہوگی۔ اللہ کریم سے دعا ہے کہ وہ کتاب کی تیاری میں کام کرنے والے تمام حضرات کو دنیا اور آخرت میں دونوں جگہ اعلیٰ وارفع درجات عطا فرمائے اور اپنے آخری رسول کی شفاعت کا مستحق بنائے۔ آمین

خاص طور پر اس کے مصنف ومرتب جناب مولانا ضیاء الدین اصلاحی اور ان کے معاون ومحرک علماء کی ٹیم کو اللہ کریم اپنی رضا کا سرٹیفکیٹ عطا کر کے ان کی اس کاوش کو قبولیت کا درجہ بخش کر ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے۔ آمین یارب العالمین

اب آپ آسمان علم کے ان ماہتابوں، آفتابوں، روشن ستاروں...... اور گلستان حدیث کے مہکتے گلابوں کا روح پرور ایمان افروز تحقیقی تذکرہ پڑھیں اور ہمیں اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں کہ ہم حدیث پر مزید نشر واشاعت کا کام کر سکیں۔ یوں اپنے اور آپ کے دامن کو سعادتوں وکامیابیوں کے چمکتے دمکتے موتیوں سے بھر سکیں۔ ان شاء اللہ

خادم کتاب وسنت

محمد طاہر نقاش

۲۲ فروری ۲۰۱۴ء، لاہور

گلستانِ حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابل رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے دھنی انسانوں کی!..... کہ جنھوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی صبحیں اور شامیں قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی دلنواز صداؤں میں بسر ہوتیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بمعہ سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمانِ رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم   اِلا حدیث یار راتکرار می کنیم

گلشن حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجال عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزاریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمتِ حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نماں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن مگر پردہ اخفا میں سنہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، آج ہی اس کا مطالعہ کریں۔ تاکہ حدیث رسول ﷺ فرمان رسول اور حکم رسول کی اہمیت، فضیلت اور محبت آپ کے دل و دماغ میں راسخ ہو، آپ اپنی نسل کو بھی اس روشن شاہراہِ حیات پر چلانے کی منصوبہ بندی کر کے اپنی آخرت کی یقینی کامیابی کا سامان کر سکیں۔

خادمِ کتاب و سنّت

محمد طاہر نقاش

۲۲ فروری ۲۰۱۴ء لاہور

نَضَّرَ اللّٰهُ اَمْرَاً سَمِعَ مِنَّا حَدِیْثًا فَبَلَّغَہٗ (حدیث)

تذکرۃ المحدثین

حصہ اول

اس میں دوسری صدی کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالاتِ زندگی، سوانح اور ان کی خدماتِ حدیث کی روح پرور تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

کلام مجید اگرچہ ایک واضح اور کھلی ہوئی کتاب ہے، اس میں کوئی غموض وخفا نہیں ہے لیکن اس میں اس کی تعلیمات کی پوری تفصیل اور تمام جزئیات کا احاطہ نہیں ہوسکتا تھا، اس لیے بہت سے احکام مجمل یا کلیات کی شکل میں ہیں جن کی وضاحت وتشریح اور کلیات سے جزئیات کی تفریع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے فرمائی، آپ کا کام محض کلام الٰہی کو لوگوں تک پہنچا دینا نہیں تھا، بلکہ اس کی تبیین وتشریح بھی تھی۔

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ۔ (نحل: ٦)

اور ہم نے تمہاری طرف نصیحت (قرآن مجید) اتاری تاکہ لوگوں کے لیے جو اتارا گیا ہے اس کو ان سے کھول کر بیان کرو شاید وہ اس پر غور وفکر کریں۔

ایک دوسری آیت میں ہے:

وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ۔ (نحل: ٨)

اور ہم نے تم پر اس لیے کتاب اتاری ہے تاکہ تم ان کے لیے ان چیزوں کی وضاحت کرو جس میں انھوں نے اختلاف کیا اور اس کو ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت ورحمت بنا کر اتارا۔

یہ تبیین وتشریح آپ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اس فہم یا ملکۂ نبوت کی رہنمائی سے کرتے تھے جو اللہ تعالیٰ نے آپ میں ودیعت کیا تھا۔

إِنَّآ أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ أَرَاكَ اللَّهُ۔ (نساء:١٦)	اور ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ کتاب اتاری تاکہ تم لوگوں کے درمیان جس طرح تم کو خدا نے سمجھایا ہے اس طرح فیصلہ کرو۔

اس ''اراءت'' سے مراد فہم نبوت ہے، اس آیت میں اگرچہ صرف فیصلہ کا ذکر ہے لیکن اس میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں، اس لیے کہ آپ جو تعلیم اور جو حکم دیں گے وہ ایک طرح کا فیصلہ ہی ہوگا۔

آپ جو کچھ بھی کہتے تھے، یا جو حکم بھی دیتے تھے، وہ درحقیقت ایک قسم کی وحی ہوتی تھی جس کو اصطلاح میں وحی خفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ۔ (نجم:١)	رسول اپنی خواہش سے کچھ بھی نہیں کہتا بلکہ وہ وحی ہوتی ہے جو اس کو کی جاتی ہے۔

اس لیے آپ کے تمام احکام واجب التعمیل ہیں، اس فہم نبوت اور وحی سے مستنبط احکام کو قرآن مجید نے حکمت سے تعبیر کیا ہے۔

وَأَنزَلَ اللَّهُ عَلَيْكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكَ عَظِيمًا۔ (نساء:١٧)	اور تم پر کتاب وحکمت اتاری اور تم کو وہ چیز سکھائی جو تم نہیں جانتے تھے اور یہ تم پر خدا کا بڑا فضل تھا۔

مسلمانوں پر خدا نے یہ احسان جتایا ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ	اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت کو یاد کرو کہ تم پر
وَمَا اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ	کتاب وحکمت اتاری جس کے ذریعہ
وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ.	وہ تم کو نصیحت کرتا ہے۔
(بقرۃ:۲۹)	

دوسری آیت میں ہے:

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ	وہی اللہ ہے جس نے ان پڑھ لوگوں
رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ	میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا جو
وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ	ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے
وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ	اوران کو پاک وصاف کرتا ہے
لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ.	اور کتاب وحکمت سکھاتا ہے اور اس
(سورہ جمعہ:۱)	سے پہلے وہ گمراہی میں مبتلا تھے۔

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ صرف آیات قرآنی کی تلاوت وتبلیغ نہیں بلکہ مسلمانوں کی تعلیم وتزکیہ بھی تھا اور آپ ان کو کتاب اللہ کے ساتھ حکمت کی تعلیم بھی دیتے تھے، یہ حکمت اگرچہ قرآن مجید اور وحی خفی سے ماخوذ ہے مگر اس سے الگ چیز ہے اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال واعمال ہیں، اس لیے کتاب کے ساتھ وہ بھی مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، آپ کی ذات اور آپ کا ہر قول وفعل مسلمانوں کے لیے نمونۂ عمل تھا۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ	لوگو! تمہارے لیے رسول کے اندر اچھا
اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (احزاب:۳)	نمونہ ہے۔

اسی لیے قرآن مجید میں اللہ کی اطاعت کے ساتھ ساتھ رسول کی اطاعت کی بھی تاکید ہے اور بہت سی آیات میں اطیعوا اللہ کے ساتھ ساتھ اطیعوا الرسول کا بھی

حکم ہے۔

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ۔ (آل عمران:۱۴)	اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ۔ (محمد:۴)	مسلمانو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ۔ (مائدہ:۱۲)	اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ڈرو، پھر اگر تم روگردانی کرو گے تو جان لو کہ ہمارے رسول کے ذمہ صرف پوری تبلیغ ہے، (یعنی اس کو منوانے کی ذمہ داری اس پر نہیں ہے)
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ وَاَنْتُمْ تَسْمَعُوْنَ۔ (انفال:۳)	اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اور اس سے منہ نہ موڑو، حالاں کہ تم سنتے ہو۔

یہ ظاہر ہے کہ اطاعت نام ہے کسی حکم کی تعمیل یا کسی عمل کی تقلید کا، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو حکم دیں اس کی تعمیل اور جس چیز پر عمل کریں اس پر عمل کیا جائے، اسی کا نام حدیث وسنت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت رسول کے اتباع پر موقوف ہے اور اس کا صلہ بندوں سے اللہ کی محبت اور مغفرت ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ	آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے

وَيَغْفِرْلَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (آل عمران:۴)	محبت کرے گا اور تمہارے گناہوں کو معاف کردے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

رسول کی اطاعت عین خدا کی اطاعت اور رسول کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من اطاعني فقد اطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله۔(۱)	جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی

اطاعت کے ان احکام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ تمام اقوال وافعال داخل ہیں جو آپ نے مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ارشاد فرمائے یا ان پر عمل کیا، اس لیے کتاب اللہ کے بعد ان کی حیثیت بھی قانون کی ہے اور وہ مسلمانوں کے لیے کتاب اللہ ہی کی طرح واجب العمل ہیں، کلام مجید میں ارشاد ہے:

وَمَاكَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَامُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (احزاب:۵)	اور کسی مسلمان مرد اور عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسول ان کے کسی معاملہ میں فیصلہ کردے تو اس میں اس کو چون وچرا کا اختیار باقی رہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کی وہ کھلی گمراہی میں ہے۔

''امر'' میں آپ کے تمام احکام داخل ہیں جس کی وضاحت احادیث سے ہوتی ہے، مسلم میں ہے:

(۱) مسلم کتاب الامارۃ باب وجوب طاعۃ الامیر فی غیر المعصیۃ وتحریمھا فی المعصیۃ۔

مانهيتكم عنه فاجتنبوه وماامرتكم به فافعلوه۔ (۱)	میں جس چیز سے تم کو منع کردوں اس سے رک جاؤ اور جس چیز کا حکم دوں اس کو اختیار کرو۔

ایک دوسری حدیث میں اس سے زیادہ واضح الفاظ میں ہے:

''وہ زمانہ قریب ہے کہ کسی آدمی سے جب وہ اپنے پرتکلف تخت پر تکیہ لگائے بیٹھا ہوگا، میری کوئی حدیث بیان کی جائے گی تو وہ کہے گا کہ ہمارے درمیان اللہ عزوجل کی کتاب موجود ہے، ہم اس میں جو چیز حلال پائیں گے اس کو حلال سمجھیں گے اور جو چیز حرام پائیں گے اس کو حرام سمجھیں گے، ایسے لوگوں کو آگاہ ہونا چاہیے کہ جس کو اللہ کے رسول نے حرام کیا ہے وہ بھی خدا کی حرام کی ہوئی چیز کی طرح حرام ہے۔'' (سنن ابن ماجہ ص ۳)

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے اقوال واعمال مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، اور جس طرح قرآن مجید کے اوامر ونواہی کا ماننا ان کے لئے ضروری ہے اسی طرح رسول کے اوامر ونواہی کا بھی، اسی کا نام حدیث وسنت ہے، قول رسول کا نام حدیث ہے اور عمل متواتر کا سنت اور کلام مجید کے بعد اسی حدیث وسنت کا درجہ ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تركت فيكم الثقلين كتاب الله وسنتي '' میں نے تمہارے لیے دو بھاری چیزیں چھوڑی ہیں کتاب اللہ اور اپنی سنت، بلکہ اپنی سنت کے ساتھ خلفائے راشدین کی سنت پر بھی عمل کا حکم دیا ہے، '' عليكم بسنتي وسنة الخلفاء الراشدين '' جن کی زندگی اتباع سنت کا نمونہ تھی۔

درحقیقت اسلام کی پوری عمارت قرآن مجید اور احادیث نبوی پر قائم ہے، وہ

(۱) مسلم ج ۲ کتاب الفضائل باب توقیرہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

کلام مجید کی تفسیر بھی ہے، اُس کے اجمال کی تفصیل بھی، اس کے کلی احکام سے جزئیات کی تفریع بھی اور اسلام کے قرن اول کی تاریخ بھی، اس کے بغیر اسلام کی تعلیم اور اس کی ابتدائی تاریخ کے بہت سے اوراق سادہ رہ جاتے ہیں، اسلام کے ارکان اربعہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکام بھی نہیں معلوم ہو سکتے ہیں اور نہ اس کو حدیث کی مدد کے بغیر ادا کیا جا سکتا ہے، ان کے صرف کلی احکام قرآن مجید میں ہیں، اس کی تفصیل حدیث وسنت سے معلوم ہوتی ہے، یہی حال اکثر اوامر ونواہی اور حلال وحرام کا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، اسلام کا ظہور، اس کی تبلیغ، اس کی راہ کی صعوبتیں، غزوات، اسلام کا غلبہ واقتدار، حکومت الٰہیہ کا قیام، اس کا نظام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ اور آپ کی سیرت معلوم کرنے کا ذریعہ صرف حدیث ہے، اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو اسلام کی بہت سی تعلیمات اور تاریخ اسلام کے بہت سے گوشے مخفی رہ جائیں گے اس لیے احادیث نبویؐ اسلام اور اسلامی تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں اور اس پر ان کی عمارت قائم ہے، اس لیے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی روایت واشاعت کا حکم دیا ہے اور مبلغ حدیث کے لیے دعا فرمائی ہے:

نضر الله امرأ سمع منا حديثا فحفظه حتى يبلغه فرب حامل فقه الىٰ من هو افقه منه ورب حامل فقه ليس بفقيه.
(ابوداؤد ج ۲ کتاب العلم باب فضل نشر العلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خدا اس شخص کو سرسبز وشاداب رکھے جس نے ہم سے ایک حدیث سنی، اس کو محفوظ رکھا اور اس کو دوسروں تک پہنچایا، کیوں کہ بسا اوقات علم کا حامل اس کو ایسے شخص تک پہنچاتا ہے جو اس سے زیادہ سمجھ دار ہوتا ہے اور وہ خود سمجھدار نہیں ہوتا۔

آپ نے حدیثوں کی کتابت کا بھی حکم دیا ہے، بعض لوگوں کے لیے حدیثیں

لکھوائی ہیں،"حدثوا عنی ولا حرج"۔ "اکتبوا لابی شاہ" حجۃ الوداع میں آپ نے جو خطبہ دیا تھا جو اسلام کے بہت سے اساسی احکام پر مشتمل ہے، اس کو دوسروں تک پہنچانے کا عام حکم دیا تھا، چنانچہ حدیث کی اُن تمام کتابوں میں جن میں اس خطبہ کا ذکر ہے آپ کا ارشاد "فلیبلغ الشاھد الغائب" (۱) بھی ہے، یعنی جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اُن لوگوں تک اُن احکام کو پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں، اسی کا نام روایتِ حدیث ہے۔

اس لیے عہد رسالت سے لے کر بعد کے ہر دور میں حدیث نبویؐ کی نقل و روایت کا سلسلہ جاری رہا، یہ حدیثیں پوری دنیائے اسلام میں بکھری ہوئی تھیں، محدثینِ کرام کا یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں اور سفر ہم معنی سفر سمجھا جاتا تھا اور نہ نشر و اشاعت کے موجودہ سامان تھے، تعلیم بھی محدود تھی، دنیائے اسلام کا چپہ چپہ چھان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال یعنی حدیث و سنت کو تحقیق و صحت کے پورے اہتمام کے ساتھ جمع و مرتب کیا، ان کے رد و قبول اور صحت و سقم کے جانچنے اور رواۃ کی جرح و تعدیل کے اصول بنائے، اصول حدیث کا مستقل فن ایجاد کیا، ہزاروں راویانِ حدیث کے حالات نہایت صحت و تحقیق کے ساتھ قلمبند کیے جو مسلمانوں کا بڑا قابلِ فخر کارنامہ ہے۔

اس لیے صاحبِ تصنیف محدثین کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، حضرت سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ دارالمصنفین کے قیام سے بھی پہلے امام بخاری اور امام مالک کے حالات الندوہ میں لکھ چکے تھے، امام مالک کے حالات بعد میں کتابی شکل میں شائع کر دیے، مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم نے امام مسلم کے حالات اور راقم نے امام ترمذی کے حالات لکھے تھے، سید صاحبؒ کی خواہش تھی کہ اس سلسلہ کو مکمل کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا جائے، مگر اس وقت یہ کام نہ ہو سکا، اب اس

(۱) اس قسم کے اور بھی ارشادات حدیث کی کتابوں میں ہیں، ہم نے صرف مثالاً چند نقل کیے ہیں۔

زمانہ میں جب کہ موجودہ دور کے مجتہدین حدیث سے آزادی کے لیے اس کے پورے ذخیرہ کو مشکوک اور ناقابل اعتبار قرار دینے کی مہم میں لگے ہوئے ہیں، محدثین کرام کے حالات کو شائع کرنے کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوئی تا کہ یہ معلوم ہو سکے کہ انھوں نے کس جانکاہ محنت سے اور کتنی تحقیق واحتیاط کے ساتھ حدیثوں کو جمع ومرتب کیا اور یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ تحقیق وصحت کے مادی وعقلی معیار کے اعتبار سے بھی دنیا کا کوئی علمی ذخیرہ حدیث کی کتابوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

یہ کتاب دو جلدوں میں ہوگی، پہلی جلد میں امام مالکؒ سے لے کر امام طحاویؒ تک، یعنی دوسری صدی ہجری سے لے کر چوتھی صدی کے شروع تک (جو تدوین حدیث کا سب سے اہم دور ہے) کے محدثین اور ان کی تصانیف کے حالات ہیں، دوسری جلد میں اس کے بعد کے محدثین کے حالات ہوں گے۔

اس حصہ میں امام بخاریؒ کے حالات سید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قلم کے ہیں، امام مالکؒ کے حالات حیات امام مالکؒ کی تلخیص ہے، امام مسلمؒ کے حالات مولانا عبدالسلام صاحب مرحوم کے اور امام ترمذی کے راقم کے تحریر کردہ ہیں، باقی محدثین کے حالات مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی نے لکھے ہیں، اس طرح یہ کتاب صاحبِ تصنیف محدثین کرام کا تذکرہ بھی ہے، تدوین حدیث کی تاریخ بھی اور حدیث کی موجودہ کتابوں پر نقد وتبصرہ بھی، اللہ تعالیٰ اس کو نافع بنائے۔

معین الدین احمد ندوی
دار المصنفین اعظم گڑھ
۱۵/مارچ ۱۹۶۸ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام مالکؒ

(المتوفی ۱۷۹ھ/۷۹۵ء)

نام ونسب وولادت: مالک نام، ابوعبداللہ کنیت، امام دارالہجرۃ لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: مالک بن انس بن مالک بن ابی عامر بن حارث بن عمر بن حارث بن غیمان بن خثیل بن عمرو ابن حارث ذی اصبح۔(۱)

امام مالکؒ خالص عرب خاندان سے تھے جو جاہلیت اور اسلام دونوں میں معزز تھا، بزرگوں کا وطن یمن تھا مگر اسلام کے بعد مدینۃ النبی میں سکونت اختیار کرلی تھی، نسباً یمن کے آخری خاندان شاہی یعنی حمیر کی شاخ ''اصبح'' سے تعلق رکھتے تھے' امام کے مورث اعلیٰ حارث اس خاندان کے شیخ تھے' اسی لئے ذی اصبح کے لقب سے مشہور ہوئے۔

آپ کے خاندان میں سب سے پہلے آپ کے پردادا ابوعامر عہد نبویؐ میں مشرف بہ اسلام ہوئے، امام مالکؒ کے دادا مالک بن ابی عامر جلیل القدر تابعی اور صحاح کے رواۃ میں داخل ہیں، حضرت عثمانؓ کے ساتھ ان کو یک گونہ اختصاص تھا، چنانچہ جن سربکف جوانمردوں نے حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد ان کی لاش کو دشمنوں کے نرغہ سے اٹھا کر دفن کرنے کی خطرناک خدمت انجام دی تھی ان میں ایک یہ بھی تھے، فن روایت وحدیث

(۱) کتاب الانساب سمعانی' ورق ۱۴۱۔

میں ان کو حضرت عمرؓ، عثمانؓ، طلحہؓ، عقیلؓ بن ابی طالب، ابو ہریرہؓ، ام المومنین حضرت عائشہؓ ودیگر صحابہ کبار رضی اللہ عنہم سے شرف تلمذ حاصل تھا، مدینہ کے مشہور فقیہ سلیمان بن یسار اور خود مالک کے بیٹوں نے اور دوسروں نے مالک سے حدیث روایت کی ہے، موطا میں بھی ان کی روایات ہیں، امام نسائی نے ان کی توثیق کی ہے، ۱۰۴ھ میں وفات پائی۔

مالک بن ابی عامر کے تین بیٹے تھے، انس امام مالک کے والد بزرگوار، ربیع اور ابو سہیل نافع، ابو سہیل نافع ایک بلند پایہ محدث تھے، ثقات تابعین اور ارکانِ حدیث میں ان کا شمار ہے، امام مالکؒ نے مؤطا میں ان سے روایت کی ہے۔

امام کے عم محترم ربیع اور والد ماجد انس بھی اپنے خاندان کی علمی وراثت سے محروم نہ تھے تاہم اس فن میں کوئی مخصوص پایہ نہیں رکھتے تھے اور نہ مؤطا میں امام نے ان سے کوئی روایت کی ہے۔(۱)

امام مالکؒ کی صحیح تاریخ ولادت (۹۳ھ) ہے، کیونکہ یہ تاریخ امام کے شاگرد خاص یحییٰ ابن بکیر سے سند کے ساتھ مروی ہے، جو مدتوں امام کی صحبت میں رہے ہیں۔(۲)

تعلیم وتربیت: امام نے ہوش سنبھالا تو اپنے کو علم کی آغوش میں پایا، خود ان کا گھر اور گھر سے باہر پورا شہر علماء وفضلاء کا مخزن تھا، آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد سینکڑوں صحابہ دور دراز مقامات میں نکل گئے تھے لیکن معدن سونا نکلنے کے بعد بھی معدن ہے، تمام اکابر صحابہؓ جو علومِ شریعت کے امین اور قرآن وسنت کے خزینہ دار تھے، اسی مقدس شہر میں سکونت پذیر تھے، عہد نبویؐ اور اس کے بعد بھی ۲۴، ۲۵ برس تک پوری حکومتِ اسلامیہ کا یہ مرکز تھا، یہیں سے احکام وفتاویٰ فقہائے صحابہ کی مجلس میں طے ہو کر تمام دنیائے اسلام میں پھیلتے تھے۔

---

(۱) تزئین الممالک، ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰، اسعاف المبطاء برجال المؤطا ص ۳۴ تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۸، کتاب الانساب سمعانی ورق ۳۱ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۲۔

مدینہ کے فقہائے صحابہ: حضرت ابوبکرؓ صدیق، عمرؓ فاروق اور حضرت عائشہؓ جو اسرارِ شریعت کے راز داں تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ جن سے بڑھ کر آنحضرت ﷺ کے اعمال وسنن کا متبع اور واقف کار کوئی دوسرا نہ تھا، حضرت ابن عباسؓ جو حبر الامۃ تھے، حضرت ابو ہریرہؓ جن سے بڑھ کر حدیث کا کوئی دوسرا راوی نہیں، حضرت زید بن ثابتؓ جو کاتبِ وحی تھے، ان سب کی درسگاہیں اسی شہر میں آباد تھیں۔

تابعین مدینہ: تلامذۂ صحابہ میں سے جن کو اصطلاح میں تابعین کہتے ہیں، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیرؒ نافع، عبداللہ بن دینار، سالم بن عبداللہ، خارجہ بن زید، سعید بن مسیتب، ہشام بن عروہ، محمد بن منکدر، عبیداللہ بن عتبہ بن مسعود، محمد بن مسلم بن شہاب زہری، عامر بن عبداللہ، جعفر صادق، ربیعہ رای، ابو سہیل نافع بن مالک اور سلیمان بن یسار وغیرہ وہ بزرگان اسلام ہیں جن کے فضل وکمال کے آغوش میں اسلام کے علم دین نے نشو ونما پائی ہے، اسی مدینۃ النبی کے لعل وگہر تھے۔

فقہائے سبعہ: ان میں سے ابوبکر بن حارث (۹۴ھ) خارجہ بن زید (۹۹ھ) قاسم بن محمد (۱۰۱ھ) سعید بن مسیتب (۱۰۱ھ) عبداللہ بن عتبہ (۱۰۲ھ) سالم بن عبداللہ (۱۰۶ھ) سلیمان بن یسار (۱۰۷ھ) مدینہ کے فقہائے سبعہ کہلاتے ہیں، صحابہ کے بعد تمام فتاوئی، مسائل اور مقدمات وقضایا انہی کے فیصلہ سے طے پاتے تھے، ان کی مجلس اجتماعی اس عہد کی سب سے بڑی عدالت العالیہ تھی، فقہ مدینہ جس کا ذکر آگے آئے گا ان ہی فقہائے سبعہ کی علمی مجلسوں کے نتائج بحث ہیں۔

شیوخ مالک: امام مالک نے جب آنکھ کھولی تو مدینہ باغ وبہار تھا، چند کے سوا تمام بزرگوار درس وافتاء میں مشغول تھے، امام نے ان میں سے اکثر سے استفادہ کیا اور اس طرح مدینہ کا جو علم متفرق سینوں میں پراگندہ تھا وہ ایک سینہ میں مجتمع ہوگیا اسی لئے امام دارالہجرۃ آپ کا لقب ہوا، امام کے شیوخ کی یوں تعداد تو بہت ہے، اسماء الرجال کی کتابوں میں ہے

کہ (روی عن خلق کثیر) یعنی انھوں نے بہت سے لوگوں سے روایتیں کی ہیں۔

امام کے شیوخ اعزہ: خود امام کا گھر علم حدیث کا مرجع تھا، آپ کے دادا، چچا اور والد محدث تھے، امام کے دادا جو ثقات رواۃ میں ہیں، امام کے ہوش تک زندہ تھے لیکن ان سے بلاواسطہ امام نے فیض حاصل نہیں کیا، ابوسہیل نافع امام کے ایک چچا روایت و حدیث کے شیخ تھے، امام زہری وغیرہ کے استاذ ہیں، امام نے بھی ان سے حدیثیں سیکھی ہیں، آپ کے والد انس اور دوسرے چچا ربیع دونوں اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں لیکن ان سے کوئی روایت امام نے موطا میں نہیں نقل کی ہے۔

امام نے غالباً لڑکپن سے طلب علم شروع کی، خود ان کی زبانی مروی ہے "میں نافع کے پاس آتا تھا تو ایک کم سن لڑکا تھا، میرے ساتھ ایک غلام ہوتا تھا، نافع اتر کر آتے تھے تو مجھ سے حدیث بیان کرتے تھے۔" (۱)

اس وقت تک تعلیم کا نصاب نہایت سادہ تھا یعنی قرآن مجید، حدیث اور فقہ۔

امام مالک نے قرآن مجید کی قرأت و سند مدینہ کے امام القراء ابورویم نافع بن عبدالرحمٰن متوفی ۱۶۹ھ سے حاصل کی، (۲) جن کی قرأت پر آج تمام دنیائے اسلام کی قرأت کی بنیاد ہے، قرآن مجید کی تعلیم ہمیشہ مسلمانوں میں لڑکپن میں ہوتی ہے، عجب نہیں کہ اس کا یہی زمانہ ہو۔

علم حدیث: علم حدیث کی تعلیم بھی بچپن ہی سے شروع ہوئی جیسا کہ گذشتہ روایت سے ثابت ہوتا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ امام کے سب سے پہلے شیخ الحدیث حضرت نافع ہیں یا ممکن ہے آپ کے چچا ابوسہیل ہوں لیکن یہ محض قیاس ہے اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔

نافع: نافع حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے آزاد کردہ غلام اور حدیث و روایت میں ان کے شاگرد

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۱ ص۸۸ ترجمہ نافع (۲) ابن خلکان ج۲ ص۲۰۰ و جلد۳ ص۵۱۔

تھے، حضرت نافع نے کامل تیس سال حضرت ابن عمرؓ کی خدمت کی ہے، ان کے علاوہ اور متعدد صحابہ حضرت عائشہؓ، ام سلمہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت ابو سعید خدریؓ وغیرہ سے بھی روایت کی ہے، امام اوزاعی، امام زہری، ایوب سختیانی، ابن جریج، امام مالک جیسے ائمہ حدیث ان سے شرف تلمذ رکھتے تھے، نافع کی جلالت قدر کا اس سے اندازہ ہوگا کہ خلیفہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے جو خود مجتہد و ناقد فن تھے، نافع کو اہل مصر کی تعلیم کے لئے بھیجا تھا، ۱۱۷ھ میں نافع نے وفات پائی۔(۱)

نافع جب تک زندہ رہے، امام مالک ان کے حلقۂ درس سے استفادہ کرتے رہے، وہ ان سے پوچھتے تھے کہ ''ان مسائل میں حضرت ابن عمرؓ نے کیا فرمایا ہے'' نافع ان کے اقوال بیان کرتے تھے، شاگرد کو استاد کے علم وفضل پر اتنا غرور تھا کہ فرماتے ہیں کہ ''جب میں ابن عمرؓ کی حدیث نافع کی زبان سے سن لیتا ہوں تو پھر اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ کسی اور سے بھی اس کی تائید سنوں'' شاگرد واستاد کے شرف وقبول کی دلیل اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ روایت مالک عن نافع عن ابن عمرؓ کو دنیا سلسلۃ الذہب یعنی ''طلائی زنجیر'' کہہ کر پکارتی ہے۔(۲)

نافع کے علاوہ امام نے مدینہ کے دوسرے شیوخ کبار سے بھی حدیث سیکھی، جن میں ممتاز نام یہ ہیں: محمد بن شہاب زہری، جعفر صادق بن محمد، محمد بن منکدر، محمد بن یحییٰ انصاری، ابو حازم، یحییٰ بن سعید۔

شیوخ کی تعداد: امام مالک نے مؤطا میں جن شیوخ سے روایت کی ہے ان کی مجموعی تعداد شاہ ولی اللہ صاحب نے مسوی کے مقدمہ میں پچھتر (۷۵) بتائی ہے لیکن **اسعاف المبطاء** برجال المؤطا سے میری تحقیق کے مطابق شیوخ کی تعداد چورانوے (۹۴) ہے لیکن یہ تعداد مؤطا کی احادیث وآثار کی ہے، ورنہ اصل میں امام مالک کی احادیث صحیحہ وغیر صحیحہ کی تعداد دس

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۸۷و۸۸ (۲) ابن خلکان ج ۳ ص ۵۰۔

ہزار ہے، اس لحاظ سے اگر شیوخ کی تلاش کی جائے تو موجودہ تعداد سے بہت زیادہ بڑھ جائے گی، امام مسلم نے امام مالک کے شیوخ کے حال میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی لیکن اب وہ ناپید ہے۔

غیر مدنی شیوخ: امام مالک کے اساتذہ میں بعض غیر مدنی شیوخ کے نام بھی ملتے ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک ایسے چھ اشخاص ہیں، جیسا کہ مقدمۂ مسوی میں لکھا ہے لیکن درحقیقت نو شخص ہیں، ایک شام کے ابراہیم بن ابی عبلہ مقدسی، دو مکہ معظمہ کے محمد بن مسلم ابوالزبیر مکی اور حمید بن قیس اعرج مکی، دو خراسان کے عطاء بن ابی مسلم خراسانی اور زیادہ بن سعد خراسانی، دو جزیرہ کے عبدالکریم بن مالک جزری اور زید بن انیسہ جزری اور دو بصرہ کے ایوب سختیانی بصری اور حمید بن ابی حمید الطویل بصری، امام نے ان ممالک کا کبھی سفر نہیں کیا اس لیے ان بزرگوں سے اخذ واستفادہ کا موقع مدینہ ہی میں ملا ہوگا، کیوں کہ حج وزیارت کی غرض سے اکثر بزرگانِ علم کا سال میں ایک بار اور کبھی کبھی کئی کئی بار مدینہ میں آنا ہوتا تھا۔

علم فقہ: امام مالک نے فقہ کی تعلیم گو نافع وغیرہ شیوخ سے بھی پائی لیکن ابوعثمان ربیعۃ الرای سے خاص طور سے اس کی تحصیل کی، ربیعہ مدینہ کے کبار تابعین میں تھے، حضرت انسؓ وغیرہ صحابۂ کرام کے دامنِ تربیت میں تعلیم پائی تھی، امام مالک، یحییٰ انصاری، شعبہ، اوزاعی، حسن بصری، لیث مصری وغیرہم جو اس طبقہ کے اکابر رجال واعیان علم ہیں ان کے شاگرد ہیں، ربیعہ کے ساتھ امام مالک کا اختصاص اس درجہ تھا کہ تاریخ ورجال میں ''شیخ مالک'' ان کے نام کا جزء ہوگیا ہے، ربیعہ اجتہاد واستنباط وتفریع ورائے میں اس قدر معروف تھے کہ ''رائی'' ان کا لقب ہوگیا، امام ابن حنبل ان کو ثقہ کہتے ہیں، ابن شیبہ کا قول ہے کہ وہ ''ثقہ'' ثبت اور مدینہ کے مفتیوں میں سے ایک تھے، خطیب نے لکھا ہے ''وہ فقیہ، عالم اور فقہ وحدیث دونوں کے حافظ تھے۔''

ربیعہ رائی خاص مسجد نبویؐ میں درس دیتے تھے، قرن اول کا مدینہ جو سینکڑوں محدثین وفقہا کا مخزن تھا، اس میں فتویٰ دینا ایک خاص لیاقت وقابلیت کا کام تھا، ربیعہ رائے اس وصف سے متصف اوران اکابر فقہائے محدثین میں تھے جن کو مدینۃ الرسول کے مفتی ہونے کی سعادت حاصل تھی، دولت عباسیہ کے پہلے فرماں روا سفاح نے قاضی دارالخلافت کا عہدہ ان کے سپرد کیا، حکومت عباسیہ کا پہلا پایہ تخت انبار تھا یہیں ۱۳۶ھ میں انھوں نے وفات پائی۔

امام مالک کے شیوخ واساتذہ کی یہ تعداد اس زمانہ کے کثرتِ شیوخ کے مذاق کے لحاظ سے نہایت کم ہے اور عجب نہیں کہ اس پر ان لوگوں کو جو تعداد کو افضلیت کا معیار جانتے ہیں تعجب ہوا، لیکن درحقیقت اس میں بھی امام مالک کے لئے ایک مزیت خاص مضمر ہے۔

امام مالکؒ کا انتخاب شیوخ: صحابہ کے بعد تابعین کا دور شروع ہوا، یہ دور ثانی یا قرن ثانی گو عمومیت اور اکثریت کے لحاظ سے خیر وبرکت کا عہد اور صدق وطہارت کا دور تھا تاہم زمانہ کا کوئی دور کبھی ایسا نہیں گذرا ہے اور نہ گذر سکتا ہے، جب مجمع انسانی فاسد عنصر سے بالکل خالی ہو زمانہ کے خیر یا شر ہونے کا فیصلہ صرف نسبتاً ہوسکتا ہے، صحابہ کا قرن اول اپنے ماقبل ومابعد کی نسبت سے خیر القرون تھا تاہم وہ ماعز اور زن مخزومیہ وغیرہ کے وجود سے خالی نہ تھا، گو یہ ہستیاں بھی قرون مابعد کے اخیار وابرار سے شرف صحبت، قوت ایمان، اعتراف قصور وخشیت الٰہی اور توبہ وندامت میں بدرجہا بہتر تھیں، عفی اللہ عنہم۔

صحابہ کے بعد تابعین کا زمانہ بھی اپنے مابعد کے لحاظ سے برکات کا مجمع اور کمالات کا منبع تھا، تاہم وہ.............انسانی طبقات کے جو اقسام ہیں اُن سے یکسر پاک بھی نہ تھا، بہتیرے لوگ قصداً جھوٹ بولتے تھے، بہتیرے اپنے غایت زہد وسادہ دلی سے ہو بولنے والے کو سچا سمجھ کر بلا تامل اس کی بات نقل کرتے تھے، اس طرح نادانستہ کذب

بیانی میں مبتلا ہو جاتے تھے، سینکڑوں غیر فقیہ راوی ایسے تھے جو اپنی روایات کا خود محل و مفہوم نہیں سمجھتے تھے، کچھ ایسے تھے جو فن کی عدم ممارست کے سبب سے جید و ردی میں تمیز نہیں کر سکتے تھے لیکن چوں کہ اس زمانہ کی آب وہوا میں روایت حدیث اور اشاعت قول نبوی کا مذاق پھیلا ہوا تھا اور یہی عز و شرف کا ذریعہ تھا، اس لیے اہل فضل اور مستحقین علم کے پہلو بہ پہلو نا اہل اور غیر مستحقین بھی اپنی مسند بچھاتے پھرتے تھے، باہر کے ناواقف آفاقی جن میں زیادہ تر عراقی تھے، ہر چمکدار چیز کو سیم خالص سمجھ کر اور ہر ڈھیر سے بلا تمیز ایک خروارہ اٹھاتے پھرتے تھے اور اس بار گراں کے ساتھ جب گھر لوٹتے تھے تو اپنے کو سب سے بڑے ڈھیر کا مالک سمجھ کر خوش ہوتے تھے۔

امام مالک کا مدینہ وطن تھا، بچپن سے علما میں تربیت پائی، ایک ایک صاحب حدیث سے برسوں ملاقاتیں رہیں، ہر ایک سرمایہ دار کی متاع کے ایک ایک ذرہ سے واقف تھے اور یہ غیر ممکن ہے کہ نا اہلوں کی نا اہلیت خود اپنے ارباب وطن سے مخفی رہے۔

خصوصیات شیوخ مالک: امام مالک نے صرف ان ہی اساتذۂ فن سے استفادہ کیا جو اہلیت و استحقاق کے مسند نشیں تھے اور صرف ان شیوخ کے حلقۂ درس میں بیٹھے جو صدق وطہارت میں معروف اور حفظ وفقہ میں ممتاز تھے، امام ممدوح ہمیشہ تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کرتے تھے کہ میں کبھی کسی غیر فقیہ (سفیہ) کی مجلس میں نہیں بیٹھا، امام ابن حنبل فرماتے ہیں کہ ''یہ مخصوص نعمت تھی جو صرف حضرت امام مالک کے حصہ میں آئی۔'' امام صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''اس صحن مسجد (نبوی) میں ان ستونوں کے پاس میں نے ستر شیوخ کو پایا جو قال اللہ قال الرسول کہا کرتے تھے لیکن ان میں سے ایک کے پاس بھی میں نہیں بیٹھا۔'' کبھی فرماتے ''مدینہ میں بیسیوں اشخاص تھے جن سے لوگ حدیث سیکھتے تھے لیکن میں نے کبھی ان سے اخذ علم نہیں کیا، یہ چند قسم کے لوگ تھے، بعض نادانستہ جھوٹ بولتے تھے، بعض مغز سخن سے ناواقف تھے، بعض پورے جاہل تھے، ابن وہب جو امام صاحب کے نامور

شاگرد ہیں نقل کرتے ہیں کہ امام صاحب نے فرمایا کہ مدینہ میں ایسے لوگ تھے کہ اگر بارش کی دعا مانگی جاتی تو ان کی برکت سے آسمان سے پانی برس پڑتا" اور بہت سی احادیث اور مسائل کی ان کو سماعت بھی حاصل تھی لیکن میں نے ان سے استفادہ نہیں کیا کیوں کہ وہ صرف متقی اور زاہد تھے اور حدیث و روایت اور فتویٰ کا کام صرف زہد و اتقا اور سادگی سے نہیں چل سکتا، اس کے لیے اتقاو پرہیز گاری کے ساتھ علم و فہم اور پختگی کی حاجت ہے، وہ یہ جانتا ہو کہ اس کے منھ سے کیا نکل رہا ہے اور کل قیامت کے دن یہ معاملہ کہاں تک پہنچے گا، جس زہد کے ساتھ پختگی اور دانائی نہ ہو وہ اس راہ میں مفید نہیں اور نہ وہ حجت ہے اور نہ ایسے لوگوں سے اخذ علم کرنا چاہیے۔" امام مالک کے بھانجے اسماعیل بن ابی اویس روایت کرتے ہیں کہ میں نے اپنے ماموں مالک کو کہتے سنا ہے کہ "یہ علم حدیث دین ہے پہلے دیکھ لو کہ کس سے حاصل کرتے ہو، میں نے ان ستونوں کے پاس ستر آدمیوں کو قال رسول اللہ قال رسول اللہ کہتے سنا لیکن میں نے ان سے ایک حرف نہیں سیکھا، حالانکہ ان میں سے ہر شخص ایسا تھا کہ اگر خزانہ بھی ان کے سپرد کیا جاتا تو ان کی ایمان داری اور دیانت کے شیشہ میں بال نہ آتا لیکن وہ اس فن کے آدمی نہ تھے۔" مطرف بن عبداللہ کہتے ہیں کہ میں نے امام کی زبان سے ان کا قول سنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ "میں نے اس شہر میں بہت سے نیک و صالح لوگوں کو پایا لیکن ان سے میں نے حدیث نہیں سنی۔" لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "جو وہ کہتے تھے وہ سمجھتے نہ تھے۔"(۱)

امام صاحب نے اہل عراق سے کیوں روایت نہیں کی: امام کے شیوخ میں کوئی عراقی نہیں ہے، ابو مصعب جو امام کے شاگرد اور مشہور محدث ہیں، بیان کرتے ہیں کہ امام صاحب سے کسی نے پوچھا کہ آپ نے اہلِ عراق سے کیوں روایت نہیں کی؟ جواب میں فرمایا کہ "کیا میں ایسے لوگوں سے روایت کروں جن کو میں نے دیکھا ہے کہ یہاں آ کر ان

(۱) مقدمہ اسعاف ص ۲، ۳، ۴، ۵۔

لوگوں سے حدیث سیکھتے ہیں جن پر وثوق نہیں کیا جاسکتا" ابو مصعب کا بیان ہے کہ "میں نے کہا کہ وہ اپنے شہر میں بھی ایسے ہی لوگوں سے روایت کرتے ہیں" اسی قسم کا سوال ایک بار امام مالک سے شعیب بن حرب نے کیا کہ آپ لوگ اہل عراق سے کیوں نہیں روایت کرتے، امام صاحب نے کیا معقول جواب دیا، فرمایا کہ "ہمارے بزرگوں نے ان کے بزرگوں سے روایت نہیں کی اس لیے ہمارے پچھلوں نے بھی ان کے پچھلوں سے روایت نہیں کی۔(۱)

امام مالک جب کسی غیر مدنی شیخ سے اخذِ حدیث کرنا چاہتے تھے تو پہلے اس کو پوری طرح جانچ لیتے تھے، امام کا کوئی شیخ اگر عراقی کہا جاسکتا ہے تو وہ بصرہ کے ایوب سختیانی مشہور تابعی المتوفی ۱۳۱ھ ہیں جن کی نسبت ابن سعد کہتے ہیں "کان حجة ثقة ثبتا في الحديث جامعا كثير العلم" اور جن کو شعبہ نے سید الفقہاء کا خطاب دیا ہے اور جن کا نام رجال میں احد الائمۃ الاعلام کے وصف کے ساتھ لیا جاتا ہے، امام مالک فرماتے ہیں کہ مکہ میں حج کے موقع پر ان کو دو سال میں نے دیکھا لیکن ان سے کوئی حدیث نہیں لکھی، تیسرے سال دیکھا کہ وہ صحن زمزم میں بیٹھے ہیں، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی لیا جاتا تو وہ اتنا روتے کہ مجھ کو رحم آتا تھا، جب یہ حال دیکھا تو ان کی حدیث لکھی۔(۲)

اپنے دادا اور بعض فقہائے سبعہ سے کیوں نہیں روایت کی: امام جب سن رشد کو پہنچے اُس وقت آپ کے دادا مالک بن ابی عامر زندہ تھے، ان کی وفات کے وقت امام کی عمر ۱۲، ۱۳ سال کی تھی، فقہائے سبعہ میں سے سالم بن عبداللہ نے ۱۰۶ھ میں وفات پائی، جب کہ امام کی عمر ۱۶ برس کی تھی، سلیمان بن یسار نے ۱۰۷ھ میں انتقال کیا، اس وقت امام ۱۷ سال کے تھے تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں سے بلا واسطہ کوئی روایت نہیں کی، اس کا سبب خود

(۱) مقدمہ اسعاف ص ۲، ۳ (۲) مقدمہ اسعاف ص ۳ تا ۵۔

انھوں نے بیان فرمادیا ہے کہ "مدینہ میں بعض ایسے لوگوں کا زمانہ میں نے پایا ہے جو ۱۰۰ اور ۱۰۵ برس کی عمر کو پہنچ گئے تھے لیکن ایسے بوڑھوں کی روایت نہیں لی جاتی ہے اور اگر کوئی لے تو عیب شمار کیا جائے گا۔" اور یہ بالکل سچ ہے کیوں کہ عمر کی طوالت کا حفظ وعقل کے ضعف پر جو اثر پڑتا ہے اس سے کون انکار کرسکتا ہے۔

امام مالک کے اس احتیاط وتمیز ونقد کا یہ اثر تھا کہ امام مالک جس شیخ سے روایت کرتے تھے وہ ثقاہت وعدالت وحفظ میں نشان سمجھا جاتا تھا، یحییٰ بن معین جو مبصرین فن حدیث کے امام ہیں فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ امام کے آگے کیا ہیں؟ ہم لوگ تو اُن کے نقش قدم پر چلتے ہیں، جب کسی شیخ کا نام آتا ہے تو دیکھتے ہیں کہ امام مالک نے اس سے لیا ہے یا نہیں، اگر نہیں لیا ہے تو چھوڑ دیتے ہیں۔" امام احمد بن حنبل سے کسی نے ایک راوی کی نسبت پوچھا انھوں نے فرمایا کہ "میرے نزدیک وہ اچھا ہے کیوں کہ امام مالک نے اس سے روایت کی ہے۔" (۱)

اساتذہ آپ کے معترف تھے: امام مالک فطرتاً قوی الحافظہ تھے، خود فرمایا کرتے تھے کہ کوئی چیز میرے خزانۂ دماغ میں آکر پھر نہ نکلتی (۲) اور خود دوسروں کو بھی اس کا اعتراف تھا، ابو قلابہ کہتے ہیں کان مالك احفظ اهل زمانه (۳) ایک بار استاذ ربیعہ کی معیت میں امام زہری کی مجلس میں حاضر ہوئے، امام زہری نے اُس دن چالیس سے زیادہ حدیثوں کا املا کرایا۔ دوسرے دن پھر مجلس منعقد ہوئی تو امام مالک اپنے استاذ کے ساتھ پھر حاضر ہوئے، امام زہری نے کہا کتاب لاؤ، میں اس سے حدیث بیان کروں، کل جو میں نے بیان کیا تھا اس سے تم کو کیا فائدہ ہوا، ربیعہ نے کہا اس مجلس میں ایک شخص ہے جو کل کی تمام حدیثیں زبانی سنا دے گا، زہری نے پوچھا وہ کون ہے؟ ربیعہ نے کہا ابن ابی عامر، زہری

(۱) ان تمام اقوال کے لیے دیکھیے مقدمہ اسعاف (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۸، ۱۸۹ (۳) تزیین الممالک ص ۹ مصر۔

نے سنانے کا اشارہ کیا، امام صاحب فرماتے ہیں کہ میں نے چالیس حدیثیں سنا دیں، زہری نے تعجب سے کہا میرا خیال تھا کہ یہ حدیثیں میرے سوا کسی کو یاد نہیں ہیں۔(۱)

شوقِ علم اور فراغ قلب بہت کم مجتمع ہوئے ہیں، امام مالک کے فقر کی نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ چھت کی کڑیاں فروخت کر کے ضرورتیں پوری کیں لیکن دست طلب سم کوتاہ نہیں کیا۔(۲) اسی لیے آپ فرماتے تھے کہ "اس علم میں کسی شخص کو اُس وقت تک کمال حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ وہ مبتلائے فقر نہ ہو اور اس پر بھی طلب علم کو ترجیح دے(۳) امام مالک طلب علم کے لیے بجز موسم حج کے مدینہ سے باہر نہیں نکلے مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کو طلب علم کے لیے محنت نہیں اٹھانی پڑی، ابن سعد نے امام مالک سے بیک واسطہ روایت کی ہے کہ نافع سے حدیث سیکھنے کا وقت ٹھیک دوپہر کو مقرر تھا، دوپہر کی دھوپ میں بلا سایہ شہر سے باہر بقیع میں جاتا تھا، جہاں ان کا مسکن تھا، مدینہ کے ایک فقیہ ابن ہرمز تھے، ان کے گھر صبح کو آتا تھا تو رات کو جاتا تھا۔(۴)

مجلس درس: اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امام صاحب کی لیاقت واستحقاق کا اعتراف عام طور سے کیا جا رہا تھا اور امام کے شیوخ کی موجودگی میں امام کے مستفیدین کا الگ حلقہ قائم ہو چکا تھا(۵) شیخ الفقہ ربیعہ متوفی ۱۳۶ھ زندہ تھے کہ امام مالک فقہ وفتویٰ کے مرجع بن گئے،(۶) اور ربیعہ کی وفات کے بعد تو متفقہ طور سے فقہ ورائے واجتہاد کے امام تسلیم کر لیے گئے، ابن ربیعہ نے جو مصر کے ایک شیخ حدیث ہیں، شیخ مدینہ ابوالاسود نعیم بن عروہ بن زبیر سے پوچھا کہ "ربیعہ کے بعد مدینہ میں فقہ واجتہاد کا امام کون ہے؟" انھوں نے جواب دیا کہ نوجوان اصبحی (۷) یعنی (مالک بن انس اصبحی)

---

(۱) تزیین الممالک ص ۹ مصر ص ۱۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۸ (۳) تزیین ونقلا عن الحلیۃ لابی نعیم ص ۱۵ مصر (۴) طبقات ابن سعد (۵) تزیین الممالک ص ۱۰ (۶) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ (۷) تزیین الممالک ص ۹۔

مجلس مالک: فن حدیث میں امام صاحب کے خاص شیخ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے غلام نافع تھے، حضرت ابن عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ساٹھ برس تک حدیث و فقہ وفتویٰ وارشاد کے مرکز رہے ہیں، حضرت نافع کامل تیس برس تک سفر وحضرت اور خلوت وجلوت میں ہمیشہ حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ رہے اوران کے بعد ان کی مجلسِ درس میں ان کے جانشیں ہوئے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی، امام مالک کم ازکم بارہ برس حضرت نافع کے درس میں رہے۔

حضرت نافع کی وفات کے بعد امام مالک ان کے جانشیں ہوئے، شعبہ جو کوفہ کے رأس المحدثین تھے، بیان کرتے ہیں کہ ''نافع کی وفات کے ایک سال بعد مدینہ آیا تو دیکھا کہ مالک ایک حلقہ کے صدر نشین ہیں۔''(۱) اس واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے ۱۱۷ھ میں اپنی مجلسِ درس مستقل قائم کی۔

مجلس کی تہذیب: امام صاحب کی مجلس درس ہمیشہ پر تکلف فرش اور بیش قیمت قالینوں سے آراستہ رہتی تھی، وسط مجلس میں شہ نشین تھی، جس پر امام صاحب املائے حدیث کے وقت رونق افروز ہوتے تھے، جابجا شرکائے مجلس کے لیے پنکھے پڑے رہتے تھے، جب حدیث کا درس ہوتا تو انگیٹھی میں عود اور لوبان جلائی جاتی، صفائی ونزاہت کا یہ عالم تھا کہ فرش پر ایک تنکا بھی بارِ خاطر ہوتا تھا، جب حدیثِ نبویؐ کے املا کا وقت آتا، پہلے وضو یا غسل کر کے عمدہ اور بیش قیمت پوشاک زیب تن فرماتے، بالوں میں کنگھی کرتے، خوشبو لگاتے، اس اہتمام کے بعد مجلس علمی کی صدارت کے لیے باہر تشریف لاتے۔(۲)

سب لوگ سرنگوں خاموش مؤدب بیٹھتے تھے، یہاں تک کہ امام ابوحنیفہ بھی جب امام کی مجلس درس میں آکر شریک ہوئے تو وہ بھی اسی طرح مؤدب ہوکر بیٹھے،(۳) اس وقت

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۱۸۸ (۲) تزئین الممالک ص۱۳و۱۶ وبستان المحدثین ص۳۰۳ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۱ص ۱۸۹۔

امام صاحب کی ہر ادا سے شکوہ اور وقار کا اظہار ہوتا تھا، پوری مجلس پر ایک مقدس سکوت طاری رہتا تھا، امام شافعی فرماتے ہیں کہ ''ہم لوگ کتاب کے ورق بھی اس ڈر سے نہیں الٹتے تھے کہ کھڑ کھڑاہٹ کی آواز نہ ہو۔''(۱) جاہ وجلال اور شان وشکوہ سے کاشانۂ امامت پر بارگاہ شاہی کا دھوکہ ہوتا تھا، طلبہ کا ہجوم، مستفتیوں کا ازدحام، امرا کا ورود، علما کی تشریف آوری، سیاحوں کا گذر، حاضرین کی مودب نشست، مکان کے پھاٹک پر سواریوں کا انبوہ دیکھنے والوں پر رعب طاری کر دیتا تھا، اسی موقع پر ایک شاعر کا گذر ہوا تو بے اختیار اس کی زبان سے یہ دو شعر نکل گئے۔ (۲)

یدع الجواب فما یراجع هیبة　　　والسائلون نواکس الاذقان

اگر امام جواب نہیں دیتے تو ہیبت سے پھر پوچھا نہیں جا سکتا، پوچھنے والے سر نیچے کئے رہتے ہیں۔

ادب الوقار وعزسلطان التقی　　　فهوالمهاب ولیس ذا سلطان

وقار کا ادب اور سلطان تقویٰ کا جاہ وجلال ہے، لوگ اس سے ڈرتے ہیں حالانکہ یہ صاحب حکومت نہیں ہے۔

امام مالک صاحبِ حکومت نہ تھے لیکن صاحبِ حکومت اس آستانہ پر آکر جھکتے تھے، امام شافعی نے اپنی تعلیم کے لئے والیٔ مدینہ کو بہ غرض سفارش جب درِ امامت پر لانا چاہا تو اس نے کہا ''میرا کہاں وہاں گذر۔''

حدیث کا املا مسجد نبوی یا مجلس درس سے باہر نہیں کرتے تھے، خلیفہ مہدی اور ہارون دونوں نے خیمۂ خلافت میں املا کی خواہش کی لیکن امام نے انکار کر دیا، جلدی میں یا کسی کام کی مصروفیت میں یا راہ چلتے ہوئے حدیث نہیں بیان فرماتے تھے کہ خلاف ادب ہے، درحقیقت سماع وفہم حدیث کے لئے اطمینان اور حضور قلب چاہیے جو ان موقعوں پر

(۱) توالی التاسیس بمناقب ابن ادریس بن حجر (۲) تزئین ص ۱۷۔

عموماً مفقود ہوتے ہیں، ان کی مجلس میں زور زور سے بولنا بھی خلاف ادب تھا، ایک بار خلیفہ منصور امام سے مسجد میں مناظرہ کر رہا تھا اور اس کی آواز نہایت بلند ہو رہی تھی، امام نے ڈانٹ کر یہ آیت پڑھی۔(۱)

لَا تَرْفَعُوٓا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ۔ (حجرات:۲)

پیغمبر کی آواز پر اپنی آواز بلند نہ کرو۔

آپ کا معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک مصلیٰ پر اوراد وظائف میں مشغول رہتے، طلوع کے بعد لوگ آنا شروع ہوتے، امام صاحب ان کی طرف متوجہ ہو کر خیریت پوچھتے، مجلس کی یہ ترتیب تھی کہ قریب تر اچھے، مستعد اور صاحب فہم طلبہ کو جگہ دیتے، پھر علی قدر مراتب لوگ آ آ کر بیٹھتے جاتے، درس شروع کرنے سے پہلے فرمادیتے کہ "مشہور اور صاحب فہم لوگ قریب بیٹھیں، املا آہستہ اور سکون کے ساتھ کرتے، ایک حدیث ختم ہو جاتی تو دوسری حدیث شروع کرتے۔"

طریقۂ درس: مختلف شیوخ کی مجلسوں میں درس کا طرز مختلف تھا، اکثر شیوخ کا دستور تھا کہ وہ خود کسی بلند مقام پر بیٹھ جاتے یا کھڑے ہو جاتے، طلبہ ترتیب کے ساتھ آگے پیچھے قلم دوات لے کر بیٹھ جاتے، شیخ زبانی یا اپنا جزء حدیث ہاتھ میں لے کر اس سے املا کرتا، طلبہ لکھتے جاتے تھے، مجلس درس میں اگر غیر معمولی اجتماع ہوتا تو تھوڑی تھوڑی دور پر مستملی کھڑے ہو کر شیخ کے الفاظ آگے کو پہنچاتے، امام مالک بھی کبھی کبھی اس طریقہ سے درس دیتے تھے، ابن علیہ جو ایک اچھے شاگرد تھے، امام کے مستملی تھے۔

لیکن مدینہ کے اکثر شیوخ کا دستور یہ تھا کہ وہ اپنی احادیث وفتاویٰ وتعلیقات کو پہلے قلم بند کر لیتے، یا کسی مستعد اور صاحب فہم شاگرد کو لکھنے پر مامور کرتے، یہ لکھے ہوئے اجزا کاتب کے ہاتھ میں ہوتے اور وہ مجلس میں اس کو پڑھتا، شیخ جا بجا اس کے مطالب کی

---

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ وتہذیب الاسماء قسم اول ج ۲ ص ۷۲۔

تشریح کرتا جاتا، اگر کاتب سے غلطی ہو گئی ہوتی تو اس کی تصحیح کر دیتا، امام صاحب کے کاتب کا نام ابن حبیب تھا، جن کا شمار محدثین کبار میں ہے، کبھی معن بن عیسیٰ یا دوسرے تلامذہ پڑھتے، یہی سبب ہے کہ امام کے بعض تلامذہ مثلاً یحییٰ جن کی روایت بخاری میں ہے بجائے حدثنا مالک واخبرنا مالک کے قراۃ علی مالک کہتے ہیں۔

امام صاحب اس اصول کی شدت سے پابندی کرتے تھے، یحییٰ بن سلام اسی بات پر ناراض ہو کر مجلس سے اٹھ گئے کہ ''خود نہیں پڑھتے، شاگردوں سے پڑھواتے ہیں'' یحییٰ بن سلام تو خیر ایک ادنیٰ شاگرد تھے، خود خلیفۂ وقت ہارون نے امین و مامون کے لیے درخواست کی کہ امام پڑھیں اور یہ سنیں تو امام نے شیوخ مدینہ کا نام گنا کر فرمایا کہ ''ہمارے شہر کے شیوخ کا یہی دستور تھا،''(۱) کیا عجیب بات ہے کہ جس بات کے لیے لوگوں کو اس قدر اصرار تھا وہی آج ایک مدت سے تمام مدارس اسلامیہ کا دستور عام ہے۔

اس طریقہ کی خوبی: شیوخِ مدینہ کا یہ طریقہ متعدد وجوہ سے زیادہ محتاط اور بہتر ہے، مجمع عام میں جب کوئی شخص بولنے کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو عجلت، کثرت ازدحام اور کبھی مرعوبیت کے سبب سے اس میں مسامحت ہو سکتی ہے، بخلاف اس کے اگر پہلے سے لکھ لیا جائے تو فراغِ خاطر، اطمینان قلب اور فرصتِ فکر و مراجعت کے سبب سے صحت و حفظ و وثوق کے ذرائع زیادہ ہیں، محدث کا خود قراءت نہ کرنا اس لیے زیادہ مناسب ہے کہ وہ دوبارہ سن کر اپنے مسودہ کی تصحیح کر سکے کیوں کہ خود پڑھنے میں اکثر دیکھا گیا کہ زبان و نظر اپنی یاد کی بنا پر غلط لکھے ہوئے کو بھی صحیح پڑھتی ہے، دوسرا اجنبی شخص ہر سطر پر بار بار ٹھہرتا ہے، اس طرح معلم کو ہر مرتبہ غلطی پر تنبیہ ہوتی ہے، لیکن اس سے بھی بڑی مصلحت اس میں یہ ہے کہ اکثر فقہائے محدثین احادیث و آثار کے ساتھ اپنی ذاتی تحقیق و رائے یا کسی لغت کی شرح بھی بیان کرتے جاتے تھے، چنانچہ امام زہری کا یہی طرز تھا لیکن اس طرز میں ایک

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۹۰، ۱۹۱

بڑی خرابی یہ ہے کہ اکثر طلبہ اصل اور اضافہ میں تمیز نہیں کر سکتے تھے اور متن حدیث اور شیخ کے کلام میں ان کو اشتباہ ہوتا تھا، امام مالک کا طرز نہایت محفوظ تھا کہ اصل تو کاتب پڑھتا تھا اور اضافہ خود اپنی زبان مبارک سے ادا کرتے تھے، اس طرح ہر طالب علم کو اصل واضافہ وادراج میں فرق معلوم ہو جاتا تھا۔

مجلس درس کی شہرت: ایک تو مدینہ خود اسلام کا گہوارہ اور نسلاً بعد نسلٍ علم دین کا مرکز تھا، دوسرے امام ہمام کا خاندان ابتداء سے علم کے ساتھ ایک خاص نسبت رکھتا تھا، ان اضافی اوصاف کے ساتھ خود ذاتی جوہر نے وہ پروبال نکالے کہ پوری دنیائے اسلام مشرق سے مغرب تک امام کے آوازۂ شہرت سے معمور ہو گئی اور امام کی درس گاہ مرز وبوم کے اختلاف وبوقلمونی کا مظہر بن گئی، ایک طرف سیستان دوسری صدی کی مملکت اسلام کا مشرقی گوشہ اور دوسری طرف قُرطبہ دنیائے اسلام کا مغربی گوشہ، دونوں کے ڈانڈے مدینۃ الرسول میں آکر مل گئے، ممالک عرب، ممالک شام، ممالک عراق، ممالک عجم، ممالک ترکستان، ممالک مصر، ممالک افریقہ، ممالک اندلس، وایشیائے کوچک، الغرض ایشیا، افریقہ اور یورپ تینوں براعظموں سے طالبان علم کے قافلے مسلسل مدینہ کا رخ کرنے لگے، اس طرح پیغمبر عالم علیہ الصلاۃ والسلام کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔

عن ابی هريرة عن النبی صلی الله علیه وسلم یوشك ان یضرب النّاس اكباد الابل فلا يجدون احدا اعلم من عالم المدينة. (ترمذی ابواب العلم باب ماجاء فی عالم اہل المدینۃ)	ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عنقریب وہ زمانہ آئے گا جب لوگ طلب علم کے لیے اونٹ ہنکائیں گے لیکن مدینہ کے عالم سے زیادہ بڑا عالم وہ کسی کو نہ پائیں گے۔

☆☆☆

تلامذہ ومستفیدین

محدث ذہبی لکھتے ہیں کہ ''امام مالک سے اتنے لوگوں نے روایت کی ہے جن کا شمار تقریباً ناممکن ہے،(۱) ان کے تلامذہ میں وہ لوگ بھی داخل ہیں جو دوسرے علماء کی مجلس سے فضل وکمال کی سند حاصل کر چکے تھے، بلکہ خود امام کے شیوخ بھی امام کے احسان علمی کے بارے سبکدوش نہ تھے۔(۲) خود امام مالکؒ فرماتے تھے کہ ''بہت کم ایسے لوگ ہیں جن سے میں نے سیکھا ہو اور آخر میں ان کو خود مجھ سے پوچھنے کی حاجت نہ پڑی ہو۔''(۳)

تلامذہ کی خصوصیات: امام کو اپنے تلامذہ ومستفیدین کی حیثیت سے بھی متعدد خصوصیات حاصل ہیں، جس کثرت، جس رتبہ اور جتنے طبقات کے لوگ امام کے حلقۂ فیض میں داخل ہیں وہ محدثین وفقہاء میں سے کسی کو بھی نصیب نہیں وَذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔

۱- کثرت تعداد کے لحاظ سے امام مالک کے تلامذہ کی تعداد ۱۳۰۰ ہے، فربری کی روایت کے مطابق امام بخاری کے شاگردوں کی تعداد ۹۰۰۰۰ ہے لیکن ان کا تیرہ سو ۱۳۰۰ منتخب روزگار تلامذہ سے کوئی مقابلہ نہیں، ان میں سے چند (۴ یا ۵) کے سوا ہر ایک اس فن کا نکتہ داں اور بلند پایہ محدث ہے۔

۲- امام بخاری کے نوے ہزار رواۃ میں سے ایک مخصوص تعداد کے سوا باقی کے حالات مجہول ومستور اور نام بنام غیر معلوم ہیں لیکن امام مالک کے تمام رواۃ وتلامذہ نام بنام

(۱) تذکرۃ الحفاظ ذہبی ج۱ ص۱۸۷ حیدرآباد دکن (۲) تہذیب التہذیب ج۱۱ ص۵ د۶ (ذکر مالک بن انس) (۳) تزئین الممالک نقلاً عن فضائل مالک لابن محمد الزہرانی ص۴۰۔

معلوم ومشہور ہیں، ابوبکر خطیب بغدادی، ابن بشکوال اندلسی، قاضی عیاض، شمس الدین دمشقی حافظ سیوطی نے ان کے نام حروف تہجی کی ترتیب سے رسائل میں جمع کردیئے ہیں۔

۳- دوسرے عام محدثین کے تلامذہ کی دنیا جغرافی حیثیت سے اس قدر وسیع نہیں جس قدر امام مالک کی ہے، ابوحنیفہ کے تلامذہ تمام عجم وعرب میں پھیلے ہوئے تھے لیکن افریقہ واندلس ان سے بے نیاز رہے، امام اوزاعی کا علم اندلس میں پھیلا لیکن عجمی ممالک ان سے مستفید نہ ہوئے، لیکن امام مالک کے علم ومعارف نے دنیائے اسلام کے کسی گوشہ کو بھی اپنی غلامی سے آزاد نہ چھوڑا۔

۴- لیکن محض تلامذہ کی کثرت اور جغرافی وسعت اس قدر مایۂ فخر نہیں ہے، جس قدر ان کا علوئے رتبۂ رفعت کمال اور کثرت فضل ہے، امام مالک اپنے ہمسروں میں اس حیثیت سے جس قدر ممتاز ہیں، اس کو محض عطیۂ الٰہی سمجھنا چاہیے جو صرف عالم مدینہ کے لئے مقدر تھا، ان کے حلقۂ تلامذہ ومستفیدین میں ان کے شیوخ بھی شامل ہیں اور دوسرے ایسے ائمہ کبار وارباب فن بھی، جن میں سے ہر ایک اپنی اپنی اقلیم مستقل کا فرماں روا ہے۔

۵- اس سے بھی زیادہ عجیب شے یہ ہے کہ امام کا حلقۂ افادہ اتنے مختلف النوع طبقوں پر مشتمل ہے کہ حیرت ہوتی ہے کہ یہ مختلف سمتوں اور جہات کے خطوط کیونکر ایک ہی مرکز کی طرف رجوع ہوئے، مثلاً خلفائے اسلام، امرائے بلاد، تابعین، ائمہ محدثین، ائمہ مجتہدین، فقہاء، قضاۃ، زہاد وصوفیائے کرام، ادباء وشعراء، مورخین، مفسرین اور فلاسفہ سب آپ کے حلقۂ مستفیدین میں داخل تھے۔

اس عہد کے بعد کے تمام محدثین کبار بلا استثناء بیک واسطہ یا بدو واسطہ امام مالک کے تلمذ سے مشرف ہیں۔ مسانید وصحاح کے مصنفین میں امام احمد بن حنبل، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، ابوداؤد ونسائی، صرف ایک واسطہ سے امام کے حلقہ بگوشوں میں شامل ہیں اور اس پر ان کو ناز وفخر ہے، یہ فخر آٹھویں صدی تک باقی رہا، چنانچہ محدث کبیر شمس الدین

ذہبی فخریہ لکھتے ہیں کہ ''میں سات واسطوں سے امام کا شاگرد ہوں۔(۱) امام نووی کو بھی ساتویں صدی میں امام سے قرب نسبت پر ناز ہے، مقدمۂ شرح مسلم میں اپنے استاد کے حال میں لکھتے ہیں ''ایک کتاب کی سند مجھ کو کتب بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی سب سے بہتر ملی اور وہ امام مالک کی مؤطا ہے جو ان تمام محدثین کے شیخ تھے۔(۲)

فقہ وفتاویٰ

فقہ مالک: امام مالکؒ کے فقہ وفتاویٰ کی بنیاد فقہ مدینہ پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے مصفیٰ کے مقدمہ میں لکھا ہے:

> ''امام مالک بنائے فقہ بر حدیث آنحضرتؐ نہادہ است کہ مسند باشد یا مرسل ثقاۃ، بعد ازاں قضایائے حضرت عمرؓ عمل او بعد ازاں بر فتاوائے سائر صحابہ وفقہائے مدینہ کہ سعید بن مسیب وغیرہ، بن زبیر، قاسم وسالم وسلیمان بن یسار وابوسلمہ وابوبکر بن عبدالرحمٰن وابوبکر بن عمرو عمر بن عبدالعزیز(۳)

مؤطا کے طرز استدلال اور احادیث وآثار کا جس نے بغور مطالعہ کیا ہے، وہ یقیناً اس کی تائید کرے گا کہ امام مالک کی فقہ وفتاویٰ کی یہی وہ بنیاد واصول ہیں جن پر امام مالک فقہی فتاویٰ کا جواب دیتے تھے۔

امام مالک کے فضل وکمال کا تمام شیوخ مدینہ کو اعتراف تھا، اس کے باوجود انھوں نے اس قدر احتیاط کی کہ جب تک ستر ۷۰ علمائے عظام نے امام صاحب کی قابلیت واستحقاق کا فتویٰ نہ دیا، انھوں نے اس مرتبۂ عالی پر قدم رکھنے کی ہمت نہ کی، آپ کا معمول تھا کہ جب کسی فتویٰ کا جواب ارشاد فرماتے تو پہلے ماشاء اللہ لا حول ولا قوۃ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۷ (۲) مقدمہ صحیح مسلم ص ۶ مصر (۳) مقدمہ مصفیٰ ص ۱۱۔

الا باللہ کہتے۔(۱)

حکومت کا اعلان: نہ صرف مدینہ وحجاز بلکہ تمام اطراف ملک سے سائلین کا ازدحام رہتا تھا، موسم حج میں جب پوری دنیائے اسلام عرصۂ عرفات میں جمع اور سارے علمائے دین کوفہ، بصرہ، خراسان وغیرہ سے سمٹ کر حرم مکہ میں جمع ہو جاتے تھے تو حکومت کی طرف سے اعلان ہوتا تھا کہ ''امام مالک اور ابن ابی ذئب کے سوا اور کوئی فتویٰ نہ دے۔''(۲)

حکومت کے مقابلہ میں آزادی فتویٰ، طلاق مکرہ: حکومت کی اس تعظیم وتکریم کا اثر شاید دوسروں پر یہ ہوتا کہ وہ کم از کم مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے کے خلاف حکومت کے منشاء کی تعلیم کرتے لیکن امام صاحب اپنی حریت رائے اور اعلان حق میں اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے، اگر کسی کو زبردستی اپنی بیوی کو طلاق دینے پر مجبور کیا جائے اور وہ ڈر کر محض جبر سے طلاق دیدے تو امام ابوحنیفہ اور بعض دیگر ائمہ کے نزدیک طلاق واقع ہو جائے گی لیکن امام مالک اور اکثر اصحابِ حدیث اس کے قائل ہیں کہ طلاق واقع نہ ہوگی، والیِ مدینہ جعفر بن سلیمان عباسی نے جو خلیفہ منصور کا چچازاد بھائی بھی تھا امام کو حکم دیا کہ وہ یہ فتویٰ نہ دیں لیکن امام صاحب نے علی الاعلان اپنی رائے کا اظہار کیا اور آخر اس کے لئے کوڑوں کی سزا تک گوارا کی۔

لاادری: اس سے بھی زیادہ شدید موقع اعلان حق کا اپنے نفس کے مقابلہ میں ہوتا ہے، مفتی کے لئے جس قدر پہلی قسم کی حریت کی حاجت ہے اس سے زیادہ دوسری قسم کی حریت کی ضرورت ہے لیکن امام صاحب جس طرح پہلی منزل میں مستقیم تھے، دوسری منزل میں بھی درماندہ نہ تھے، امام صاحب سے جب کوئی فتویٰ پوچھا جاتا اور اس وقت اس جزیہ پر اطلاع نہ ہوتی تو نہایت کشادہ پیشانی کے ساتھ فرماتے تھے کہ لاادری میں نہیں جانتا، امام کے شاگرد ابن وہب کہتے ہیں کہ اگر میں امام مالک کی لاادری لکھا کرتا تو کتنی تختیاں

(۱) تزئین الممالک عن ابن نعیم ص ۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۱ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰۔

بھر جاتیں۔(۱)

ممالک بعیدہ کے استفتا سے احتراز: چنانچہ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ دور کے شہروں سے جو مستفتی آتے تھے امام صاحب ان کو بھی ایسا ہی جواب دیتے تھے، ابن عبدالبر کی روایت ہے کہ ایک شخص نہایت دور دراز مسافت سے امام صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے ایک مسئلہ پوچھا، امام صاحب نے فرمایا کہ ''میں اس کو اچھی طرح نہیں جانتا'' سائل نے کہا کہ ''میں چھ مہینے کی راہ طے کر کے صرف اس مسئلہ کی خاطر حاضر ہوا ہوں جن لوگوں نے مجھ کو بھیجا ہے میں ان کو جا کر کیا جواب دوں گا، امام صاحب نے فرمایا کہ کہہ دینا کہ ''مالک نے کہا کہ میں نہیں جواب دے سکتا۔''(۲)

امام صاحب کی یہ احتیاط درحقیقت شدتِ تقویٰ اور ایک نہایت دقیق نکتہ پر مبنی تھی، مفتی کی حالت یہ ہے کہ آج وہ ایک مسئلہ کی نسبت ایک رائے رکھتا ہے، دوسرے دن اس سے صحیح تر صورت اس کے خیال میں آتی ہے، ایسے موقع پر شہر اور اس کے قرب وجوار میں مستفتی کو اپنی غلطی کی اطلاع دے سکتا ہے لیکن اس زمانہ میں جب وسائلِ سفر آسان نہ تھے، دور کے مقامات میں تصحیح وتغلیط کی اطلاع مشکل تھی، امام صاحب کے ایک مصری دوست نے حیرت سے امام صاحب سے پوچھا کی آپ ان بیاروں کو جو کوسوں سے مصائب سفر ومصارف برداشت کر کے آتے ہیں کیوں واپس کر دیتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا یہ صحیح ہے کہ مصری مصر سے، شامی شام سے، عراقی عراق سے آتے ہیں اور پوچھتے ہیں، مگر میں نے جو جواب آج دیا ہے اس کے بجائے اگر کل مجھ کو کچھ اور جواب معلوم ہوا اس وقت کیا ہوگا'' حضرت لیث مصری نے جب امام کا یہ قول سنا تو رو پڑے کہ مالک لیث سے قوی تر ہیں اور لیث ان سے کمزور تر۔(۳)

---

(۱) تزئین الممالک ص۱۴ عن ابی نعیم (۲) جامع بیان العلم ابن عبدالبر ص۱۲۵ مصر (۳) تزئین الممالک عن ابی نعیم ص۱۴۔

رائے پوچھنے پر زجر: فتووں کے جواب میں اکثر فرماتے تھے کہ قال رسول اللہ کذا، سائل نے کہا آپ کی رائے کیا ہے؟ آپ نے جواب میں یہ آیت پڑھی (۱) فَلْيَحْذَرِ الَّذِينَ يُخَالِفُونَ عَنْ أَمْرِهِ أَنْ تُصِيبَهُمْ فِتْنَةٌ أَوْ يُصِيبَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ. جب کسی مسئلہ قیاسی کو بیان فرماتے تو پہلے یہ آیت پڑھتے إِنْ نَظُنُّ إِلَّا ظَنًّا وَمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِينَ۔

جواب میں کاوش فکر: مسائل وفتاویٰ کا جواب ہمیشہ نہایت دقت نظر اور کاوش فکر سے دیتے تھے، ابن ابی اویس کہتے ہیں کہ ایک بار امام صاحب نے فرمایا کہ کبھی کبھی ایسا مسئلہ پیش آجاتا ہے، کہ خواب وخور حرام ہو جاتا ہے، ابن ابی اویس نے کہا آپ کی بات تو لوگوں کو نقش فی الحجر کی طرح تسلیم ہوتی ہے، پھر آپ کیوں یہ مشقت برداشت کرتے ہیں، امام کس نکتہ سنجی کے ساتھ جواب دیتے ہیں کہ ''ابن ابی اویس! اس حال میں تو مجھ کو اور بھی کاوش کرنی چاہئے۔'' (۲)

انصاف پسندی: اگر کسی مسئلہ میں غلطی ہو جاتی اور کوئی شخص اس کی اصلاح کرتا تو فوراً تسلیم کر لیتے تھے، ایک شخص نے پوچھا کیا وضو میں پاؤں کی انگلیوں میں تخلیل کرنی چاہئے؟ امام نے فرمایا لیس ذالک علی الناس، ابن وہب امام کے شاگرد بیٹھے تھے، مجلس کے بعد انھوں نے کہا کہ تخلیل کی ایک حدیث میرے پاس ہے، امام نے حدیث سن کر فرمایا کہ حدیث حسن اور اس کے بعد پھر ہمیشہ فتویٰ اس کے موافق دیا۔ (۳)

امام مالک تقریباً ساٹھ برس مستقل فقہ وفتاویٰ میں مصروف رہے، امام کے تلامذہ نے ان کے مسائل فقہیہ کو مدون بھی کیا ہے، سب سے پہلی کتاب اسد بن فرات قاضی افریقہ کی ''اسدیہ'' ہے اور سب سے ضخیم ابن قاسم متوفی (۱۹۱ھ) کی المدونہ ہے جو خود امام

---

(۱) تزئین الممالک عن ابی نعیم ص۱۴ (۲) مناقب مالک للزواوی ص۲۹ عن سعید بن میتب (۳) الزواوی ص ۲۷۔

کی زندگی میں مدون ہو رہی تھی، مدونہ مصر میں چھپ گئی ہے، تیسری کتاب ابن وہب مصری متوفی (۱۹۷ھ) کی کتاب المجالسات عن مالک ہے، ان کتابوں میں امام کے ہزاروں مسائل وفتاویٰ مدون ہیں، ابن قاسم مصنف مدونہ کے متعلق مشہور ہے کہ ان کو امام کے چالیس ہزار مسائل زبانی یاد تھے۔

اہل علم کا اعتراف

امام مالک ارباب رائے میں داخل ہیں، محدثین نے ارباب رائے کا کم اعتراف کیا ہے لیکن اس کے باوجود امام صاحب محدثین میں وہی درجہ رکھتے ہیں جو صاحب فن اپنے اتباع اور مقلدین میں رکھتا ہے یحییٰ بن معین جو حدیث ورجال کے ناقد ہیں کہتے ہیں "مالک اقلیم حدیث کے بادشاہ ہیں" محدث کبیر سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ "ہم لوگ مالک کے سامنے کیا چیز ہیں؟ ہم تو ان کے نقش قدم کی پیروی کرتے ہیں، اگر امام مالک نے کسی شیخ سے روایت کی ہے تو اس سے کرتے ہیں ورنہ چھوڑ دیتے ہیں" عبدالرحمٰن بن مہدی کا قول ہے، کہ "روئے زمین پر مالک سے بڑھ کر حدیث کا کوئی امانت دار نہیں۔"

امام شافعی فرمایا کرتے تھے "علماء میں امام مالک ستارہ ہیں" محدث ابن نہیک کا قول ہے کہ "صحت حدیث میں میں مالک پر کسی کو ترجیح نہیں دے سکتا۔" امام ابن حنبل سے ایک شخص نے پوچھا کہ "اگر کسی کی حدیث وہ زبانی یاد کرنی چاہے تو کس کی کرے؟" جواب دیا کہ "مالک بن انس کی۔" ابن مہدی سے جو نہایت مشہور محدث ہیں ایک شخص نے کہا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں کہ مالک ابوحنیفہ سے زیادہ فقیہ ہیں" انھوں نے فرمایا "میں نے یہ تو نہیں کہا، لیکن یہ کہتا ہوں کہ مالک ابوحنیفہ کے استاد (حماد) سے بھی زیادہ فقیہ ہیں۔"

سفیان بن عیینہ باایں ہمہ علم وفضل، حلال وحرام اور حدیث معمول کا املاء امام مالک کے حلقہ میں بیٹھ کر سنتے اور وہاں سے اٹھ کر اپنے مستفیدین کے حلقہ میں بیٹھتے تھے

سفیان ثوری جو مجتہد مستقل ہیں وہ مناسک حج میں امام کی پیروی کرتے تھے، ابن معین جو نقد حدیث میں امام ہیں، فرماتے ہیں "مالک خدا کی طرف سے خلق پر ایک حجت تھے۔" ابن معین کا دوسرا قول ہے کہ "اصحاب زہری میں مالک سے بڑھ کر کوئی اثبت نہیں" یحییٰ بن سعید القطان جو امام حدیث ہیں فرماتے ہیں کہ "مالک اس امت کے لئے رحمت تھے" ابن ابی حازم نے ناقد حدیث دراوردی سے پوچھا کہ "اس خدائے کعبہ کی قسم! مالک سے بڑا کوئی عالم تم نے دیکھا؟" جواب دیا کہ "خدایا نہیں۔"

عام حالات

اب ہم مجلس درس واستفادہ سے اٹھ کر دربار شاہی میں آتے ہیں، امام صاحب ۹۳ھ میں پیدا ہوئے تھے جب کہ ولید سریر آرائے خلافت تھا لیکن پچیس برس کے بعد ۱۱۷ھ میں جب امام تعلیم سے فارغ ہو کر شہرت عام حاصل کر رہے تھے تو خلافت امویہ کا دم بازواپسیں تھا (۱۳۲ھ) میں خلافت عباسیہ کے نام سے تاریخ کا نیا باب شروع ہوا۔

خلافت عباسیہ کا پہلا تاج دار ابوالعباس سفاح تھا، اس کے بعد اس کا بھائی ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا، اس انقلاب سے پہلے وہ مدینہ کی درس گاہ کا ایک طالب علم اور امام مالک کے طبقہ کا ایک شریک صحبت تھا۔

خلافت کے بعد منصور نے (۱۴۰ھ میں) پہلا حج کیا اور مکہ معظمہ کے بعد مدینہ منورہ آیا، شہر کے شرفا اور علما اس کے استقبال کے لئے نکلے، سفیان ثوری، سلیمان خواص اور امام مالک بھی اس لئے اس سے ملنے کے لیے آئے کہ کل تک وہ علم حدیث کی مجلسوں میں ان کے ساتھ برابر کا شریک تھا، دیکھیں اب وہ کس حال میں ہے؟ دربار میں حجاز کے تمام علما اور فقہا موجود تھے، منصور نے امام صاحب کی طرف خطاب کر کے کہا "اے ابوعبداللہ! میں اختلافات سے گھبرا گیا ہوں عراق میں تو کچھ نہیں ہے، شام میں صرف جہاد کا شوق ہے، کوئی

بڑا علم نہیں، جو کچھ ہے وہ حجاز میں ہے اور حجاز کے علما کے سرخیل آپ ہیں، میں چاہتا ہوں کہ آپ کی اس تصنیف مؤطا کو خانہ کعبہ میں آویزاں کر دوں کہ لوگ اسی کی طرف رجوع کریں اور تمام اطراف ملک میں اس کی نقلیں بھیجوں تاکہ اسی کے مطابق لوگ فتویٰ دیں۔'' بعض روایتوں میں ہے کہ اس نے ایک ایسی کتاب کی تالیف کی خواہش ظاہر کی جو ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ اور ابن عمرؓ کے اصول فقہ کے بین بین اور معتدل ہو، اس کے بعد امام صاحب نے مؤطا تالیف کی۔

جاہ پسند علما کے لئے یہ طلائی موقع تھا لیکن امام صاحب کے قدم کو اس موقع پر لغزش نہ ہوئی، انھوں نے فرمایا کہ ''صحابہ تمام اطراف ملک میں پھیل گئے تھے، ان کے فتاویٰ اور احکام اپنے اپنے مقام میں وراثۃً ان کے فقہا و علما تک پہنچے ہیں اور ہر جگہ وہی مقبول ہیں، ایسی حالت میں ایک شخص کی رائے و عقل پر جو صحت و غلطی دونوں کر سکتا ہے، تمام ملک کو مجبور کرنا مناسب نہیں'' منصور نے کہا ''اگر آپ مجھ سے متفق ہوتے تو میں یہی کرتا'' (۱) ایک بار اس نے پوچھا کہ ''اے عبداللہ! تم سے بھی زیادہ کوئی عالم ہے؟ امام نے فرمایا ''ہاں'' پوچھا ''وہ کون ہے؟'' فرمایا ''ان کا نام یاد نہیں'' منصور نے کہا ''میں نبوامیہ کے زمانہ میں طلب علم کر چکا ہوں سب کو جانتا ہوں۔'' (۲)

امام مالک کے فضل و کمال کا اعتراف منصور نے نہ صرف امام کے سامنے کیا بلکہ پیٹھ پیچھے بھی کرتا تھا، ایک بار ان کی عدم موجوگی میں فرمایا کہ ''سفیان ثوری اور امام مالک ابن انس کے سوا کوئی نہیں جس کا ادب کیا جائے۔''

نئے تاج دار اموییوں کے استیصال اور بیخ کنی میں لگے ہوئے تھے اور منصور نے احتیاط یا سوء ظن کی بناء پر فاطمی و علوی سادات کی بیخ کنی شروع کر دی، آخر تنگ آ کر ان ہی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۸۹، کتاب الامامۃ ابن قتیبہ ج ۲ ص ۱۷۱، مناقب مالک للزواوی ص ۲۴ (۲) مناقب زدادی ص ۲۴۔

سادات میں سے ۱۴۵ھ میں محمد نفس زکیہ نے مدینہ میں علم بغاوت بلند کر دیا، اکثر لوگوں نے ان کا ساتھ دیا لیکن تقدیر ساتھ نہ تھی، بڑی بہادری سے میدان جنگ میں لڑے مگر مارے گئے، ان کے بعد ان کے بھائی ابراہیم اس ساز و سامان سے نکلے کہ منصور بدحواس ہو گیا، چند مہینوں کے بعد ابراہیم کی شہادت پر جنگ کا خاتمہ ہو گیا، منصور نے اپنے عم زاد بھائی جعفر کو مدینہ کا والی مقرر کیا۔

امام مالک منصور کی نوازشوں کے باوجود ان تمام کوششوں میں حق کے ساتھ تھے، امام صاحب نے فتویٰ دیا کہ ''خلافت نفس زکیہ کا حق ہے'' لوگوں نے پوچھا کہ ''ہم منصورؔ کی بیعت پر حلف اٹھا چکے ہیں،، امام صاحب نے فرمایا ''منصور نے جبراً بیعت لی ہے(۱) اور جو کام جبراً کرایا جائے شرع میں اس کا اعتبار نہیں، حدیث میں ہے کہ اگر جبراً طلاق کسی سے دلائی جائے تو واقع نہ ہوگی۔''

طلاق مکرہ کا فتویٰ: جعفر نے مدینہ پہنچ کر نئے سرے سے لوگوں سے بیعت لی، امام مالک کو کہلا بھیجا کہ آیندہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتویٰ نہ دیں کہ لوگوں کو بیعت جبری کی بے اعتباری و عدم صحت کے لئے سند ہاتھ آئے لیکن امام صاحب نے اس کی کوئی پروا نہ کی اور بدستور جبری معاملہ کے عدم صحت کا فتویٰ دیتے رہے، جعفر نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ ان کو ستر ۷۰ کوڑے مارے جائیں، چنانچہ امام دار الہجرۃ محکمۂ امارت میں گنہگاروں کی طرح لائے گئے، کپڑے اتارے گئے اور شانۂ امامت پر دست ظلم نے ستر ۷۰ کوڑے پورے کئے، تمام پیٹھ لہولہان ہو گئی، دونوں ہاتھ مونڈھے سے اتر گئے، اس پر بھی جعفر کی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا کہ اونٹ پر بیٹھا کر شہر میں ان کی تشہیر کی جائے، امام صاحب بایں حال زار بازاروں اور گلیوں سے گذر رہے تھے اور زبان صداقت نشان باآواز بلند کہہ رہی تھی ''جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا ہے وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں، فتویٰ دیتا

(۱) ان واقعات کے لئے دیکھو کتاب الامامۃ ج ۲ ص ۱۸۲، ابن خلدون ج ۳ ص ۱۹۰۔

ہوں کہ ''طلاق جبری درست نہیں۔''(۱)

اس کے بعد اسی طرح خون آلودہ کپڑوں میں مسجد نبوی میں تشریف لائے، پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھ کر لوگوں سے فرمایا کہ ''سعید بن مسیب کو جب کوڑے مارے گئے تھے تو انھوں نے بھی مسجد میں آ کر نماز پڑھی تھی''(۲) یہ تعزیر گو تحقیر کے لئے تھی لیکن اس نے امام کی عزت ووقار کے پایہ کو اور بلند کر دیا، یہ واقعہ (۱۴۷ھ) کا ہے۔(۳)

منصور کی لاعلمی اور ندامت: جعفر والیِ مدینہ کی یہ حرکت منصور کو پسند نہ آئی اور فوراً اس کو معزول کر کے بذلت تمام گدھے پر سوار کر کے بغداد طلب کیا اور امام مالک کو معذرت کا خط لکھا۔

دوسرے سال ۱۵۸ھ میں جب کہ تمام حجاز وعراق میں سکون ہو چکا تو حج کے ارادہ سے منصور حجاز آیا امام مالک ملنے کو آئے اور بعض روایتوں میں ہے کہ حج سے پہلے خود امام کو بغداد بلا بھیجا اور نہایت تعظیم سے ملا اور بوثوق کہا کہ ''نہ میں نے تعزیر کی اجازت دی اور نہ مجھے اس کا علم ہوا، امام صاحب نے فرمایا کہ ''ہاں آپ کو اطلاع نہ ہوگی'' منصور نے خلعت پیش کیا، قاعدہ تھا کی خلعت کے کپڑے درباری کے کندھے پر رکھ دیئے جاتے تھے، حاجب نے یہی عام طریقہ امام صاحب کے ساتھ برتنا چاہا، امام صاحب پیچھے ہٹ گئے، منصور نے حاجب کو ڈانٹا کہ اس خلعت کو آپ کے فرودگاہ میں پہنچا دو۔''

منصور کو ایک بار معلوم ہوا کہ علما میری حکومت سے ناراض ہیں تو اس نے خلاف وقت شب کو ابن ابی ذئب وابن سمعان اور امام مالک کو طلب کیا، امام صاحب واقعہ سمجھ گئے، زندگی سے ناامید ہو کر، غسل فرما کر، کفن کے کپڑے پہن کر اور حنوط مل کر دربار میں

(۱) طبقات ابن سعد ترجمۂ مالک، مناقب للزواوی (۲) تزئین نقلاً عن الخطیب روایۃً عن ابی وہب ص ۱۲
(۳) کتاب الانساب سمعانی ترجمہ ''اصحی''۔

آئے، منصور نے کہا اے گروہِ فقہا! مجھ کو ایک خبر معلوم ہوئی ہے جس کا افسوس ہے تمہارا فرض تھا کہ پہلے تم لوگ میری اطاعت کرتے اور مجھ کو برا کہنے سے باز رہتے، پھر اگر مجھ میں کچھ عیب تھا تو مجھ کو نصیحت کرتے، امام صاحب نے فرمایا کہ امیر المومنین خدا کا ارشاد ہے:

يَـاَيُّهَـا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ جَآءَ كُمْ	مسلمانو! اگر کوئی فاسق تم کو کچھ خبر دے
فَـاسِقٌ بِـنَبَـاٍ فَتَبَيَّـنُـوْا اَنْ	تو اس کی تحقیق کرلو، ایسا نہ ہو کہ
تُـصِيْبُـوْا قَـوْمًـا بِـجَهَـالَةٍ	نادانستگی میں بے گناہوں کو ستاؤ، پھر
فَتُصْبِـحُـوْا عَـلٰـى مَـافَعَلْتُمْ	اپنے کیے پر تم کو ندامت ہو۔

نَادِمِيْنَ۔ (حجرات:۱)

منصور نے کہا، اچھا بتاؤ کہ میں تمہارے نزدیک کیسا ہوں؟ امام نے فرمایا مجھے اس کے جواب دینے سے معاف کرو، منصور نے ابن سمعان کی طرف رخ کیا، وہ بولے ''امیر امومنین آپ سب سے بہتر ہیں، حج کرتے ہیں، جہاد کرتے ہیں، مظلوموں کی امداد کرتے ہیں، اسلام کی پشت پناہ ہیں، عادل ہیں، اب منصور نے ابن ابی ذئب سے پوچھا کہ تم مجھ کو کیسا سمجھتے ہو، ابن ابی ذئب نے نہایت دلیری سے کہا کہ ''تم بدترین مخلوق ہو، مسلمانوں کی تمام دولت اپنی شان وشوکت میں صرف کرتے ہو، غریبوں کو ہلاک اور امیروں کو پریشان کر ڈالا، بتاؤ کل تم خدا کے سامنے کیا جواب دو گے؟'' منصور نے کہا ''تم دیکھتے ہو کہ تمہارے سامنے یہ کیا چیز ہے'' ابن ابی ذئب نے کہا ''ہاں ننگی تلواریں دیکھتا ہوں لیکن آج کی موت کل کی موت سے بہتر ہے۔''

تھوڑی دیر کے بعد ابن سمعان اور ابن لبی ذئب چلے گئے لیکن امام تشریف فرما رہے، منصور نے کہا ''مجھے آپ کے کپڑوں سے حنوط کی بو آتی ہے،'' امام صاحب نے فرمایا اس بے وقت کی طلبی سے میں اپنی زندگی سے مایوس ہو کر آیا تھا، منصور نے کہا ''سبحان

اللہ ابو عبداللہ کیا میں خود اپنے ہاتھ سے اسلام کا ستون گراؤں گا۔"(۱)

۱۵۸ھ میں منصور نے انتقال کیا اور محمد المہدی اس کا جانشین ہوا اور ۱۶۰ھ میں حج کے ارادہ سے عازم حجالہ ہوا، حج سے فارغ ہو کر مدینہ منورہ آیا، شہر کے قریب پہنچا تو شرفا وعلمائے شہر نے استقبال کیا جن میں امام مالک بھی تھے، مہدی نے امام کو سلام کر کے سینہ سے لگالیا، اس سال حجاز میں سخت قحط تھا، موقع پا کر امام نے فرمایا "امیر المومنین اس وقت آپ جس شہر میں جا رہے ہیں وہاں مہاجرین وانصار کی اولاد آباد ہے، وہ روضۂ نبوی کے ہمسایہ ہیں" مہدی امام کا مقصد سمجھ گیا اور ۲۵ لاکھ درہم امام کے پاس بھیج دیئے کہ تقسیم کرا دیجیے، امام نے رقم اپنے معتمد تلامذہ کے حوالہ کی کہ حسب حاجت لوگوں میں تقسیم کر دیں۔(۲)

ایک مرتبہ تین ہزار دینار اپنے صاحب اعظم ربیع کے ہاتھ امام کی خدمت میں بھیجے اور خواہش ظاہر کی کہ آپ بغداد میرے ساتھ چلیں، امام صاحب نے قاصد سے کہا تھیلیاں اب تک سربستہ اسی طرح پڑی ہیں، جی چاہے لے جاؤ لیکن مالک مدینہ نہیں چھوڑ سکتا کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے المدینۃ خیرلھم لوکانوایعلمون۔(۳)

ایک مرتبہ مہدی نے سواری بھیجی کہ اس پر سوار ہو کر بارگاہ خلافت میں آئیں، امام نے سواری واپس کر دی کہ میں مدینہ میں سوار ہو کر نہیں نکلتا کیونکہ ان گلیوں میں رسولؐ اللہ چلتے پھرتے تھے، پیادہ آئے بیمار تھے، اس لئے بعض مشاہیر علمائے مدینہ سے ٹیک لگا کر بیٹھے، مہدی نے کہا سبحان اللہ، اگر میں خود یہ خدمت ان سے لینا چاہتا تو شاید ان میں سے کوئی قبول نہ کرتا، مغیرہ نے کہا "امیر المومنین! مالک جس سے ٹیک لگا کر بیٹھیں وہ اس کے لئے شرف ہے۔"(۴)

---

(۱) کتاب الامامہ والسیاستہ ج ۲ ص ۲۷۶ مصر (۲) کتاب الامامۃ وسیاستہ ج ۲ ص ۲۹۰ ومناقب مالک للزواوی ص ۲۷ (۳) تذکرۂ ذہبی ج ۱ ص ۱۸۹ (۴) زواوی عن ابی مصعب ص ۲۸۔

مہدی نے اسی سفر میں موطا کی سماعت کی بلکہ بعض روایتوں میں ہے کہ مہدی ہی کے لیے امام نے موطا لکھی گو یہ صحیح نہیں، مہدی نے موسیٰ وہارون اپنے دونوں بیٹوں کو حکم دیا کہ امام سے موطا سنیں، شہزادوں نے امام کو بلا بھیجا، امام صاحب نے فرمایا "علم بیش قیمت شے ہے، اس کے پاس خود شائقین آتے ہیں" اس جواب پر مہدی کی اجازت سے دونوں شہزادے خود مجلس درس میں حاضر ہوئے، شہزادوں کے اتالیق نے کہا پڑھ کر سنائیے، امام صاحب نے فرمایا کہ ہمارے علما کا دستور یہ ہے کہ طلبہ پڑھیں، شیوخ سنیں، مہدی کو اس کی اطلاع دی گئی تو اس نے کہا ان علما کی اقتدا کرو اور تم خود پڑھو، چنانچہ شہزادوں نے خود پڑھا اور امام نے سماعت کی۔(۱)

۱۷۰ھ میں ہارون رشید خلیفہ ہوا، خلافت کے پہلے ہی سال حج وزیارت کے لیے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ حاضر ہوا، لوگ پیادہ استقبال وتہنیت کے لئے نکلے، امام صاحب بھی محمل میں سوار ہو کر آئے، ہارون رشید نے ان کو دیکھ کر بڑی مسرت ظاہر کی اور کہا آپ کی تصنیفات پہنچیں، میں نے خاندان کے نوجوانوں کو ان کے مطالعہ تاکید کی ہے لیکن اس کا کیا سبب ہے کہ میں نے ان میں ابن عباسؓ اور حضرت علیؓ کی روایتیں نہیں پائیں' امام نے فرمایا امیر المومنین! یہ دونوں بزرگوار ہمارے شہر میں نہ تھے۔

۱۷۴ھ میں ہارون رشید اپنے دونوں شہزادوں امین ومامون کو لے کر حج کے لیے آیا اور موطا کے املا کے لیے امام کو سراپردۂ خلافت میں طلب کیا، امام صاحب نے انکار کیا اور خود موطا کے بغیر تشریف لائے، ہارون رشید نے شکایت کی، امام صاحب نے فرمایا "علم تیرے گھر سے نکلا ہے، خواہ اس کو ذلیل کر، خواہ عزت دے، یہ سن کر ہارون رشید متاثر ہوا، اور امین اور مامون کو لے کر مجلس درس میں حاضر ہوا، وہاں طلبہ کا ہجوم تھا، ہارون رشید نے امام سے کہا اس بھیڑ کو الگ کر دیجئے" امام نے فرمایا شخصی فائدہ کے لیے عام افادہ کا خون

(۱) تزئین الممالک ص ۴۵۔

نہیں کیا جاسکتا۔" ہارون رشید مسند پر بیٹھ گیا، امام نے فرمایا امیر المومنین "تواضع پسندیدہ ہے۔" یہ سن کر ہارون نیچے اتر گیا، اور امام سے درخواست کی کہ آپ قرأت کیجئے امام نے فرمایا خلاف عادت ہے،" اور معن بن عیسیٰ کو جو ایک مستعد طالب علم تھے اور آگے چل کر بڑے بڑے محدثین کے استاد ہوئے اشارہ کیا، انھوں نے قرأت شروع کی، اور ہارون نے مع شہزادوں کے سماعت کی۔

اس سفر میں شام وعراق وحجاز کے کل علما کے ساتھ تھے، قاضی ابو یوسف بھی اس مجمع میں شریک تھے، ہارون رشید نے ان سب علما کی ایک علمی مجلس منعقد کی، امام صاحب مسند تدریس پر رونق افروز ہوئے مؤطا کا املا شروع ہوا، ہر مسئلہ کے اختتام پر فقہا ومحدثین سکوت کی زبان سے صحت کا اعتراف کرتے جاتے تھے، فقہی معلومات کا ایک دریا تھا جو زبان امامت سے امنڈ امنڈ کر سواحل قلوب تک پہنچ رہا تھا۔

ہارون رشید کے نام امام مالک کا ایک رسالہ بھی ہے جس میں امام نے ہارون کو نصائح کئے ہیں اور آداب وسنن کی تعلیم دی ہے، رسالہ مصر میں ۱۳۲۲ھ میں چھپ گیا ہے اور لاہور میں اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

وفات

آخر عمر میں اتنے ضعیف وناتواں ہو گئے تھے کہ مسجد نبوی کی حاضری، جماعت میں شرکت اور غم وشادی کی تقریبوں میں آنا جانا بند ہو گیا تھا، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ "ہر شخص اپنا ہر عذر نہیں بیان کر سکتا" معن بن عیسیٰ م ۱۹۸ھ جو امام کے عزیز ترین شاگرد تھے امام کے خادم تھے، امام صاحب انہی کے سہارے چلتے تھے لیکن اس ضعف وناتوانی کے عالم میں بھی درس وافتا کی خدمت جاری تھی، یحییٰ بن یحییٰ اندلسی مصمودی امام اندلس جب دوسری بار مصر سے لوٹ کر مدونہ کی سند لینے کے لئے آئے تو امام صاحب بستر مرض الموت پر تھے۔

اتوار کے روز بیمار پڑے اور تقریباً تین ہفتہ بیمار رہے، مرض کی شدت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی، لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اب وقت آخر ہے، مدینہ کے تمام علما و امرا آخری دیدار کے لئے جمع ہو گئے، یحییٰ اندلسی کا بیان ہے کہ مجھے تو اپنی محرومی کا رونا تھا ہی، وہ لوگ بھی جو مدتوں امام کی ملازمت کا شرف حاصل کر چکے تھے وہ بھی روتے تھے، تلامذہ کے علاوہ حدیث وفقہ کے ایک سو ساٹھ علما مؤدب باچشم گریاں آس پاس بیٹھے تھے۔

نبض کی حرکت آہستہ آہستہ کم ہو رہی تھی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، قعنبی جو امام کے اخص تلامذہ میں تھے، وہ اس وقت حاضر ہوئے، اور گریہ کا سبب دریافت کیا، فرمایا کہ قعنبی! میں نہ روؤں تو کون روئے، اے کاش! مجھ کو میرے ہر قیاسی فتویٰ کے بدلہ ایک کوڑا مارا جاتا اور میں فتویٰ نہ دیتا۔" گریہ جاری تھا اور لب متحرک تھے کہ روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

امام صاحب بروایت صحیحہ ۹۳ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۱ ربیع الاول ۱۷۹ھ کو انتقال فرمایا، ۸۶ برس کی عمر پائی، ۱۱۷ھ میں مسند درس پر قدم رکھا اور ۶۲ برس تک علم و دین کی خدمت میں مصروف رہے۔

جنازہ میں ایک خلقت کا ہجوم تھا، والیِ مدینہ عبداللہ بن محمد ہاشمی خود پیادہ شریک تھا، اور نعش اٹھانے والوں میں داخل تھا، جنۃ البقیع جس کی خاک میں اسلام کے ارکان عظام واعلام کرام مدفون ہیں امام مدینہ کا جسد مبارک بھی اسی خاک کو سپرد ہوا۔ (۱)

دور دراز شہروں اور ملکوں کے علما کو جب امام کی وفات کی خبر پہنچی تو ہر جگہ ماتم کیا گیا، کوفہ میں سفیان بن عیینہ کو جب معلوم ہوا تو ان پر سکوت طاری ہو گیا اور جب بولے تو یہ بولے کہ "روئے زمین پر مالک نے اپنی مثال نہیں چھوڑی" حماد بن زید نے کہا "خدا اُن پر رحم کرے، مذہب میں ان کا بڑا مقام تھا۔"

---

(۱) ان بیانات کے لئے ملاحظہ ہو ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۱ تزئین الممالک ص ۴۱۔

امام کی تاریخ پیدائش و وفات پر ایک بزرگ نے یہ قطعہ کہا ہے ؎

فخر الأئمة مالك نعم الامام لسالك

مالک اماموں کے فخر ہیں۔ پیرو کے لیے بہترین پیشوا ہیں

مولده "نجم هدى" وفاته فاز مالك (۱)

ان کی تاریخ پیدائش ہدایت کا ستارہ ہے۔ اوران کی تاریخ وفات یہ ہے

کہ مالک کامیاب ہے۔

اخلاق و عادات اور ذاتی حالات

طاعتِ الٰہی: امام کا شمار عبادِ زمانہ میں تھا،(۲) درس وافتاء سے جو وقت بچتا وہ زیادہ تر عبادت اور تلاوت میں صرف ہوتا، امام کی خواہر محترمہ سے کسی نے پوچھا کہ امام مالک گھر میں کیا کرتے تھے، جواب دیا ان کے دو کام تھے، "المصحف والتلاوۃ"(۳) امام صاحب کی صاحبزادی سے منقول ہے کہ امام جمعہ کی شب عبادت وطاعت میں مشغول رہتے تھے، امام صاحب کے بھانجے ابن ابی یونس سے روایت ہے کہ امام مہینہ کی پہلی تاریخ کو شب زندہ دار رہتے تھے۔(۴)

حب رسول: حضرت سرور کائنات ﷺ کا بے حد ادب کرتے تھے، جب نام مبارک زبان پر آتا چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا، لوگ پوچھتے تو فرماتے کہ ہم نے جن مقدس بزرگوں کی زیارت کی ہے، ان کی حالت مجھ سے بھی بڑھ کر تھی۔(۵)

مسجد نبوی میں جس کے ایک حجرہ میں روضۂ انور ہے، شوروغل ناپسند فرماتے کہ یہ آستانۂ نبوت۔ بے گستاخی ہے، کلام نبویؐ اس وقت تک زبان پر نہیں آتا جب تک وضو یا

(۱) بستان المحدثین ص۳ (۲) کتاب الفہرست ابن ندیم ذکر عباد ص۲۶۰ (۳) مناقب مالک للزواوی ص۳۳ (۴) تزئین الممالک ص۱۸ (۵) مناقب مالک للزواوی ص۳۳۔

غسل فرما کر باادب بیٹھ نہ لیتے، امام کے اصطبل میں کثرت سے گھوڑے اور خچر تھے، مگر کبھی مدینہ کی گلیوں میں سوار ہو کر نہ نکلے، لوگوں نے سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ "مجھے شرم آتی ہے کہ جو سرزمین قدوم نبوی سے مشرف ہوئی ہے اس کو میں جانوروں کے سموں سے روندوں (۱) ذات نبوی کی محبت اور حدیث نبوی کے شغل وانہماک کے سبب سے کوئی شب ایسی نہ گذرتی جس میں عالم رویا میں زیارت نبوی کا شرف حاصل نہ ہوتا۔ (۲)

حب مدینہ: امام کو مدینہ سے غایت درجہ محبت تھی، بجز سفر حج کبھی مدینہ سے باہر نہیں نکلے، منصور نے بغداد کی سکونت کے لئے درخواست کی، پذیرانہ ہوئی، مہدی نے تین ہزار دینار بھیجے اور کہلا بھیجا کہ بغداد کا عزم کیجئے، فرمایا" اشرفیاں علی حالہا رکھی ہیں، جی چاہے تو لے جاؤ مگر مالک سے مدینہ نہیں چھوٹ سکتا۔ (۳) انتہائے محبت یہ ہے کہ جمہور اسلام کے خلاف امام مکہ معظمہ پر مدینہ منورہ کو فضیلت دیتے ہیں۔ (۴)

فیاضی: امام مالک طبعاً فیاض تھے، ایک بار امام شافعی کو لے کر اصطبل کا ملاحظہ کر رہے تھے، امام شافعی نے بعض گھوڑوں کی تعریف کی، امام صاحب نے تمام اصطبل ان کی نذر کر دیا، (۵) ہر سال امام شافعی کو گیارہ ہزار دینار مرحمت فرماتے تھے۔

مہمان نوازی: مہمان نوازی عربوں کا خاصہ اور ایک مومن کا فرض ہے لیکن امام صاحب کا اخلاق میزبانی اس سے بھی زیادہ تھا، امام شافعی جو طالب علم کی حیثیت سے ان کے گھر میں ٹھہرتے تھے، امام ان کے لئے خود اپنے ہاتھوں سے خوان اٹھا کر لاتے تھے، صبح کی نماز کے لیے اپنے ہاتھ سے پانی لا کر رکھتے تھے، باوجود وقار کے رخصت کے وقت خود بازار تک جا کر سواری کر دی اور روپے کی ایک تھیلی زادِ راہ کے لئے عنایت کی۔ (۶)

---

(۱) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۰۰ و بستان المحدثین ص ۷ (۲) تزئین عن ابی نعیم والخطیب ص ۱۲ (۳) تذکرہ ذہبی ج ۱ ص ۱۹۰ (۴) اعلام علماء الاعلام لعبد الکریم بن محب اللہ المکی ص ۳ قلمی کتب خانہ بانکی پور (۵) توالی التاسیس معالی ابن ادریس لابن حجر (۶) مرات الاوراق ابن حجہ حموی ج ۱ ص ۲۰۰۔

صبر واستقلال: استقلال وضبط کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ موزہ میں بچھو تھا، امام مالک نے بے خبری میں اس کو پہن لیا، اور مجلس درس میں آکر بیٹھ گئے، بچھو نے مسلسل سترہ بار ڈنک مارا لیکن آداب مجلس کے خیال سے امام نے پہلو تک نہ بدلا، چہرہ کا رنگ بار بار متغیر ہورہا تھا، اختتام درس کے بعد عبداللہ بن مبارک نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ موزہ میں بچھو ہے۔(۱)

حلم وعفو: خودداری وجلالت شان کے ساتھ حلم وعفو جو ایک گراں قدر جوہر ہے، اکثر جمع نہیں ہوتا لیکن امام میں یہ دونوں صفتیں مجتمع تھیں، ایک طرف تو منصور ورشید جیسے قہار سلاطین کو ڈانٹ دیتے ہیں، دوسری طرف آپ کے شانۂ مبارک پر ذلیل ہاتھوں سے کوڑا مارا جاتا ہے تو آپ انگیز کرتے ہیں اور منصور جب مجرم کی سزا کا ذکر کرتا ہے تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے معاف کیا۔(۲)

حق گوئی وآزادی: امام صاحب خلفا کے دربار میں آمد ورفت رکھتے تھے، بعض لوگوں کو اس پر اعتراض تھا، امام صاحب نے فرمایا کہ" اگر نہ جاؤں تو حق گوئی کا موقع کہاں ملے"؟(۳) امام مالک کو اس لئے کوڑے مارے گئے کہ حق کے اظہار میں انھوں نے حکومت کی پروانہ کی، ایک بار منصور نے مسجد نبوی میں زور وشور سے مناظرہ شروع کیا، امام نے فرمایا کہ ادب ملحوظ رہے، لَاتَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِي، عباسیوں کے مقابلہ میں محمد نفس زکیہ نے جب علم بلند کیا تو آپ نے علی الاعلان فتویٰ دیا کہ خلافت محمد نفس زکیہ کا حق ہے، عباسیوں نے زبردستی بیعت لی ہے۔

خودداری: علم کی شان یہ ہے کہ اس کی جلالت ملحوظ رکھی جائے تاکہ لوگوں میں اہل علم کا وقار قائم رہے اور ان میں اکتساب علم کا ذوق پیدا ہو، امام مالک نے اس کو ہمیشہ پیش نظر رکھا، اوپر گذر چکا ہے کہ امام صاحب مجلس درس میں بڑے وقار ومتانت اور خودداری کے ساتھ

---

(۱) بستان المحدثین ص۶و۷ (۲) کتاب الامامۃ ابن قتیبہ ج۲ص ۲۸۶ (۳) مناقب مالک للزواوی ص۳۱۔

بیٹھتے تھے، لوگ اعتراض کرتے تو فرماتے کہ اریدان اجل العلم یعنی" میں چاہتا ہوں کہ علم کی شان بڑھاؤں" بڑے بڑے امرا اور حکام آستانۂ امامت پر حاضر ہوتے ہوئے کانپتے تھے، رشید نے اپنے خیمہ میں املائے حدیث کے لئے بلایا تو فرمایا "لوگ علم کے پاس آتے ہیں، لوگوں کے پاس علم نہیں جاتا" رشید خود آیا تو مسند درس پر بیٹھنا چاہا، فرمایا تواضع محبوب ہے، رشید نے کہا آپ پڑھئے فرمایا اپنی یہ عادت نہیں۔ (۱)

منصور کے دربار کا یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی دربار میں آتا تو خلیفہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا، امام نے کبھی یہ ذلت گوارا نہ کی۔

انصاف پسندی: لیکن اس خودداری اور اس اظہار حق سے زیادہ گراں قیمت اور مشکل الحصول شے انصاف پسندی ہے، وہ بھی اپنے نفس کے مقابلہ میں امام صاحب کا یہ حال تھا کہ جس مسئلہ پر عبور نہ ہوتا تو بمتانت فرمادیتے کہ "مجھے نہیں معلوم" آپ کے ایک شاگرد کا قول ہے کہ میں امام کے "نہیں معلوم" کو لکھا کرتا تو تختیاں بھر جاتیں۔

ابن القاسم امام کے ایک شاگرد نے کہا کہ مصر کے علما بیع وشرا کے مسائل میں بڑی مہارت رکھتے ہیں، امام مالک نے پوچھا، انھوں نے کس سے ان کی تعلیم پائی، ابن القاسم نے کہا کہ آپ سے، فرمایا کہ مجھے تو خود ان میں دخل نہیں۔ (۲)

اہل علم کی عزت: خلیفہ ہارون رشید مجلس درس میں آیا تو اس کو مسند سے نیچے اتر کر بیٹھنا پڑا لیکن ایک بار امام ابوحنیفہ تشریف لائے تو امام نے اس قدر تعظیم کی کہ ان کے لیے اپنی چادر فرش پر بچھائی، وہ اٹھ گئے تو طلبہ سے کہا کہ یہ عراق کے ابوحنیفہ ہیں، جو اس ستون کو سونا ثابت کرنا چاہیں کر سکتے ہیں، اس کے بعد کوفہ کے محدث سفیان آئے تو ان کی بھی تعظیم کی لیکن اس سے کم، ان کے چلے جانے کے بعد فرمایا کہ لوگوں کی علیٰ قدر مراتب عزت کرنی چاہیے۔

---

(۱) مناقب مالک للزواوی ص ۲۹ (۲) مختصر جامع بیان العلم لابن عبدالبر ص ۱۲۵۔

عبدالرحمن بن قاسم آپ کے شاگرد تھے لیکن جب ان کو خط لکھتے تھے تو ''فقیہ مصر'' لکھا کرتے تھے، ایک بار آپ کے نامور شاگرد قعنبی محدث مدینہ آرہے تھے، تو امام صاحب اپنے تلامذہ کو لے کر خود بنفس نفیس ان کے استقبال کے لئے شہر سے باہر نکل آئے۔(۱)

حلیہ: رنگ سرخ وسپید، قد بلند وبالا، بدن بھاری، پیشانی کشادہ، آنکھیں بڑی، ناک اونچی، داڑھی بڑی اور گھنی، سر میں قدرتا بال نہ تھے، مونچھوں کو بہت چھوٹی کرانا ناپسند کرتے تھے، خضاب کا استعمال کبھی نہیں کیا۔

پوشاک: مزاج میں صفائی اور نزاہت غایت درجہ تھی، ہمیشہ نفیس اور بیش قیمت پوشاک زیب بدن فرماتے تھے، بعض لوگ اس پر ٹوکتے تو فرماتے کہ میں اس شہر (مدینہ) کے جس عالم سے ملا اس کو خوش پوشاک پایا، امام صاحب کو اپنے کپڑوں کا خاص اہتمام تھا، عدن کے کپڑے اس زمانہ میں مشہور اور بیش قیمت ہوتے تھے، وہاں سے اپنے لئے کپڑے منگواتے تھے، کبھی کبھی مرو کے بنے ہوئے کپڑے بھی استعمال کرتے۔(۲)

خوشبو کا استعمال ہمیشہ کرتے تھے، عود کی انگیٹھیاں جلتی رہتی تھیں، کپڑے خوشبو سے بسے رہتے تھے، جس گلی سے ایک بار نکل جاتے، دیر تک اس میں خوشبو پھیلی رہتی اور اکثر فرماتے کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ خدا نے جس کو نعمت دی ہو اس کے آثار اس پر نہ ظاہر ہوں، کبھی کبھی طیلسان کا بھی استعمال کرتے جو اس زمانہ میں علما کی نشانی تھی، عمامہ جب زیب سر فرماتے تو شملہ گلے میں لپیٹ کر دائیں یا بائیں شانہ پر ڈال لیتے، ہاتھ میں ایک چاندی کی انگوٹھی تھی، جس کے سیاہ پتھر کے نگینہ پر حسبنا الله ونعم الوکیل نقش تھا۔

امام مالک کا یہ شرف کیا کم ہے کہ مدینہ مطہرہ کی خاک پاک جسم مبارک کا عنصر تھی لیکن اس سے بھی زیادہ شرف یہ ہے کہ مسکن وہ تھا جو حضرت عبداللہ بن مسعود کا مکان تھا اور

(۱) تذکرۃ ذہبی ج ۱ ص ۱۵۱ (۲) ابن ندیؒ مطبوعہ یورپ ص ۲۸۰ و مرآۃ الجنان ج ۱ ص ۳۷۳ و ۳۷۴ و بستان المحدثین ص ۳۔

مجلس ونشست گاہ وہ تھی جو حضرت عمر فاروقؓ کا دولت خانہ تھا، یہیں اکثر املائے حدیث کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، اس بنا پر امام مالک نہ صرف علوم ومعارف فاروقی کے وارث تھے، بلکہ ان کی مادی جائداد کا بھی خدا نے انھیں وارث بنایا تھا۔

تصنیفات

اس عہد میمون میں تصنیف وتالیف کی ابتدا ہوچکی تھی، امام کے دست مبارک سے جو کتابیں ترتیب پائی ہیں یا ان کی طرف منسوب ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- مؤطا کی نسبت مفصل بحث آگے آئے گی، مؤطا اور ان کی دوسری تصنیفات میں پہلا امتیاز یہ ہے کہ مؤطا کی روایت امام کے تلامذہ نے کی ہے اور بقیہ رسائل وکتب صرف بعض تلامذہ کی روایت سے ثابت ہیں۔

۲- رسالة مالك الى الرشيد: یہ خلیفہ ہارون رشید کے نام خط کے طور پر ۲۲ صفحہ کا ایک رسالہ ہے جس میں امام نے خلیفہ کو ہر قسم کے دینی ودنیاوی واخلاقی نصائح کئے ہیں۔

بعض علماء نے اس بناء پر اس کی نسبت امام صاحب کی طرف کرنے سے انکار کیا کہ اس میں بعض ضعیف ومنکر حدیثیں ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ اخلاقیات میں محدثین اس قدر احتیاط نہیں کرتے تھے، ابن ندیم نے الفہرست میں اس کا ذکر کیا ہے، یہ رسالہ چھپ گیا ہے اور لاہور میں کسی شخص نے اس کا اردو ترجمہ بھی چھاپا ہے۔

۳- احکام القرآن: یہ خود امام کی تصنیف نہیں ہے، بلکہ چوتھی صدی ہجری کے مشہور ماہر علوم قرآن علامہ ابو محمد مکی بن ابی طالب اندلسی متوفی (۴۳۷ھ) کی تالیف ہے امام مالک سے جو احکام قرآن یعنی آیات احکامیہ کی تفسیریں مروی ہیں ان کو علامہ موصوف نے اس میں یکجا کر دیا ہے، اسی لئے اس کا پورا نام کتاب الماثور عن مالک فی احکام

القرآن ہے۔(۱)

۴-المدونة الكبرىٰ: فقہ ملکی کی ضخیم کتاب ہے، بعض لوگ اس کو خود امام کی تصنیف بتاتے ہیں حالانکہ عبدالرحمٰن بن قاسم متوفی ۱۹۱ھ امام کے ایک شاگرد کی تصنیف ہے، البتہ اس لحاظ سے امام کی تصنیف کہنا درست ہے کہ یہ کتاب درحقیقت ان کے ''ملفوظات فقہیہ'' کا مجموعہ ہے، ابن قاسم نے امام کے زمانہ میں مدینہ سے واپس آ کر امام کے مجتہدات واقوال کو ایک کتاب کی صورت میں مدون کرنا شروع کیا تھا اور شاید اسی زمانہ میں ختم بھی ہوگئی تھی کیونکہ یحییٰ بن یحییٰ مضمودی دوسری بار مصر سے مدونۂ ابن قاسم کو خود امام سے سننے کے لئے آئے تھے لیکن افسوس کہ امام اس وقت بستر مرض پر تھے۔(۲) مصر میں مدونہ چھپ گئی ہے اور ہر جگہ ملتی ہے۔

۵- رسالة مالك الىٰ ابن مطرف: غسان بن محمد بن مطرف کے نام ''فتویٰ'' کی بحث پر ایک رسالہ ہے۔

۶-رسالة مالك الىٰ ابن وهب. امام کے شاگرد رشید ابن وہب کے نام سے مسئلہ قضا وقدر پر ایک مشہور رسالہ ہے، قاضی عیاض نے اس رسالہ کی تعریف کی اور لکھا ہے، وهو من خيار الكتب فى هذا الباب الدال على سعة علمه بهذا الشان۔

۷- كتاب الاقضيه: بعض قاضیوں کے لئے امام نے یہ رسالہ لکھا، غالباً اس میں عہدۂ قضا کے متعلق اصول وہدایات ہوں گے۔

۸- كتاب المناسك: ابوجعفر زہری امام کے ایک دوست کا بیان ہے کہ یہ امام مالک کی سب سے بڑی تصنیف تھی جس میں حج کے احکام ومسائل تھے۔

۹- تفسير غريب القرآن: اس کی روایت خالد بن عبدالرحمٰن مخزومی نے

(۱) تزئین الممالک ص ۴۰، ۴۱۔ (۲) ابن خلکان ترجمہ ابن قاسم۔

امام سے کی ہے۔

۱۰- کتاب المجالسات عن مالك. ابن وہب امام کے تلمیذ رشید نے امام کی مجالس میں حدیث و آثار و اخلاق کے جو متفرق فوائد و نکات سنے ان کو اس میں جمع کیا ہے، حافظ سیوطی نے یہ رسالہ دیکھا تھا۔

۱۱- تفسیر القرآن: قرآن مجید کی تفسیر بروایت احادیث مسندہ ہے، حافظ سیوطی نے اس کو دیکھا تھا اور اس کی تعریف کی ہے لیکن یہ مشکوک ہے کہ آیا یہ خود امام کی تالیف ہے، یا کسی شاگرد نے امام سے اس کی تعلیق کی ہے۔

۱۲- کتاب المسائل: ان رسائل و کتب کے علاوہ امام کی اور بھی تصنیفات تھیں، محدث خطیب نے تاریخ بغداد میں لکھا ہے کہ ابو العباس سفاح کے سامنے بہت سے منتشر اوراق پڑے تھے جس کی نسبت اس نے کہا کہ یہ امام صاحب کے ستر ہزار مسائل کا مجموعہ ہے۔(۱)

مؤطا

امام کی اصلی تصنیف ''مؤطا'' ہے جو قرآن پاک کے بعد کتب خانۂ اسلام کی دوسری کتاب ہے، اول کلام خدا ہے اور ثانی کلام رسول اللہ۔

۱۳۲ھ میں خلافت امویہ مٹ کر خلافت عباسیہ قائم ہوتی ہے اسی کے پس و پیش عہد میں سینکڑوں مجموعہ ہائے حدیث مدون ہوئے، مؤطا کی تالیف کا بھی یہی زمانہ ہے۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد اکثر صحابہ تعلیم و ارشاد اور جہاد و غزا کی نیت سے بلاد مفتوحہ میں پھیل گئے تھے لیکن صحابہ کا گروہ عظیم جن میں اکابر و اجلہ فقہا داخل تھے، مدینہ ہی میں رہا، امام مالک کا عہد وہ ہے جب احادیث و روایات تمام بلاد اسلامیہ میں

(۱) تزئین الممالک ص ۴۰، ۴۱۔

منتشر تھیں، اس لحاظ سے ان کے عصر میں جن ملکوں میں مجموعہ ہائے حدیث کی تدوین ہوئی وہ اپنے اپنے حدود ملکی کے اندر محدود تھے مرکز نبوت اور مہبط وحی مدینہ میں جو علوم نبوی کا سب سے بڑا گنجینہ تھا حدیثوں کی جمع وترتیب، جس خوش بخت کی قسمت میں تھی وہ امام مالک ہیں۔(۱)

مؤطا: مؤطا علوم مدینہ کا مجموعہ ہے، جہاں زروجواہر کی اصلی کان تھی، تمام اکابر صحابہ واعاظم تابعین کا مسکن یہی شہر مبارک تھا، اس لئے یہ صحیفہ مقدس انھی بزرگوں کی روایات وفتاویٰ پر مبنی ہے، اس بنا پر یہ صحیفہ حقیقت میں صحیح ترین، موثق ترین اور کامل ترین احکام اسلامیہ کا مجموعہ ہے۔(۲)

تالیف مؤطا: یہ ظاہر ہے کہ امام مالک ہمیشہ مدینہ ہی میں قیام فرمارہے، اس لئے تالیف کا مقام معلوم ہے لیکن صحیح زمانہ متعین نہیں، ۱۳۰ھ سے زوال بنی امیہ کی تاریخ شروع ہوتی ہے اس سے پہلے تصنیف وتالیف کا شغل عام نہ تھا، ۱۴۴ھ میں منصور نے آخری حج کیا ہے، اس وقت مؤطا متداول ومشہور ہو چکی تھی۔(۳) اس لئے اس کا زمانہ تالیف ان دونوں کا درمیانی زمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

ایک روایت ہے کہ امام مالک نے منصور ہی کے حکم سے موطا کی تالیف شروع کی تھی، اس کی فرمایش تھی کہ اس مجموعۂ احکام میں نہ ابن عمر کی سختیاں ہوں نہ ابن عباسؓ کی رخصتیں اور عباسی مسعود کے شواذ۔(۴)

امام صاحب جب موطاء کی تالیف میں مشغول ہوئے اور اس کی خبر دوسرے لوگوں کو پہنچی تو مدینہ کے علما بھی اپنی اپنی احادیث کا مجموعہ تیار کرنے لگے، لوگوں نے امام سے جاکر

(۱) ان معلومات کے لئے مقدمہ فتح الباری ملاحظہ ہو (۲) مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب وکشف الظنون ج ۲ ص ۵۷۲ (۳) ایضاً جامع بیان العلم ابن البرص ۶۷ (۴) کتاب الامامۃ والسیاسۃ ذکر منصور ج ۲ ص ۱۴۰ و ۱۴۱۔

عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ "صرف حسن نیت کو بقا ہے" یہ پیشین گوئی کس قدر صحیح ثابت ہوئی، چنانچہ موطائے امام مالک کے سوا کوئی موطا دنیا میں معلوم وباقی نہیں رہی، بعض لوگوں نے رشک کا انتقام دوسری طرح لیا، محمد بن اسحق صاحب سیر ومغازی نے کہا "مالک کی کتابیں میرے پاس لاؤ، میں ان کے عیوب دکھاؤں، مالک کی کتابوں کا ناقد تو میں ہوں۔"(۱)

امام مالک نے تصنیف سے فارغ ہو کر اس کو شیوخ حدیث کی خدمت میں پیش کیا، سب نے بہ غایت پسند کیا، عام اہل مدینہ کے لئے وہ دن عجیب مسرت کا تھا، جب ان کے مجموعہ فضائل میں ایک اور فضیلت کا اضافہ ہو رہا تھا، سعدون نام کا ایک شاعر موطا کی تعریف میں کہتا ہے:(۲)

فبادر موطا مالك قبل فوته　　　فما بعده ان فات للحق مطلب

مالک کی موطا کو جلد لو، کھونے نہ پائے، اگر یہ کھوئی تو حق کی جستجو کی پھر جگہ نہیں

ودع للموطا كل علم تريده　　　فان الموطا الشمس والغير كوكب

اور موطا کے لیے ہر اس علم کو جس کو چاہتے ہو چھوڑ دو کہ موطا آفتاب ہے

اور اس کے علاوہ دوسری کتابیں ستارہ ہیں۔

وجہ تسمیہ: موطا کے لغوی معنی "روندا ہوا" یا "چلا ہوا" کے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہے "روندے ہوئے یا چلے ہوئے" مجازی معنی یہ ہیں کہ "جس پر عام ائمہ اور علما اور اکابر چلے ہوں اور جس کو ان سب کی رایوں نے روندا اور پامال کیا ہو یعنی سب نے اس کے متعلق گفتگو کی ہو اور اس سے اتفاق کیا ہو" اس طرح گویا اس کے معنی "متفق" اور "مطابق" کے ہیں، چونکہ تمام شیوخ حدیث نے اس سے اتفاق ومطابقت کی، اس لئے اس کا نام موطا مشہور ہو گیا۔(۳) میرے نزدیک اس سے زیادہ صحیح تعبیر یہ ہے کہ "موطا اس راستہ کو کہتے

(۱) تہذیب الکمال" مالک بن انس (۲) بستان المحدثین ذکر امام مالک ص۹ (۳) مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب ص ۶۔

ہیں جس پر لوگ بکثرت گذرتے ہوں" سنت کے معنی بھی راستہ کے ہیں یہ وہ راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ گذرے، مؤطا وہ پامال راستہ ہے جس پر آنحضرت ﷺ کے بعد تمام صحابہ گذرے، غرض مؤطا کا لفظ اپنی حقیقت کا آپ مفسر ہے کہ ان مسائل پر مشتمل ہے جن پر صحابہ کا عمل رہا ہے اور جمہور سلف جن پر چلے ہیں۔

تعداد مرویات: ابتداء مؤطا میں دس ہزار حدیثیں تھیں لیکن امام کے خامۂ صحت پسند نے تقریباً آٹھ ہزار حدیثیں قلم زد کردیں، باقی ۱۷۲۰ ہیں جن میں سے مسند اور مرفوع ۶۰۰ ہیں، مرسل ۲۳۵، موقوف ۶۱۳، تابعین کے اقوال وفتاوی ۲۸۵، بلاغات مالک ۷۵۔(۱)

موضوع: مؤطا کا موضوع صرف احکام فقہیہ ہیں، اس لئے وہ سینکڑوں ابواب وفصول جو بخاری ومسلم اور ترمذی وغیرہ میں نظر آتے ہیں مؤطا ان سے خالی ہے، کیونکہ فقہیات سے ان کو کوئی تعلق نہیں ہے اس بنا پر محدثین کی اصطلاح کے مطابق اس کو "کتاب السنن" کہنا چاہئے۔

مؤطا اور دیگر فقہائے مجتہدین کے مجموعہ ہائے حدیث: چاروں مجتہدین فقہا میں سے ہر ایک کے انتساب سے ایک مجموعۂ حدیث موجود ہے لیکن امام مالک کے سوا کسی امام مجتہد کے قلم سے علم حدیث کی کوئی تصنیف ظاہر نہیں ہوئی وذالك فضل الله يوتيه من يشاء مسند ابی حنیفہ کے نام سے متعدد کتابیں موجود ہیں مگر دراصل یہ تمام کتابیں امام ابوحنیفہ کے سینکڑوں برس بعد امام ممدوح کے تلامذہ کی تصنیفات اور غیر معروف مسانید سے لے کر محمد بن یعقوب اور حسین بن محمد بن خسرو وغیرہ نے تالیف کی ہیں اور ان کو مسند ابی حنیفہ امام اعظم کے نام سے موسوم کردیا ہے۔

مسند امام شافعی کی حقیقت یہ ہے کہ امام شافعی نے اپنی تصنیفات میں بر سبیل استدلال جو حدیثیں روایت کی ہیں، ابوجعفر بن محمد بن مطر نیشاپوری اور ابوالعباس نام ایک شافعی نے ان کو یکجا کر دیا ہے، مسند احمد بن حنبل کی تالیف یقیناً امام احمد نے شروع کی تھی

(۱) مقدمہ مسوی شاہ ولی اللہ صاحب ص ۶۔

لیکن وہ ابھی مسودہ تھا کہ امام موصوف نے وفات پائی، اس کی تبییض وترتیب بعد کو امام احمد کے صاحبزادہ عبداللہ نے کی، جو افسوس ہے کہ اس میدان کے مرد نہ تھے، اسی لئے اس میں مدنی اور عراقی مسندوں میں تخلیط ہے اور صحیح احادیث کا التزام نہیں، گو خود امام ابن حنبل کو اس کا دعویٰ تھا۔

مؤطا اور اس کی معاصر کتابیں: مؤطا سے قبل اور خود اس کے زمانہ میں بیسیوں مسانید اور مؤطائیں لوگوں نے لکھیں، جن میں سے بعض اب تک باقی ہیں لیکن اور مؤطاؤں اور مؤطائے امام مالک کے موازنہ سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ مؤطا اور ان کتابوں میں وہی نسبت ہے جو صحیح بخاری کو مصنف ابن ابی شیبہ اور سنن بیہقی سے ہے خود ان کتابوں کا فقدان اور عدم شہرت اس کی سب سے بڑی دلیل ہے، تین خاص وجوہ سے مؤطا کا امتیاز بالکل روشن ہو جاتا ہے۔

۱- مؤطا سے پہلے جو حدیث کی کتابیں لکھی گئیں ان کا مبنیٰ زیادہ تر صحابہ وتابعین کے آثار وفتاویٰ تھے، امام مالک نے مؤطا میں احادیث صحاح ومسند یا منقطع ومرسل کو بنائے اول اور آثار وفتاوی کو بنائے ثانی قرار دیا۔

۲- دوسرا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ ان میں صحت کا التزام نہیں کیا گیا تھا اور مؤطا میں صرف اسی حدیث یا فتویٰ نے جگہ پائی ہے جس کو صحت کا شرف حاصل تھا۔

۳- تیسری بات یہ کہ مؤطا مدینہ میں تالیف ہوئی ہے اور اس کے رواۃ حجازی ہیں اور دیگر مسانید اور مؤطائیں کوفہ بصرہ، واسط، شام، یمن، خراسان اور رے وغیرہ میں لکھی گئیں اس لیے ان کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہے اور اس پر تمام علمائے حدیث کا اتفاق ہے کہ حجاز کی حدیثیں صحت، قوت اور جودت اسناد میں سب پر فائق ہیں۔

طبقات کتب حدیث میں موطا کا درجہ: علمائے حدیث نے کتب حدیث کو چار مختلف طبقات میں منقسم کیا ہے، طبقۂ اولیٰ میں وہ تصانیف ہیں جن کے مصنفین حدیث کے امام

اور فن کے نقاد تھے اور جن کی تصنیفات صحت، جودت، اسناد اور قبول محدثین کے لحاظ سے سب سے مقدم ہیں اور جن کے رجال حفظ، ثبوت، وثوق، شہرت میں معروف ہیں اس طبقہ میں مؤطا، بخاری اور مسلم داخل ہیں۔

طبقہ اولیٰ میں مؤطا کا درجہ: عام علما تو اس کو مسلم بلکہ ترمذی کے بھی بعد جگہ دیتے ہیں لیکن محققین قدما اور عموماً متاخرین میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز صاحب اس کو بخاری سے بھی مقدم سمجھتے ہیں اور خود میں بھی بدءِ طلب حدیث سے یہی اعتقاد جازم رکھتا ہوں۔

یہ صحیح ہے کہ مؤطا میں مرسل، موقوف اور منقطع حدیثیں ہیں، جو صحیح کے لئے قادح ہیں لیکن ان کا ارسال، وقف اور انقطاع مؤطا کی روایت کے لحاظ سے درست ہے مگر حقیقت کے رو سے یہ تمام مراسیل وموقوفات ومنقطعات، متصل، مرفوع ومسند ہیں اور خود ان کا رفع واتصال واسناد، امام بخاری وامام مسلم وترمذی وغیرہ نے کیا ہے۔ اس بنا پر درحقیقت مؤطا میں کوئی مرسل، موقوف یا منقطع حدیث نہیں، اس میں جو حدیث بھی ہے اس پر (الا ماشاءاللہ) بخاری ومسلم وترمذی وغیرہ کی مہر تصدیق لگی ہوئی ہے، اس سے مؤطا کی صحت کے درجہ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۱- مؤطا کو سب سے بڑا شرف یہ بھی حاصل ہے کہ مسلمانوں کے ہاتھ میں کلام اللہ کے بعد جو کتاب آئی وہ کلام الرسول کا یہی اصح ترین مجموعہ تھا، ظاہر ہوئی، کشف الظنون میں ہے "سب سے پہلی کتاب جو اسلام میں لکھی گئی ہے وہ مؤطا ہے۔" (۱) قاضی ابوبکر ابن عربی م ۵۴۶ھ مؤطا کی شرح میں لکھتے ہیں یہ "پہلی کتاب ہے جو شریعت اسلامیہ میں لکھی گئی ہے" حضرت سفیان کہتے ہیں "سب سے پہلے مالک نے صحیح تالیف کی۔"

۲- باوجود نقشِ اول ہونے کے بھی اس کے بعد کی کتابیں اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتیں، جس کے متعلق ائمہ مجتہدین اور علمائے حدیث کی قوی شہادتیں موجود ہیں،

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ص ۵۷۲۔

امام شافعی م ۲۰۴ھ فرماتے ہیں ''روئے زمین پر کتاب اللہ کے بعد کوئی کتاب مؤطا امام مالک سے زیادہ صحیح نہیں ہے'' ابوبکر ابن عربی فرماتے ہیں ''یہ اسلام کی سب سے پہلی کتاب ہے اور سب سے پچھلی بھی، کیونکہ پھر اس کے مثل کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔''

شاہ ولی اللہ صاحب لکھتے ہیں کتاب الام میں امام شافعی اور کتاب الآثار میں امام محمد کی جو نقاہت ہے وہ مؤطا ہی کے صدقہ میں ہے۔

۳- امام مالک سے مؤطا کی روایت کرنے والے جس پایہ کے لوگ ہیں وہ بخاری اور مسلم کے نہیں ہیں اس لئے خواص وعوام کی نقل و روایت میں جو فرق ہے وہ یقیناً مؤطا اور دیگر کتب کے نقل و روایت میں ہے۔

۴- رسول اللہ ﷺ اور مؤلفین حدیث میں جتنے واسطے کم ہوں گے اسی قدر اس کی تالیفات زیادہ معتبر اور مستند ہوں گی، بخاری و مسلم کی روایتیں عموماً پانچ چھ واسطوں سے مروی ہیں، مؤطا کی حدیثیں تین چار واسطوں سے زیادہ کی نہیں ہیں، امام بخاری کو اپنی بیس ثلاثیات پر ناز ہے اور مؤطا کی بنیاد ہی ثلاثیات پر ہے اس کے علاوہ اس میں چالیس ثنائیات ہیں۔

مؤطا کے نسخے: موطا امام مالک صاحب سے تیس مختلف طریقوں سے مروی ہے جن میں مشہور ۱۶ نسخے ہیں، ان میں سے معتبر اور باوثوق گیارہ اور باوثوق تر چار ہیں، یعنی یحییٰ ابن بکیر، ابومصعب اور ابن وہب کے نسخے لیکن متداول ترین اور مشہور ترین یحییٰ کی روایت والا نسخہ ہے، کتاب کی مشہور ترتیب یہ ہے: اول کتاب الجنائز، پھر کتاب الصلوۃ، پھر کتاب الزکوۃ، پھر کتاب الصیام، اس کے بعد تمام نسخے کتاب الحج تک متفق ہیں، کتاب الحج کے بعد سے پھر مختلف الترتیب ہیں (۱) اس قسم کا اختلاف بخاری و مسلم سب میں ہے۔

شروح وتعلیقات: کسی تصنیف کے قبول و ہردلعزیزی کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کو شارحین، معلقین و محشین کی ایک بڑی جماعت ہاتھ آئے اور اس میں کمیت سے زیادہ

(۱) بستان المحدثین ص ۱۰، ۱۱۔

اصل چیز کیفیت ہو، مؤطا ان دونوں خصوصیات کے لحاظ سے خوش قسمت ہے، تقریباً پچیس علمائے کبار نے اس کی شرح وتعلیق اور دیگر خدمات انجام دی ہیں، قدما میں ابن حبیب مالکی متوفی ۲۳۹ھ، امام ابوسلیمان خطابی م ۳۸۸ھ، ابن رشیق قیروانی م ۴۵۶ھ، محدث ابن عبدالبر، م ۴۶۳ھ، امام باجی اندلسی متوفی ۴۷۴ھ، قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ، قاضی ابوبکر بن عربی متوفی ۵۴۶ھ اور متاخرین میں حافظ جلال الدین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ علامہ زرقانی مصری م ۱۱۲۲ھ، شاہ ولی اللہ دہلوی م ۱۱۷۶ھ وغیرہ داخل ہیں۔

امام خطابی، حافظ سیوطی، ابن عبدالبر، ابن حزم، ابوالولید باجی نے بحذف فتاوی صرف مؤطا کی احادیث کی تلخیص کی ہے، حافظ سیوطی نے رجال مؤطا کو علاحدہ کیا ہے، احمد بن عمران، اخفش بصری اور قاضی عیاض نے مؤطا کے لغات حل کیے ہیں، باجی اور دارقطنی نے مؤطا کے اختلاف نسخ پر بحث کی ہے، ابوالحسن علی بن محمد قابسی نے مؤطا کی صرف متصل الاسناد حدیثیں جمع کی ہیں، ابن بشکوال اور خطیب بغدادی نے صرف ان لوگوں کے حالات لکھے ہیں جنھوں نے امام سے مؤطا کی روایت کی ہے، غرض مؤطا کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کی تعداد ستر ۷۰ کے قریب ہے۔

مؤطا کا ایک اور امتیاز: سلاطین اور خلفائے اسلام میں سینکڑوں ایسے گذرے ہیں جو صاحب سیف وقلم تھے جن کے نام سے تخت ومنبر دونوں عزت پاتے تھے لیکن کسی کے متعلق یہ ذکر نہیں ہے کہ اس نے طلب علم واخذ سند کے لیے کوئی سفر کیا ہو کیوں کہ خود ان کا دربار اساتذہ کا مرکز اور علما کا مرجع ہوتا تھا، تنہا امام مالک کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ ان کی کتاب مؤطا کے لیے مہدی، ہادی، رشید، مامون، اور امین جیسے مشاہیر خلفائے اسلام نے عراق سے حجاز تک کا سفر کیا اور آخر میں چھٹی صدی میں بزرگ ترین سلاطین اسلام صلاح الدین ایوبی فاتح بیت المقدس نے قاہرہ سے اسکندریہ تک صرف اسی کی خاطر سفر گوارا کیا۔(۱)

(۱) تزئین الممالک ص ۴۶۔ ☆

امام ابوداؤد طیالسی

(متوفی ۲۰۴ھ)

نام ونسب: سلیمان نام، ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: سلیمان بن داؤد بن جارود (۱)

ولادت: وہ باتفاق ۱۳۳ھ میں پیدا ہوئے، علامہ سمعانی نے ربیع الاول کا مہینہ بھی لکھا ہے۔

خاندان ووطن: آبائی وطن فارس ہے، بصرہ میں مستقل بودوباش اختیار کر لی تھی، اصلاً غلام زادہ تھے، ان کے والدین قبیلہ قریش کے موالی تھے، فارسی، بصری، قرشی اور طیالسی کی نسبتوں سے منسوب کیے جاتے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور نسبت طیالسی ہے، جو طیالسہ کی جانب ہے، طیالسہ، طیلسان کی جمع ہے، یہ ایک قسم کی چادر ہوتی تھی، جس کو اہل عرب عماموں کے اوپر اوڑھتے تھے، اس نسبت سے جو لوگ منسوب ہیں ان میں ابوداؤد سب سے زیادہ مشہور اور ممتاز ہیں۔ (۲)

طیلسان فارسی زبان کا لفظ ہے، اصمعی کے نزدیک وہ اصل میں تالشان (تالسان) تھا اور معرب ہو کر طیلسان ہو گیا ہے، (۳) اس نسبت سے منسوب ہونے کا سبب نہیں معلوم ہو سکا۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۵۱ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۲۲ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۷۵ (۳) لسان العرب ج ۷ ص ۴۳۱۔

اساتذہ وشیوخ: حافظ ابوداؤد طیالسی کو دوسری صدی ہجری کا مبارک زمانہ ملا جو علم وفضل اور خیر وبرکت کے لحاظ سے خیر القرون میں شمار کیا جاتا ہے اس لیے ان کو مقدس اور برگزیدہ علمائے اسلام کی صحبت میسر آئی اور بڑے بڑے محدث علما سے استفادہ کا موقع ملا، ان کے اساتذہ کی تعداد بہت زیادہ ہے، وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک ہزار شیوخ سے حدیثیں لکھیں، ان میں ابن عون اور ان کے مرتبہ کے متعدد لوگ تھے، بعض مشہور شیوخ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابان بن یزید عطار، ابراہیم بن سعد، ایمن بن نابل، جریر بن حازم، جریر بن عبدالحمید، حبیب بن یزید، حرب بن شداد، حماد بن درہم، حماد بن سلمہ، زائدہ بن قدامہ، زہیر بن معاویہ، سفیان بن سعید ثوری، شعبہ بن حجاج، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، عبداللہ بن عون، عبدالعزیز بن ماجشون، قرۃ بن خالد، ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ، ورقاء، ہشام بن عبداللہ دستوائی، ہمام بن یحییٰ اور یزید بن ابراہیم وغیرہ۔ (۱)

تلامذہ: جس طرح انھوں نے بیشمار مشائخ سے اکتساب فیض کیا تھا، اسی طرح ان کے دامن سے بھی بکثرت طلبہ اور محدثین وابستہ ہوئے، ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

احمد بن ابراہیم دورقی، احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور کوسج، ابوبکر بن ابی شیبہ ابومسعود رازی، ابن فرات، بکار بن قتیبہ ثقفی، حجاج بن یوسف الشاعر، عباس دوری، عبداللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، علی بن مدینی، علی بن مسلم طوسی، عمرو بن علی فلاس، محمد بن ابوبکر مقدمی، محمد بن بشار بندار، محمد بن رافع، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن غیلان، ہارون حمال، یعقوب بن ابراہیم دورقی اور یونس بن حبیب اصبہانی وغیرہ۔ (۲)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴، ۲۵ و کتاب الانساب ورق ۳۷۵ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴، ۲۵ و کتاب الانساب ورق ۳۷۵ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶۔

آپ کے استاذ جریر بن عبدالحمید نے بھی آپ سے روایت کی ہے،(۱) مؤلفین صحاح اور امام طیالسی کے زمانہ میں کافی تفاوت ہے اس لیے ان میں سے تین نے آپ سے بالواسطہ روایت کی ہے، حافظ ابن حجر نے امام بخاری (۲) اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے امام ترمذی کے سلسلۂ رواۃ میں ان کا نام گنایا ہے،(۳) شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے امام ابوداؤد سجستانی کے متعلق لکھا ہے کہ غالبًا وہ ان سے بیک واسطہ روایت کرتے ہیں۔(۴)

رحلت وسفر: ابوداؤد کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے حدیث کی طلب وجستجو کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا ہوگا لیکن کتابوں میں صرف بغداد اور اصبہان کے سفر کا ذکر کیا ہے۔

فضل وکمال: حدیث کے علاوہ ان کے دوسرے علمی کمالات پردۂ خفا میں ہیں اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کن کن علوم وفنون میں جامعیت رکھتے تھے، صرف فن حدیث میں ان کی مہارت وژرف نگاہی کا حال معلوم ہوتا ہے جس نے ان کو مرتبۂ امامت پر فائز کیا۔

حفظ وضبط: ان کا حافظہ غیر معمولی تھا، علمائے فن اور ان کے معاصرین نے اس کا اعتراف کیا ہے، بعض علما کا بیان ہے کہ ''ان کو ۳۰ ہزار اور بعض نے کہا ہے کہ ۴۰ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں'' یونس بن حبیب اصبہانی فرماتے ہیں کہ انھوں نے اصبہان میں ایک لاکھ حدیثیں محض اپنی یادداشت سے املا کرائیں، عمرو بن علی فلاس کہتے ہیں کہ ''محدثین کے زمرہ میں مجھ کو کوئی شخص ابوداؤد سے بڑا حافظ نظر نہیں آیا، میں نے ان کو خود یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں ۳۰ ہزار حدیثیں زبانی بیان کرتا ہوں'' علی بن مدینی کا بیان ہے کہ میری نظر سے کوئی ان سے زیادہ حدیثوں کا حافظ نہیں گذرا، محمد بن بشار کا قول ہے کہ ''جتنی حدیثیں ابوداؤد سے

(۱) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۴ وتہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۳ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۲۲۸ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۲۷۲، ۳۲۰ (۴) بستان المحدثین ص ۳۲۔

لکھی گئیں اتنی کسی اور محدث سے نہیں لکھی گئیں، صالح بن احمد عجلی ان کو کثیر الحفظ بتاتے ہیں، ابن عدی کا بیان ہے کہ "بصرہ میں ابوداؤد طیالسی اپنے زمانے میں سب سے بڑے حافظ حدیث تھے اور اس وصف میں وہ اپنے معاصرین میں فائق و برتر تھے" ہشیم بن خارجہ نے امام احمد سے دریافت کیا کہ "ابوداؤد اور ابوعبیدہ حداد میں کس کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں" فرمایا ابوداؤد: حافظہ کے لحاظ سے فائق ہیں اور ابوعبیدہ زیادہ تر کتابوں سے روایت کرتے ہیں، اس لیے غلطی بہت کم کرتے ہیں" وکیع کا بیان ہے کہ "طویل حدیثوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں (۱) رہا" شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں "ابوداؤد طویل حدیثوں کو اچھی طرح محفوظ کرتے تھے اور اس وصف میں اپنے معاصرین سے ممتاز تھے۔"

عدالت وثقاہت: ثقاہت میں بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا، علمائے جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، عبدالرحمٰن بن مہدی فرماتے ہیں "وہ لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے" (۲) ابوالمنذر نعمان کا ارشاد ہے کہ "وہ ثقہ اور معتبر تھے" ابن معین سے شعبہ کے تلامذہ کے متعلق دریافت کیا گیا کہ ابوداؤد طیالسی اور حرمی میں آپ کے نزدیک کون زیادہ بہتر ہے تو انھوں نے فرمایا کہ ابوداؤد صدوق ہیں، اس لیے وہ مجھ کو زیادہ پسند ہیں، صالح بن احمد عجلی اور خطیب بغدادی نے ان کو ثقہ وثابت بتایا ہے، عمرو بن علی نے ان کو ثقہ ومعتبر کہا ہے، ابن عدی عمرو کی رائے کی تصدیق کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ وہ میرے اور دوسروں کے نزدیک متیقظ اور ثابت تھے، ابوحاتم ان کو صدوق محدث قرار دیتے ہیں، ابومسعود رازی نے امام احمد سے ان کے بارے میں سوال کیا تو ارشاد ہوا کہ وہ ثقہ اور صدوق تھے، امام نسائی کا

---

(۱) العبر ج۱ص۳۴۴ وکتاب الانساب ورق ۳۷۵، تاریخ بغداد ج۹ص۲۶ وتذکرۃ الحفاظ ج۱ص۱۲۲ ومیزان الاعتدال ج۱ص۴۱۳، تہذیب التہذیب ج۴ص۱۸۴ (۲) تاریخ بغداد ج۹ص۲۸ وتہذیب التہذیب ج۴ص۱۸۳، کتاب الانساب ورق ۳۷۵ ومیزان الاعتدال ج۹ص۴۱۳ وطبقات ابن سعد قسم دوم ج۷ص۵۱۔

ارشاد ہے کہ ''ابوداؤد ثقہ اور لوگوں میں سب سے زیادہ سچے تھے، ابن حبان نے بھی ان کو ثقات میں شامل کیا ہے اور محمد بن سعد صاحب طبقات لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، (۱) شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ یحییٰ بن معین وابن المدینی وفلاس ووکیع ودیگر علمائے رجال اور التعدیل وتوثیق مفرط نمودہ اند۔ (۲)

معرفت حدیث: وہ حدیثوں کے صرف ناقل وحافظ ہی نہ تھے بلکہ ان کی پرکھ میں بھی مہارت رکھتے تھے، نبدار کا بیان ہے کہ وہ حفظ اور معرفت حدیث کے لحاظ سے نہایت برتر تھے۔

وکیع جیسے نامور محدث حدیث میں ان کی غیر معمولی واقفیت اور تمیز کی بنا پر ان کو جبل العلم کہتے تھے، یحییٰ بن معین ان کو عبدالرحمٰن بن مہدی سے بھی زیادہ صاحب علم اور حدیثوں کا واقف کار بتاتے ہیں، ان کے استاذ شعبہ کو ان کے علم وتمیز پر اتنا اعتماد تھا کہ اپنی عدم موجودگی میں ان کو مسندِ درس پر رونق افروز ہونے کی اجازت دے دیتے تھے، ابوحاتم کا بیان ہے کہ معرفت حدیث میں ان کا مقام اتنا بلند تھا کہ وہ شعبہ سے مذاکرہ کر سکتے تھے، اس سلسلہ میں ابوداؤد کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ بعض محدثین اور شیوخ کی روایات کا ان سے زیادہ کوئی واقف کار نہ تھا، عثمان بری کے متعلق وہ خود بیان کرتے ہیں کہ میرے سینہ میں ان کی ۱۲ ہزار حدیثیں محفوظ ہیں، مشہور محدث شعبہ کی روایتوں کے لیے تو وہ سند کی حیثیت رکھتے تھے، احمد بن سعید دارمی نے امام احمد سے سوال کیا کہ شعبہ کی حدیثیں کس سے قلم بند کی جائیں تو انھوں نے فرمایا کہ جب تک ابوداؤد زندہ ہیں ہمارا خیال ہے کہ ان ہی سے نقل وروایت کی جائے، ابومسعود رازی کا بیان ہے کہ شعبہ کی روایتوں کے معاملہ میں ابوداؤد سے زیادہ کوئی واقف کار مجھ کو نہیں ملا، (۳) حضرت شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ ''واز محدثان آنجا مثل شعبہ وہشام دستوائی وابن عون وغیرہم روایات

---

(۱) طبقات ابن سعد قسم دوم ج ۷ ص ۵۱ (۲) بستان المحدثین ص ۲۱ (۳) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۷، ۲۸، ۲۹ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۵۱۔

بسیار دارد۔(۱)

اخلاق وعادات: ابوداؤد طیالسی کے اخلاق وعادات اور اعمال وعبادات وغیرہ کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی، بعض واقعات سے ضمناً ان کے بعض اوصاف کا پتہ چلتا ہے، مثلاً اصبہان میں ایک لاکھ حدیثیں املا کرانے کے بعد جب ان کو اپنی بعض غلطیوں کا پتہ چلا تو انھوں نے ان کو تسلیم کرلیا اور اپنے شاگردوں کو بھی ہدایت کی کہ وہ بھی ان کی تصحیح کرلیں۔

امام احمد نے بھی ان کی اس خوبی کا ذکر کیا ہے کہ وہ اپنی غلطی پر اصرار نہیں کرتے تھے۔

وفات: مشہور روایت کے مطابق ۷۲ سال کی عمر میں ۲۰۴ھ میں ان کا انتقال ہوا، بعض لوگوں نے صفر اور بعض نے ربیع الاول ۲۰۴ھ کا مہینہ بتایا ہے، ۲۰۳ھ اور ۲۱۴ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے لیکن یہ غلط ہے، اس زمانہ کے حاکم بصرہ یحییٰ بن عبداللہ بن عمر نے نماز جنازہ پڑھائی''(۲)

مسند طیالسی: مسانید کے جو مجموعے مشہور ومتداول ہیں، ان میں ایک ابوداؤد طیالسی کی مسند بھی ہے، اس کی اہمیت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ دوسرے مسانید کے مقابلہ میں قدیم ہے، بعض علما نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے(۳) حاکم صاحب مستدرک فرماتے ہیں کہ ''علمائے اسلام میں عبیداللہ موسیٰ اور ابوداؤد طیالسی نے سب سے پہلے تراجم رجال پر مسانید مرتب کیے۔''(۴) لیکن علمائے محققین کی ایک جماعت کو اس رائے سے اتفاق نہیں ہے وہ کہتے ہیں کہ ''عام مصنفین مسانید کے مقابلہ میں ابوداؤد کا زمانہ قدیم ہے، اس لیے لوگوں نے ان کی مسند کو بھی سب سے قدیم سمجھ لیا، حالانکہ اس کی جمع وترتیب ان کے بعد بعض متاخرین خراسانی حفاظ نے کی ہے،(۵) بہر حال اس کی قدامت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، گو بعض مشہور کتب حدیث کی طرح ان کی مسند کو زیادہ شہرت نصیب نہیں ہوئی

(۱) بستان المحدثین ص ۳۱۔(۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۹ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۳۱، والرسالۃ المستطرفۃ ص ۵۲ (۴) المدخل فی اصول الحدیث ص ۴۔(۵) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۳۱۔

لیکن اس کو مسانید میں یک گونہ خصوصیت حاصل ہے شاہ ولی اللہ صاحب نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے۔(۱)

ترتیب وتبویب: یہ مسند گیارہ اجزا پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب میں بڑی حد تک مسانید کے عام اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے، یعنی صحابہؓ کے شرف وتقدم اور سبقت فی الاسلام کے لحاظ سے روایتیں نقل کی گئی ہیں، پہلے خلفائے راشدین، عشرۂ مبشرہ اور کبار صحابہؓ کی حدیثیں ہیں، چھٹے جز کے آخر سے صحابیات کی مرویات کا سلسلہ شروع ہو کر ساتویں جز میں ختم ہوتا ہے، سب سے پہلے حضرت فاطمہؓ اور اس کے بعد حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کی روایات ہیں، ہر صحابی کی حدیثیں الگ الگ عنوان سے ہیں، بعض صحابہ کی حدیثیں دو جگہ بھی نقل ہو گئی ہیں، بعض مقامات پر ایک صحابی کی روایتوں میں دوسرے صحابی کی روایتیں بھی خلط ملط ہو گئی ہیں، مسند کی باقاعدہ جمع وترتیب کا کام بعض اہل خراسان نے کیا اور زیادہ تر روایتیں یوسف بن حبیب کے واسطہ سے مروی ہیں۔(۲)

خصوصیات: ۱-اس کی سب سے اہم خصوصیت اس کی قدامت ہے۔

۲-مسند کی اکثر روایتیں دوسری مشہور کتب حدیث میں موجود ہیں۔

۳-کہیں کہیں آثار صحابہ بھی نقل کیے گئے ہیں۔

۴-حدیث کی کتابوں کے عام خصوصیات مثلاً رواۃ کے ناموں کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، کثرتِ طرق، تعددِ اسناد، اختلاف الفاظ ومعانی یا خاص اضافہ وکمی کا ذکر، روایتوں کے باہمی فرق، رواۃ کے سہو ونسیان، روایات کے درجہ وحیثیت کی تشریح، دو روایتوں کے درمیان ترجیح، روایات کی تصویب وتخطیہ، ان کے یا راویوں کے متعلق اپنے یا شیوخ کے شک وتردد کا اظہار، مشکل الفاظ، روایات کے ابہام اور مفہوم کی وضاحت اور ان کے بعض خاص پہلوؤں اور نکتوں کی تشریح وغیرہ اس میں بھی موجود ہیں۔

یہ مسند پہلی مرتبہ مطبع دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدر آباد سے ۱۳۲۱ھ میں شائع ہوئی

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ص ۱۰۷ (۲) کشف الظنون ج ۲ص ۱۴۴۱۔

ہے، صفحات کی تعداد ۳۹۲ ہے، ارکان دائرہ نے حاشیے میں متعدد کتب حدیث خصوصاً مسند احمد، سنن ترمذی اور سنن ابی داوٗد سے اس کی حدیثوں کی مطابقت یا اختلاف کو دکھایا ہے اور کہیں کہیں لغات اور بلاد واماکن وغیرہ کی بھی مختصر تشریح کی ہے، خاتمہ میں مسند کے قدیم نسخہ سے اس نسخہ کے اختلاف کا مقابلہ کیا گیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ساتویں صدی ہجری سے قبل کا خدابخش خاں لائبریری میں موجود ہے، شیخ عبدالرحمٰن بنا ساعاتی نے مسند احمد کی طرح اس کو بھی فقہی ابواب پر مرتب کیا ہے، اسی کے ساتھ موصوف نے اس کی .... ''المحمود علی منحۃ المعبود'' کے نام سے تصحیح و تعلیق لکھی ہے، اصل و تعلیق دو جلدوں میں مطبع میمنہ مصر سے شائع ہوئی ہے۔

بعض اعتراضات اور ان کا جواب: ابوداوٗد طیالسی پر سہو و خطا اور تدلیس کے اعتراضات بھی ملتے ہیں۔

۱- خطا: ابو حاتم، ابراہیم جوہری، ابن سعد اور علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کی بھول چوک اور خطا و نسیان کا ذکر کیا ہے، مگر ان سے ابوداوٗد کے حفظ وضبط، علم وفضل اور ثقاہت میں فرق نہیں آتا، خطا و نسیان تو بشریت کا خاصہ ہے، جس سے کوئی محدث بھی بری نہیں، چنانچہ ان پر جن لوگوں نے اعتراض کیا ہے وہ بھی ان کو ثقہ اور ضابط مانتے ہیں، فلاس کا بیان ہے کہ ''میں جانتا ہوں کہ علامت منافق والی حدیث میں کسی نے ان کی متابعت نہیں کی ہے تاہم اس کے باوجود وہ ثقہ وضابط ہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک سہو و خطا کرنے والا متروک الحدیث نہیں سمجھا جاتا، ائمہ صحاح کی کتابوں میں بھی ایسے رواۃ کی روایتیں موجود ہیں، اس لیے یہ الزام خواہ صحیح ہو یا غلط، اس سے ابوداوٗد کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ ابوداوٗد طیالسی کے حافظہ میں حدیثوں کا بڑا ذخیرہ محفوظ تھا اور وہ اپنی

(۱) تہذیب التہذیب ج۴ ص۱۸۶۔

یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے، اس لیے ان سے بھول چوک کا ہو جانا تعجب انگیز نہیں ہے، ابن عدی کہتے ہیں کہ ''جو شخص محض یادداشت سے ۴۰ ہزار حدیثیں بیان کرے اس سے بعض روایتوں میں اس طرح کے سہو وخطا کا ہو جانا کہ جس روایت کو دوسرے موقوفاً بیان کرتے ہوں وہ اس کو مرفوعاً یا جس کو لوگ مرسلاً بیان کرتے ہوں وہ اس کو موصولاً بیان کر دے، بعید اور تعجب خیز نہیں کیوں کہ اس کا تمام تر دارومدار حافظہ پر ہوتا ہے، باقی ابوداؤد نہ صرف میرے بلکہ دوسرے لوگوں کے نزدیک بھی متیقظ اور ثابت ہیں، (۱) امام احمد سے ایک مرتبہ کسی نے ان کی غلطیوں کا ذکر کیا تو فرمایا ان کی غلطی کو غلطی نہیں کہنا چاہیے، خطا کا الزام اس وقت ان پر درست ہو سکتا ہے جب ان سے ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جائے اور وہ متنبہ نہ ہوں لیکن ان کا یہ حال ہے کہ ان سے جس وقت ان کی غلطی کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ فوراً متنبہ ہو جاتے اور سمجھ لیتے ہیں، (۲) دوسرے مورخین اور ائمہ تعدیل نے بھی اس قسم کی توجیہ بیان کی ہے۔

۲- تدلیس: دوسرا اعتراض تدلیس کا ہے، یعنی وہ ایک راوی کی روایت کو دوسرے کی طرف منسوب کر دیتے تھے، محمد بن منہال فرماتے ہیں ''ابوداؤد نے ہم سے ابن عون کے واسطہ سے ۲۰ سے کچھ زیادہ حدیثیں بیان کیں، مگر ان میں سے ایک کے علاوہ جس کو میں نہیں جانتا تھا باقی حدیثیں یزید بن زریع کی تھیں۔ (۳)

حافظ ابن حجر نے دو اور واقعے نقل کیے ہیں، ان میں سے ایک ان ہی محمد بن منہال کے واسطہ سے اور دوسرا امام دارقطنی کی کتاب الجرح والتعدیل سے ماخوذ ہے، ان تینوں واقعات سے خود ظاہر ہے کہ ابوداؤد نے غلطی سے روایت کا انتساب اصل راوی کے بجائے دوسرے کی جانب کر دیا ہے، خود حافظ ابن حجر نے جو ان واقعات کے ناقل ہیں،

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۶ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۴۱۳ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۲۶ (۳) ایضاً ص ۲۵ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۸۴۔

انھیں تحریف وتدلیس کے بجائے سہو ونسیان پر محمول کرنے کی کوشش کی ہے اور بجز ایک قلیل جماعت کے جمہور کا متفقہ فیصلہ یہی ہے کہ تدلیس میں کوئی عیب نہیں ہے" سفیان ثوری جیسے بزرگ جو امیر المومنین فی الحدیث کہلاتے ہیں اور بہت سے اہل کوفہ بھی تدلیس کرتے تھے، ابن صلاح لکھتے ہیں:

"صحیح یہ ہے کہ مدلس جس چیز کو لفظ محتمل سے روایت کرے اور سماع واتصال کی وضاحت نہ کرے تو اس کا حکم مرسل اور اس کی قسموں جیسا ہے لیکن جس روایت کو ایسے الفاظ سے بیان کیا جائے جن سے اتصال کی صراحت ہوتی ہے جیسے سمعت، حدثنا، اخبرنا وغیرہ تو وہ مقبول اور قابل حجت ہے، صحیحین وغیرہ کتب معتبرہ میں بھی اس قسم کی بے شمار روایتیں ہیں، جیسے قتادہ، اعمش، سفیانین اور ہشام بن بشیر وغیرہ کے واسطے سے اور یہ اس بنا پر کہ تدلیس دراصل کذب نہیں بلکہ ایک طرح کا ابہام ہے جو لفظ محتمل کی بنا پر ہوتا ہے۔" (۱)

☆☆☆

(۱) مقدمۂ ابن صلاح ص ۳۵۔

امام عبدالرزاق بن ہمام

(متوفی ۲۱۱ھ)

نام ونسب: عبدالرزاق نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبدالرزاق بن ہمام بن نافع۔

ولادت، وطن اور خاندان: یمن کے مشہور شہر اور پایہ تخت صنعا میں ۱۲۶ھ میں پیدا ہوئے، قبیلۂ حمیر سے ولا کا تعلق تھا، صنعانی حمیری کی نسبتوں سے زیادہ مشہور اور یمنی بھی کہے جاتے تھے۔(۱)

اساتذہ: بلند پایہ محدثین اور کبار ائمہ فن میں ابن جریج، امام اوزاعی، سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن ابی سبرۃ، امام مالک، معتمر بن سلیمان، معمر بن راشد ازدی اور ہیثم بن بشر واسطی وغیرہ سے اعزہ و متعلقین میں اپنے والد ہمام اور چچا وہب سے اور دوسرے علما ومشائخ میں ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ، اسماعیل بن عیاش، ایمن بن نابل، ثور بن یزید کلاعی، جعفر بن سلیمان، داؤد بن قیس فرار، زکریا بن اسحاق مکی، سعید بن بشیر، سعید بن عبدالعزیز، عبدالرحمٰن بن زید اسلم، عبدالعزیز بن ابی زیاد عبداللہ بن زیاد بن سمعان، عبداللہ بن عمر عمری اور ابو معشر، نجیح سندی وغیرہ سے شرف تلمذ حاصل ہے، معمر ازدی سے خاص تعلق تھا، سات آٹھ سال تک مستقل ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔(۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں خود ان کے بعض شیوخ ابن عیینہ اور معتمر بن سلیمان معاصرین

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ص ۵۴۳، ۵۴۴، تذکرۃ الحفاظ ج ۱ص ۳۳۳، مرآۃ الجنان ج ۲ص ۵۲، تہذیب التہذیب ج ۶ص ۳۱۴، بستان المحدثین ص ۴۸ (۲) تہذیب التہذیب ج ۶ص ۳۱۱۔

واقران میں ابواسامہ حماد بن سلمہ اور وکیع ، ائمہ اسلام اور ناقدین حدیث میں امام احمد، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن معین اور دوسرے مشہور لوگوں میں ابراہیم بن موسیٰ، ابومسعود رازی، احمد بن صالح، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق بن ابراہیم دیری، اسحاق بن ابراہیم سعدی، اسحاق بن منصور کوسج، حجاج بن شاعر، حسن بن علی خلال، زہیر بن حرب، سلمہ بن شبیب، عبد بن حمید، عبداللہ بن محمد مسندی، عبدالرحمٰن بن بشر، عمرو الناقد، محمد بن رافع، محمد بن مہران حمال، یحییٰ بن جعفر بیکندی اور یحییٰ ابن موسیٰ وغیرہ شامل ہیں۔(۱)

رحلت وسفر: مورخین نے تجارت کے لیے شام اور حج وزیارت کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے،(۲) مگر حدیث کی طلب وجستجو کے لیے سفر کی تصریح نہیں کی ہے، ان کے مشائخ کے ناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مشہور اور اہم مراکز کا سفر ضرور کیا ہوگا۔

مقبولیت ومرجعیت: ان کے فضل وکمال اور علمی عظمت نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کے علاوہ کسی اور شخص کے پاس اس قدر زیادہ لوگ سفر کر کے نہیں آئے، اکثر علمائے اسلام ان کی بارگاہ کمال میں حاضر ہوئے تھے۔(۳) مورخ یافعی نے ان کو المرتحل الیہ من الآفاق یعنی وہ شخص جس کے پاس لوگ مختلف اطراف واکناف سے آتے تھے، لکھا ہے۔(۴)

اعتراف کمال: علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے ان کو مخزن علم بتایا ہے، ایک مرتبہ امام احمد سے پوچھا گیا کہ ان سے زیادہ بہتر اور برتر محدث کا آپ کو علم ہے؟ فرمایا نہیں ان کے معاصر ہشام کو اعتراف تھا کہ ''ہم لوگوں میں سب سے زیادہ صاحب علم عبدالرزاق ہیں۔(۵)

(۱) تہذیب التہذیب ج ٦ ص ۳۱۱ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۳۴ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ا ص ۵۴۳ وکتاب الانساب ورق ۳۵۵، تذکرۃ الحفاظ ج ا ص ۳۳۴ (۴) مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۵۲ (۵) مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۵۳ و ۱۱۱ و ۱۱۲۔

حفظ وضبط: ابراہیم بن عباد دیری کا بیان ہے کہ عبدالرزاق کو ۱۷ ہزار حدیثیں زبانی یاد تھیں، ہشام بن یوسف فرماتے ہیں "ہم لوگوں میں سب سے بہتر حافظہ ان کا تھا۔"

ثقاہت: ان کی ثقاہت پر علما کا اتفاق ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ بے شمار اہل حدیث نے ان کو ثقہ اور متقن کہا ہے، ابوحاتم فرماتے ہیں کہ "عبدالرزاق کی حدیثیں لکھے جانے اور احتجاج کے لائق ہیں" ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ ان کی حدیثیں ثابت اور معتبر ہیں، ابن حبان یعقوب بن شیبہ آجری، عجلی اور بزار وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، اور ذہلی وغیرہ نے ان کو احادیث کے معاملہ میں بڑا متیقظ قرار دیا ہے، امام احمد سے ابن جریج کے شاگردوں میں ان کے اور برسانی کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا عبدالرزاق زیادہ ثقہ اور معتبر ہیں، مشہور محدث معمر کی حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ اور سب سے زیادہ مستند راوی یہی تھے، یحییٰ بن معین فرماتے ہیں کہ معمر کی حدیثوں کے لئے عبدالرزاق سے زیادہ بہتر اور معتبر کوئی نہیں، امام احمد کے نزدیک معمر کی عبدالرزاق کے واسطہ سے مروی حدیثیں بصریوں کے توسط سے مروی روایات سے زیادہ بہتر ہیں اور جب ان کی کسی حدیث کے متعلق ان کے تلامذہ مختلف الرائے ہوتے تھے تو عبدالرزاق کی روایت کو قبول کرتے تھے۔ (۱)

پیشہ: عبدالرزاق تجارت پیشہ تھے، اور بسلسلۂ تجارت شام جایا کرتے تھے۔

شعر وسخن: شعر وسخن کا ذوق تھا، اکثر یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔

فذاك زمان لعبنا به ۔۔۔ وهذا زمان بنا يلعب

ترجمہ: ایک وہ زمانہ تھا جس سے ہم کھیلتے تھے اور اب یہ زمانہ ہے جو ہم سے کھیل کر رہا ہے۔

وفات: ۸۵ سال کی عمر میں جبکہ ہوش وحواس بجا نہیں رہتے تھے ۲۱۱ھ میں وفات پائی، ابن

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۳۴، تہذیب التہذیب ج ۲ ص ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۴، ۳۱۶ بستان المحدثین ص ۴۸۔

سعد کے بیان کے مطابق شوال کا مہینہ تھا۔

تصنیفات

حافظ عبدالرزاق متعدد کتابوں کے جامع و مصنف بھی تھے، مگر ان میں سے اکثر معدوم و نایاب ہیں، بعض کے نام یہ ہیں: ۱- جامع یا سنن عبدالرزاق، اس کی اکثر حدیثوں کی صحاح میں تخریج کی گئی ہے، ۲- کتاب السنن فی الفقہ، ۳- کتاب المغازی، ۴- تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی، ۵- مصنف، عبدالرزاق کی سب سے زیادہ اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کو فقہی ابواب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ مصنف کے جو مجموعے موجود ہیں ان میں مصنف ابن ابی شیبہ کے بعد سب سے مشہور یہی ہے اور قدامت کے لحاظ سے یہ اس پر بھی فوقیت رکھتی ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کی اکثر روایتیں ثلاثی ہیں، مصنف عبدالرزاق ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے، جرمنی اور حجاز کے کتب خانوں میں اس کے مکمل اور ناقص نسخے موجود ہیں۔

عبدالرزاق پر نقد و جرح: بعض علمائے جرح و تعدیل نے عبدالرزاق پر نقد و جرح بھی کی ہے:

۱- شیعیت: ان کی جانب شیعیت کی نسبت کی جاتی ہے لیکن اس کے متعلق ان کا خود بیان ہے کہ ''مجھے اس بات پر کبھی شرح صدر نہیں ہوا کہ جناب امیر کو شیخین سے افضل قرار دوں'' سلمہ بن شبیب ان کا قول نقل کرتے ہیں کہ ''حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ پر خدا کی رحمت ہو، جس شخص کے دل میں ان بزرگوں کی محبت نہ ہو وہ مومن نہیں، مجھ کو اپنے اعمال میں سب سے زیادہ بھروسہ ان حضرات کی محبت ہی پر ہے'' ابوالازہر فرماتے ہیں کہ

"عبدالرزاق نے بتایا کہ وہ شیخین کی تفضیل کے قائل تھے اور کہتے تھے کہ خود حضرت علیؓ سے بھی یہی ثابت ہے، وہ اپنے کو شیخین سے افضل اور بہتر کہنے سے منع کرتے تھے، جناب امیر کی شان میں اس سے بڑی اور کیا گستاخی ہوگی کہ ان سے محبت رکھنے کے باوجود ان کے عقیدہ ومسلک کی مخالفت کی جائے، جس چیز کو ان کی شیعیت سے تعبیر کیا جاتا ہے اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ بعض اکابر کی طرح وہ بھی حضرت علیؓ اور اہل بیت کے بڑے گرویدہ تھے لیکن دوسرے صحابہؓ کے مراتب ودرجات کو اہل سنت ہی کی طرح مانتے تھے، اس لیے ان کے معاصرین اور تلامذہ تک کو ان کی شیعیت کا علم نہ تھا، امام احمد سے ان کے صاحبزادہ عبداللہ نے اس کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ میرے کانوں نے ان سے اس طرح کی کوئی بات نہیں سنی ہے، ان کے بارے میں مجھ کو صرف اس قدر معلوم ہے کہ وہ احادیث سے بڑا شغف رکھتے تھے" حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ان پر شیعیت کا اعتراض کیا جاتا ہے، حالانکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر تھی کہ وہ حضرت علیؓ سے بڑی محبت اور ان کے قاتل سے سخت نفرت کرتے تھے، علمائے جرح وتعدیل نے متفقہ طور پر ان کی توثیق کی ہے اور ان کی روایات کو تسلیم کیا ہے، کتب صحاح میں ان کی روایات اس کا ثبوت ہیں۔

۲-سوء حفظ وفتور عقل: دوسری جرح یہ ہے کہ ضعیفی میں ان کی بصارت زائل ہوگئی تھی اور سوء حفظ اور فتور عقل میں مبتلا ہو گئے تھے لیکن یہ علت محض آخری دور کی حدیثوں کے لیے قادح اور مانع ہوسکتی ہے اس کے پہلے کی روایات کے ثبوت واعتبار میں اس سے فرق نہیں آتا بلکہ بعض علما نے بڑھاپے کی صرف ان ہی روایتوں کو کمزور کہا ہے جن کو وہ یادداشت سے بیان کرتے تھے۔

بعض اور بھی اعتراضات کیے گئے ہیں لیکن حافظ ابن حجر اور علامہ ذہبی نے ان کو سراسر مہمل اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

☆☆☆

امام اسد بن موسیٰ

(متوفی ۲۱۲ھ)

نام ونسب: اسد نام اور اسد السنۃ لقب تھا، شجرۂ نسب یہ ہے: اسد بن موسیٰ بن ابراہیم بن ولید بن عبدالملک بن مروان بن حکم ۔(۱)

ولادت، وطن، خاندان: ۱۳۲ھ میں اموی حکومت کے زوال وانقراض کے سال مصر میں پیدا ہوئے، خاندان بنوامیہ سے نسبی تعلق تھا، اس لیے اموی اور مصری کہلاتے ہیں ۔(۲)

اساتذہ وشیوخ: ان کو جن نامور محدثین اور اکابر فضلا سے شرف تلمذ حاصل ہے اُن کے نام حسب ذیل ہیں:

ابن ابی ذئب، حماد بن سلمہ، روح، شعبہ، شیبان، عبدالعزیز بن ماجشون، لیث بن سعد، محمد بن طلحہ، مسعودی، معاویہ بن صالح اور یونس بن ابی اسحاق وغیرہ۔

تلامذہ: بعض نامور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن صالح مصری، رحیم، ربیع بن سلمان مرادی، عبدالملک بن حبیب، محمد بن عبدالرحیم برقی، مقدام بن داؤد عینی، ابویزید یوسف قراطیسی ۔(۳)

طلب حدیث کے لیے سفر: طلب حدیث کے لیے ان کے رحلت وسفر کا ذکر بھی ملتا ہے، علامہ ذہبی وابن حماد حنبلی لکھتے ہیں، رحل فی طلب الحدیث، انھوں نے حدیث کی طلب کے

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۶۸ (۲) ایضاً وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۵ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۶۸ تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰۔

لیے سفر کیا۔ (العبر ج ۱ ص ۳۶۱)

حفظ وثقاہت: اپنے زمانہ صاحب کمال محدثین اور ثقہ وضابط حفاظ میں شمار کیے جاتے ہیں، علمائے رجال نے الحافظ کے لقب سے ان کا تذکرہ کیا ہے، امام بخاریؒ نے ان کو مشہور الحدیث کہا ہے اور ان کی روایتوں سے استشہاد کیا ہے، اسی طرح امام ابوداؤد اور امام نسائی نے بھی استدلال کیا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، ابن یونس، ابن قانع، عجلی اور بزار وغیرہ نے بھی ان کی توثیق کی ہے، ابن حبان نے ثقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے، خلیلی لکھتے ہیں ''مصری صالح''یعنی اسد ابن موسیٰ مصری حدیثوں کے لیے صالح ومعتبر تھے، (۱) ابن حماد نے لکھا ہے کہ ''احد الثقات الاکیاس، یعنی وہ ثقہ اور دانشمند لوگوں میں سے ایک تھے۔ (۲)

اتباع سنت: سنت سے خاص شغف تھا، عجلی نے صاحب سنہ کہا ہے، (۳) اسی لیے اسد السنہ کہلاتے تھے۔

وفات: ۸۰ سال کی عمر میں اپنے وطن مصر میں ۲۱۲ھ میں انتقال کیا۔ (۴)

اولاد: حافظ ابن حجر نے سعید نام ایک فرزند کا ذکر کیا ہے، تابعین کے فضائل ومناقب میں ان کی ایک کتاب دو جلدوں میں تھی اس میں انھوں نے اپنے والد اور اس طبقہ کے دوسرے محدثین سے بکثرت روایات کی ہیں۔ (۵)

تصنیفات: اسد السنہ صاحب تصنیفات تھے، (۶) لیکن ان کی تصانیف میں صرف مسند اور کتاب الزہد کا ذکر ملتا ہے، بعض علمائے اسلام نے اس کو سب سے قدیم مسند بتایا ہے، یہ رائے درست ہو یا نہ ہو اتنا مسلم ہے کہ مصر میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی،

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰ (۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۷ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰ (۴) خلاصہ تہذیب تہذیب الکمال (۵) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۶۰ (۶) تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۳۶۸۔

علامہ ابن عدی کا بیان ہے کہ مصر میں سب سے پہلے اسد السنہ نے مسند مرتب کی جو یحییٰ بن عبدالحمید حمانی اور مسدد ابن مسرہد بصری سے قدیم العہد تھے،(۱) اس لیے یہ قدیم ترین مسانید میں ہے اور اس کی اہمیت کا سبب اس کی قدامت ہی ہے۔

ایک اعتراض کا جواب: اسد السنہ پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، مثلاً علامہ ابن حزم نے ان کو منکر الحدیث اور ضعیف قرار دیا ہے، ابن یونس نے لکھا ہے کہ وہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے لیکن ان اقوال کی حیثیت شواذ و نوادر کی ہے جو علمائے فن اور ائمہ جرح وتعدیل کی عام توثیق کے مقابلہ میں قابل اعتنا نہیں، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ مجھے ان کے کسی عیب کا حال معلوم نہیں سوائے اس کے کہ ابن حزم نے ان کو ضعیف بتایا ہے لیکن یہ تضعیف مردود اور نا قابل تسلیم ہے،(۲) وہ اور حافظ ابن حجر دونوں لکھتے ہیں۔ واحسب الآفة من غیرہ (۳) یعنی ان کی روایتوں میں جو ضعف وسقم نظر آتا ہے وہ بعد کے دوسرے رواۃ کی وجہ سے ہے۔

☆☆☆

---

(۱) الرسالۃ المستطرفہ ص۵۳،(۲) میزان الاعتدال ج۱ص۹۷،(۳) ایضاً وتہذیب التہذیب ج۱ص۲۶۰۔

امام عبیداللہ بن موسیٰ عبسی

(متوفی ۲۱۳ھ)

نام ونسب: عبیداللہ نام، ابومحمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبیداللہ بن موسیٰ بن ابی المختار باذام (۱)

ولادت وخاندان ووطن: ۱۲۸ھ میں کوفہ میں پیدا ہوئے، قبیلہ عبس کے مولیٰ تھے، (۲) اس لئے کوفی اور عبسی کہلاتے ہیں لیکن علامہ سمعانی کا بیان ہے:

العبسی ...... الی عبس بن بغیض بن ریث بن غطفان ...... عدنان وھی القبیلة المشھورہ التی ینسب الیھا العبسیون بالکوفة۔ (۳)	عبسی عبس بن بغیض ...... عدنان کی طرف نسبت ہے اور یہ وہ مشہور قبیلہ ہے جس کی طرف کوفہ کے عبسی منسوب ہیں۔

سید مرتضیٰ زبیدی فرماتے ہیں:

عبس محلة بالکوفة قد نزلھا بنو عبس ومنھا العبسیون المحدثون ومن الضوابط ان من کان من اھل الکوفة فھو	عبس کوفہ میں ایک محلّہ ہے جہاں بنوعبس آکر اترے تھے اور ان ہی میں سے عبسی محدثین ہیں اور یہ قاعدہ کلیہ میں سے ہے کہ جو راوی اہل کوفہ میں

(۱) تقریب التہذیب ص ۱۷۱ وتہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۰ (۲) خلاصہ تذہیب ص ۲۵۳ وتہذیب ج ۷ ص ۵۰ (۳) کتاب الانساب ورق ۳۸۲۔

بالموحدة منسوب الیٰ ھذہ المحلة۔ (۱)   سے ہوتا ہے، وہ بائے موحدہ کے ساتھ اسی محلّہ کی طرف منسوب ہے۔

ان بیانات سے عبیداللہ بن موسیٰ کا عرب نژاد ہونا اور قبیلہ عبس سے ولا کے بجائے نسبی تعلق ظاہر ہوتا ہے،

اساتذہ: ان کے شہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابن ادم محاربی، ابن جریج، اسرائیل بن یونس، اسماعیل بن ابی خالد، الاعمش، امام اوزاعی، ایمن بن نایل، حسن بن صالح، حنظلہ بن ابی سفیان، زکریا بن ابی زائدہ، سفیان ثوری، شیبان، عبدالعزیز بن سیاہ، عثمان بن اسود، محمد بن عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ، معروف بن خربوذ، موسیٰ بن عبیدہ ربذی، ہارون بن سلیمان فرا، ہشام بن عروہ، یونس بن ابی اسحاق وغیرہ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ اور منتسبین کی تعداد بے شمار ہے چند نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار بغدادی، ابوبکر بن ابی شیبہ، ابوحاتم، ابوسعید اشج، احمد بن ابراہیم دورقی، احمد بن ابی سرح رازی، احمد بن حنبل، اسحٰق بن منصور، اسحاق بن راہویہ، حجاج بن شاعر، حسین علی بن اسود، دارمی، سفیان بن عیینہ، عباس بن عبدالعظیم منذری، عباس دوری عبداللہ بن صباح عطار، عبداللہ بن محمد مسندی، عثمان بن ابی شیبہ، قاسم بن زکریا، محمد بن حسین بن اشکاب، محمد بن سعد کاتب واقدی، محمد بن سلیمان باغندی کبیر، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن یحییٰ ذہلی، محمود بن غیلان، وکیع بن جراح، یحییٰ بن معین، یعقوب سفیان وغیرہ۔ (۳)

خالد بن حمید مہری عمر میں عبیداللہ بن موسیٰ سے بڑے تھے، اس کے باوجود انھوں نے ان سے احادیث روایت کی ہیں، ائمۂ صحاح نے بالواسطہ ان سے حدیثیں بیان کی ہیں، (۴)

(۱) تاج العروس ج۴ص۱۸۴ (۲) التہذیب ج۷ص۵۱ (۳) ایضاً ص۵۱ (۴) تہذیب التہذیب ج۵ص۵۱،۵۲۔

حفظ وثقاہت: علمائے فن نے ان کا ''الحافظ'' کہہ کر تعارف کرایا ہے، ابن معین، ابن عدی اور عجلی وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، ابن حبان وابن شاہین نے ثقات میں تذکرہ کیا ہے، ابو حاتم اور ابن سعد ثقہ، صدوق اور حسن الحدیث بتاتے ہیں، ابوداؤد نے ان کو جائز الحدیث اور ابن قانع نے صالح الحدیث کہا ہے، اسرائیل کے مرویات کے سب سے زیادہ معتبر راوی یہی سمجھے جاتے تھے۔ (۱)

حدیث میں درجہ: علم حدیث میں ان کا مقام نہایت بلند تھا، علمائے فن کوان کی اس خصوصیت کا اعتراف ہے، ان کے پاس احادیث کا نہایت وافر ذخیرہ تھا، علامہ ابن سعد نے انھیں کثیر الحدیث لکھا ہے۔

قرأت وتفسیر اور فقہ: وہ حدیث کے علاوہ فن قرأت، تفسیر اور فقہ میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے، حمزۃ، علی بن صالح اور عیسیٰ بن عمر سے علم قرأت کی تحصیل کی تھی اور لوگوں کو اس کی تعلیم بھی دیتے تھے، علوم قرآنی میں مہارت کی وجہ سے صاحب قرآن کہلاتے تھے۔ عجلی کا بیان ہے کہ ''عالما بالقرآن رأسا فيه (قرآنی علوم کے ماہر ممتاز عالم تھے) اور فقہ میں بھی یک گونہ امتیاز رکھتے تھے، صاحب مرأۃ الجنان کا بیان ہے:

كان اماما في الفقه والحديث والقرآن: یعنی عبید اللہ فقہ، حدیث اور قرآن سے متعلقہ علوم کے امام تھے۔

زہد وعبادت: علم وفضل کی طرح زہد وتقویٰ اور تدین میں بھی ممتاز تھے یافعی لکھتے ہیں، موصوفا بالعبادة والصلاح (۲) (یعنی وہ عبادت وصلاح سے متصف تھے) علامہ ذہبی کا بیان ہے، كان ذا زهد وعبادة واتقان (۳) (یعنی وہ زاہد، عبادت گذار اور صاحب دیانت تھے)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۵۱، ۵۲ وطبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۷۹ ومیزان الاعتدال ج ۲ ص ۱۷۰

(۲) مرأۃ الجنان ج ۲ ص ۵۷ وتہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۳، ۵۲ (۳) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۷۰۔

وقار: مورخین نے لکھا ہے کہ وہ شرم وحیا کی وجہ سے ہمیشہ نگاہیں نیچی رکھے اور سر جھکائے رہتے تھے، ان کو کبھی ہنسی مذاق کی بات کرتے نہیں دیکھا گیا، نہایت باوقار طریقہ پر رہتے تھے۔(۱)

عقیدہ ومسلک: بعض لوگوں نے ان کو شیعہ لکھا ہے مگر شیعیت اس زمانہ میں تفضیلیت سمجھی جاتی تھی۔

وفات: مامون کے عہد خلافت میں شوال کے آخر یا شروع ذیقعدہ ۲۱۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔(۲)

تصنیفات: عبیداللہ کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے، اس کی اہمیت کا سبب بھی قدامت ہے، بعض علمائے اسلام نے سب سے قدیم مسند اسی کو قرار دیا ہے لیکن عام لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند لکھی گئی (۳) علمائے محدثین نے اس کی قدامت کی وجہ سے اس کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

ایک شبہہ کا جواب: بعض ائمہ جرح وتعدیل نے شیعیت کی وجہ سے ان کی تضعیف کی ہے، امام احمد اور بعض دوسرے علماء نے ان کو صاحب تخلیط اور منکر الحدیث قرار دیا ہے، عثمان بن ابی شیبہ ان کی ثقاہت وصداقت کے معترف ہونے کے باوجود کہتے ہیں کہ وہ سفیان ثوری کی حدیثوں میں قبیح قسم کا اضطراب کرتے تھے لیکن مجموعی طور پر ان کی توثیق کی گئی ہے، علامہ ذہبی کہتے ہیں کہ ''وہ امام بخاری کے شیوخ میں ہیں اور بذات خود نہایت ثقہ بزرگ تھے، البتہ شیعیت سے متہم کئے جاتے تھے'' ائمہ صحاح کا ان سے روایت کرنا ان کے ضبط وثقاہت کا بڑا ثبوت ہے۔

---

(۱) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۷۰ وتہذیب التہذیب ج ۷ ص ۵۲ وطبقات ابن سعد ج ۶ ص ۲۷۹ (۲) ایضاً (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۳۔

امام عبداللہ بن زبیر حمیدی

(متوفی ۲۱۹ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن زبیر بن عیسیٰ ابن عبیداللہ۔

خاندان ووطن: ان کا خاندان عربی النسل اور وطن مکہ معظمہ تھا، وہ حمیدی، اسدی، زبیری، قریشی، اور مکی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، سب سے مشہور نسبت قریش کے مشہور قبیلہ اسد کے ایک معزز فرد حمید کی جانب ہے۔(۱) سن ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔

اساتذہ: حمیدی کے بعض مشہور شیوخ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، بشر بن بکر تینسی، سفیان بن عیینہ، عبدالعزیز بن حازم، فضیل ابن عیاض، محمد بن ادریس شافعی، مروان بن معاویہ، مسلم بن خالد وکیع اور ولید بن مسلم وغیرہ۔ ان بزرگوں میں سفیان بن عیینہ اور امام شافعیؒ سے ان کو بڑا خاص تعلق تھا، ۱۹، ۲۰ سال تک سفیان کی خدمت میں رہنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا، ان کی دس ہزار حدیثیں حمیدی کو زبانی یاد تھیں، ان کے مرویات کے سب سے زیادہ معتبر اور قابل وثوق راوی سمجھے جاتے تھے، امام شافعیؒ کی صحبت میں بھی ایک عرصہ تک رہے، ان کے ہمراہ مصر تشریف لے گئے اور فقہ کی تکمیل وتخریج کی۔

تلامذہ: حمیدی کے اکثر تلامذہ فن حدیث کے ممتاز ماہرین تھے، بعض کے نام یہ ہیں:

احمد بن ازہر نیشاپوری، اسماعیل بن عبداللہ سمویہ، بشر بن موسیٰ، سلمہ بن شبیب،

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۲۔

ابوزرعہ عبیداللہ بن عبدالکریم رازی، عبیداللہ بن فضالہ نسائی، محمد بن احمد قرشی، ابوبکر محمد بن ادریس، ابوحاتم محمد بن ادریس، محمد بن اسماعیل بخاری، محمد بن سنجر، محمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم برقی، محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوالعباس محمد بن یونس کدیمی، محمد بن یونس نسائی، ہارون حمال، یعقوب بن شیبہ، یعقوب بن سفیان اور یوسف بن موسیٰ قطان، امام بخاری ان کے خاص فیض یافتہ لوگوں میں تھے، اپنی صحیح میں ۷۵ حدیثیں ان کے واسطہ سے روایت کی ہیں۔ (۱)

فضل وکمال: ان کے علم وفضل اور امامت پر محدثین اور ارباب فن کا اتفاق ہے، امام احمد اور امام بخاری نے ان کو امام کہا ہے، اسحاق بن راہویہ کا بیان ہے کہ "ابوعبیدہ، شافعی اور حمیدی ہمارے زمانہ میں امام ہیں، صاحب شذرات لکھتے ہیں کہ وہ مکہ کے مشہور عالم ومحدث اور امام حجت تھے، ذہبی فرماتے ہیں کہ "حمیدی مشہور اور کبار ائمہ دین میں تھے، ان کا خود بیان ہے کہ عراق میں احمد، خراسان میں اسحاق اور حجاز میں مجھ سے سبقت لے جانے والا کوئی دوسرا نہیں۔

ضبط وثقاہت: ان کی قوتِ حافظہ اور ثقاہت بہت مسلم ہے، امام شافعی کو ان کے غیر معمولی حافظہ کا اعتراف تھا، مورخین نے ان کو کثیر الحدیث لکھا ہے یعنی ان کے علم وحفظ میں احادیث کا وافر ذخیرہ اور وسیع سرمایہ محفوظ تھا، ابن سعد، حبان، حاکم اور ابوحاتم وغیرہ نے ان کی توثیق کی ہے، (۲) امام بخاری کو ان پر اتنا اعتماد تھا کہ ان کی روایت ملنے کے بعد وہ دوسروں کی مرویات کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔

فقہ واجتہاد: فقہ وافتا میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا، امام شافعی سے اس کی تحصیل کی تھی اور امام بخاری حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کے شاگرد تھے اور ان سے اس کی تحصیل کی تھی، مکہ کے فقیہ ومفتی کی حیثیت سے حمیدی کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، مصر سے واپسی کے

(۱) فتح الباری ص۱۱ (۲) طبقات الشافعیہ ج۱ص ۲۶۳، ۲۶۴ وتہذیب التہذیب ج۵ص ۲۱۶ تذکرۃ الحفاظ ج۲ص ۲، ۳۔

بعد وہ یہاں فقہ وافتا کا کام عمر بھر انجام دیتے رہے، صاحب مستدرک لکھتے ہیں وہ مکہ کے مشہور عالم ومحدث اور مفتی تھے، حدیث وفقہ میں ان کا وہی درجہ اور مرتبہ تھا جو امام احمد کا عراق میں تھا۔

زہد وورع: ورع وتقویٰ اور دیانت وپاکبازی میں بھی ممتاز تھے، ابن عدی نے ان کی نیکی اور پاکبازی کا ذکر کیا ہے، ابن حبان نے ان کو صاحب دین وفضیلت لکھا ہے۔

اتباع سنت: اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا، ابن حبان نے ان کو صاحب سنت بتایا ہے۔ (۱) احادیث وآثار سے شدت تمسک کی بناء پر وہ اہل رائے کو ناپسند کرتے تھے، اس کا اندازہ ان کے رسالہ اصول السنہ سے ہوتا ہے۔

عقیدہ ومسلک: عقیدہ وعمل کے لحاظ سے وہ محدثین اور سلف کے مسلک پر عامل تھے، رسالۂ اصول السنہ سے ان کے بعض عقائد واعمال کے متعلق ان کا نقطۂ نظر معلوم ہوتا ہے۔

ایمان: قول وعمل دونوں کا نام ہے، اس میں کمی وبیشی ہوتی ہے، سفیان بن عیینہ کے سامنے ان کے بھائی ابراہیم نے کہا کہ "ایمان کم نہیں ہوتا" تو وہ غضبناک ہو گئے اور فرمایا کہ تم بچے ہو، ان مسائل کے بارے میں لب کشائی نہ کرو، ایمان کم بھی ہوتا ہے اور سلب بھی ہو جاتا ہے" ایمان وعمل کا اعتبار نیت پر موقوف ہے۔

تقدیر: تقدیر کے خیر وشر ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ جو کچھ ہوا ہے اس کا ہونا ضروری تھا اور نہ ہونا ناممکن تھا اور جو کچھ نہیں ہوا ہے اس کا نہ ہونا ممکن نہیں تھا۔

قرآن اللہ کا کلام ہے جو لوگ اس کو مخلوق کہتے وہ مبتدع اور سلف صالحین کے مسلک سے منحرف ہیں۔

رؤیت: موت کے بعد مومنین دیدار الٰہی سے مشرف ہوں گے۔

صفاتِ الٰہی: قرآن کی وہ آیتیں جن میں اللہ کے یدویمین اور استوا وتمکن وغیرہ کا ذکر ہے،

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۱۶ وحسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۴۶۔

یا اس قسم کی جو حدیثیں ہیں ان کے مجرد بیان پر اکتفا اور توقف کرنا چاہیے، نہ ان میں کسی اضافہ کا ہم کو حق ہے اور نہ تشریح و تفسیر کا، اس قسم کی آیات واحادیث میں بحث وکلام کرنے والے اہل باطل اور فرقہ جہمیہ ومعطلہ میں شامل ہیں۔

مرتکبین کبائر: کبائر کے مرتکبین کو کافر سمجھنا خوارج کا عقیدہ ہے، گناہ کرنے سے انسان کافر نہیں ہوتا۔

احترام صحابہؓ: مسلمانوں کو صحابۂ کرام کے لیے دعا واستغفار کرنا چاہیے، قرآن مجید میں ہے:

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ	اے رب بخش دے ہم کو اور ہمارے
سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ	بھائیوں کو جو ہم سے پہلے داخل ہوئے
فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	ایمان میں اور نہ رکھ ہمارے دلوں میں
(الحشر: ع ۱)	بیر ایمان والوں کا۔

اگر کوئی شخص ایک صحابی کو بھی برا بھلا کہے تو وہ جادۂ سنت سے منحرف ہے۔(۱)

وفات: اپنے وطن مکہ میں ربیع الاول ۲۱۹ھ میں وفات پائی، ۲۲۰ھ بھی سنہ وفات بتایا جاتا ہے۔

تصنیفات: رسالہ اصول السنہ کے علاوہ حمیدی کی دوسری کتابوں کے نام یہ ہیں:

۱- کتاب الرد علی النعمان ۲- کتاب التفسیر۔(۲)

۳- مسند: حمیدی کی یہ سب سے زیادہ مشہور کتاب ہے جو گیارہ اجزا اور ۱۲۹۳ حدیثوں پر مشتمل ہے۔(۳) اس کے رواۃ میں بشر بن موسیٰ اسدی بڑے ثقہ اور نامور محدث تھے، بعض صحابہؓ کے مرویات اس میں شامل نہیں ہو سکے، اس کی اہم خصوصیات

---

(۱) اصول السنہ بر خاتمہ مسند حمیدی مرتبہ مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی ج ۲ ص ۵۴۶ تا ۵۴۸ (۲) مقدمہ مسند ج ۱ ص بحوالہ جرح وتعدیل ج اول ق ۱ ص ۴۰ (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۵۷۔

حسب ذیل ہیں۔

۱- اس کا شمار قدیم ترین کتب مسانید میں شامل ہوتا ہے اور اغلب یہ ہے کہ مکہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی تھی۔

۲- اکثر روایات مرفوع ہیں، موقوف روایتیں کم ہیں۔

۳- صحابہ وتابعین کے آثار کا حصہ بھی اس میں شامل ہے۔

۴- احادیث کے نقل وروایت ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا ہے بلکہ ایک ماہر فن کی طرح ان کے متعلق مختلف النوع معلومات بھی درج ہیں۔

مسند کے مخطوطے دار العلوم دیوبند، حیدرآباد کے مکتبہ سعیدیہ و جامعہ عثمانیہ اور دمشق کے دار الکتب الظاہریہ میں موجود تھے، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے ان نسخوں کی مدد سے مسند کو پہلی مرتبہ ۱۹۶۳ء میں تصحیح وتحشیہ کے بعد دو جلدوں میں شائع کیا ہے، خاتمہ پر رسالہ اصول السنہ بھی دیدیا ہے، حواشی میں مشکل الفاظ کی تشریح، اختلاف نسخ اور مختلف کتب حدیث سے اس کی حدیثوں کے باہمی اختلاف ومطابقت وغیرہ کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے مطالب عالیہ میں مسند کے زوائد بیان کئے ہیں۔(۱)

☆☆☆

(۱) مق: . مسند حمیدی ص ۲، ۳، ۴، ۹، ۲۰، ۲۱۔

امام سعید بن منصور

(متوفی ۲۲۷ھ)

نام ونسب: سعید نام اور ابوعثمان کنیت تھی، سلسلہ نسب یہ ہے: سعید بن منصور ابن شعبہ۔

وطن: سعید کا سنہ ولادت نہیں معلوم ہوسکا اور وطن کے متعلق بھی اختلاف ہے، ایک روایت کے مطابق وہ جوز جان میں پیدا ہوئے اور بلخ میں نشو ونما پائی، زیادہ مشہور روایت یہ ہے کہ ان کا وطن مرو تھا اور بلخ میں بود و باش اختیار کر لی تھی، طالقان کو بھی ان کا مولد بتایا جاتا ہے، اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ مرو، طالقان اور جوز جان سب بلخ ہی کے قرب ونواح میں تھوڑے سے فاصلہ پر واقع تھے، بلخ جو بعد میں ان کی مستقل قیام گاہ بن گیا تھا خراسان کا مشہور و مردم خیز شہر اور ایک عرصہ تک اس کا پایہ تخت رہا ہے، ان مقامات کی نسبت سے وہ مروزی، طالقانی، بلخی اور خراسانی مشہور ہیں۔(۱)

اساتذہ: سعد بن منصور نے نہایت مقدس علمائے اسلام اور برگزیدہ محدثین سے کسب فیض کیا تھا، مشہور محدث اسماعیل بن علیہ کے مرویات کے سب سے بڑے ناقل ہونے کی وجہ سے ان کے راویہ کہلاتے تھے، امام مالک سے انھوں نے موطا کے علاوہ بہت سی حدیثوں کا سماع کیا تھا، لیث بن سعد اور سفیان بن عیینہ سے بھی ان کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے، دوسرے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵، تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹ خلاصہ تذھیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ کتاب الانساب ورق ۸۹، بستان المحدثین ص ۴۸۔

ابوقدامہ حارث بن عبیدہ، حماد بن زید، داؤد بن عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، ابولاحوص سلام بن سلیم، شریک بن عبداللہ، ابوشہاب عبدربہ بن قانع، عبدالعزیز بن ابی حازم، مسلمہ بن دینار، عبیداللہ بن ایاد، فلیح بن سلیمان، مہدی بن میمون، ابومعشر نجیح بن عبدالرحمٰن، ہشیم بن بشیر اور ابوعوانہ وضاح بن عبداللہ بزار وغیرہ۔

تلامذہ: اساتذہ کی طرح ان کے تلامذہ میں بھی نامور علما و محدثین شامل ہیں، امام احمد، امام مسلم اور ابوداؤد اُن کے حلقہ فیض میں داخل تھے، صحاح کی دوسری کتابوں میں بھی سعید کے مرویات بالواسطہ شامل کیے گئے ہیں، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوثور ابراہیم بن خالد کلبی، ابوبکر اثرم، ابوشعیب حرانی احمد بن خلید حلبی، بشر بن موسیٰ، حرب بن اسماعیل کرمانی، حسن بن محمد زعفرانی، عباس بن عبداللہ سندی، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، ابوزرعہ عبدالرحمٰن بن عمرو دمشقی، ابوزرعہ عبیداللہ بن کریم رازی، عمر بن منصور نسائی، ابوحاتم محمد بن ادریس، محمد بن علی بن میمون رقی، ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن موسیٰ وغیرہ۔(۱)

رحلت وسفر: حدیث کی طلب وجستجو میں ان کے کثرت سفر کو مزی نے وکان حافظا جوالًا اور علامہ ابن حجر نے طاف البلاد کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔(۲)

عظمت: سعید بن منصور کی علمی عظمت کا اندازہ ان کے اساتذہ اور تلامذہ کے ناموں سے ظاہر ہے، امام احمدؒ ان کے بڑے قدرداں اور مداح تھے اور ہمیشہ عزت واحترام کے ساتھ ان کا ذکر کرتے تھے، محمد بن عبدالرحیم جب ان کی روایت بیان کرتے تو تعریف کرتے اور کہتے حدثنا سعید وکان ثبتا۔(۳)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹، خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ کتاب الانساب ورق ۸۹، بستان المحدثین ص ۴۸ (۲) خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ و تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹ (۳) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۸۹۔

حفظ وثقاہت: علمائے فن ان کے حفظ وثقاہت کے بھی معترف تھے، یحییٰ بن حسان دوسرے محدثین کے مقابلہ میں ان کی فضیلت اور حفظ وضبط کے بڑے قائل تھے، حرب کرمانی کا بیان ہے کہ "سعید نے ہم کو دس ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں، امام احمد ان کو سچا اور صاحب فضل وکمال بتاتے ہیں، ابوحاتم، ابن حبان، ابن نمیر، ابن خراش، ابن قانع اور مسلمہ بن قاسم وغیرہ نے ان کی توثیق وتعدیل کی ہے، خلیلی کہتے ہیں کہ ان کی ثقاہت پر اتفاق ہے، حافظ ذہبی نے ان کو الحافظ الثقة اور الحافظ الامام الحجة لکھا ہے، ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ ثقہ اور مشہور محدثین میں تھے۔ (۱)

وفات: آخر عمر میں انھوں نے مکہ معظمہ میں مستقل قیام کر لیا تھا اور یہیں تقریباً ۸۹ سال کی عمر میں مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۲۷ھ میں وفات پائی۔ (۲)

تصنیفات: سعید بن منصور صاحب تصانیف تھے (۳) مگر ان کی کتابیں معدوم ہیں، صرف ایک کتاب سنن کا ذکر ملتا ہے لیکن یہ بھی طبع نہیں ہوئی ہے، سنن کو انھوں نے آخر عمر میں مکہ معظمہ کے زمانہ قیام میں مرتب کیا تھا (۴) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بڑی چھان بین محنت واحتیاط اور حذف وترمیم کے بعد مرتب کی گئی تھی، اس لئے نہایت مستند اور معتبر ہوگی، احمد بن مخدہ اور محمد بن علی بن صائغ نے اس کی روایت کی ہے، اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اکثر روایتیں ثلاثی ہیں (۵) اور اہمیت کا حال یہ ہے کہ (جمع فیہ ما تجمع غیرہ) سنن ابی سعید میں جو کچھ اکٹھا کیا گیا، دوسرے مجموعہ احادیث ان سے خالی ہیں، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں:

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۵، تہذیب التہذیب ج ۴ص ۸۹، ۹۰ و میزان الاعتدال ج ۱ص ۳۹۱ وشذرات الذہب ج ۲ص ۶۲ (۲) طبقات ابن سعد قسم اول جز ۵ص ۳۶۷، العبر فی خبر من غبر ج ۱ص ۳۹۹ (۳) تہذیب التہذیب ج ۴ص ۹۰ (۴) الرسالۃ المستطرفہ ص ۳۱ (۵) تہذیب التہذیب ج ۴ص ۸۹، بستان المحدثین ص ۴۷۔

صاحب السنن المشهورة التي لايشاركه فيهاالا القليل (۱)

وہ اس مشہور سنن کے مصنف ہیں جو بے نظیر اور عدیم المثال ہے۔

نقد و جرح: سعید بن منصور کے متعلق علامہ ذہبی نے یعقوب فسوی سے روایت کی ہے کہ ''وہ اپنی غلطی جان لینے کے بعد بھی اس سے رجوع نہیں کرتے تھے لیکن ان کی عام مدح و توصیف کے متعلق اتنے کثرت سے اقوال منقول ہیں کہ ان کے مقابلہ میں اگر فسوی کا قول صحیح بھی مان لیا جائے تو اس کی کوئی حیثیت نہیں اور اس سے سعید کے مرتبہ و عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''ایسا وہ اس لیے کرتے تھے کہ ان کو اپنی کتاب کی صداقت و صحت پر پورا اعتماد اور وثوق تھا۔'' (۲)

☆☆☆

(۱) خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۴۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۹۹ (۲) میزان الاعتدال ج ۱ ص ۳۹۱ و تقریب التہذیب ص ۹۴۔

امام محمد بن صباح دُولابی

(متوفی ۲۲۷ھ)

نام ونسب: نام محمد، ابوجعفر کنیت، بزاز لقب اور والد کا نام صباح ہے، اس سے زیادہ نسب نامہ کی تفصیل نہیں معلوم ہوسکی۔

ولادت: مورخین اور علمائے طبقات ورجال نے ان کے سنہ ولادت کی تصریح نہیں کی ہے لیکن ان کی وفات ۲۲۷ھ میں ہوئی اور خطیب نے لکھا ہے کہ اس وقت ستر ۷۰ سال سے زیادہ عمر تھی، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وفات کے وقت ۷۷ سال کے تھے، (۱) اس اعتبار سے وہ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان: ان کے خاندان کا قبیلہ مزنیہ سے ولاء کا تعلق تھا، (۲) اسی بنا پر مزنی کی نسبت سے مشہور ہوئے۔

وطن: ان کی نسبت دولابی کے متعلق اختلاف ہے، بعض لوگوں کے نزدیک دولاب رے کے ایک گاؤں کا نام ہے جہاں وہ پیدا ہوئے تھے (۳) علامہ سمعانی کا خیال ہے کہ دولاب رہٹ اور چرخی کو کہتے ہیں جو شخص اس کا پیشہ کرتا ہو یا جس کے پاس چرخی ہو اسے دولابی کہا جاتا ہے، ابوجعفر محمد بن صباح کو بھی اسی بنا پر دولابی کہا جاتا ہے، (۴) یاقوت حموی کے نزدیک دولاب نام کے متعدد مقامات تھے، ابوجعفر دولابی کا تعلق دولاب مبارک سے تھا جو بغداد کے مشرقی جانب واقع ہے، (۵) آخر میں انھوں نے بغداد میں سکونت اختیار

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۷ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۷۴ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۳۱

(۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵ وتہذیب ج ۹ ص ۲۲۹ (۳) میزان ج ۳ ص ۷۴ وتہذیب ج ۹ ص ۲۳۰

(۴) کتاب الانساب ورق ۲۳۴ (۵) معجم البلدان ج ۴ ص ۱۰۳۔

کر لی تھی۔(۱)

اساتذہ: ابو جعفر دولابی نے نہایت برگزیدہ اور جلیل القدر محدثین سے احادیث کی روایت کی ہے، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابن ابی عبیدہ حداد، اسماعیل بن جعفر، اسماعیل بن زکریا خلقانی، اسماعیل بن علیہ، حفص بن غیاث، خالد بن عبداللہ واسطی، سعید بن محمد وراق، سفیان بن عیینہ، قاضی شریک بن عبداللہ، عبدالرحمٰن بن ابی الزناد، عبداللہ بن مبارک، عمر بن یونس یمامی، ابوقطن عمرو بن ہشیمؒ، فضل بن موسیٰ سینانی، ہشیم بن بشیر، ولید بن ابی ثور، ولید بن مسلم، یزید بن ہارون، یوسف بن یعقوب، ماجشون وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں بھی ممتاز محدثین شامل ہیں، چند کے نام یہ ہیں:

ابراہیم حربی، ابراہیم بن ہانی، ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، ابن ابی خثیمہ، ابن ابی الدنیا، ابوحاتم رازی، ابوزرعہ دمشقی، ابوزرعہ رازی، ابوقدامہ سرخسی، احمد بن حنبل، ابویعلی احمد بن علی موصلی، احمد بن محمد بن صباح، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یحییٰ حلوانی، اسماعیل سمویہ، حسن بن علی خلال، حسن بن محمد صباح زعفرانی، داؤد بن سلیمان دقاق، عبداللہ بن حنبل عبدالملک بن عبدالحمید میمونی، عثمان بن سعید دارمی، عیسیٰ بن عبداللہ طیالسی، فضل بن سہل اعرج، ابوالعلا محمد بن احمد جعفر، محمد بن بشیر بن مطر، محمد بن غالب تمتام، محمد بن یحییٰ حرانی، محمد بن یحییٰ ذہلی، یحییٰ بن معین وغیرہ۔(۲)

ائمہ صحاح اور اصحاب سنن میں، امام بخاری، امام مسلم اور ابوداؤد نے راہ راست اور دوسرے ائمہ نے امام بخاری کے واسطے سے ان سے روایت کی ہے، صحیح بخاری میں ۱۲ اور صحیح مسلم میں ۲۰ حدیثیں ان کے واسطہ سے مروی ہیں۔(۳)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵، ص ۳۶۶ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۲۹ وص ۲۳۰ (۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۵، ۳۶۶ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۲۹، ۲۳۰ (۳) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۲۳۰، ۲۳۱۔

حفظ وثقاہت: علمائے فن نے باتفاق ان کو ثقہ وضابط قرار دیا ہے، امام احمد فرماتے تھے کہ وہ ہمارے شیخ اور نہایت ثقہ بزرگ ہیں، ابن معین کا بیان ہے کہ دولابی ثقہ و مامون تھے، احمد عجلی نے ان کو ثقہ، ابوحاتم نے ثقہ، قابل حجت اور مستند کہا ہے اور ابن حبان نے ثقات میں شامل کیا ہے، تمتام جب ان کے واسطہ سے حدیث بیان کرتے تو کہتے، ہم سے محمد بن صباح دولابی نے جو ثقہ و مامون تھے، روایت کی ہے، یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، صاحب حدیث اور ہشیم کے مرویات کے سب سے زیادہ ممتاز عالم تھے، سلمہ نے ان کو ثقہ اور مشہور محدث اور ذہبی نے ثقہ وحجت قرار دیا ہے۔ (۱)

زہد وتقویٰ: تدین وتقویٰ اور زہد وصلاح میں بھی نہایت ممتاز تھے، علامہ ابن عدی فرماتے ہیں کہ وہ بڑے صالح اور نیک بزرگ تھے۔ (۲)

عزت واحترام: علمی ودینی حیثیت سے ان کی شخصیت اتنی ممتاز تھی کہ علما وصلحا ہر طبقہ میں یکساں مقبول تھے، امام احمد ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ (۳)

وفات: تقریباً ۷۱ سال کی عمر میں بغداد میں محرم ۲۲۷ھ میں انتقال کیا۔ (۴)

اولاد: مورخین نے ان کے ایک صاحبزادے احمد کا ضمناً تذکرہ کیا ہے، جو بڑے صاحب کمال محدث تھے۔ (۵)

تصنیفات: ان کی تصنیفات میں ایک مجموعہ سنن کا مورخین اور علمائے طبقات ورجال نے ذکر کیا ہے (۶)، ذہبی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ سنن واحکام سے متعلقہ روایات کا یہ ایک (۷) مختصر مگر منتخب اور مستند مجموعہ تھا۔

---

(۱) ایضاً وتاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۶ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۷۴ (۲) تہذیب ج ۹ ص ۲۳۱ (۳) ایضاً ص ۲۳۰ (۴) تہذیب ص ۲۳۱ ومیزان ج ۳ ص ۷۴ وتاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۶، ۳۶۷ (۵) کتاب الانساب ورق ۲۳۴............وتاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۶۶ (۶) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۲۹۹ (۷) العبر ج ۱ ص ۳۹۹۔

امام یحییٰ بن عبدالحمید حمانی

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب: یحییٰ نام ابوزکریا کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: یحییٰ بن عبدالحمید بن عبدالرحمٰن ابن میمون بن عبدالحمید۔(۱)

حافظ ابن حجر نے عبدالرحمٰن اور آخری عبدالحمید کے بجائے عبداللہ اور عبدالرحمٰن لکھا ہے(۲) یحییٰ کے والد بھی اکابر محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، اور ان کے پردادا میمون کا لقب کشمین تھا۔(۳)

خاندان ووطن: قبیلہ حمان سے نسبی تعلق رکھتے تھے، یہ قبیلہ کوفہ میں آباد ہوگیا تھا جو یحییٰ کا وطن ہے اسی لئے وہ کوفی اور حمانی کی نسبتوں سے مشہور ہیں۔

پیدائش: ان کے سنہ ولادت کی تعیین وتصریح کتابوں میں نہیں ہے، قیاس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵۵ھ اور ۱۶۰ھ کے لگ بھگ پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ: اپنے والد ماجد عبدالحمید کے علاوہ انھوں نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا ان کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابواسرائیل ملائی، ابوبکر بن عیاش، ابوخالدالاحمر، ابوعوانہ، ابومعاویہ

---

(۱) تاریخ بغداد ج۱۴ص۱۶۷ (۲) تہذیب التھذیب ج۱۱ص۲۴۳ (۳) تاریخ بغداد ج۱۴ص۱۶۷ ومقدمہ فتح الباری ص۴۱۵۔

ضریر جریر بن عبدالحمید، جعفر بن سلیمان، حکیم بن ظہیر، حماد بن زید، خالد بن عبداللہ، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن بلال، شریک بن عبداللہ، عبدالرحمٰن بن زید، عبدالرحمٰن بن غسیل، عبداللہ بن مبارک، عبدالواحد بن زیاد، قیس بن ربیع، ہشام، وکیع اور یحییٰ بن یمان وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے حلقہ فیض سے جو اہم اور جلیل القدر محدثین وابستہ تھے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوحاتم، ابوقلابہ قاشی، ابویعلی موصلی، احمد بن یحییٰ حلوانی، حمران بن علی وراق، عبداللہ بن احمد دورقی، عبداللہ بن محمد بغوی، عثمان بن خرزاذ، علی بن عبدالعزیز بغوی، قسیم ابن عباد ترمذی، محمد بن ابراہیم بوشنجی، محمد بن ایوب، محمد بن حسین وداعی، محمد بن عبید بن ابی الاسد، موسیٰ بن اسحاق انصاری اور موسیٰ بن ہارون وغیرہ۔(۱)

سفر: طلب حدیث کے لئے ان کے سفر وسیاحت کا بھی ذکر ملتا ہے، خطیب نے بغداد جانے کی تصریح کی ہے۔

حدیث میں درجہ: وہ بلند پایہ اور نامور محدث تھے، ان کے اساتذہ میں سفیان بن عیینہ وغیرہ ان کے علم وفضل اور حدیث میں کمال کے معترف تھے، علامہ ذہبی اور خطیب نے احد ارکان الحدیث اور احد المحدثین کے الفاظ سے ان کا تعارف کرایا ہے۔(۲)

حافظہ: ان کی قوت حفظ غیر معمولی تھی، ائمہ فن نے الحافظ، الحافظ الکبیر وکان من اعیالی الحفاظ (۳) وغیرہ الفاظ سے انھیں موسوم کیا ہے، ابن معین کا بیان ہے کہ کوفہ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، شریک کے مرویات خاص طور پر انھیں حفظ تھے، ایک روایت کے مطابق ان کی سات ہزار حدیثوں کا ذخیرہ یحییٰ حمانی کے پاس تھا۔

ثقاہت: اکثر محدثین نے ان کی توثیق کی ہے، ابن عدی فرماتے ہیں لا بأس به یعنی ان

(۱) کتاب الانساب ص ۱۷۵ و تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۷، ۱۶۸ و تہذیب التہذیب ج ۱۱ ص ۲۴۳ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۶۸ والعبر ج ۱ ص ۴۰۴، (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۴۲۵۔

کی روایات میں کوئی مضائقہ نہیں، ابن معین نے ان کی ثقاہت کا اعتراف کیا ہے ایک دفعہ فرمایا کہ وہ صدوق تھے، محض حسد کی وجہ سے ان میں کلام کیا گیا ہے لیکن امام نسائی نے انھیں ضعیف اور امام احمد ابن مدینی، ذہلی اور علامہ ابن سعد وغیرہ ائمہ نے ان پر جرح بھی کی ہے(۱) لیکن ان کی اکثریت ان کو ثقہ اور حجت مانتی ہے، امام بخاری تک نے اپنی صحیح میں فضائل قرآن کے ابواب میں ان کے واسطہ سے ایک روایت نقل کی ہے۔(۲)

وفات: مشہور روایت کے مطابق ان کا انتقال رمضان ۲۲۸ھ میں ہوا(۳) لیکن ابن سعد کا بیان ہے کہ ۲۳۰ھ میں وفات پائی۔(۴)

تصنیفات: ان کی ایک تصنیف مسند کا پتہ چلتا ہے، جو بہت ضخیم تھی(۵) ابن عدی لکھتے ہیں:

ولـه مسـنـد صالح ولم ار شيئاً منكراً في مسنده (٦)	مسند حمانی نہایت عمدہ اور بہتر ہے مجھے اس کے اندر کوئی منکر حدیث نظر نہیں آئی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کوفہ میں سب سے پہلے یہی مسند مرتب کی گئی، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، عبید اللہ ابن موسیٰ بھی صاحب مسند ہیں، ان کے اور حمانی کے سنہ وفات میں کم از کم پندرہ سال کا تفاوت ہے، اس لئے غالب گمان یہی ہے کہ انھوں نے حمانی سے پہلے مسند مرتب کی ہوگی لیکن مسند حمانی کی قدامت بھی مسلم ہے۔

☆☆☆

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۱۱ص۲۴۴ ومیزان الاعتدال ج۳ص۲۹۶ (۲) مقدمہ فتح الباری ص۴۱۵ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۲ص۱۱ وخلاصہ تذہیب ص۴۲۵، تہذیب ج۱۱ص۲۴۸ (۴) طبقات ابن سعد ج۶ ص۲۸۷ (۵) کتاب الانساب ورق ۱۷۵ (۶) خلاصہ تذہیب ص۴۲۵ ومیزان الاعتدال ج۳ص۲۹۶۔

امام مسدد بن مسرہد

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب: ابوالحسن کنیت، مسدد لقب اور عبدالملک نام تھا، نسب نامہ یہ ہے، مسدد بن مسرہد ابن مسربل بن ماسک بن حرو بن یزید بن شعیب بن صلیب بن مالک بن اسد بن شریک۔

دوسرا نسب نامہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے: مسدد بن مسرہد بن مسربل بن مغربل بن مرعبل ابن مطربل بن ارندل بن سرندل بن عرندل بن ماسک بن مستورد۔ (۱)

علامہ سمعانی نے دونوں نسب نامے نقل کر کے پہلے کو صحیح بتایا ہے۔ (۲)

ولادت وخاندان: نسبی تعلق عرب کے مشہور قبیلہ بنو اسد سے اور وطن بصرہ ہے، اسی لئے اسدی اور بصری کہلاتے ہیں، (۳) سنہ ولادت کی مورخین اور علمائے طبقات نے کوئی تصریح نہیں کی ہے، اس لئے اس کی تعیین دشوار ہے، قیاس ہے کہ ۱۵۵ھ یا اس سے کچھ پہلے یا بعد میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

اساتذہ وشیوخ: ان کے بعض اکابر شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوالاحوص، ابوعوانہ اسمٰعیل بن علیہ، باذام بن عمرو، جراح بن ملیح جعفر بن سلیمان، بشر بن مفضل، جویریہ بن اسماء، حماد بن زید، حمید بن اسود، خالد بن حارث، خالد بن عبداللہ واسطی، عبداللہ بن یحییٰ بن ابی کثیر عبدالواحد بن زیاد، عبدالوارث بن سعید، عیسیٰ بن یونس، فضیل بن عیاض، قطان، محمد بن جابر یمیمی، معتمر بن سلیمان، مہدی بن میمون

(۱) شذرات الذہب ج ۲ ص ۶۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۲ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۷،

وکیع، ہشیم، یزید بن زریع اور یوسف بن ماجشون وغیرہ۔(۱)

تلامذہ: بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن یعقوب جوزجانی، ابوحاتم رازی، ابوخلیفہ جمحی، ابوزرعہ رازی، احمد بن محمد بن مدریہ، قاضی اسمٰعیل بن اسحٰق، حسن بن احمد کرہانی، حماد بن اسحٰق، محمد بن سعید وندانی، معاذ بن مثنی، یعقوب بن شیبہ، قاضی یوسف بن یعقوب وغیرہ۔

ائمہ صحاح میں امام بخاری نے بلاواسطہ اور امام ترمذی نے بالواسطہ اور امام ابوداؤد نے دونوں طریقوں پر ان سے روایت کی ہے۔(۲)

حدیث میں امتیاز: مسدد بن مسرہد کے اساتذہ وتلامذہ کی عظمت سے خود ان کے مقام ومرتبہ کا اندازہ ہوتا ہے، ان کا اپنے زمانہ کے اکابر فضلا، اور بصرہ کے نہایت مشہور اور جلیل القدر محدثین میں شمار ہوتا ہے۔(۳)

حافظہ: ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، محدثین میں وہ ''الحافظ'' کے لقب سے مشہور تھے، عجلی کا بیان ہے کہ ان کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ جب وہ املا کرانے لگتے تو اتنی زیادہ حدیثیں بیان کرتے کہ ہم لوگ لکھتے لکھتے گھبرا جاتے تھے،(۴) ذہبی نے الحافظ الحجۃ اور ابن عماد نے احد الحفاظ الثقات "لکھا ہے۔(۵)

ثقاہت: ان کی عدالت وثقاہت پر علمائے فن کا اتفاق ہے یحیٰی بن معین روایت کرتے ہیں کہ یحیٰی بن سعید قطان فرماتے تھے کہ ''اگر میں مسدد سے ملتا تو ضرور ان سے حدیثیں نقل وروایت کرتا، بلاشبہ وہ اس کے اہل تھے، ان کا پایہ نہایت بلند اور وہ بڑے ثقہ تھے، ابوحاتم فرماتے ہیں کہ ان کی وہ حدیثیں جو قطان عبداللہ بن عمر کے واسطے سے روایت کرتے ہیں، دنانیر کے مانند ہیں، گویا تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کو سن رہے ہو۔(۶)

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۷، (۲) ایضاً ص ۱۰۷، ۱۰۸، (۳) کتاب الانساب ورق ۳۲ (۴) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۸، (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۶۶ (۶) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

امام احمد جیسے بزرگ ان کی عظمت وثقاہت کے مداح ومعترف تھے، ان کے شاگرد رشید میمونی کا بیان ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ مسدد کی اللہ مغفرت کرے کیا ہی عمدہ اور بہتر شیخ تھے، ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ امام احمد نے مجھ سے کہا کہ مسدد سے جو حدیثیں میں بیان کرتا ہوں وہ صحیح اور درست ہیں، اس لئے تم کو ان سے تجاوز نہیں کرنا چاہئے، ابن معین، ابوحاتم ابن قلغ عجلی اور امام نسائی وغیرہ ائمہ جرح نے ان کی توثیق کی ہے اور ابن حبان نے ثقات میں تذکرہ کیا ہے، جعفر بن عثمان نے یحیٰی بن معین سے دریافت کیا کہ بصرہ کے کس شخص کی حدیثیں لکھی جائیں تو فرمایا مسدد سے، لاریب وہ ثقہ اور مستند تھے۔(۱)

وفات: رمضان المبارک ۲۲۸ھ میں جب کہ بوڑھے ہو چکے تھے انتقال کیا۔(۲)

تصانیف: ان کی تصنیفات میں صرف مسند کا ذکر ملتا ہے، علامہ ذہبی نے اس کے بعض حصوں کا سماع کیا تھا،(۳) یہ مقطوع وموقوف ہر قسم کی روایتوں کا مجموعہ تھا، امام دارقطنی نے سب سے پہلی مسند اسی کو قرار دیا ہے اور ابن عدی کا بیان ہے کہ بصرہ میں مسند لکھنے کا شرف سب سے پہلے مسدد ہی کو حاصل ہوا،(۴) اس مسند کی اہمیت اس کی قدامت کی وجہ سے ہے، تمام اصحاب تراجم وفہرست نے اس کا ذکر کیا ہے اس سے بھی اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

☆☆☆

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۹ وطبقات ابن سعد قسم دوم جز ہفتم ص۵۷، (۲) العبر ج۱ ص۴۰۴ وتذکرہ ج۲ ص۹ وشذرات الذہب ج۲ ص۶۶ (۳) العبر ج۱ ص۴۰۴ اور الرسالۃ المستطرفہ ص۵۳۔ (۴) تقریب التہذیب ص۲۴۴ وتہذیب التہذیب ج۱۰ ص۱۰۹۔

امام نعیم بن حماد خزاعی

(متوفی ۲۲۸ھ)

نام ونسب: نعیم نام ابوعبداللہ کنیت، اورنسب نامہ یہ ہے: نعیم بن حماد بن معاویہ بن حارث بن ہمام بن سلمہ بن مالک۔(۱)

خاندان ووطن: ان کا قبیلہ خزاعہ سے خاندانی اور خراسان کے مشہور شہر مرو سے وطنی تعلق تھا لیکن مصر میں مستقل بود و باش اختیار کر لی تھی اس لئے خزاعی، مروزی اور مصری کی نسبتوں سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

اساتذہ وشیوخ: انھوں نے جن نامور علمائے اسلام سے استفادہ کیا تھا، ان کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن سعد، ابراہیم بن طہمان، ابوبکر عیاش، ابوحمزہ عسکری، ابوداؤد طیالسی بقیہ بن ولید، جریر بن عبدالحمید، حفص بن غیاث، خارجہ بن مصعب، زبید بن سعد، سفیان بن عیینہ، عبداللہ بن مبارک، عبدالوہاب ثقفی، عیسیٰ بن عبید کندی، فضل بن موسیٰ سنیانی، فضیل بن عیاض، نوح ابن ابی مریم، معتمر بن سلیمان اور ہشیم وغیرہ، روح بن عبادہ سے ۵۰ ہزار حدیثوں کا سماع کیا تھا۔(۲)

تلامذہ: ان کے مشہور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن جوزجانی، ابوالاحوص عکبری، ابوبکر صنعانی، ابوحاتم رازی، ابواسماعیل ترمذی، احمد بن منصور رمادی، احمد بن یوسف سلمی، اسماعیل سمویہ، بکر بن سہل، میاطی، حمزہ بن محمد بن عیسیٰ بغدادی، علی بن داؤد قنطری، عصام بن رواد بن جراح، عبداللہ بن عبدالرحمٰن

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۰۰ و تہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۸ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۸۔

دارمی، محمد بن عوف طائی، محمد بن یحییٰ ذہلی اور یحییٰ بن معین وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین کے متعلق حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

امام بخاری نے صرف ایک دو موقع پر ان سے روایت کی ہے لیکن اکثر مواقع پر تعلیق کی ہے، امام مسلم نے مقدمہ میں ایک جگہ ان کی روایت لی ہے، بقیہ ائمہ سنن میں امام نسائی کے علاوہ سب نے ان سے بالواسطہ روایتیں کی ہیں۔(۱)

طلب حدیث کے لئے سفر: مورخین لکھتے ہیں کہ طلب الحدیث طلبا کثیرا بالعراق والحجاز یعنی عراق وحجاز میں نہایت دلچسپی اور انہماک سے حدیث کی تحصیل وتکمیل کی، عراق وحجاز میں ایک عرصہ تک قیام کرنے کے بعد مصر تشریف لائے اور ۴۰ سال کے لگ بھگ وہاں رہے۔(۲)

حفظ وثقاہت: حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان کے لئے مشہور وممتاز تھے، یحییٰ بن معین، امام احمد، عجلی، ابن عدی، اور ابو حاتم وغیرہ متعدد اکابر محدثین اور ائمہ جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، بعض ائمہ فن نے ان کے وہم وخطا کا بھی ذکر کیا ہے لیکن اس سے ان کی عدالت وثقاہت میں فرق نہیں آتا، ابن معین وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے۔(۳)

فقہ: حدیث کی طرح ان کو فقہ سے بھی بڑی مناسبت تھی اور علم فرائض کے ماہر تھے اسی لئے فرائضی بھی کہلاتے تھے، مورخین نے فقیه عارف بالفرائض اور من اعلم الناس بالفرائض کہہ کر اس کا اعتراف کیا ہے۔

علم وفضل: ان کے علم وفضل کے بھی تمام علماء معترف تھے، علامہ ذہبی وغیرہ نے ان کے متعلق احد علماء العصر (یکتائے روزگار) اور کان من اوعیة العلم (خزانہ) علم لکھا ہے۔(۴)

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۸ (۲) ایضاً ص ۴۶۲، تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۳۱۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۳۸ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۶۰ تا ۴۶۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱

(۴) تہذیب ج ۱۰ ص ۴۶۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱۔

دینی حمیت: نعیم بن حماد بڑے متبع سنت اور دیندار بزرگ تھے، حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ وہ ان لوگوں میں تھے جو سنتوں کے معاملہ میں نہایت متشدد و متصلب تھے اور اہل بدعت واہوا سے سخت متنفر اور بیزار رہتے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ پہلے وہ خود بھی جہمیہ فرقہ سے تعلق رکھتے تھے لیکن ابوعصمہ کے فیض صحبت سے جن کے یہ کاتب تھے اور جو جہمیت سے سخت متنفر تھے ان کو بھی جہمیہ اور اہل اہوا سے سخت تنفر ہو گیا تھا۔(۱)

قید و بند: امام نعیم کی دینی حمیت اور غیرت کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان سے خلق قرآن کا عقیدہ جبراً قبول کرنے کے لئے کہا گیا لیکن انھوں نے اصحاب دعوت و عزیمت کی طرح اس کو ماننے سے انکار کر دیا، اس کے نتیجہ میں ان کو قید و بند کی مشقت سے دوچار ہونا پڑا اور وہ مصر سے قید کر کے عراق لائے گئے اور بغداد یا سامرا میں قید خانہ میں انتقال کیا۔(۲)

وفات: ۱۳ جمادی الاولی ۲۲۸ھ کو انتقال کیا، ۲۲۷ھ کی بھی روایت کی گئی ہے۔(۳)

تصنیفات: وہ کئی کتابوں کے مصنف بھی تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں وله المصنفات في السنن وغيرها، (۴) ان کی تصنیفات میں دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں۔

۱- الفتن والملهم: یہ بڑی اہم، مشہور اور اپنے موضوع پر نہایت قدیم کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ برٹش میوزیم میں موجود ہے۔(۵)

۲- مسند: اس کو قدامت کی بنا پر بڑی اہمیت حاصل ہے، ایک عرصہ تک یہ اہل علم میں متداول رہ چکی ہے، بعض علما سب سے قدیم مسند اسی کو بتاتے ہیں، امام احمد فرماتے ہیں ہمارے علم کے مطابق کتب مسند میں سب سے پہلی تصنیف نعیم کی ہے، خطیب نے لکھا ہے کہ مسند کے سب سے پہلے جامع و مرتب یہی تھے۔(۶)

---

(۱) تہذیب ج ۱۰ ص ۴۶۳ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۰ و ۲۴۱ (۲) ایضاً و طبقات ابن سعد ق ۲ ج ۷ ص ۲۰۶ (۳) ایضاً (۴) البدایہ ج ۱۰ ص ۳۰۲ (۵) ضحی الاسلام ج ۲ ص ۱۲۶ (۶) تہذیب ج ۱۰ ص ۴۵۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۔

امام عبداللہ بن محمد جعفی

(متوفی ۲۲۶ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابوجعفر کنیت اور مسندی لقب تھا، سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن یمان بن اخنس بن حنیس۔ (۱)

خاندان ووطن: ماوراء النہر کا مشہور شہر بخارا جو امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری اور دوسرے اکابر محدثین کا مولد ومسکن ہے، ابوجعفر جعفی بھی اسی خاک کے نامور محدث تھے، جعفی بن سعد مذحجی کے مولیٰ تھے اسی نسبت سے جعفی کہلائے، (۲) مسندی اس لئے کہلاتے تھے کہ مرسل اور منقطع حدیثوں کے بجائے ان کو مسند اور متصل حدیثوں کی تلاش رہتی تھی۔ (۳)

اساتذہ: ابوجعفر مسندی کے بعض اساتذہ وشیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوداؤد، ابوعامر عقدی، اسحاق بن ازرق، حرمی بن عمارہ، خلیل بن احمد مزنی، سفیان بن عیینہ، عبدالرزاق، فضیل بن عیاض، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، یحییٰ بن آدم وغیرہ۔

تلامذہ: چند مشہور تلامذہ یہ ہیں:

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۵۳۱ وتہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۷ وحاشیۃ العبر ج ۱ ص ۴۰۵ بحوالہ انساب (۳) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۹-۱۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۵۷ وکتاب الانساب ورق ۵۳۱۔

ابو حاتم رازی، ابوزرعہ رازی، احمد بن سیار، حمدون بن عمارہ بزار، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، عبیداللہ بن واصل، محمد بن احمد بن ہارون مصیصی، محمد بن نصر مروزی محمد بن یحییٰ ذہلی وغیرہ۔

ان کی محدثانہ عظمت اس سے ظاہر ہے کہ امام بخاری اور ان کے واسطہ سے امام ترمذی نے ان سے روایتیں نقل کی ہیں، امام بخاری کی صحیح میں ان کے واسطہ سے ۴۴ حدیثیں درج ہیں۔(۱)

رحلت وسفر: مورخین اور علمائے طبقات نے احادیث کی طلب وجستجو کے لئے ان کے سفر وسیاحت کا بھی ذکر کیا ہے، حافظ ذہبی نے یمن جانے کی تصریح کی ہے۔

حفظ وثقاہت: محدثین اور علمائے فن نے ان کو ثقہ اور معتبر حافظ ومحدث قرار دیا ہے، ابن عماد نے الثبت، حافظ ذہبی نے الحاظ الحجة اور علامہ ابن حجر نے ثقہ وحافظ کہہ کر ان کا تعارف کرایا ہے(۲) احمد بن سیار فرماتے ہیں کہ وہ صاحب سنت اور ضبط واتقان اور صدق وعدالت کے لئے مشہور تھے، ابوحاتم نے صدوق اور ابن حبان نے ثقہ ومتقن کہا ہے اور علامہ خلیلی کا خیال ہے کہ ان کی ثقاہت واعتبار پر اتفاق ہے۔(۳)

اعتراف: اہل علم اور محدثین نے ان کے علم وفضل کا اعتراف کیا ہے، علامہ سمعانی نے عالم بخارئ اور دوسرے علماء نے امام حدیث لکھا ہے حاکم کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں بخارئ کے استاد اور ماوراء النہر کے امام تھے، حسن بن شجاع نے ایک بار امام بخاری کی ایک حدیث سے ناواقفیت دیکھ کر حیرت سے فرمایا کہ آپ خزانۂ حدیث یعنی ابوجعفر مسندی کے پاس جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود اس حدیث سے ناوقف ہیں۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۵۷وشذرات الذہب ج ۲ص ۶۷ (۲)شذرات الذہب ج ۲ص ۶۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۵۷وتقریب التہذیب ص ۱۳۱ (۳) تہذیب ج ۶ ص ۹-۱۰وتذکرہ ج ۲ص ۷۶ (۴) تذکرہ ج ۲ص ۷۶ کتاب الانساب ورق ۱۳۱۔

وفات: ان کی وفات ان کے وطن بخارا میں ذیقعدہ ۲۲۹ھ میں ہوئی۔(۱)

حلیہ: خوش قامت اور موزوں اندام تھے، بڑھاپے کی وجہ سے سر اور ڈاڑھی کے بال سفید ہو گئے تھے۔(۲)

تصنیفات: ان کی تصنیفات میں ایک مسند کا ذکر ملتا ہے ماوراء النہر میں سب سے پہلے ان ہی کو مسند کی جمع وتدوین کی سعادت حاصل ہوئی، حاکم کا بیان ہے کہ انھیں مسندی کہے جانے کا سبب یہ ہے کہ ماوراء النہر میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر سب سے پہلے انہی نے احادیث جمع کی تھیں،(۳) یہ مسند بھی اپنی صحت وقدامت کی وجہ سے مشہور اور اہم سمجھی جاتی ہے۔

☆☆☆

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ٦ وتہذیب التہذیب ج ٦ ص ۹ (۲) تہذیب التہذیب ج ٦ ص ۹ (۳) ایضاً ص ۱۰۔

امام ابوبکر بن ابی شیبہ

(متوفی ۲۳۵ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابوبکر کنیت، اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ محمد بن ابی شیبہ ابراہیم بن عثمان بن خواستی۔

ولادت، خاندان اور وطن: ابن ابی شیبہ ۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے ان کا وطن واسط ہے اور وہ قبیلہ بنو عبس کے مولیٰ تھے، ان کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے دادا ابوشیبہ جن کے نام کی نسبت سے وہ مشہور ہوئے، ایک صاحب علم بزرگ تھے اور ۲۳ سال تک منصور کے زمانہ میں واسط میں منصب قضا پر فائز رہے، ابوشیبہ کے فرزند محمد کو بھی علم وفن سے اشتغال تھا، وہ فارس کے قاضی تھے، ان کے تین صاحبزادے عبداللہ عثمان، اور قاسم اکابر محدثین میں شمار کیے جاتے ہیں، ابوبکر کا خاندان بعد میں کوفہ میں آباد ہو گیا تھا، اس لیے بعض لوگوں نے ان کو یہیں کا باشندہ بتایا ہے، کوفی، واسطی اور عبسی ان کی مشہور نسبتیں ہیں۔(۱)

اساتذہ اور شیوخ: ابوبکر نے جن نامور محدثین سے اکتساب فیض کیا تھا، ان میں سے بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

ابن ابی زائدہ، ابن شریح، ابوبکر بن عیاش، اسمٰعیل بن علیہ، اسمٰعیل بن عیاش،

(۱) تاریخ بغداد ج۶ص ۶۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۰، تہذیب ج۶ص ۲ وکتاب الانساب ورق ۳۸۲ وبستان المحدثین ص ۴۹۔

جریر بن عبدالحمید، حفص ابن غیاث، ابواسامہ حماد بن سلمہ، خلف بن خلیفہ، سفیان بن عیینہ، ابوالاحوص سلام بن سلیم، ابوخالد الاحمر سلیمان بن حیان، شریک بن عبداللہ نخعی، عباد بن عوام، عبدالاعلیٰ ابن عبدالاعلیٰ، عبداللہ بن ادریس، عبدالرحمٰن بن محمد محاربی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن نمیر، عمر بن عبید، ابونعیم فضل بن وکین، محمد بن بشر عبدی، محمد بن حازم، محمد بن فضیل، ابومعاویہ، مروان بن معاویہ، معتمر بن سلیمان، وکیع بن جراح، ہشیم بن بشیر، یحییٰ بن سعید قطان، یزید بن مقدام، یزید بن ہارون وغیرہ۔

تلامذہ: نامور فقہا و محدثین میں امام احمد بن حنبل، ابوزرعہ، ابوحاتم اور بقی بن مخلد کے علاوہ صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، مسلم اور ابن ماجہ کو براہ راست اور امام نسائی کو بالواسطہ روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، دوسرے مشہور علما میں ابراہیم بن اسحٰق حربی، ابوبکر احمد بن ابی عاصم النبیل، جعفر فریابی، حسن بن علی معمری، زکریا نساجی، عباس بن محمد دوری، عبداللہ بن احمد بن حنبل، عبداللہ بن احمد اہوازی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بغوی، عثمان بن خرزاذ، محمد بن ابراہیم مربع، محمد بن اسحاق صاغانی، محمد بن سعد، محمد بن عبدوس بن کامل، محمد بن عبیداللہ منادی، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، محمد بن محمد باغندی، موسیٰ بن اسحاق انصاری، ہشیم بن خلف دوری، یعقوب بن شیبہ اور یوسف بن یعقوب نیشاپوری وغیرہ۔

رحلت وسفر: ان کے بعض مشائخ کے علاوہ اکثر کا وطن کوفہ اور واسط ہے لیکن دوسرے مراکز حدیث کے محدثین سے بھی انھوں نے استفادہ کیا ہے، چنانچہ بغداد میں ان کے قیام اور درس وتدریس کی تصریح بہت سے مورخین نے کی ہے۔(۱)

اعتراف کمال: ابن ابی شیبہ کے معاصر علما اور نامور محدثین کو ان کے علم وفضل اور فن حدیث میں تبحر اور جامعیت کا اعتراف ہے، ابوعبید قاسم بن سلام فرماتے ہیں کہ علم حدیث چار آدمیوں پر تمام ہوگیا، ابوبکر بن ابی شیبہ، حسن ادا، خوش سلیقگی اور حفظ و مذاکرہ میں امام

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۶۶ و تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲، ۳۔

احمد، فقہ و معرفت حدیث میں یحییٰ بن معین جامعیت اور کثرت روایت میں اور علی بن مدینی حدیث کے مخارج و علل سے واقفیت میں یکتائے روزگار تھے، امام احمد کا ارشاد ہے کہ ابوبکر بن ابی شیبہ میرے نزدیک اپنے بھائی عثمان سے افضل و برتر ہیں، آپ کے صاحبزادہ عبداللہ نے عرض کیا کہ ابن معین عثمان کو فائق سمجھتے ہیں فرمایا لیکن میں ابوبکر ہی کو زیادہ پسند کرتا ہوں، (۱) علامہ ذہبی نے عدیم النظیر ، الامام، احد الاعلام، اور حافظ ابن کثیر نے احد الاعلام وائمۃ الاسلام وغیرہ القاب سے ان کا ذکر کیا ہے، (۲) شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ ''وہ حدیث کے امام تھے۔'' (۳)

حفظ وضبط: ان کے حفظ وضبط کا علما نے اعتراف کیا ہے، عمرو بن علی فلاس فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے بڑا حافظ حدیث نہیں دیکھا، صالح محمد جزرہ کا بیان ہے کہ ''مذاکرے کے وقت ابن ابی شیبہ سے بہتر یادداشت کسی کی نہیں تھی، حافظ ابوزرعہ کہتے ہیں کہ ''ان سے بڑا حافظ حدیث میں نے نہیں پایا، احمد بن حمید سے کوفہ کے سب سے بڑے حافظ حدیث کے بارے میں سوال کیا گیا، تو انھوں نے جواب دیا کہ ابوبکر بن ابی شیبہ، ابن حبان لکھتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں منقطع روایتوں کے سب سے بڑے حافظ یہی تھے۔

ثقاہت: امام احمد ان کو صدوق، عجلی، ابوحاتم، ابن خراش اور ابن قانع ثقہ و ثابت، اور خطیب و ابن حبان نے متقن کہا ہے، علامہ ابن ناصر الدین اور حافظ ذہبی نے ثقۃ التحریر لکھا ہے، ابن معین سے دریافت کیا گیا کہ کوفہ کے کس آدمی سے حدیث بیان کی جائے، فرمایا ابوشیبہ کے دونوں بیٹوں ابوبکر اور عثمان سے ایک مرتبہ ابن معین سے ان کے شریک سے سماع کا حال دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ ہمارے نزدیک سچے ہیں، اگر وہ شریک کے بجائے کسی اور متقدم سے بھی سماع کا دعویٰ کرتے تو ہم اس کو بھی مان لیتے، میں نے خود ان سے اس کے متعلق دریافت کیا تھا، کہ آپ نے شریک سے کب سماع کیا ہے؟ فرمایا کہ چودہ سال کی

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴، ۳، ۲۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰ (۳) بستان المحدثین ص ۴۹۔

عمر میں جب میرا حافظہ اِس وقت سے زیادہ اچھا اور بہتر تھا۔(۱)

وفات: ابن ابی شیبہ نے تقریباً چوہتّر سال کی عمر میں ۸ محرم الحرام ۲۳۵ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا۔(۲)

تصنیفات: تصنیفی حیثیت سے ابن ابی شیبہ باکمال مصنف تھے، ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ ''احسنھم وضعا للکتاب ابن ابی شیبۃ (۳) مصنفین اور تذکرہ نگاروں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی متعدد تصنیفات تھیں لیکن وہ سب معدوم اور نایاب ہیں، ابن ندیم نے ان کی حسب ذیل کتابوں کا ذکر کیا ہے:

۱-کتاب السنن فی الفقہ، ۲-کتاب التفسیر، ۳-کتاب التاریخ، ۴-کتاب الفتن، ۵-کتاب صفین، ۶-کتاب الجمل، ۷-کتاب الفتوح، ۸-کتاب المسند۔(۴)

لیکن عام مؤرخین ان کی چار کتابوں کا ذکر کرتے ہیں، مسند، تفسیر، کتاب الاحکام اور مصنف، آخری دونوں کتابوں کا ابن ندیم نے ذکر نہیں کیا ہے، اس طرح ابن ابی شیبہ کی معلوم کتابوں کی تعداد دس ہو جاتی ہے، مسند کے متعلق ملاچلپی نے لکھا ہے کہ ''وہ ایک بڑی اور ضخیم کتاب ہے۔

مصنف ابن ابی شیبہ: ابوبکر بن ابی شیبہ کی سب سے مشہور کتاب مصنف ہے، اس کی بدولت ان کو لازوال شہرت نصیب ہوئی، یہ حدیث کی اہم اور بلند پایہ کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور، اہم، جامع اور مبسوط یہی کتاب ہے، مصنف عبدالرزاق اس کے مقابلہ میں قدیم ضرور ہے لیکن یہ اُس سے زیادہ ضخیم اور جامع ہے۔(۵)

ترتیب: محدثین کے طریقہ کے مطابق اس کو سندوں کے ساتھ فقہی کتابوں کی طرح ابواب

---

(۱) بستان المحدثین ص ۴۹ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۸۱ والعبر ج ۱ ص ۴۲۱ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰ (۴) والفہرست ص ۳۸ (۵) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۰، ۴۵۱۔

وکتب پر مرتب کیا گیا ہے، اس کی ابتدا کتاب الطہارۃ سے ہوتی ہے، یہ کئی اجزا پر مشتمل ہے۔

اہمیت: حافظ ابن کثیر نے اس کے متعلق تحریر فرمایا کہ "ابوبکر بن ابی شیبہ لا جواب اور عدیم المثال مصنف کے مرتب ہیں، ان سے پہلے اور بعد کسی زمانہ میں ایسی کتاب نہیں لکھی گئی، شاہ ولی اللہ دہلوی نے حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں اس کا شمار کیا ہے، حافظ ابن حزم اندلسی نے اس کو مؤطا سے بھی بالاتر بتایا ہے۔(۱)

یہ رائے مبالغہ سے خالی نہیں لیکن اس سے مصنف کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

خصوصیات: اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اکثر مرویات صحاح ستہ کی کتابوں میں موجود ہیں، امام بخاری نے تیس اور امام مسلم نے ۱۵۴۰ روایات کی تخریج کی ہے سنن ابی داؤد میں بکثرت اور سنن ابن ماجہ میں غالباً سب سے زیادہ اسی سے حدیثیں لی گئی ہیں۔(۲)

۲- احکام ومسائل کا اس سے زیادہ جامع اور مستند کوئی مجموعہ نہیں ہے، (۳) اس میں وہی روایتیں شامل کی گئی ہیں جن سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

۳- نقل احادیث غیر جانبدارانہ ہے، اہل حجاز اور اہل عراق سب کے مرویات بلا ترجیح وتنقید ذکر کئے گئے ہیں۔

۴- اس میں مرفوع ومتصل روایات کے ساتھ مرسل، منقطع اور موقوف حدیثیں بھی ہیں اور صحابہ کے آثار، تابعین کے فتاوے اور فقہا وغیرہ کے آرا واقوال بھی بیان کئے گئے ہیں، اس سے ہر حدیث کے متعلق سلف کے تعامل اور ائمہ کے اتفاق واختلاف کا پتہ چل جاتا ہے۔

مصنف کا ایک باب ھذا ما خالف به ابو حنیفة الاثر الذی جاء عن

(۱) البدایہ والنہایہ، ج ۱۰ ص ۳۱۵ وحجۃ اللہ البالغہ ج ا ص ۱۰۵ وتذکرہ ج ۳ ص ۳۴۷ (۲) تہذیب ج ۶ ص ۴ وامام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۴۵ (۳) النکت الطریفہ ص ۳۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عنوان سے امام ابوحنیفہؒ کے رد میں بھی ہے، اس کے جواب میں زاہد الکوثری نے النکت الطریفة فی التحدث عن ردہ ابن ابی شیبة علیٰ ابی حنیفة کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جو قاہرہ کے مطبع انوار سے ۱۳۶۵ھ میں شائع ہوا ہے اور دو سو ستر صفحے پر مشتمل ہے لیکن علامہ کوثری نے اعتراف کیا ہے کہ اس رد کے باوجود مصنف ابن ابی شیبہ کا اہل عراق پر بڑا احسان ہے کیوں کہ ان کے فقہی دلائل کے لیے سب سے زیادہ جامع اور مستند ماخذ یہی ہے۔“

مصنف کے قلمی نسخے، جرمنی، مدینہ منورہ کے مکتبہ محمودیہ اور خدیویہ مصر وغیرہ میں موجود ہیں، (۱) ہندوستان میں مکتبہ سندیہ، کتب خانہ آصفیہ، کتب خانہ مولانا عبدالحیٔ لکھنوی اور بعض دیگر کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، (۲) اس کے بعض اجزا ملتان سے شائع ہوئے ہیں، چوتھا جزء ۲۰۴ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں کتاب الزکوٰۃ، کتاب الجنائز، کتاب الایمان والنذور والکفارات شامل ہیں۔

☆☆☆

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵، والرسالۃ المستطرفہ ص ۳۶، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۱ ص ۴۲۴

(۲) تذکرۃ النوادر ص ۳۶ بحوالہ مکتوبات شاہ احسان اللہ سندی، فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۶۲۲۔

امام اسحٰق بن راہویہ

(متوفی ۲۳۸ھ)

نام و نسب: اسحٰق نام، ابو یعقوب کنیت اور ابن راہویہ لقب تھا، شجرۂ نسب یہ ہے: اسحٰق بن ابراہیم بن مخلد بن ابراہیم بن مطر بن عبید اللہ بن غالب بن عبد الوارث بن عبید اللہ بن عطیہ بن مرہ بن کعب ابن ہمام بن اسد بن مرہ بن حنظلہ بن مالک بن زید بن منات بن تمیم۔

اسحٰق کے والد ابراہیم بطن مادر ہی میں تھے کہ ان کی والدہ نے مکۂ معظمہ کا سفر کیا، اسی سفر میں کسی مقام پر ان کی ولادت ہوئی، اس لئے اہل مرو انہیں راہوی یا راہویہ یعنی راستہ والا کہتے تھے، اسحٰق کا بیان ہے کہ میرے والد کو جب لوگ راہویہ کہتے تھے تو ان کو ناگوار ہوتا تھا لیکن مجھے ابن راہویہ کہا جاتا ہے تو کوئی ناگواری نہیں ہوتی۔ (۱)

ولادت: ابن راہویہ بروایت صحیح ۱۶۱ھ میں پیدا ہوئے، ۱۶۶ھ اور ۱۶۳ھ کی روایتیں بھی کی گئی ہیں۔ (۲)

خاندان و وطن: ان کا وطن خراسان کا مشہور شہر مرو تھا لیکن انھوں نے نیشاپور میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، (۳) اس لئے مروزی اور نیشاپوری کہلاتے تھے، تمیمی اور حنظلی کی نسبتوں سے ان کا عربی النسل ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۷، ۳۴۸، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۰۹، ۴۱۰، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۳، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳، تہذ یب ج ۱ ص ۲۱۶ (۲) ایضاً، (۳) الانتقاء لابن عبد البر ص ۱۰۸۔

اساتذہ: ان کے مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابواسامہ، ابوبکر، بن عیاش، ابومعاویہ، اسباط بن محمد، اسماعیل بن علیہ، بشر بن مفضل، بقیہ بن ولید، جریر بن عبدالحمید رازی، حاتم بن اسمٰعیل، حفص بن غیاث، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن نافع عبدی، سوید بن عبدالعزیز، شعیب بن اسحٰق، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، عبدالعزیز دراوردی، عبداللہ بن مبارک، عبداللہ بن وہب، عبدہ بن سلیمان، عبدالوہاب ثقفی، عتاب بن بشیر جزری، عمر بن ہارون عیسٰی بن یونس، غندر، فضیل بن عیاض، محمد بن بکر برسانی، محمد بن سلمہ حرانی، معاذ بن ہشام، معتمر بن سلیمان نضر بن شمیل، وکیع بن جراح، ولید بن مسلم اور یحیٰی بن قاضح وغیرہ۔

تلامذہ: ابن راہویہ کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں، ۱- ان کے بعض اساتذہ بقیہ بن ولید، محمد بن یحیٰی ذہلی اور یحیٰی بن آدم وغیرہ، ۲- اور معاصرین میں احمد بن حنبل، اسحاق بن منصور کوسج، محمد بن رافع اور یحیٰی بن معین، ۳- اور عزیزوں میں فرزند محمد نے بھی استفادہ کیا ہے اور صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ابن ماجہ کے علاوہ سب کو ان سے شرف تلمذ حاصل ہے، بعض اور ممتاز تلامذہ اور منتسبین کے نام حسب ذیل ہیں:

ابراہیم بن ابی طالب، احمد بن سلمہ، اسحاق بن ابراہیم نیشاپوری، جعفر فریابی، حسن بن سفیان، زکریا سجزی، ابوالعباس سراج، عبداللہ بن عبدالرحمٰن دارمی، عبداللہ بن محمد بن شیرویہ، محمد بن افلح، محمد بن نصر مروزی اور موسیٰ بن ہارون وغیرہ۔(۱)

طلب حدیث کے لیے سفر: علامہ ابن عساکر اور حافظ ابن حجر نے آپ کے کثرت سفر (فطاف البلاد طبع الحدیث)(حدیث کی طلب وتحصیل کے لیے مختلف شہروں میں پھرے) کہہ کر ذکر کیا ہے اور خطیب نے لکھا ہے کہ حجاز، عراق، یمن اور شام وغیرہ مراکز حدیث

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۵ تا ۳۴۷، ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ وطبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۲ و ۲۳۳، تہذیب ج ۱ ص ۲۱۷۔

کا سفر کیا اور بغداد کئی بار تشریف لائے، عراق کا سفر ۲۳ سال کی عمر میں ۱۸۴ھ میں کیا تھا۔(۱)

علم و فضل کا اعتراف: اسحاق بن راہویہ بلند پایہ علمائے اسلام میں تھے، معاصرین علما اور اساطین فن نے ان کے فضل و کمال اور علمی عظمت و بلند پائیگی کا اعتراف کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل جو ان کے بڑے مداح اور قدرداں تھے، فرماتے ہیں، خراسان و عراق میں ان کا کوئی ہمسر نہیں، بغداد کے اس پل کو ان سے زیادہ عظیم و برتر کسی آدمی نے عبور نہیں کیا، گو بعض مسائل میں ہمارا اور ان کا اختلاف ہے اور اہل علم کے درمیان تو اختلافات ہوا ہی کرتے ہیں'' ایک مرتبہ اسحاق کے صاحبزادے محمد ان کی خدمت میں حصول علم کے لئے حاضر ہوئے تو ارشاد ہوا کہ تمہارا اپنے والد سے وابستہ رہنا زیادہ مفید اور بہتر ہے ان سے زیادہ پر عظمت آدمی تمہاری آنکھوں نے نہ دیکھا ہوگا، امام احمد ان کی عظمت کے اس حد تک قائل تھے کہ اگر ان کے سامنے کوئی انھیں ابن راہویہ کہتا تو ناگواری کا اظہار کرتے اور فرماتے کہ اسحاق بن ابراہیم حنظلی کہا کرو۔

محمد اسلم کہتے ہیں کہ اگر امام ثوری زندہ ہوتے تو اسحاق کے علم و فضل سے بے نیاز نہیں رہتے، احمد بن سعید رباطی کا قول ہے کہ اور ابن عیینہ اور حماد بھی ان کے محتاج ہوتے، محمد بن یحییٰ صفار نے سنا تو کہا کہ اگر حسن بصری زندہ ہوتے تو اکثر چیزوں میں ان کو اسحاق کی جانب رجوع کرنا پڑتا، ابن خزیمہ کا بیان ہے کہ اگر وہ تابعین کے زمانہ میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے علم و فضل کے معترف ہوتے، نعیم بن حماد فرماتے ہیں کہ اگر کوئی خراسانی اسحاق بن راہویہ کے علم و کمال میں کلام یا نکتہ چینی کرے تو اسے متہم فی الدین سمجھو، سعید بن ذویب فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر اسحاق کے مانند میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا، ابو یحییٰ شعرانی کا بیان ہے کہ علمی مذاکرہ کے وقت وہ یکتا اور یگانہ معلوم ہوتے تھے۔

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۰۹ و تہذیب ج ۱ ص ۲۱۷ و تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۵ تا ۳۴۷ و طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۳۔

یحییٰ بن یحییٰ کا بیان ہے کہ خراسان میں علم کے دو خزانے تھے، ایک محمد بن سلام بیکندی کے پاس، دوسرا اسحاق بن راہویہ کے پاس ہے، حسین بن منصور بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں یحییٰ اور اسحاق کے ہمراہ ایک شخص کی عیادت کرنے گیا، جب ہم لوگ اس کے گھر کے پاس پہنچے تو اسحاق پیچھے ہو گئے اور یحییٰ سے کہا پہلے آپ داخل ہوں کیونکہ آپ ہم سے عمر میں بڑے ہیں، انھوں نے کہا بیشک میں عمر میں بڑا ہوں لیکن علم و فضل میں آپ فائق ہیں اس لئے پہلے آپ ہی چلیں، حافظ ابن عبد البر لکھتے ہیں ''وہ جلیل القدر علمائے اسلام اور نامور محدثین و حفاظ عالم میں تھے۔(۱)

شرف امامت: اسحاق بن راہویہ کا شمار ان ائمہ میں ہوتا ہے جو صاحب مذہب، فقیہ و مجتہد تھے مگر اب ان کا فقہی اور اجتہادی مذہب مٹ چکا ہے لیکن ایک زمانہ میں یہ بھی مسلمانوں کا معمول بہ مسلک رہا ہے، امام احمد اور امام نسائی ان کے متعلق فرماتے ہیں، امام من ائمة المسلمین یعنی مسلمانوں کے ایک امام یہ بھی ہیں، ایک مرتبہ امام احمد سے ان کے بارہ میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ وہ مسلمانوں کے امام ہیں، ہمارے نزدیک شافعی ،حمیدی اور اسحاق تینوں امام ہیں، محمد بن یحییٰ ذہلی کا بیان ہے کہ ایک دن بغداد کے مقام رصافہ میں ائمہ محدثین امام احمد اور یحییٰ بن معین وغیرہ جمع تھے لیکن مجلس صدارت پر اسحاق بن راہویہ رونق افروز تھے اور وہی اس مجلس کے خطیب بھی تھے، محمد بن نصر فرماتے ہیں وہ ہمارے اور ہمارے مشائخ کے شیخ و بزرگ تھے، فضل شعرانی کہتے ہیں وہ بلاشک وشبہ خراسان کے امام تھے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں احد الاعلام وعلماء الاسلام، علامہ ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں احد أئمة الدین واعلام المسلمین وھداة المومنین دوسرے مورخین نے بھی ان کو احد أئمة الاسلام احد أئمة المسلمین وعلما من اعلام

(۱) تاریخ بغداد ج۶ ص۳۴۹، ۵۰، ۵۱، تاریخ ابن عساکر ج۲ ص۴۱۰، ۱۱، ۱۲، تہذیب التہذیب ج۱ ص۲۱۸، ۲۱۹، طبقات الشافعیہ ج۱ ص۲۳۴، ۲۳۵، انتقاء ص۱۰۸۔

الدین امام مشرق اور عالم نیشاپور وغیرہ لکھا ہے۔(۱)

علم حدیث میں کمال وامتیاز: علم حدیث سے ان کو خاص تعلق تھا اور وہ اکابر محدثین اور نامور حفاظ میں شمار کئے جاتے ہیں، خلیلی کا بیان ہے کہ وہ ''شہنشاہ حدیث تھے'' حدیثوں کے نشر واشاعت، درس ومذاکرہ، حفظ وضبط اور حزم واحتیاط کے لئے ان کی ذات بڑی اہمیت اور شہرت رکھتی ہے، ذیل میں ان کی ان خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے۔

حفظ وضبط: اسحاق بن راہویہ کا حافظہ غیر معمولی اور یادداشت حیرت انگیز تھی، ابن حبان، خطیب بغدادی اور ابن عساکر وغیرہ نے حافظہ میں ان کی جامعیت کا اعتراف کیا ہے، علامہ ابن خزیمہ فرماتے ہیں کہ اگر اسحاق تابعین کے عہد میں ہوتے تو وہ لوگ بھی ان کے حافظہ کے معترف ہوتے، قتیبہ بن سعید کا بیان ہے کہ خراسان کے نامور حفاظ میں اسحاق بن راہویہ اور ان کے بعد امام دارمی اور امام بخاری تھے، ابویحیٰ شعرانی کہتے ہیں کہ میں نے ان کے ہاتھ میں کبھی کتاب نہیں دیکھی، وہ ہمیشہ یادداشت سے حدیثیں بیان کرتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے کبھی کوئی چیز قلمبند نہیں کی جب بھی مجھ سے کوئی حدیث بیان کی گئی میں نے اسے یاد کرلیا، میں نے کسی محدث سے کوئی حدیث کبھی دوبارہ بیان کرنے کے لئے نہیں کہا، یہ کہنے کے بعد انھوں نے پوچھا کیا تم لوگوں کو اس پر تعجب ہے؟ لوگوں نے کہا جی ہاں؟ یہ حیرت کی بات ہی ہے، انھوں نے کہا جس چیز کو میں ایک مرتبہ سن لیتا ہوں وہ مجھے یاد ہوجاتی ہے، ستر ہزار سے زیادہ حدیثیں ہر وقت میری نگاہ کے سامنے رہتی ہیں اور میں ان کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ وہ کتاب میں کس جگہ ہیں؟ ابوداؤد خفاف کی روایت کے مطابق انھوں نے ایک لاکھ حدیثوں کے متعلق کہا کہ وہ میری نظر کے سامنے ہیں، میں ان کا تذکرہ کرسکتا ہوں ایک دفعہ انھوں نے گیارہ ہزار حدیثیں زبانی املا کرائیں اور پھر جب

(۱) حوالۂ مذکورہ اختلاف صفحات وتاریخ ابن خلکان ج اص ۲ا۱ والبدایہ ج ۱۰ص ۳۱۷ میزان الاعتدال ج اص ۸۶ والعبر ج اص ۴۴۶ ومرآۃ الجنان ج ۲ص ۱۲۱ وشذرات الذہب ج ۲ص ۸۹۔

دوبارہ کتاب سے ان کی قرأت کی تو ایک لفظ کی بھی کمی یا بیشی نہیں نکلی، احمد بن سلمہ کہتے ہیں کہ انھوں نے پوری مسند کا زبانی املا کرایا، ابو حاتم رازی نے ابو زرعہ سے اسحاق بن راہویہ کے حفظِ اسانید و متون کا ذکر کیا تو انھوں نے کہا کہ ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں دیکھا گیا، احمد بن سلمہ نے ابو حاتم کو بتایا کہ انھوں نے یادداشت سے اپنی تفسیر کا املا کرایا ہے تو ابو حاتم نے کہا یہ اور زیادہ حیرت انگیز بات ہے کیوں کہ مسند حدیثوں کا ضبط تفسیر کے اسناد والفاظ کے ضبط کے مقابلہ میں آسان ہے، امیر خراسان عبداللہ بن طاہر نے ایک مرتبہ ان سے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے فرمایا کہ اس کے متعلق سنت یہ ہے اور یہی اہل سنت کا قول ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ اور ان کے تلامذہ کی رائے اس سے مختلف ہے، ابراہیم بن ابی صالح وہاں موجود تھے بولے امیر المومنین اسحاق غلط کہتے ہیں، امام ابوحنیفہ کا مسلک اس سے مختلف نہیں ہے، انھوں نے جواب دیا کہ مجھ کو یہ مسئلہ یاد ہے، فلاں کتاب کا فلاں جز لائیے، کتاب لائی گئی اور ابن طاہر نے اس کو الٹنا شروع کیا تو اسحاق نے کہا امیر المومنین گیارھویں ورق کی نویں سطر میں ملاحظہ فرمایئے، چنانچہ اس کے اندر وہ مسئلہ اسحاق کے بیان کے عین مطابق نکلا، امیر نے کہا ہم کو معلوم تھا کہ آپ کو مسائل ازبر ہیں لیکن حافظہ کا یہ مشاہدہ ہمارے لیے یقیناً حیرت انگیز ہے۔(۱)

صدق وثقاہت: اس غیر معمولی حفظ کے ساتھ اسی درجہ کا صدق اور ثقاہت بھی تھی، ابو حاتم فرماتے ہیں کہ کثیر الحفظ ہونے کے باوجود اسحاق کا ضبط واتقان اور غلطیوں سے محفوظ ومصون رہنا حیرت انگیز ہے، خطیب بغدادی وغیرہ لکھتے ہیں کہ وہ حفظ وثقاہت دونوں کے جامع تھے، ذہبی نے ان کو ثقہ وحجت بتایا ہے اور ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے، امام نسائی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ ومامون تھے، امام دارمی کا بیان ہے کہ اسحاق

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۰ تا ۳۵۴، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۳ و ۴۱۴، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۴، ۲۳۵، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۱۷، میزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۸۷، ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳۔

اپنے صدق کی وجہ سے اہل مغرب و مشرق کے سردار بن گئے تھے، امام احمد کو ان کے صدق و ثقاہت پر اتنا اعتماد تھا کہ ایک دفعہ انھوں نے ان سے کوئی حدیث پوچھی، جب اسحاق نے اسے بیان کیا تو ایک شخص نے اعتراضا کہا کہ وکیع نے یہی روایت اس سے مختلف طریقہ پر بیان کی ہے، امام احمد نے برافروختہ ہوکر کہا خاموش رہو، جب ابویعقوب جو امیر المومنین فی الحدیث ہیں کوئی روایت بیان کریں تو اسے بلا تامل قبول کر لینا چاہیے۔ (۱)

حزم و احتیاط: اس حفظ کے ساتھ اتنے محتاط تھے کہ بچپن میں انھوں نے عبداللہ بن مبارک سے حدیثیں سنی تھیں مگر ان کو روایت نہیں کرتے تھے کہ احتیاط کے خلاف ہے۔ (۲)

حفاظت و اشاعت حدیث: ان کی ذات سے حدیث نبوی کی بڑی اشاعت اور سنت نبوی کا بڑا احیا ہوا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ''اسحاق بن راہویہ نے سنتوں کا دفاع اور مخالفین حدیث کا قلع قمع کیا'' وہب بن جریر کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ اسحاق، صدقہ اور یعمر کو ان کے اسلامی خدمات کا صلہ عطا فرمائے، ان لوگوں نے مشرق کی سرزمین میں حدیثوں کی اشاعت اور سنت نبوی کا احیا کیا۔

فقہ و اجتہاد: حدیث کی طرح فقہ و اجتہاد کے بھی ماہر تھے، ابواسحاق شیرازی، حاکم صاحب مستدرک اور خطیب نے ان کو فقہ و اجتہاد میں جامع اور اکابر فقہا میں شمار کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے احد المجتہدین من الانام اور ابن حبان نے نامور و ممتاز فقہا میں ان کا شمار کیا ہے، ایک مرتبہ امام احمد ابن حنبل سے ان کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا کہ اسحاق کے مانند کون ہوسکتا ہے، ایسے ہی لوگوں سے مسائل دریافت کرنا چاہیے، ہم لوگ بھی ان سے فتوے پوچھتے ہیں۔ (۳)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۰ تا ۳۵۳۔ تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۲، ۴۱۳، طبقات الشافعیہ ج ا ص ۲۳۴ وتہذیب ج ا ص ۲۱۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۵، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۰ (۳) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۱، ۴۱۲، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۱۷۔

غرض فقہی حیثیت سے بھی ان کا پایہ بہت بلند تھا اور وہ مسلمہ امام اور صاحب مذہب فقہا میں ہیں اور متعدد علمانے ان کا محدث کے بجائے فقیہ و مجتہد ہی کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، کتب خلاف میں ان کے اقوال و فتاویٰ اور فقہی واجتہادی تخریجات موجود ہیں، ابن رشد مالکی نے اپنی کتاب بدایۃ المجتہد میں اکثر امام احمد کے ساتھ اسحاق کے اقوال بھی نقل کیے ہیں، ایک زمانہ تک مسلمانوں میں اسحاق کا مذہب رائج رہا۔

ابن راہویہ کے فقہی اصول اور بنیادیں: فقہ و حدیث میں امام احمد بن حنبل اور اسحاق کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، دونوں بزرگوں کی فقہ واجتہاد کا دارومدار حدیث پر ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے رسالۂ الانصاف میں لکھا ہے کہ ان کے مسائل کی بنیاد احادیث اور اقوال صحابہؓ پر زیادہ ہے، ابوحاتم سے پوچھا گیا کہ آپ کا میلان ان دونوں کی جانب زیادہ ہے، فرمایا مجھے ان سے زیادہ پر عظمت شخص نظر نہیں آتا، ان دونوں نے احادیث قلمبند کیں، ان کا مذاکرہ کیا اور ان پر تصنیفات کیں، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں وفرع علی السنن یعنی ان کی فقہی تفریعات سنن واحادیث پر مبنی ہوتی ہیں لیکن امام احمد کے برخلاف ان کا میلان امام مالک کی طرف زیادہ ہے جن کا اصل ماخذ اہل مدینہ کے اقوال ہوتے ہیں اور امام احمد زیادہ تر آثار و روایات پر اعتماد کرتے ہیں۔

فقہ واجتہاد میں ان کے کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے امام شافعی جیسے عظیم المرتبت امام و مجتہد سے دو مرتبہ مناظرہ کیا اور صالح بن احمد روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ مناظرہ کے موقع پر میرے والد بھی موجود تھے، ان کا بیان ہے کہ اسحاق امام شافعی کے مقابلہ میں غالب نظر آرہے تھے۔(۱)

پہلا مناظرہ: پہلی مرتبہ جب وہ امام احمد کے اصرار پر امام شافعی سے ملے تو انھوں نے مکہ کے مکانات کو کرایہ پر دیے جانے کے متعلق ان سے مناظرہ کیا اور اسحاق کرایہ پر دینا جائز

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۶۲، ۴۱۱ و تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۲۱۹، تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۵۱۔

نہیں سمجھتے تھے اور امام شافعی جائز سمجھتے تھے، ان کا استدلال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ. (حشر،ع۱)	واسطے ان مفلسوں، وطن چھوڑنے والوں کے جو نکالے ہوئے آئے ہیں اپنے گھروں سے۔

من دیار کی نسبت مالکوں کی طرف کی گئی ہے یا غیر مالکوں کی طرف، فتح مکہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من أغلق بابه فهو آمن ومن دخل دار ابی سفیان فهو آمن.	جس نے اپنا دروازہ بند کرلیا اور جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہوگیا اس کو امان ہے۔

یہاں دار و باب کی نسبت جس کی جانب کی گئی ہے کیا وہ اس کا مالک تھا یا نہیں؟ حضرت عمرؓ نے قید خانہ کے لیے جو مکان خریدا تھا، وہ اس کے مالک یا غیر مالک سے خریدا تھا؟ اسی طرح رسول کریمؐ نے فرمایا:

وهل ترك لنا عقيل من دار	یعنی کیا عقیل نے ہمارے لیے کوئی گھر چھوڑا ہے۔

اسحاق کی دلیل یہ تھی کہ ان کی رائے کی تائید بعض تابعین سے منقول ہے، امام شافعی کا جواب یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں کسی شخص کی رائے حجت نہیں ہوسکتی، اسحاق کی دوسری دلیل یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ" یعنی مسجد حرام میں مکہ کے باشندوں اور باہر کے لوگوں دونوں کا برابر حق ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک یہ حکم مسجد حرام کے ساتھ خاص تھا، امام شافعیؒ کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر مکہ کی زمین لوگوں کے لئے مباح ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، لم يترك لنا عقيل مسكنا کے بجائے یہ فرماتے کہ جو جگہ ہم کو مل جائے یا جس شخص کے گھر میں بھی

ہم لوگ اتر پڑیں وہ گھر اور جگہ ہمارے لیے مباح ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ کی زمین لوگوں کی ملکیت بن سکتی ہے، اس لیے اس کو کرایہ پر بھی دیا جاسکتا ہے، آخر میں اسحاق کو امام شافعیؒ کی اصابتِ رائے کا اعتراف کرنا پڑا اور وہ شافعیؒ کی عظمت اور علم وفضل کے معترف ہوگئے اور جب کبھی ان کا ذکر کرتے تو تعریف وتوصیف کرتے اور اپنی بات پر نادم بھی ہوتے۔

دوسرا مناظرہ: دوسرے مناظرہ میں امام احمد بھی شریک تھے اور غالباً اسی کے متعلق ان سے روایت ہے کہ اس میں امام شافعیؒ کے مقابلہ میں اسحاق کی رائے وزنی معلوم ہوتی تھی، چنانچہ وہ اس مسئلہ میں اسحاق کے ہم نوا بھی ہوگئے تھے، اس مناظرہ کا موضوع بحث مردار کی کھال تھی، امام کے نزدیک وہ دباغت کے بعد پاک ہوجاتی ہے، اسحاق نے دلیل طلب کی تو انھوں نے حضرت میمونہ کی یہ حدیث بیان کی ان النبیؐ مرّ بشاة میتة فقال هلا انتفعتم بجلدها (آپؐ نے ایک مردہ بکری دیکھ کر فرمایا کہ کیوں نہیں تم لوگوں نے اس کی کھال سے فائدہ اٹھایا) اسحاق نے اس کے جواب میں ابن حکیم کی یہ حدیث بیان کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یہ لکھایا کہ لا تنتفعوا من المیتة باهاب ولا عصب (یعنی مردار کے غیر مدبوغ اور مدبوغ کسی قسم کے چمڑے سے انتفاع نہ کرو) اور یہ تحریر آپ کی وفات سے صرف ایک ماہ پہلے کی ہے، اس لیے میمونہ کی روایت اس سے منسوخ ہوجاتی ہے، امام شافعیؒ نے فرمایا کہ میں تو سماعی حدیث بیان کرتا ہوں اور آپ تحریر کا تذکرہ کرتے ہیں، اسحاق نے جواب دیا کہ رسول اللہؐ نے قیصر وکسریٰ کے نام جو خطوط لکھے تھے وہ تحریری تھے اور اللہ کے یہاں ان کے خلاف حجت ہوں گے، اس جواب پر امام شافعیؒ خاموش ہوگئے۔

مذہب ومسلک: اسحاق بن راویہ خود صاحب مذہب مجتہد تھے، اس لیے چاروں مشہور اجتہادی مذاہب میں وہ کسی مذہب سے وابستہ نہ تھے، البتہ امام دارقطنی نے ان کو امام شافعی

کے راویوں میں اور امام بیہقی نے ان کے اصحاب میں ذکر کیا ہے، اسی طرح ابن خلکان نے لکھا ہے کہ مناظرہ کے بعد جب ان کو امام شافعی کے علم وفضل کا اندازہ ہوا تو وہ ان کے اصحاب میں داخل ہو گئے اور ان کی کتابوں کو مہیا کر کے نقل کیا، (۱) لیکن ان آرا و اقوال سے ان کا شافعی المذہب ہونا ثابت نہیں ہوتا بلکہ صرف امام شافعی سے تلمذ اور تعلق ظاہر ہوتا ہے، علامہ ابن عبدالبر فرماتے ہیں ''امام شافعی سے ان کا صرف اس حد تک تعلق ثابت ہے کہ اسحاق نے ان کی کتابیں لکھیں اور ان کی صحبت میں رہے لیکن امام ابوثور کی طرح ان کے بھی مختارات واجتہادات ہیں، البتہ ان کا رجحان امام احمد کی طرح حدیث واتباع سلف کی جانب زیادہ تھا۔'' (۲)

عقیدہ وکلام: اسحاق بن راہویہ اتباع سنت اور طریقہ سلف کی پیروی میں نہایت متشدد تھے، اس لیے کلام وعقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث وتدقیق اور غور وخوض ناپسند کرتے تھے، ان کے زمانہ میں خلق قرآن کا معرکۃ الآرا مسئلہ پیش آیا، گو انھوں نے امام احمد کی طرح اس میں الوالعزمی اور ثابت قدمی نہیں دکھائی مگر وہ بھی قرآن کو خدا کا کلام اور غیر مخلوق سمجھتے تھے، احمد بن سعید رباطی کا شعر ہے۔

لم یجعل القرآن خلقا کما قد قاله زندیق ناق (۳)

ترجمہ: اسحاق بن راہویہ نے فاسق اور زندیق شخص کی طرح قرآن کو خدا کی مخلوق قرار نہیں دیا۔

زہد واتقا: امام ابن راہویہ کے زہد واتقا کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ وہ حدیث وفقہ اور حفظ وصدق کی طرح ورع وتقویٰ کے بھی جامع تھے، محمد بن اسلم طوسی نے ان کی وفات کے وقت فرمایا ''میں نے ان سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا نہیں دیکھا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

---

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۲ (۲) الانتقاء ص ۱۰۸ (۳) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۱۲، طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۲۵۔

(اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ) یعنی اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم والے ہیں۔(۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق انھوں نے ۷۷ سال کی عمر میں بروز یکشنبہ ۱۴ یا ۱۵ شعبان ۲۴۸ھ کو انتقال کیا، ۲۴۷ھ بھی روایت کی گئی ہے، ایک شاعر کے مرثیہ کا شعر ہے:

یـاهـدة مـاهـددنـا لیلة الاحد   فی نصف شعبان لاتنسی مدی الابد

ترجمہ: جس سانحہ عظیم سے ہم لوگ اتوار کی رات میں ۱۵ ر شعبان کو دوچار ہوئے، اس کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

آپ کی قبر زیارت گاہ خلائق ہے، بعض بزرگوں نے آپ کی بخشش ومغفرت کے خواب بھی دیکھے(۲)

اولاد: آپ کی اولاد میں تین صاحبزادوں کا نام ضمناً ملتا ہے، ۱-ابوالحسن علی، ۲-محمد، ۳-یعقوب۔(۳)

تصنیفات: علمائے طبقات وتراجم نے ان کو صاحب تصانیف کثیرہ لکھا ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب ضائع ہو گئیں جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- کتاب السنن فی الفقہ: (۴) اس کے نام سے موضوع ظاہر ہے۔

۲- کتاب التفسیر: علامہ سیوطی نے عہد تابعین کے بعد کی جن تفسیروں کو اہم اور اقوال صحابہ وتابعین کی جامع قرار دیا ہے ان میں سفیان بن عیینہ اور وکیع بن جراح وغیرہ کی تفسیروں کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے(۵) اس کو وہ خود باقاعدہ مرتب ومکمل بھی کر چکے تھے اور اس کا املا بھی کرایا تھا۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۵ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۲ (۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۳۵۵ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۱۴ (۳) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۴۷ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۱۰ وطبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۳۳ (۴) الفہرست ص ۳۲۱ (۵) الاتقان ج ۲ ص ۱۹۰۔

۳- مسند: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور تصنیف اور ۶ جلدوں پر مشتمل ہے، (۱) حاکم نیشاپوری نے دوسرے دور کی مسانید میں امام احمد کی مسند کے ساتھ اس کا نام بھی گنایا گیا ہے۔ (۲) اس کی ترتیب و تکمیل سے بھی وہ اپنی زندگی میں فارغ ہو چکے تھے اور اپنے شاگردوں کو زبانی اور پڑھ کر اس کا املا بھی کرایا تھا، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

واسحاق يخرّج امثل ماورد عن ذالك الصحابي فيما ذكره الرازي۔ (۳)	ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ اسحاق ان ہی روایتوں کی تخریج کرتے تھے جو اس صحابی کی سب سے بہتر اور اچھی روایت ہوتی تھی۔

اس مسند کا ایک قلمی نسخہ علامہ سیوطی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، علامہ ذہبی نے اس کے رجال کے نقد میں ایک مستقل کتاب لکھی تھی، اس کو بھی سیوطی نے اس نسخہ کے حاشیے میں درج کیا ہے۔ (۴)

☆☆☆

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۱۱۳ (۲) المدخل فی اصول الحدیث ص ۴ (۳) تدریب الراوی ص ۵۷ (۴) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵۔

امام احمد بن حنبلؒ

(متوفی ۲۴۱ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شیخ الاسلام اور امام السنہ القاب، شیبانی، ذہلی، بصری، مروزی اور بغدادی نسبتیں ہیں، سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن محمد بن حنبل بن ہلال بن اسد بن ادریس بن عبداللہ بن حیان بن عبداللہ بن انس بن عوف بن قاسط بن مازن بن شیبان۔

خاندان: امام احمد خالص عربی النسل تھے، ان کا خاندانی سلسلہ بنی شیبان سے جو قبیلۂ عدنان کی شاخ سے ملتا ہے، یہ خاندان اپنی شجاعت، دلیری اور غیرت وحمیت کے لیے ہمیشہ سے مشہور تھا، آپ کے دادا حنبل امویوں کے عہد میں سرخس کے گورنر اور والد محمد ایک بہادر سپاہی تھے جن کا ۳۰ سال کی عمر ہی میں جب کہ امام احمد صرف ۳ سال کے تھے انتقال ہوگیا، آپ کی والدہ ماجدہ نے پرورش وپرداخت کی۔

دنیوی وجاہت کی طرح علمی حیثیت سے بھی یہ خاندان بہت ممتاز تھا اور اس میں متعدد علما وفضلا، مقررین، شعرا اور ماہرین انساب گذرے ہیں۔(۱)

ولادت: امام احمد ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے بعض مورخین نے تصریح کی ہے کہ ربیع الاول کا مہینہ تھا۔(۲)

مقام پیدائش: امام صاحب شکم مادر ہی میں تھے کہ ان کی والدہ مرو سے بغداد تشریف

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۸، ۲۹ و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۲ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸۔

لے آئیں، یہیں امام صاحب کی ولادت ہوئی، ایک روایت یہ بھی ہے کہ وہ مرو میں پیدا ہوئے تھے اور شیر خوارگی کے زمانہ میں بغداد آئے۔ (۱)

وطن: آپ کا خاندان ایک عرصہ تک بصرہ میں آباد رہا، آپ کے دادا خراسان تشریف لائے یہاں روز اور مرو شاہجہاں نام کے دو شہر قریب ہی قریب آباد تھے، امام صاحب کا تعلق دوسرے مرو سے تھا جو ہر زمانہ میں اکابر علما وفضلا کا گہوارہ رہا ہے (۲) لیکن امام صاحب کی نشوونما بغداد میں ہوئی اور یہیں آپ کی عمر کا اکثر حصہ بسر ہوا، اس لیے اسی کو آپ کا اصلی وطن سمجھا جاتا ہے۔

ابتدائی تعلیم: امام صاحب کی تعلیم کا سلسلہ بچپن ہی میں شروع ہو گیا تھا، ۴ سال کی عمر میں انھوں نے قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، سات سال کی عمر میں حدیث پڑھنا شروع کر دی اور ۱۵، ۱۶ سال کے سن میں اس کی باقاعدہ طلب وتکمیل میں مصروف ہو گئے۔

رحلت وسفر: امام صاحب عرصہ تک بغداد ہی میں رہ کر وہاں کے مشائخ سے سماع کرتے رہے اس کے بعد انھوں نے دوسرے مشہور مراکز حدیث کوفہ، بصرہ، مکہ، مدینہ، یمن، شام اور جزیرہ وغیرہ کا رُخ کیا۔ (۳)

شیوخ واساتذہ: امام احمد نے آنکھیں کھولیں تو بغداد علما وفضلا کا مرکز اور دینی علوم کا گہوارہ بنا ہوا تھا، اس لیے شروع میں وہ یہیں کے مشائخ اکابر کے دامن فیض سے وابستہ رہے، بغداد میں ان کی نظر سب سے پہلے مشہور محدث حافظ ہشیم بن بشیر واسطی (م ۱۸۳ھ) پر پڑی جو حضرت عبداللہ ابن عباس وابن عمر رضی اللہ عنہما کی مرویات کے متبحر عالم تھے چار سال تک اسی خرمن علم کی خوشہ چینی کرتے رہے، جب یہ آفتاب غروب ہو گیا تو دوسرے اساتذۂ فن کی جانب متوجہ ہوئے، بچپن میں امام ابو یوسف کے درس میں بھی شریک ہوئے

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸ (۲) معجم البلدان ج ۸ ص ۳۵ (۳) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۲ وتہذیب الاسمانووی ج ۱ ص ۱۱۔

تھے، سفیان بن عیینہ، سلیمان بن داؤد طیالسی، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن نمیر، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن سعید وغیرہ جیسے اکابر محدثین اور ائمہ وقت سے بھی ان کو استفادہ کا موقع ملا، (۱) امام احمد کے اساتذہ میں سب سے زیادہ ممتاز اور باکمال شخصیت امام شافعیؒ کی ہے، ان سے ان کے بڑے مراسم اور گوناگوں تعلقات تھے، فقہ کے علاوہ حدیث وانساب کا علم بھی ان سے حاصل کیا تھا، امام شافعی جب تک بغداد میں رہے وہ ان کے حلقۂ درس سے وابستہ رہے، جب مصر تشریف لے گئے تو امام احمد نے بھی وہاں جانا چاہا مگر عسرت وناداری کی بنا پر اس کا موقع نہیں ملا، امام احمد کو امام شافعیؒ کی ذات سے بڑی عقیدت اور شیفتگی تھی، اور وہ ان کا ہمیشہ بڑا احترام کرتے تھے، امام شافعیؒ سوار ہوتے تو یہ ان کے پیچھے پیچھے پیدل ان سے سوال کرتے جاتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ میں نے تیس سال سے کوئی ایسی نماز نہیں پڑھی جس میں امام شافعیؒ کے لیے دعا نہ کی ہو، (۲) شفیق استاذ کو بھی اپنے لائق شاگرد سے بڑی محبت اور ان کے علم وفضل اور دیانت وتقویٰ پر بڑا اعتماد تھا، ان سے روایت بھی کرتے تھے، امام احمد کا خود بیان ہے کہ امام شافعی نے جتنا استفادہ ہم سے کیا اتنا ہم اُن سے نہیں کر سکے، عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ امام شافعی کی کتاب میں حدثنی الثقه یا اخبرنی الثقه سے میرے والد ہی مراد ہیں، امام شافعی فتویٰ دیتے تو ان سے بھی مشورہ لیتے تھے، فرط تعلق کی بنا پر اکثر ان کے گھر بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ (۳)

تلامذہ: امام احمد کے تلامذہ کے مختلف طبقے ہیں، آپ کے اساتذہ میں حسن بن موسیٰ اشیب، زیاد بن ایوب، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن ادریس شافعی، وکیع بن جراح، ہشام بن عبدالملک طیالسی، یحییٰ بن آدم اور یزید بن ہارون وغیرہ نے آپ سے استفادہ کیا ہے، خلف (۴) ابن ہشام داؤد بن عمرو ضبی اور قتیبہ بن سعید ثقفی نے عمر میں

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۶ (۲) ایضاً (۳) احمد بن حنبل ص ۲۹۔ (۴) حافظ ابن حجر نے ان کو بھی امام احمد کا استاذ بتایا ہے، تہذیب ج ۳ ص ۱۵۶۔

بڑے ہونے کے باوجود آپ سے روایت کی ہے، ہم عصروں میں احمد بن ابی الحواری، حسین بن منصور، عبدالرحمٰن بن ابراہیم، عبیداللہ بن سعید سرخسی، علی بن عبداللہ مدینی، محمد بن رافع قشیری، محمد بن یحییٰ بن ابی سمینہ اور یحییٰ بن معین وغیرہ کو آپ سے شرف تلمذ حاصل ہے، اعزہ میں آپ کے چچیرے بھائی حنبل بن اسحاق اور صاحبزادگان صالح اور عبداللہ کو آپ سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، صحاح ستہ کے مصنفین میں امام بخاری، (۱) مسلم اور ابوداؤد بلاواسطہ اور امام ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ بالواسطہ آپ کے شاگرد ہیں، عام تلامذہ کی تعداد جن میں سے اکثر امام وقت سمجھے جاتے تھے بے شمار ہے۔

اہل علم کا اعتراف اور شہادتیں: امام احمد کے علم وفضل اور زہد وتقویٰ کے متعلق ان کے اساتذہ، معاصرین اور تلامذہ کے بکثرت اقوال طبقات وتراجم کی کتابوں میں موجود ہیں۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''بغداد کو جب میں نے چھوڑا تو وہاں امام احمد سے زیادہ صاحب علم وفضل اور متدین ومتورع کوئی شخص نہیں تھا'' امام ابوثور فرماتے ہیں کہ ''وہ سفیان ثوری سے بڑے عالم وفقیہ اور ہمارے شیخ وامام ہیں'' یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ ''میں نے ان سے بہتر آدمی نہیں دیکھا، ان کی توصیف وتعریف میں مبالغہ برا نہیں۔'' علی بن مدینی سے جب کہا گیا کہ ''امام احمد کا اس زمانہ مین وہی حال ہے جو سعید بن میسب کا ان کے زمانہ میں تھا۔'' تو انھوں نے فرمایا کہ ''نہیں سعید بن میسب کے زمانہ میں ان کی طرح کے لوگ موجود تھے مگر موجودہ دور میں امام احمد کی کوئی مثال نہیں، ابوعبید فرماتے

---

(۱) محمد بن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے امام احمد سے کتاب المغازی کے آخر میں مسند بریدہ کے اندر احمد بن حسن ترمذی کے واسطہ سے ایک حدیث کی روایت کی ہے، کتاب الصدقات میں محمد بن عبداللہ انصاری سے روایت کرنے کے بعد لکھا ہے کہ وزادنی احمد بن حنبل عن محمد بن عبداللہ انصاری اور کتاب النکاح میں حدثنا واخبرنا کے بجائے قال لنا احمد بن حنبل تحریر کیا ہے (کتاب الجمع فی رجال الصحیحین ص۵)

ہیں کہ حدیث وسنت میں نہ امام احمد سے بڑا کوئی عالم ہے اور نہ علمائے اسلام میں ان کا کوئی مقابل۔(۱)

امام صاحب کے مشہور شاگرد ابراہیم حربی فرماتے ہیں کہ ''ان کو اللہ نے سلف وخلف کے علوم کا مخزن بنایا تھا، علی بن مدینی کا ارشاد ہے کہ '' وہ ہمارے اور اللہ کے درمیان حجت ہیں، جب کسی مسئلہ میں مجھ کو ان کا فتویٰ مل جاتا ہے تو میں بے تکلف اس پر عمل کرتا ہوں، ابونصر بن ماکولا کہتے ہیں کہ ''ان کو صحابہؓ وتابعین کے مذاہب سے سب سے زیادہ واقفیت تھی۔

امام احمد کی عظمت اس سے بھی ظاہر ہے کہ علمائے امت نے ان کی مدح وتوصیف کو تقویٰ ودیانت کا ثبوت اور ذم وتنقیص کو ایمان کے منافی اور نفاق کی علامت قرار دیا ہے، سفیان بن وکیع فرماتے ہیں کہ ''امام احمد کی عیب جوئی کرنے والا فاسق وفاجر ہے،'' احمد دورقی کا بیان ہے کہ ''امام احمد کی مذمت کرنے والے کو بے دین سمجھنا چاہیے'' ابوحاتم اور قتیبہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ''امام سے محبت وعقیدت رکھنے والا متبع سنت اور غیر مبتدع ہے ابن اعین نے ان دو شعروں میں یہی حقیقت بیان کی ہے:

اضحی ابن حنبل محنة مامونة   وبحب احمد یعرف المتنسك

واذا رأیت لاحمد متنقصا   فاعلم بان ستوره ستهتك (۲)

ترجمہ: احمد کی ذات ایک بہترین کسوٹی ہے، ان کی محبت دینداری کی علامت ہے، اگر کوئی شخص ان کی مذمت کرتا ہے تو یقین مانو اس کی قلعی کھل کر رہے گی۔

فضل وکمال: امام احمد بڑے بلند پایہ محدث اور ان تمام اوصاف وکمالات سے متصف تھے

(۱) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۰ وطبقات الفقہا شیرازی ص ۷۵، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۳۹، ۴۲ وتاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۴ والبدایہ ج ۱۰ ص ۳۳۶ (۲) صفة الصفوة ج ۲ ص ۱۹۱ وتہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۱۲، ۱۱۱ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۴ والبدایہ ج ۱ ص ۳۴۲ وتاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۲۰۔

جو ایک امام حدیث میں ہونے چاہئیں۔

حافظہ: ان کی قوت حافظہ کا کمال اس سے ظاہر ہے کہ انھوں نے چار سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ ان کے پاس بارہ گٹھروں کے بقدر کتابیں تھیں اور وہ سب ان کو زبانی یاد تھیں، علی بن مدینیؒ فرماتے تھے کہ ''ان سے بہتر کسی کا حافظہ نہیں تھا، احمد بن سعید دارمی کہتے ہیں ''امام احمد کی طرح باوجودے کہ وہ کمسن تھے کسی کو حدیثیں یاد نہیں تھیں، ابوزرعہ فرماتے تھے کہ ''ہمارے مشائخ میں ان سے بڑا کوئی حافظ حدیث نہیں تھا، ان کو لاکھوں حدیثیں یاد تھیں۔''

عدالت وثقاہت: ان کی توثیق پر ائمہ فن کا اتفاق ہے، عجلی کا بیان ہے کہ ''وہ حدیث میں ثقہ وضابط تھے'' ابن سعد لکھتے ہیں کہ ''وہ ثقہ وثابت اور صدوق تھے'' امام نسائی ان کو ثقہ ومعتمد قرار دیتے ہیں، حافظ ابن حجر نے ان کو متقن کہا ہے، ابن حبان نے ان کا ثقات میں ذکر کیا ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ''بغداد کی عجیب چیزوں میں ایک یہ نوجوان بھی تھا کمسنی کی وجہ سے جس کے بال بھی سیاہ نہیں ہوئے تھے مگر جب وہ حدثنا کہتا تھا تو ہر طرف سے صدوق کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ (۱)

نقد وتمیز: وہ حدیثوں کے معتبر ناقل وحافظ ہی نہ تھے بلکہ روایتوں میں امتیاز میں بھی پورا ملکہ رکھتے تھے، ابوحاتم فرماتے ہیں کہ امام احمد کو صحیح اور سقیم روایتوں کی معرفت میں بڑا کمال اور خاص امتیاز حاصل تھا'' ابوعبید کا بیان ہے کہ ''وہ حدیث ورجال میں سب سے بہتر مہارت اور اچھی پرکھ رکھتے تھے، امام شافعیؒ کو ان کی بصیرت پر اس درجہ اعتماد تھا کہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ''جب کوئی روایت تمہارے معیار پر صحیح وثابت اتر جائے تو مجھے بھی بتلا دو میں

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۱، تہذیب الاسماء ص ۱۱۱، طبقات سبکی ج ۱ ص ۲۰۰، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۴، ۳۰، ۳۱، تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۱۹، ۴۱۵، تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۷۴، ۷۵، طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۹۲۔

اس کو بے تکلف قبول کرلوں گا، عمر بن احمد ناقد کا بیان ہے کہ "حدیث میں احمد کی موافقت کے بعد مجھ کو دوسروں کی مخالفت کی پرواہ نہیں ہوتی۔" (۱)

مسندِ درس: چالیس سال کی عمر میں درس وتدریس کی مسند پر رونق افروز ہوئے، آپ کی مجلس درس بڑی باوقار، سنجیدہ اور شائستہ ہوتی تھی، لوگ ہمہ تن گوش رہتے اور مذاق ومزاح کا ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لاتے، ابوعبید بیان کرتے ہیں کہ "میں امام ابویوسف، محمد بن حسن شیبانی، یحییٰ بن سعید اور عبدالرحمٰن بن مہدی وغیرہ باکمال محدثین وفقہا کے درس میں شریک رہا ہوں لیکن امام احمد کی طرح مجھ پر کسی کی ہیبت ودہشت طاری نہیں ہوئی، ان کی مجلس نہایت بارعب اور پروقار ہوتی تھی" درس میں حاضرین اور شرکا کا جم غفیر ہوتا تھا، علمائے سیر کا بیان ہے کہ پانچ پانچ ہزار کی تعداد میں لوگ شریک ہوتے تھے۔ (۲)

مرجعیت ومقبولیت: شہرت وناموری اور امامت وسیادت سے کنارہ کش رہنے کے باوجود عالم اسلام کا کوئی گوشہ بھی آپ کے آوازۂ شہرت سے خالی نہ تھا، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ عنفوانِ شباب ہی میں ان کو پوری شہرت حاصل ہوگئی تھی اور بڑھاپے میں تو ہر جگہ ان کا نام روشن ہوگیا تھا۔ (۳) آپ کے دروازے پر طلبہ کا ہجوم رہتا تھا، جب قید کئے گئے تو عالم اسلام میں کہرام مچ گیا، بیمار ہوئے تو مزاج پرسی کے لیے لوگوں کا ایک جم غفیر ہر وقت موجود رہتا، جنازہ میں شرکت کرنے والے بے شمار تھے، وہ عوام وخواص ہر طبقہ میں یکساں مقبول اور ہر دل عزیز تھے، ادریس بن عبدالکریم مقری فرماتے ہیں کہ اکابر علما وفقہا اور نامور محدثین بھی ان کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور سلام کرنے میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے، عوامی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ایک شخص کے سوال پر اس کو کوئی چیز دی تو دوسرے شخص نے اسے بقیمت خریدنا چاہا، مگر پہلے شخص نے یہ کہہ کردینے سے انکار کردیا کہ "مجھ کو بھی

(۱) تہذیب الاسما واللغات ج ۱ قسم اول ص ۱۱۱ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۴ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷ (۲) صفۃ الصفوہ ج ۲ ص ۱۹۲ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷۔

تمہاری طرح اس سے برکت کی امید ہے" حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ "امامت وسیادت آپ کے نام کا جز ہوگئی تھی۔"(۱)

عبادات واعمال

نماز: نماز باجماعت ادا کرتے تھے، آپ کا ارشاد ہے کہ اذان سے پہلے ہی نماز کے لئے تیار ہوجانا چاہئے، جماعت کا اس قدر اہتمام تھا کہ جب خلق قرآن کے انکار کے جرم میں آپ کو کوڑے لگائے گئے اور بدن لہولہان ہوگیا اس وقت بھی ابن ساعہ کی اقتدا میں نماز ادا کی، انھوں نے اعتراض کیا کہ خون سے لت پت ہونے کے باوجود آپ نے نماز پڑھی؟ جواب دیا کہ (قد صلی عمرؓ وجرحه يثب دماً) یعنی قاتلانہ حملہ میں حضرت عمرؓ کا جسم بھی لہولہان ہوگیا تھا مگر انھوں نے اسی حالت میں نماز ادا کی تھی، نمازوں میں استغراق ومحویت اور خشوع وخضوع کا یہ حال تھا کہ بقول عبدالرزاق ان کی نمازوں سے سلف کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔

نوافل: آپ کے صاحبزادہ عبداللہ کا بیان ہے کہ میرے والد روز وشب میں تین سو رکعتیں نفل پڑھتے تھے، ابتلاء کے بعد ضعف کی وجہ سے ۱۵۰ رکعتیں کردی تھیں۔

تہجد: عشاء کے بعد تھوڑی دیر تک آرام فرماتے پھر ساری رات نماز اور یاد الٰہی میں گذارتے بچپن ہی سے یہ معمول بن گیا تھا اور کبھی اس میں فرق نہ آنے دیتے، ابوبکر مروزی فرماتے ہیں کہ چار مہینے میں نے ان کے ساتھ قیام کیا، اس عرصہ میں کبھی انھوں نے تہجد ترک نہیں کیا۔(۲)

تلاوت: تلاوت قرآن سے بڑا شغف تھا، شب میں قیام اور دن کا اکثر حصہ تلاوت قرآن

---

(۱) مجموعۃ الرسائل ص ۵ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۱۹۶، ۱۹۷، وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۱، ۳۶، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵۔

میں بسر ہوتا، ہر ساتویں دن اور ایک روایت کے مطابق ہر روز ایک قرآن ختم کرتے تھے۔

دعا و استغفار: خدا سے دعا و استغفار اور تضرع و گریہ زاری بھی معمولات میں داخل تھے، بڑے مستجاب الدعوات تھے، آپ کی دعاؤں میں برکت و تاثیر دیکھ کر اکثر لوگ آپ سے دعا کی فرمائش کرتے تھے، ایک دفعہ آپ کے ایک پڑوسی نے اپنی اپاہج ماں کے لئے دعا کی درخواست کی تو امام صاحب سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ ہم تو خود تم لوگوں کی دعاؤں کے زیادہ محتاج ہیں، وہ آدمی اپنے گھر واپس لوٹ رہا تھا تو امام صاحب کی خادمہ نے راستہ میں آکر اس کو بتایا کہ تمہاری واپسی کے بعد سے وہ برابر تمہاری ماں کے لئے دعا کر رہے ہیں، اس نے آکر اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو خود اس کی ماں نے دروازہ کھولا اور بتایا کہ اب میں چلنے پھرنے کے قابل ہوگئی ہوں۔(۱)

صدقہ وخیرات: غربت وناداری کے باوجود طبیعت میں بڑی فیاضی تھی، جہاں تک ہوسکتا غریبوں کی امداد فرماتے، امراء وسلاطین کے تحائف قبول نہ فرماتے، اگر کبھی مجبوراً قبول بھی کرنا پڑتا تو اس کو محتاجوں اور ضرورتمندوں میں تقسیم کر دیتے۔

روزہ: روزوں کے اہتمام کا یہ حال تھا کہ قید خانہ میں سحری اور افطار کا انتظام نہ ہونے کے باوجود پانی کے چند گھونٹ پی کر روزہ رکھتے، ایک دن جب معتصم باللہ کے جلاد کوڑے لگا رہے تھے تو کچھ ستو لائے اور کہا کہ اس ضعف ونقاہت کی حالت میں روزہ رکھنا ٹھیک نہیں ہے مگر آپ نے ان کی درخواست قبول نہ کی، فرض کے علاوہ مسنون اور مستحب روزے بھی اکثر رکھتے تھے، متوکل نے امام صاحب کے علاج کے لئے ابن ماسویہ طبیب کو بھیجا تو اس نے بتایا کہ امیر المومنین انھیں کوئی بیماری نہیں، ان کی کمزوری اور بیماری کی وجہ کم خوری اور نمازوں کی زیادتی ہے۔

حج: پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، تین دفعہ ناداری کی وجہ سے پاپیادہ تشریف

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۱۹۷، تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۵، ۳۶۔

لے گئے، تیسری اور چوتھی مرتبہ مجاورت بھی کی۔(۱)

آخرت کا استحضار: آخرت کے تصور اور مواخذۂ الٰہی سے ان کا دل ہر وقت لرزہ براندام رہتا تھا، ان کی مجلسوں کا موضوع گفتگو یہی تھا، علی بن مدینی کو تاکید کی کہ ''ہمیشہ آخرت کو پیش نظر رکھو۔''

دنیا سے بے رغبتی: امام صاحب کی مجلس میں دنیا اور اس کے مزخرفات کا تذکرہ نہیں ہوتا تھا، اگر کوئی اس قسم کا تذکرہ کرتا تو آپ خاموش رہتے، مامون، معتصم، واثق اور متوکل ہر ایک نے مال و دولت کا انبار آپ کے قدموں پر نچھاور کرنا چاہا مگر آپ نے دنیا کے چند خزف ریزوں کی خاطر دین کا سودا نہیں کیا، آپ کے سامنے ابن ابی شیبہ، عبدالاعلیٰ اور دوسرے محدثین کے عیش وعشرت کا ذکر کیا جاتا تو فرماتے کہ دنیا چند روزہ ہے، اس سے کوئی بڑی مراد حاصل نہیں ہوسکتی، کل آخرت میں جو کامیاب ہوگا کامیابی اسی کی ہے، ایک مرتبہ مامون نے محدثین میں زر و جواہر تقسیم کرنے کے لئے بھیجا تو آپ کے علاوہ کسی نے لینے سے انکار نہیں کیا، فرماتے تھے کہ مجھے سب سے زیادہ اس دن آرام ملتا ہے جس دن میرے پاس کوئی چیز نہیں ہوتی۔(۲)

اتباع سنت اور محبت رسول: امام کی زندگی کا مشن ہی سنت کی تائید وحمایت اور بدعات کا ابطال تھا، خلاف سنت کاموں کو دیکھ کر سخت برہم ہوتے تھے، اور سنت کی خلاف ورزی کرنے والوں کے ساتھ نشست و برخاست کو ناپسند کرتے تھے، خود کبھی قصداً سنت ترک نہیں کی اور جب اپنے کسی عمل کے خلاف سنت ہونے کا علم ہوجاتا تو فوراً اس سے باز آجاتے تھے، مرض الموت میں شدت الم کے باوجود کراہنا اس لئے پسند نہیں کیا کہ وہ خلاف

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵، ۳۳۹، وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۰ و ۳۵ وصفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۷ وتہذیب الاسماء ج ۱ ص ۱۱۲ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲ و ۲۱۱ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹، والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸ و ۳۲۹۔

سنت ہے، اکثر دعا فرماتے تھے امتنا علی الاسلام والسنة (اے اللہ اسلام اور سنت پر ہمارا خاتمہ کر)

رسول کی ظاہری عقیدت ومحبت سے بھی آپ کا دل معمور تھا، قید خانہ میں آپ کو تین بال دیے گئے اور بتایا گیا کہ یہ موئے مبارک ہیں، آپ نے ان کو حرز جان بنائے رکھا اور انتقال کے وقت وصیت کی کہ قبر میں ان کو میری دونوں آنکھوں اور زبان پر رکھ دیا جائے۔(۱)

جاہ ومنصب سے گریز: آپ کی استغنا وبے نیازی نے کبھی کسی منصب واعزاز کو قبول کرنا گوارا نہیں کیا، خلفا وسلاطین نے مقرب بارگاہ بنانا اور انعام واکرام سے نوازنا چاہا مگر آپ نے ہمیشہ رد فرما دیا، امام شافعیؒ نے خلیفہ ہارون سے یمن کی بدنظمی کا ذکر کرکے ایک مناسب اور بہتر قاضی کے تقرر کی فرمائش کی، خلیفہ نے کہا آپ کے حلقہ میں جو موزوں شخص ہو اس کا انتخاب کرکے مجھے مطلع کیجئے، امام شافعیؒ کی نگاہِ انتخاب امام احمد پر پڑی، جب ان سے اس کا ذکر کیا تو امام احمد نے جواب دیا کہ میں تو آپ کے پاس طلب علم کے لئے حاضر ہوتا ہوں اور آپ مجھ کو عہدۂ قضا قبول کرنے کی ترغیب دے رہے ہیں، اگر آپ کے پاس علم کی دولت نہ ہوتی تو اب میں آپ سے رسم وراہ ترک کر دیتا، امام شافعیؒ یہ سن کر نہایت نادم اور پشیمان ہوئے۔(۲)

امرا وسلاطین سے بے تعلقی: امرا وسلاطین سے ہمیشہ بے تعلق رہے، خلفا نے آپ کے سامنے مختلف قسم کی پیشکشیں کیں مگر انھوں نے ان کو ٹھکرا دیا، امیر المومنین عبداللہ ابن طاہر نے اپنے حاجب سے سلام کہلایا اور ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا امام صاحب نے فرمایا کہ یہ مجھے پسند نہیں ہے اور امیر سے مجھ کو توقع ہے کہ وہ ایک ناگوار کام کی مجھ کو زحمت نہ دیں گے، ابن

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۲، ۲۰۱ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹، والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸، ۳۲۹ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۱ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸۔

طاہر کا خود بیان ہے کہ "میں دو آدمیوں (یحییٰ اور احمد) کو نہایت عزیز رکھتا ہوں لیکن دونوں نہ کبھی میرے یہاں آئے اور نہ دوسرے امرا کے قریب پھٹکے ہیں" آپ کے چچا اسحاق نے آپ سے کہا کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی کے لیے امرا کے یہاں جایا کریں اور اسحاق بن راہویہ کو مثال میں پیش کیا آپ نے جواب دیا کہ عم محترم! آپ اسحاق کے طرز عمل کو پیش کرتے ہیں، اگر میری ان سے ملاقات ہوئی تو میں ان کو بھی ضرور منع کروں گا، سلاطین وامرا کی صحبت فتنہ ہے، جب ہم ان سے دور اپنے کو محفوظ نہیں رکھ سکتے تو قریب ہونے کے بعد کیا حال ہوگا، متوکل اپنے پیش رؤوں کی غلطیوں کی تلافی کے لیے ہر وقت آپ کی دلجوئی کی فکر میں رہتا، روزانہ قاصد بھیج کر خیریت دریافت کرتا، معاملات سلطنت اور مہمات امور میں مشورے طلب کرتا، مال ودولت اور انعام واکرام سے مالا مال کرنا چاہتا مگر اس کا یہ التفات امام صاحب پر سخت بار ہوتا، آپ روکر فرماتے سلمت من هؤلاء حتى اذا كان في آخر عمري بليت بهم (۱) (زندگی بھر میں ان لوگوں کی آزمائشوں سے محفوظ رہا لیکن آخر عمر میں ان کے فتنوں سے دوچار ہو رہا ہوں) کبھی ارشاد فرماتے هذا امر اشد عليّ من ذلك (یہ نوازشات کا معاملہ تو میرے لیے اس ابتلا وآزمائش سے بھی زیادہ سخت اور شاق ہے) ان کے ہدایا وتحائف سے بھی سخت پرہیز تھا، ایک مرتبہ خلیفہ نے امیر بغداد عبداللہ بن اسحاق کو خط لکھا کہ امام صاحب کو کسی طرح دربار میں لائے، امام صاحب نے ضعف ونقاہت کا عذر کیا، متوکل کو معلوم ہوا تو اس نے لکھا کہ میں آپ کی دید اور قربت کا مشتاق اور دعا وبرکت کا خواستگار ہوں، اس لیے امام صاحب کو مجبوراً اس کے لشکر گاہ میں قیام کرنا پڑا، خلیفہ روزانہ آپ کے لیے پرتکلف کھانے اور انواع واقسام کے میوہ جات بھجواتا مگر آپ نے کبھی ان کو تناول نہیں فرمایا، ۸ روز تک مسلسل

---

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۲۰۱ وطبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۳ وتاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ و ۴۰ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸، ۳۳۹ واحمد بن حنبل والمحنۃ ص ۱۴۶۔

روزے رکھتے رہے، سولہ دنوں تک وہاں قیام رہا اس مدت میں صرف ستو پر اکتفا فرماتے رہے، خلیفہ نے خلعت اور اپنی خاص سواری بھیج کر بلا بھیجا، آپ نے اس خیال سے کہ واپسی کی اجازت مل جائے گی، جانا منظور کر لیا لیکن ایک ٹٹو پر سوار ہو کر تشریف لے گئے، خادم نے ایک بیش قیمت جوڑا پہنایا، چند دنوں کے بعد واپسی کی اجازت ملی تو شاہی خلعت وہیں چھوڑ دی اور فرمایا کہ اس کو بیچ کر اس کی قیمت غربا و مساکین میں تقسیم کر دی جائے، اس کے باوجود عرصہ تک اس واقعہ سے متاثر اور اس کی اذیت محسوس کرتے رہے، اپنے اعزہ و متعلقین کو بھی امرا کے یہاں آمد و رفت اور ان کے ہدیے قبول کرنے سے منع فرماتے تھے، بعض اعزہ کے یہاں آمد و رفت بھی اس لیے ترک کر دی تھی کہ وہ سلاطین کے یہاں نشست و برخاست رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ خلیفہ نے آپ کے اہل وعیال کے لیے چار ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے انکار کرنا چاہا تو خلیفہ نے کہلایا کہ یہ تو اہل وعیال کے لیے ہے، امام صاحب سن کر خاموش ہو گئے لیکن متعلقین کو ملامت اور ان کے سامنے دنیوی زندگی کی بے ثباتی اور آخرت کی حیاتِ سرمدی کا ذکر فرماتے رہے، ان لوگوں نے عرض کیا کہ حدیث میں ہے کہ اس مال کو لینے میں کوئی قباحت نہیں جو بلا طلب مل جائے اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ بھی امرا کے تحائف قبول فرماتے تھے، آپ نے فرمایا کہ اس میں اور ان بزرگوں کے معاملہ میں بڑا فرق ہے اگر مجھ کو بھی معلوم ہو جائے کہ یہ مال ظلم و جور سے حاصل نہیں کیا گیا ہے تو لینے میں تامل نہ ہوگا۔

ایک دفعہ تین روز کا فاقہ تھا، اپنے کسی شاگرد سے آٹا قرض لیا، گھر والوں نے بھوک کی شدت کا خیال کر کے فوراً روٹی پکا کر حاضر کر دی، دریافت فرمایا کہ اس قدر جلد کس طرح روٹی پک گئی بتایا گیا کہ صالح کے یہاں آگ جل رہی تھی وہیں پکا لی گئی، صالح امرا وسلاطین کے تحفے قبول کرتے تھے، اس لیے آپ نے ان کے چولھے پر پکی ہوئی روٹیاں

کھانے سے انکار کر دیا اور حکم دیا کہ صالح کے گھر میں جانے کا دروازہ بند کر دیا جائے۔

متوکل نے امام صاحب کے اخراجات کے لیے یعقوب بن قوصرہ کے ہاتھ دس ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے لینے میں لیت ولعل کیا، یعقوب نے کہا کہ اگر آپ اسے قبول نہیں فرماتے تو خلیفہ کو آپ سے بدگمانی ہوگی اور روپے رکھ کر چلے گئے، رات کے آخری پہر میں امام صاحب نے اپنے بیوی، بچوں اور دوسرے متعلقین کو اکٹھا کر کے فرمایا کہ ان روپیوں کی وجہ سے مجھے رات بھر نیند نہیں آئی، اس لیے ان کو ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا جائے، چنانچہ ان لوگوں نے اسی وقت بصرہ وبغداد کے محتاج اور ضرورت مند محدثین کی ایک فہرست تیار کی اور صبح ہوتے ہی ساری رقم تقسیم کر دی گئی۔ (۱)

خودداری: احباب اور مخلصین سے بھی کسی قسم کا انتفاع خودداری کے منافی سمجھتے تھے، حسن بن عبدالعزیز نے ایک مرتبہ ایک ہزار دینار کی تین تھیلیاں بھیجیں اور کہلایا کہ "یہ حلال وطیب مال ہے اس کو قبول فرمایئے اور اہل وعیال کو اس سے فائدہ اٹھانے دیجیے، امام صاحب نے واپس کر دیا اور کہلا بھیجا کہ "ہم کو اس کی ضرورت نہیں، بحمد اللہ ہم آرام وراحت سے ہیں، عبدالرزاق کے سامنے امام احمد کا ذکر کیا گیا تو ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور فرمایا کہ ایک دفعہ وہ میرے پاس آئے مجھے معلوم تھا کہ ان کے پاس خرچ نہیں ہے، اس لیے میں نے خلوت میں لے جا کر دس دینار نذر پیش کی، مسکرا کر فرمایا، میں نہایت آرام سے ہوں، آپ نے ناحق زحمت گوارا کی، اگر میں اور لوگوں سے اس قسم کی رقمیں لیتا ہوتا تو اس کے قبول کرنے میں تامل نہ ہوتا۔ (۲)

انکسار وتواضع: طبعاً بڑے متواضع اور منکسر المزاج تھے، خاندانی نجابت، علمی برتری، مذہبی عظمت اور غیر معمولی شہرت ومقبولیت کے باوجود اُن میں کبر وغرور کا شائبہ بھی نہ تھا،

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۸ تا ۳۴۰ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۶ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۸، ۳۴۰، ایضاً باختلاف صفحات وصفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۳۔

یحیٰ ابن معین فرماتے ہیں کہ میرا اوران کا پچاس سال سے سابقہ ہے مگر انھوں نے اپنے خیر وصلاح اور خاندانی وجاہت پر فخر وبرتری کا اظہار نہیں کیا، ایک شخص نے کہا آپ عربی النسل ہیں، ارشاد ہوا کہ ''ہم مسکین اور فقیر لوگ ہیں، محمد بن حسن فرماتے ہیں کہ جب وہ راستہ چلتے تو کوئی آگے پیچھے نہ ہوتا، اس کو وہ سخت ناپسند کرتے تھے، ابوعوانہ کے درس میں شریک ہونے کے لیے گئے تو لوگوں نے ممتاز جگہ پر بیٹھانے کی کوشش کی، آپ نے کہا میں شیخ کے سامنے بیٹھوں گا، ہم کو معلمین کے سامنے تواضع سے پیش آنے کا حکم دیا گیا ہے، اپنا کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے، صالح کا بیان ہے کہ میرے والد کبھی دوسروں سے وضو کا پانی تک نہیں لانے کے لیے کہتے تھے بلکہ خود ہی کنویں سے پانی نکال کر وضو کرتے تھے۔ فوران وفات سے دودن پہلے عیادت کے لیے حاضر ہوئے تو دیکھا کہ آپ کے غلام نے آپ کو پنکھا جھلنا چاہا آپ نے روک دیا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہین کہ امام احمد پر خدا کی رحمت ہو، نہایت متواضع اور خلیق بزرگ تھے۔ (۱)

شرافت وحسن خلق: امام احمد شرافت اورحسن خلق کا پیکر تھے، کبھی کسی کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی، اگر کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تو آپ اس کا اور بہتر بدلہ چکانے کی فکر کرتے، کوئی ناگوار خاطر بات کہتا تو خندہ پیشانی سے اس کو انگیز کر لیتے، زبان پر شکایت یا ملامت کا لفظ نہیں آنے دیتے، طالب علمی کے زمانہ میں مکہ تشریف لے گئے اور ابن سماعہ کے مکان میں قیام کیا، اتفاقاً ایک دن ان کے کپڑے اور جملہ سامان چوری ہو گیا، قیام گاہ پر واپس آئے تو ابن سماعہ کی والدہ نے اس کی خبر کی، آپ خاموش رہے اور صرف اس قدر فرمایا کہ میری تختیاں کیا ہوئیں جن پر میں حدیثیں لکھتا تھا۔ (۲)

وقار ومتانت: طبیعت میں وقار تھا اس لیے عام لوگوں سے ملنا جلنا، خواص کے یہاں

---

(۱) ایضاً باختلاف صفحات وتاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۱۴ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۷۔

آمد ورفت، بازاروں میں چلنا پھرنا ناپسند تھا، لطف وتفریح کے کاموں سے اس لیے پرہیز کرتے تھے کہ اس سے علم کی عظمت ختم ہوجاتی ہے، اگر کبھی متوکل کے دربار میں حاضر ہونا پڑا تو علم کی آن بان اور شان وشکوہ میں فرق نہ آنے دیا۔(۱)

آپ کی متانت پر مزاح بھی بار ہوتا تھا اس لئے آپ کے اساتذہ بھی اس کا لحاظ کرتے تھے، ایک دن یزید بن ہارون نے اپنے شاگردوں کے سامنے مزاح کی کوئی بات کہی، بعد میں ان کو معلوم ہوا کہ امام احمد بھی موجود تھے تو سخت شرمندہ ہوئے اور سر پر ہاتھ مار کر فرمایا کہ اگر تم لوگوں نے بتادیا ہوتا کہ وہ موجود ہیں تو میں مذاق نہ کرتا، ایک روز اسماعیل بن علیہ کے شاگرد کسی بات پر ہنسے تو وہ سخت برہم ہوئے اور فرمایا کہ امام احمد کی موجودگی میں تم لوگ ہنسی مذاق اور بے شرمی کی باتیں کرتے ہو۔

خلوت پسندی: خلوت پسند تھے اژدہام اور ہنگامہ آرائی کو سخت ناپسند کرتے تھے، جنازہ، جماعت اور عیادت کے علاوہ گھر سے باہر نہیں نکلتے تھے مگر ان کے فضل وکمال نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنادیا تھا، اس لیے ہر وقت طلبہ اور شائقین علم کا ہجوم رہتا تھا۔

نظافت وپاکیزگی: طبیعت نظافت پسند تھی، گندگی سے سخت نفرت تھی، اکثر باوضو رہتے، ہمیشہ صاف ستھرے کپڑوں میں نظر آتے رہے۔(۲)

ذریعہ معاش: امام صاحب کی آمدنی کا اصل ذریعہ صرف ایک آبائی جائداد تھی جس سے کل سترہ درہم ماہوار کرایہ ملتا تھا، اسی میں تنگی ترشی سے بسر کرتے اور خدا کا شکر بجالاتے، اتنی حقیر آمدنی اہل وعیال کے خرچ کے لیے بالکل ناکافی تھی، اس لیے اکثر گھر میں فاقہ ہوتا تھا، کئی کئی دن تک چولھا جلنے کی نوبت نہ آتی، مگر فقر وفاقہ کا اثر کسی پر ظاہر نہ ہونے دیتے اور کسی کا تحفہ اور ہدیہ قبول کرتے، ایک مرتبہ آپ کی والدہ کے پاس کپڑا نہ تھا، ایک صاحب نے

(۱) العبر ج۱ص ۴۳۵ (۲) تاریخ بغداد ج۴ص ۱۱۶ وتاریخ ابن عساکر ج۲ص ۳۰، ۳۵، صفۃ الصفوۃ ج۲ص ۱۹۰۔

ہدیہ کرنا چاہا تو منظور نہیں کیا، آپ کے احباب آپ کی حالت دیکھ کر آپ کی خدمت کرنا چاہتے، مگر انکار کر دیتے، آپ کے صاحبزادہ صالح کا بیان ہے کہ وہ اکثر لوگوں کی پیش کش مسترد کر دیتے اور ہمیشہ یہی فرماتے کہ الحمد للہ ہم لوگ آرام وعافیت سے ہیں، حالانکہ گھر میں ایک حبہ بھی نہیں ہوتا تھا، محنت ومزدوری کر لینا پسند تھا مگر کسی کے سامنے دست طلب دراز کرنا گوارا نہ تھا، ایک مرتبہ یمن میں تھے تو کپڑے چوری ہو گئے، کئی دن گھر سے نہ نکلے، جب لوگوں کو تلاش ہوئی اور حال معلوم ہوا تو کچھ روپیوں کا انتظام کیا گیا مگر آپ نے صرف ایک دینار قبول کیا اور اس کے معاوضہ میں ایک تحریر لکھی، بعض اوقات ازار بند بن کر فروخت کر کے اخراجات پورے کرتے تھے، گھر میں پھٹا پرانا بوریا تھا اسی پر بیٹھتے تھے، انتقال کے وقت گھر میں چند چیتھڑوں کے علاوہ کچھ نہیں نکلا۔

غذا: غذا بہت سادہ اور معمولی تھی، خشک روٹی کا ٹکڑا پانی سے تر کر کے نمک سے کھایا کرتے، پھلوں میں خربوزے سے شوق تھا، اکثر سرکہ کا استعمال کرتے، ایک درہم کی چربی مہینہ بھر کے لیے کافی ہوتی، آخر عمر میں چربی کھانا بھی چھوڑ دیا تھا، بیماری کے دنوں میں بھی نمک، سرکہ، اچار اور روٹی آپ کی خوراک تھی، ایک مرتبہ روزہ سے تھے، شام کو گھر سے افطار آیا، امیر بغداد نے کہا ذرا میں بھی دیکھوں، دیکھا تو چند روٹیاں اور کھیرا نکلا، اس نے کہا یہی سادگی اور قناعت تو آپ کو ہماری دعوتیں قبول کرنے نہیں دیتی، متوکل کے یہاں سے پر تکلف کھانا آتا مگر آپ ستو پر قناعت کرتے، اس نے ایک دفعہ دس ہزار درہم بھجوائے، امام صاحب نے سب صدقہ کر دیا، علی بن جہم نے کہا امیر المومنین ان کو مال ودولت سے کیا سروکار، ان کے لیے تو ایک نان جویں کافی ہے، خلیفہ نے کہا تم صحیح کہتے ہو۔(۱)

لباس: آپ کا عام لباس قمیص اور ازار تھا، سر پر عمامہ بھی باندھتے تھے، موٹا جھوٹا مگر سفید اور صاف ستھرا کپڑا زیب تن فرماتے تھے۔

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۸، ۳۹ وصفۃ الصفوہ ج ۲ ص ۱۹۰۔

حلیہ: رنگ ملیح مائل بہ سپیدی تھا، مگر چہرہ نہایت خوبصورت اور بارونق تھا، قد ایک روایت کے مطابق لانبا اور دوسری روایت کے مطابق میانہ اور درمیانی تھا، آخر میں داڑھی کے چند بال سفید ہو گئے اس لیے حنا کا خضاب لگاتے تھے۔(۱)

ابتلاء اور آزمائش

عباسی خلفا کے دور میں عجمی روح کی کارفرمائی اور یونانی منطق وفلسفہ کے اثرات نے عربوں کے سادہ مذاق طبیعت کو بدل دیا اور وہ سادہ اور سہل دین حنیف پر عقیدہ رکھنے کے بجائے لایعنی موشگافیوں اور فلسفہ وکلام کے غیر ضروری مباحث میں الجھ کو مختلف گروہوں میں بٹ گئے، ان میں فرقہ معتزلہ زیادہ مشہور اور ممتاز ہے، اس نے دین کی حفاظت وخدمت کا کام بھی انجام دیا لیکن اس کی بدولت مذہب میں نئے نئے اور بے بنیاد مسائل بھی پیدا ہو گئے، اس لئے محدثین جن کا مقصدِ زندگی احیائے سنت اور رد بدعت تھا، معتزلہ کے عقائد وافکار کے خلاف صف آرا ہو گئے، معتزلہ کے ان مسائل میں خلقِ قرآن کا مسئلہ بھی تھا۔

ہارون رشید کے زمانہ تک اس عقیدہ کو ماننے والے بہت تھوڑے لوگ تھے اور وہ بھی اپنے عقیدہ کا اعلان نہیں کرتے تھے، بشر مریسی کے متعلق جب خلیفہ کو معلوم ہوا کہ وہ اس عقیدہ کا قائل ہے تو اس نے قسم کھائی کہ اگر یہ شخص مجھ کو مل گیا تو میں اسے نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالوں گا۔(۲)

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۹، ۳۰، تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۸ (۲) احمد ابن حنبل والمحنۃ ص ۴۸، ۴۹۔

اس کے بعد مامون خلیفہ ہوا، وہ بڑا علم وادب نواز اور علما وشعرا کا قدرداں تھا، بچپن ہی میں اس کو برامکہ کی صحبت میسر آئی، فلسفہ کے مطالعہ اور مختلف زبانوں کی تعلیم اور غیر قوموں کے علما کی صحبت ومعاشرت کے اثر سے وہ عقل پرست اور آزاد خیال ہوگیا، اس لیے ہارون رشید کے زمانہ میں جو معتزلہ گوشہ گیر تھے وہ اس کے زمانہ میں کھل کر میدان میں آگئے اور رفتہ رفتہ اس کے دربار سے وابستہ ہوگئے، مامون کی تائید وسرپرستی نے معتزلہ کے اثر ورسوخ کو بہت بڑھادیا اور انھوں نے بزور شمشیر لوگوں سے خلق قرآن کا اقرار کرانا چاہا، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے محدثین وفقہا کی ایک جماعت جس کے سربراہ امام احمد ابن حنبل تھے، آگے بڑھی، معتزلہ کی قیادت احمد بن ابی داؤد (م ۲۴۰ھ) کے ہاتھ میں تھی جو نہایت فاضل ولائق شخص تھا، شروع میں مامون کو اس مسلک کی جبری تبلیغ واشاعت میں تامل تھا(۱) بلکہ باقاعدہ اس کے اظہار میں بھی پس وپیش تھا،(۲) لیکن احمد بن ابی داؤد کی حکمت وفراست نے اس کو اس پر آمادہ کرلیا اور ۲۱۸ھ میں اس نے اعلان کیا کہ جو لوگ خلق قرآن کا اقرار نہ کریں گے انھیں سخت سزا دی جائے گی۔

اس مسئلہ میں اس کو اتنی ضد پیدا ہوگئی کہ اسی زمانہ میں اس کو رومیوں سے جنگ کرنے کے لیے طرسوس جانا پڑا تو وہاں سے والیٔ بغداد اسحاق بن ابراہیم کو تاکیدی خطوط لکھے کہ لوگوں سے زبردستی اس عقیدہ کا اقرار کرایا جائے اور ممالک اسلامیہ کے تمام علما وفقہا اور مذہبی رہنماؤں سے اس مسئلہ میں ان کی رائیں دریافت کرکے مجھ کو مطلع کیا جائے، اس حکم کی تکمیل میں امام صاحب بھی طلب کیے گئے اور ان سے خلق قرآن کے متعلق سوال کیا گیا، آپ اسحاق کے ردوکد کے باوجود صرف یہی فرماتے رہے کہ ''قرآن خدا کا کلام ہے، میں اس کو مخلوق نہیں کہہ سکتا۔''

اسحاق نے امام احمد اور دوسرے علما کے بیانات قلمبند کرکے مامون کے پاس بھیج

(۱) حیوۃ الحیوان دمیری ج ۱ ص ۱۵ (۲) احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۵۳، ۵۴۔

دیے، مامون نے اس کے جواب پر یہ حقارت آمیز تنقید کی تھی اور امام احمد کے بارے میں لکھا تھا کہ "ان کے بارے میں جو کچھ تم نے لکھا امیر المومنین نے اسے پڑھا، احمد کو بتادو کہ امیر المومنین اس کے مفہوم ومنشا سے پورے طور پر واقف ہیں، اس مسئلہ میں ان کے جاہلانہ عقیدہ سے مطلع ہوئے اس کا خمیازہ بہر حال ان کو بھگتنا پڑے گا۔"

خط کے آخر میں یہ حکم بھی تھا کہ "بشر بن ولید اور ابراہیم بن مہدی کو توقتل کردو اور باقی لوگوں میں جن کو اپنی رائے پر اصرار ہو پا بہ زنجیر میرے پاس بھیج دو، میں خود ان لوگوں کی موت وحیات کا فیصلہ کردوں گا" یہ فرمان جب مجمع عام میں پڑھ کر سنایا گیا تو اس کی ہیبت نے بڑے بڑے لوگوں کے عزم کو متزلزل کردیا اور وہ مامون کے ہم زبان ہو گئے، علامہ قواریری اور سجادہ نے کسی قدر استقلال دکھایا مگر جب پاؤں میں بیڑیاں ڈالی گئیں تو دوسرے دن سجادہ اور تیسرے دن قواریری نے بھی اپنی رائے سے رجوع کرلیا اور صرف امام احمد بن حنبل اور محمد بن نوح آخروقت تک ثابت قدم رہے، اس لیے ان کو مامون کے پاس پابجولاں بھیج دیا گیا مگر ابھی یہ لوگ رقہ ہی میں تھے کہ مامون کے انتقال کی خبر آ گئی۔(۱)

مامون مرتے وقت ہونے والے خلیفہ کو وصیت کر گیا تھا کہ وہ عقیدۂ خلق قرآن کا لوگوں سے اقرار کرائے اور قاضی احمد بن ابی دُواد کو اپنے دربار سے وابستہ رکھے اور جملہ معاملات میں ان کے رائے ومشورہ پر عمل کرے، معتصم باللہ نے اس وصیت پر پورا پورا عمل کیا اور اس معاملہ میں اپنے پیشرو سے بھی زیادہ سخت ثابت ہوا۔

امام احمد مامون کی وفات کے بعد طرسوس سے قید وبند کی حالت میں بغداد لائے گئے، راستہ میں ان کے رفیق محمد بن نوح کا انتقال ہوگیا امام صاحب نے ان کی تجہیز وتکفین کی اور نماز جنازہ پڑھائی (۲) اور وہ اکیلے رمضان کے مہینہ میں بغداد پہنچے اور پیروی

(۱) ملخص از تاریخ طبری ج ۱۱ ص ۱۱۲، ۱۳۳ (۲) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۰۹ والبدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۲۔

میں کئی بھاری بیڑیاں پہنا کر داخلِ زنداں کیے گئے اور پھر سزا کے لیے معتصم باللہ کے سامنے پیش کیے گئے، اس موقع پر لوگوں نے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور کہا آپ کے ساتھیوں میں سے تو کسی شخص نے عزیمت کی یہ راہ اختیار نہیں کی، آخر آپ کیوں اس قدر جوش وہمت سے کام لے رہے ہیں؟ تو آپ نے جواب میں صرف اس قدر فرمایا کہ لِلّٰہ اس قسم کی باتیں کرنے کے بجائے کتاب اللہ اور سنتِ نبوی سے کوئی ثبوت پیش کرو، ان دو چیزوں کے علاوہ میں کسی اور بات کا قائل نہیں، بعض لوگوں نے رخصت اور تقیہ کی حدیثیں پیش کیں، فرمایا لیکن حدیث خباب کے بارے میں کیا کہتے ہو، جس میں ہے کہ ''تم سے پہلے لوگوں کو آروں سے چیر دیا جاتا تھا مگر وہ لوگ اپنے دین سے روگردانی کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے'' آپ کے چچا اسحاق بھی آپ کی رہائی کے لیے کوشاں تھے، انھوں نے امام احمد سے کہا ''تمہارے ساتھی تو اقرار کر کے چھوٹ گئے اور تم قید وبند کی مشقت جھیل رہے ہو، آپ نے فرمایا چچا جان'' جاہل لوگ تو خیر ناواقف ہی ہیں لیکن جب علما تقیہ کا سہارا لیں تو آخر حق کس طرح واضح ہوگا'' اسحاق کا بیان ہے کہ انھوں نے مجھ کو بالکل لاجواب کر دیا۔(۱)

معتصم باللہ کو اس مسئلہ سے اتنی دلچسپی اس لئے تھی کہ اول تو مامون کی وصیت تھی، دوسرے احمد بن ابی دُواد برابر اس کو سختی کرنے پر ابھارتے رہتے تھے، ورنہ وہ امام صاحب کے معاملہ میں نرم تھا، اس نے بار بار آپ کو سمجھانے کی کوشش کی اور یہاں تک کہا کہ احمد میں تم پر اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ شفیق اور مہربان ہوں، اگر تم ذرا بھی اقرار پر آمادہ ہو جاؤ تو تمہیں رہا کر دوں گا اور خود اپنے ہاتھوں سے تمہاری ان بیڑیوں کو کھول دوں گا (۲) ایک مرتبہ وہ امام صاحب کی گفتگو سے متاثر ہو گیا اور اس کی سختی میں بہت کمی آ گئی، مگر ابوداؤد نے یہ کہہ کر پھر ورغلایا کہ اگر آپ نے ان کو سزا نہ دی تو لوگ کہیں گے کہ مامون کے مسلک سے

(۱) احمد بن حنبل والمحنۃ ص ۸۹ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۱۲ و ۲۱۳۔

دستبردار ہو گئے اور .... نے آپ کو زیر کر لیا، یہ سن کر پھر امام صاحب سے بگڑ گیا، امام صاحب کی سزا کی تفصیل خود ان کی زبان سے سننے کے قابل ہے، وہ فرماتے ہیں کہ جب میں معتصم کے قریب گیا تو سلام کرنے کے بعد کچھ دیر خاموش رہا، پھر عرض کیا، امیر المومنین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کس چیز کی تعلیم دی ہے، اس نے کہا لا اِلٰہ اِلّا اللّٰہ کے اقرار وشہادت کی، میں نے عرض کیا کہ ''میں تو اس کی شہادت دیتا ہوں'' پھر حضرت عبداللہ بن عباس کی روایت بیان کی جس میں وفد عبدالقیس کا ایمان کے متعلق سوال اور رسول اللہ کا جواب مذکور ہے، میری گفتگو کے بعد اس نے ابن ابی دواد سے کچھ باتیں کیں اور مجھ سے کہا اگر تمہارا معاملہ میرے پیش رو خلیفہ کے زمانہ سے نہ چلا آتا تو میں تم سے تعرض نہ کرتا، اس کے بعد عبدالرحمٰن کو مجھ سے بحث ومناظرہ کرنے کا حکم دیا، جس کا سلسلہ تین دن تک جاری رہا، میرے دلائل اور براہین کے سامنے سب کو عاجز اور خاموش ہو جانا پڑا، مگر وہ اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے باز نہ آتے، بغداد کے گورنر اسحاق بن ابراہیم نے کہا، امیر المومنین یہ گمراہ اور کافر ہے، اس کو رہا کرنا دانشمندی کے خلاف ہے، خلیفہ نے غضبناک ہو کر کہا تم پر خدا کی لعنت ہو، مجھ کو امید تھی کہ تم میری بات مان لو گے، اب اس نے میرے جسم کے کپڑے اتارنے اور مجھ کو گھسیٹنے کا حکم دیا اور جلادوں کو طلب کیا، میں نے عرض کیا، امیر المومنین خدا سے ڈریے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لایحل دم امرء مسلم یشھد ان لآالٰہ الّا اللّٰہ الا باحدی الثلاث۔	بجز تین صورتوں کے کسی حال میں بھی کسی مسلمان کا جو لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کرتا ہو خون بہانا جائز نہیں۔

دوسری حدیث میں نے یہ پڑھی:

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لاالٰہ الااللّٰہ فاذا	مجھے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے تا آنکہ وہ لا الٰہ نہ کہہ دیں، جب

قالوها عصموا منی دمائهم واموالهم۔	انھوں نے لا الٰہ إلا اللہ کہہ دیا تو ان کی جان ومال محفوظ ہوگیا۔

اس لیے آپ میرے خون کو کیسے حلال سمجھ رہے ہیں، میں نے تو حلال کرنے والے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا ہے، امیر المومنین جس طرح اس وقت میں آپ کے سامنے کھڑا ہوں، اسی طرح آپ کو بھی خدا کے سامنے کھڑا ہونا ہے، میرا خیال تھا کہ اب وہ باز آجائیں گے لیکن لوگ برابر ان کو اکساتے اور مجھ کو کافر اور گمراہ بتاتے رہے، معتصم نے ان کی باتوں سے متاثر ہوکر جلادوں کو مجھے کوڑے مارنے کا حکم دیا، اس حکم پر ہر جلاد دو کوڑے پوری قوت سے لگاتا، اس طرح مجھ کو بہت سے کوڑے لگائے گئے، ہر کوڑے پر مجھے غشی طاری ہوجاتی تھی، جب کوڑے لگانا بند کردیا جاتا تو ہوش میں آجاتا اور دیکھتا کہ معتصم میرے پاس موجود ہے اور کہہ رہا ہے، احمد کیوں نہیں لوگوں کی بات مان لیتے، دوسرے حاضرین کہتے کہ خلیفہ تم سے درخواست کررہے ہیں اور تم ان کی بات بھی ٹھکرارہے ہو مگر میں کسی بات پر دھیان نہ دیتا، میرا اصرار صرف اس قدر تھا کہ:

اعطونی شیئا من کتاب الله او سنة رسوله حتی اقول به۔	میرے سامنے اللہ کی کتاب یا اس کے رسول کی سنت سے کوئی دلیل لادو تب ہی میں تمہاری بات مان سکتا ہوں۔

اس پر مجھ کو زدوکوب کیا جاتا، آخر میں مار کی شدت سے میرے ہوش وحواس بجا نہ رہے اور تکلیف کا احساس تک ختم ہوگیا، اس سے خلیفہ خوفزدہ ہوگیا اور اس نے رہائی کا فرمان جاری کردیا اور پورے اسّی کوڑے زور وقوت سے لگائے جانے کے بعد مین ۲۵ رمضان کو رہا کردیا گیا۔(۱)

حافظ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ امام صاحب کو جب سزا دینے کے لیے لایا گیا

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۱ ص ۲۱۱ تا ۲۱۳۔

تو بغداد میں ایک کہرام مچ گیا تھا اور جب پہلا کوڑا لگایا گیا تو آپ نے بسم اللہ کہا، دوسری مرتبہ لاحول ولاقوۃ الا باللہ کہا، تیسری بار فرمایا القرآن کلام اللہ غیر مخلوق اور چوتھی مرتبہ یہ آیت تلاوت کی، لَنْ یُّصِیْبَنَا اِلَّا مَا کَتَبَ اللّٰهُ لَنَا، محمد بن اسماعیل روایت کرتے ہیں کہ ایک نوجوان کو میں نے یہ کہتے سنا کہ احمد کو ۸۰ کوڑے جتنے زور سے لگائے گئے تھے اگر کسی ہاتھی کو بھی اتنے زور سے مارا جاتا تو وہ چیخ اٹھتا۔(۱)

رہائی کے وقت بھی ابن ابی دواد نے مزاحمت کی مگر اس کا بس نہ چلا معتصم باللہ نے ایک بہترین خلعت اور سواری دے کر روانہ کیا، آپ کے ہمراہ جم غفیر تھا، گھر آنے کے بعد آپ نے خلعت فروخت کر کے اس کی قیمت غربا و مساکین میں تقسیم کر دی۔(۲)

رہائی کے بعد معتصم باللہ کو امام صاحب کے ساتھ اتنی سختی برتنے پر ندامت ہوئی، اسحاق کو تاکید کی کہ امام صاحب کی خیریت سے برابر مطلع کرتا رہے، وہ ہر روز آپ کے گھر جا کر مزاج پرسی کرتا تھا، خلیفہ کی طرف سے طبی امداد بھی بہم پہنچائی گئی، جب امام صاحب صحت یاب ہو گئے تو وہ بہت خوش ہوا اور سارے مسلمانوں میں بھی مسرت کی لہر دوڑ گئی۔(۳)

ابتلا کے بعد امام صاحب بہت کمزور ہو گئے، پشت پر ضرب کے جو نشانات پڑ گئے تھے، وہ ہمیشہ باقی رہے، کلائی میں ایسا کاری زخم لگا تھا کہ عمر بھر اس کی تکلیف محسوس کرتے رہے، آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "اللہ ابو الہیثم کی مغفرت کرے" آپ کے فرزند عبداللہ نے دریافت کیا یہ کون شخص ہے؟ فرمایا جب مجھ کو کوڑے لگانے کے لئے جلادوں کے درمیان کھڑا کیا گیا تو ایک نوجوان نے پیچھے سے میرا دامن کھینچا اور کہا مجھ کو جانتے ہو؟ میں نے کہا نہیں، اس نے بتایا کہ میں مشہور عیار و شاطر ڈاکو ابو الہیثم ہوں، مجھے دنیا کے چند معمولی خزف ریزوں کے لئے مختلف وقتوں میں اٹھارہ ہزار کوڑے لگائے گئے مگر

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۸ (۲) احمد والمحنۃ ص ۱۳ (۳) ایضاً۔

میں اپنے شیطانی اعمال سے باز نہیں آیا، تم کو خدا کی راہ میں مارا جائے گا اس لئے تمہارے دل میں راہ حق سے انحراف کا خیال بھی نہیں آنا چاہئے مجھ پر اس بات کا بڑا اثر ہوا اور اس سے بڑی تقویت حاصل ہوئی اب بھی جب ضرب کی شدت محسوس ہوتی ہے تو اس شخص کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور اس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ (۱)

امام احمد نے سوائے ابن ابی دواد کے ان تمام لوگوں کو جنھوں نے آپ کے ساتھ یہ ظالمانہ برتاؤ کیا تھا، معاف کر دیا، ابن ابی دواد کے بارے میں فرماتے تھے کہ اگر وہ اس فتنہ کا داعی و محرک نہ ہوتا اور اپنی بدعتوں سے باز آ جاتا تو اسے بھی معاف کر دیتا، واثق باللہ نے عفو خواہی کی تو ارشار فرمایا کہ رسول اللہ کے خاندان سے تمہاری قرابت و تعلق کی بنا پر میں نے اول روز ہی تمہیں معاف کر دیا تھا۔ (۲)

معتصم باللہ کے بعد واثق باللہ خلیفہ ہوا، یہ بھی اس مسئلہ میں بڑا سخت تھا، اس نے بہت سے محدثین اور علمائے حق کو قید و بند اور قتل کی سزائیں دیں، مشہور صاحب عزیمت بزرگ احمد بن نصر خزاعی کو تختۂ دار پر چڑھایا لیکن امام احمد کے ساتھ کوئی سختی نہیں کی، البتہ ان کو جلا وطن کر دیا، امام صاحب اس کے زمانۂ خلافت بھر روپوش رہے، جمعہ و جماعت کے لئے بھی باہر نہیں نکلتے تھے۔ (۳)

اس کے بعد متوکل خلیفہ ہوا، اس نے ان تمام عقائد و خیالات کو جو کتاب و سنت کے خلاف تھے بالکل روک دیا، امام صاحب کو ابتلا سے نجات دلوائی اور ان کے اعزاز و اکرام کا فرمان جاری کیا اور یہ اعلان بھی کرا دیا کہ قرآن مخلوق نہیں ہے، اس کی خلافت سے معتزلہ کے زور و قوت کا خاتمہ اور ان کا اثر کم ہو گیا۔ (۴)

یہ فتنہ ۲۱۸ھ سے ۲۳۴ھ تک یعنی سولہ سال رہا اور امام احمد نے ۲۸ یا ۳۰ مہینے قید

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۱۹۸ (۲) ایضاً (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵ (۴) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۳۵، الطبقات الکبریٰ شعرانی ج ۱ ص ۴۷۔

وبند اور مشقت ومحن میں گذارے۔(۱)

اس عظیم ابتلا سے جو امام احمد کی ہمت وعزیمت کا غیر معمولی نمونہ ہے، ان کی شہرت ومقبولیت میں بڑا اضافہ ہوگیا، امام صاحب کے دوسرے اوصاف وکمالات میں تو اور لوگ بھی شریک وسہیم تھے لیکن راہ حق میں یہ ثابت قدمی اور اولوالعزمی انھیں کا طغرائے امتیاز ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں ''امام احمد کی ذات گرامی صبر وابتلا اور استقامت علی الحق کے لیے ضرب المثل ہے، تین جابر وقاہر بادشاہوں کے ظلم واستبداد اور غیر معمولی مشکلات وشدائد کے باوجود ان کی استقامت وعزیمت میں فرق نہ آیا، اور نہ وہ کتمانِ حق اور اخفائے علم کے مرتکب ہوئے اور نہ رخصتوں اور تقیہ کا سہارا لیا بلکہ ہر حال میں انھوں نے اپنے کو سنت نبوی اور آثار صحابہ سے وابستہ رکھا اور دین کی اشاعت اور بدعات کا استیصال کرتے رہے، یہ وہ مخصوص فضل وکمال ہے جس میں امام صاحب کا کوئی معاصر صاحب علم ان کا شریک نہیں''(۲)

اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں ''کہ اللہ نے اسلام کو دو آدمیوں کے ذریعہ اعزاز وغلبہ عطا کیا، امت میں ان دونوں کی کوئی مثال نہیں، یعنی حضرت ابوبکر صدیقؓ جنھوں نے فتنۂ ارتداد کے موقع پر اس کا مقابلہ اور اسلام کی مدافعت کی، دوسرے امام احمد جو فتنۂ خلق قرآن کے زمانہ میں پیش پیش رہے۔

بعض بزرگوں نے آپ کی وفات کے بعد خواب دیکھا کہ آپ اس حق گوئی اور صبر واستقلال کی بنا پر خدا کے خاص فضل وانعام سے نوازے گئے۔(۳)

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج۱۰ص۳۳۶ (۲) مجموعۃ الرسائل ص۵ (۳) تاریخ بغداد ج۴ص۴۱۷ و۴۱۸ و۴۲۳، البدایہ والنہایہ ج۱۰ص۳۳۲، ۳۴۲ وطبقات الشافعیہ ج۱ص۲۰۲، ۲۰۴ وابن خلکان ج۱ص۲۸ وتاریخ ابن عساکر ج۲ص۴۲ وتہذیب الاسماء ج۱قسم۱ص۱۵۔

علالت ووفات

۲/ربیع الاول بروز چہارشنبہ کو شدید بخار میں مبتلا ہوئے، ۹/دن تک علالت کا سلسلہ جاری رہا، بیماری کے زمانہ میں عیادت کرنے والوں کا بڑا ہجوم رہتا تھا، مسجدیں بھر جاتیں تھیں، سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کا اتنا مجمع ہوتا تھا کہ آمد ورفت کے راستے بند اور خرید وفروخت دشوار ہوگئی تھی، لوگوں کو جب موقع ملتا تو جوق در جوق حاضر ہو کر سلام عرض کرتے، خلیفہ کو اس اژدہام کی خبر ہوئی تو اس نے گلیوں کے صدر دروازوں پر وقائع نگار متعین کردیے جو لوگوں کو امام صاحب کے حال سے مطلع کرتے تھے، راستہ بند ہوجانے کی وجہ سے زائرین چھپ کر دیواریں پھاند کر امام صاحب کی زیارت کرتے، آخری روز ایک بزرگ داخل ہوئے اور فرمایا احمد خدا کے حضور حاضر ہونے کو یاد کرو تو بے اختیار چیخ نکلی اور آنسو رخسار پر ٹپک پڑے، بھرائی ہوئی آواز میں بچوں کو بلوایا اور ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور انگلیوں میں خلال کرانے کے لیے کہا، وضو کرتے وقت برابر اللہ کو یاد کرتے رہے، وضو کرنے کے بعد روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی، اس سے پہلے ایک موثر وصیت بھی کی تھی۔

تاریخ وفات ۱۲/ربیع الاول ۲۴۱ھ ہے، اس وقت ۷۷ سال کی عمر تھی، ابن خلکان نے ۱۷/ربیع الاول اور مورخین نے رجب اور ربیع الآخر کا مہینہ بھی لکھا ہے، وفات کی خبر مشتہر ہوتے ہی صف ماتم بچھ گئی، گلیوں اور سڑکوں پر صرف آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے جو درد وغم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔

محمد بن طاہر امیر بغداد نے اپنے بچوں اور حاجب کے ہمراہ کفن بھجوایا مگر امام صاحب کے متعلقین نے اس کو لینے سے انکار کیا اور کہا کہ امیر نے جب زندگی میں ان کو ناگوار کاموں سے معاف رکھا تو موت کے بعد بھی معاف رکھیں۔

جنازہ میں اتنا بڑا مجمع تھا کہ صحرائے ابی قیراط سے جہاں جنازہ رکھا گیا تھا سوق رقیق اور قطیعہ کے پل تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے، محمد بن طاہر نے نماز کے بعد شرکا کا تخمینہ لگایا تو تقریباً آٹھ لاکھ مرد اور ساٹھ ہزار عورتیں تھیں، ان کے علاوہ بے شمار آدمی سڑکوں، راستوں اور چھتوں وغیرہ پر تھے، عبدالوہاب وراق کا بیان ہے،.......... کہ جاہلیت اور اسلام کسی زمانہ میں اتنے زیادہ آدمی کسی کے جنازہ میں شریک نہیں ہوئے تھے۔(۱)

امام کے فرزند عبداللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے سنا تھا کہ اہل بدعت اور ہمارے درمیان وجہ امتیاز جنازہ ہے، اللہ نے ان کی بات صحیح کر دی، بلاشبہ وہ امام سنت تھے، آپ کے سب سے بڑے حریف احمد بن ابی دواد کی جو قاضی القضاۃ بھی تھے، موت کی ایک شخص کو بھی پرواہ نہیں ہوئی، صرف حکومت کے ارکان اور وابستگان کی ایک محدود جماعت جنازہ میں شریک ہوئی۔

تجہیز و تکفین کے دن مسجد رصافہ میں جن لوگوں نے عصر کی نماز ادا کی تھی، ان کی تعداد بھی ۲۰ ہزار سے زیادہ تھی حاضرین کی زیادتی کی وجہ سے جنازہ کی نماز کئی بار ہوئی، اور عصر سے پہلے جسد مبارک کو قبر میں نہ رکھا جا سکا، تدفین کے بعد بھی نماز جنازہ کا سلسلہ جاری رہا، امیر بغداد محمد بن عبداللہ بن طاہر نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔

باب حرب کے مقبرہ میں امام صاحب کو دفن کیا گیا، وفات کے بعد بھی ایک عرصہ تک لوگ قبر پر آتے اور کئی دنوں تک نماز جنازہ پڑھتے رہے، مزار مبارک اب تک زیارت گاہ خلائق ہے۔

امام صاحب کی وفات اور مغفرت کے متعلق بعض کرامتیں اور خواب بیان کیے جاتے ہیں، متعدد لوگوں نے آپ کی مغفرت اور عالم آخرت میں آپ کے اعزاز و اکرام کے خواب دیکھے۔

(۱) صفۃ الصفوۃ ج ۲ ص ۲۰۰ و ۲۰۱ و تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۲۲ و تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۴۵ و ۴۶۔

ازواج واولاد

امام احمد نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں، پہلی بیوی عباسہ بنت فضل کے بطن سے بڑے صاحبزادہ صالح تولد ہوئے، ان کی وفات کے بعد ریحانہ سے شادی کی، ان کے بطن سے عبداللہ پیدا ہوئے، جب ریحانہ کا بھی انتقال ہوگیا تو ایک لونڈی کو خرید کر عقد میں داخل کیا، ان سے ۴ لڑکے حسن، حسین، محمد اور سعید اور ایک لڑکی زینب پیدا ہوئیں۔

ابوالفضل صالح: یہ امام صاحب کے سب سے بڑے فرزند اور ۲۰۳ھ میں پیدا ہوئے، کم سنی میں گھر کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی وجہ سے ان کو امام صاحب سے نقل وروایت کا زیادہ موقع نہیں ملا، تاہم ان کے واسطے سے امام صاحب کی حدیثوں کا بڑا حصہ مروی ہے اور وہ فقہ حنبلی کے ناقلین میں بھی شمار کیے جاتے ہیں، آخر عمر میں اصبہان کے قاضی مقرر کیے گئے، جب عہدۂ قضا پر مامور کیے گئے تو رو پڑے اور فرمایا کہ مجھے میرے والد یاد آ گئے، اس لیے رو پڑا، وہ مجھ کو اس حالت میں دیکھنا پسند نہیں کرتے لیکن خدا شاہد ہے کہ میں نے قرضوں کی زیادتی اور اپنے والد کے اہل وعیال کی کفالت ہی کے خیال سے یہ منصب قبول کیا، رمضان ۲۶۶ھ میں وفات پائی۔(۱)

ابوعبدالرحمٰن عبداللہ: یہ نہایت ثقہ وضابط اور بڑے بلند پایہ محدث تھے،(۲) ان کو امام احمد کے علاوہ بھی متعدد کبار محدثین سے روایت کرنے کا فخر حاصل ہے، امام احمد صاحب کی روایتیں سب سے زیادہ انھیں کے واسطہ سے مروی ہیں، انھوں نے امام کی اکثر کتابوں کی بھی روایت کی ہے یکشنبہ ۲۲/ جمادی الاولیٰ ۲۹۰ھ کو انتقال کیا، آپ کے بھتیجے زہیر بن صالح نے جنازہ کی نماز پڑھائی، میت میں ایک بڑے مجمع نے شرکت کی، وفات سے پہلے

(۱) مقدمہ ثلاثیات مسند احمد ص ۱۴، ۱۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۲۹ (۲) الفہرست ابن ندیم ص ۳۴۲۔

دریافت کیا گیا کہ آپ کس جگہ دفن ہونا پسند کریں گے، فرمایا مجھے معتبر طریقے سے معلوم ہوا ہے کہ قطیعہ میں کوئی پیغمبر مدفون ہیں اس لیے اپنے والد کے مقابلہ میں پیغمبر کے قرب وجوار میں دفن ہونا مجھ کو زیادہ پسند ہے۔(۱)

سعید امام صاحب کی وفات سے ۵۰ روز قبل پیدا ہوئے تھے، بعد میں کوفہ کے گورنر بھی مقرر ہوئے، محمد امام کی بیماری کے زمانہ میں چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے۔(۲)

کلام وعقائد

امام احمد فقیہ ومجتہد ہونے کے باوجود عملی اور اعتقادی مسائل میں فقہا اور متکلمین کی طرح زیادہ تحقیق وتدقیق نہیں کرتے تھے بلکہ محدثین کے مسلک کے مطابق جو کچھ ظواہر حدیث سے ثابت ہوتا تھا اسی پر عمل کرتے اور اعتقاد رکھتے تھے، اس لیے جب ان سے اس قسم کے سوالات کیے جاتے تو وہ خاموش رہتے اور ان میں غور وتفتیش کو بدعت بتاتے، ایک شخص نے کرابیسی سے قرآن کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا وہ اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے، اس نے پوچھا متکلم اور قاری قرآن کے جن الفاظ کو پڑھتا اور ادا کرتا ہے اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کرابیسی نے کہا قاری کی قرأت اور متکلم کا قول مخلوق ہے، امام احمد سے اس کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے کہا اس طرح غیر ضروری سوالات اور مباحث میں غور وخوض اور ان کی بحث وتفتیش بدعت اور سکوت افضل ہے،(۳) ایک دفعہ الفاظ قرآن کے بارے میں آپ سے تین بار سوال کیا گیا آپ دو مرتبہ خاموش رہے تیسری مرتبہ امام بخاریؒ نے جواب دیا کہ قرآن اللہ کا کلام ہے مخلوق نہیں، البتہ بندوں کے افعال مخلوق ہیں

(۱) مقدمہ ثلاثیات، مسند احمد ص ۱۵ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۲۹ (۲) مقدمہ ثلاثیات، مسند احمد ص ۱۵، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۴۱ (۳) احمد بن حنبل والمحنہ ص ۴۳۔

لیکن اس طرح کے مسائل میں پڑنا بدعت اور خلافِ سنت ہے۔(۱)

گو امام احمد اس قسم کے مسائل عام مسلمانوں کے سامنے بیان کرنا پسند نہیں کرتے تھے تاہم اقتضاء ضرورت کی بنا پر ان سے اس طرح کے مسائل میں جو آرا منقول ہیں، ان میں بھی احتیاط پوری طرح ملحوظ ہے مثلاً:

صفاتِ الٰہی اور قرآن: قرآن کے بارے میں امام صاحب کی رائے گذر چکی ہے ایک مرتبہ متوکل کو اس مسئلہ کے متعلق جواب دیتے ہوئے تحریر فرمایا ''سلف صالحین قرآن کو کلام اللہ اور غیر مخلوق مانتے تھے اور یہی ہمارا بھی مسلک ہے، میں صاحب کلام نہیں اور نہ اس معاملہ میں کسی قسم کی بحث وتفتیش کو پسند کرتا ہوں، کتاب اللہ سنت نبوی اور صحابۂ کرام وتابعین عظام سے جو کچھ ثابت ومنقول ہے اس سے زیادہ کدوکاوش کو میں معیوب سمجھتا ہوں۔(۲)

وہ اللہ تعالیٰ کو اس کی ان صفتوں سے جو قرآن وحدیث میں بیان ہوئی ہیں متصف مانتے ہیں لیکن ان کی ماہیت وحقیقت پر بحث وگفتگو کو ناپسند اور ان کی دور از کار تاویل کو بدعت سمجھتے تھے، ان کے نزدیک جس طرح اللہ قدیم ہے، اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں اور کلام بھی خدا کی ایک صفت ہے اس لیے وہ قدیم ہے۔

تشبیہ اور جسمیت: وہ اللہ کی تشبیہ اور جسمیت کے قائل نہیں ہیں اسی لیے (وَجَـآءَ رَبُّكَ) سے وَجَآءَ ثَوَابُ رَبِّكَ مراد لیتے ہیں۔(۳)

رؤیت باری: عام اہل سنت والجماعت کی طرح امام احمد بھی عالم آخرت میں مومنین کے لیے اللہ کی رؤیت اور دیدار کے قائل ہیں، اس کے ثبوت میں متعدد قرآنی آیات واحادیث موجود ہیں، امام صاحب صہیب رومی کی ایک روایت سے بھی استدلال کرتے تھے جس میں لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ الآية میں وَزِيَادَةٌ کی تفسیر رؤیت

(۱) احمد بن حنبل والمحنہ ص ۳۵ (۲) ایضاً ص ۱۵۹ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷۔

سے کی گئی ہے۔(۱)

ایمان واسلام: امام احمد کے نزدیک ایمان قول وعمل دونوں سے عبارت ہے اور اس میں کمی بیشی ہوسکتی ہے(۲) ان کا قول ہے کہ کارِ خیر سے ایمان میں اضافہ اور معاصی سے اس میں کمی ہو جاتی ہے، برے کاموں کے ارتکاب سے ایمان سلب ہو جاتا ہے لیکن اسلام باقی رہتا ہے، اسلام اس وقت ختم ہوتا ہے جب آدمی خدا کے ساتھ کسی کو شریک کرتا یا فرائض میں کسی فرض کو تمرد کی وجہ سے ترک کر دیتا ہے، غفلت اور کوتاہی سے اگر کوئی شخص فرض بجا نہ لائے تو یہ خدا کی مرضی پر موقوف ہے کہ اسے عذاب دے یا معاف کر دے۔(۳)

مرتکبین کبائر: مرتکب کبائر کو کافر نہیں سمجھتے تھے، آپ کا قول ہے کہ "اہل توحید میں سے کوئی شخص کافر نہیں ہوسکتا خواہ وہ کبائر کا مرتکب ہی کیوں نہ ہو۔(۴)

لیکن وہ تارک صلوٰۃ کو کافر سمجھتے تھے، اس بارے میں ان کا امام شافعیؒ سے ایک مناظرہ بھی ہوا تھا۔

مسئلہ خلافت: حضرت علیؓ کی ذات سے بڑی عقیدت اور محبت رکھتے تھے لیکن عام صحابہ کی عظمت وبرتری کے بھی قائل تھے، خلفائے ثلاثہ اور حضرت امیر معاویہؓ وغیرہ کسی صحابی کو سب وشتم کرنا ان کے نزدیک معصیت ہے، خلافت کے معاملہ میں ان کا وہی نقطۂ نظر ہے جو عام اہل سنت والجماعت کا ہے، امام صاحب اس کی تائید میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ روایت پیش کرتے تھے:

ماراٰه المسلمون حسنا فهو	جس چیز کو جملہ مسلمان بہتر خیال کریں
عند الله حسن وماراٰوه	وہ اللہ کے نزدیک بہتر ہے اور جس کو
سيئاً فهو عندالله سيئ۔	سب برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی
	برا ہے۔

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۷ (۲) ایضاً (۳) المناقب ابن جوزی ص ۲۱۷ (۴) ایضاً۔

فرماتے تھے کہ تمام صحابہؓ نے حضرت ابوبکرؓ کو رسول اللہ کا خلیفہ منتخب کیا اس سے ان کی فضیلت و بزرگی خود ہی ثابت ہو جاتی ہے، عمر بن عثمان حمصی نے خلافت کے متعلق آپ کی رائے دریافت کی تو فرمایا، پہلے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ ہیں، اس کے بعد حضرت عمرؓ پھر حضرت عثمانؓ اور سب سے آخری خلیفہ حضرت علیؓ ہیں، جو لوگ حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر ترجیح دیتے ہیں وہ درحقیقت ان اجلہ صحابہ اور اہل شوریٰ پر نکتہ چینی کرتے ہیں جنھوں نے حضرت عثمانؓ کو مقدم قرار دیا تھا۔(۱)

فقہ و اجتہاد (۲)

کیا امام احمد فقیہ اور صاحب مذہب نہیں تھے: امام احمد کا شمار ان چار مشہور ائمہ اسلام اور فقہا مجتہدین میں ہوتا ہے جن کے اجتہادی مذاہب پر چوتھی صدی سے اب تک مسلمان عمل کرتے چلے آ رہے ہیں لیکن بعض متقدمین علما کو ان کے فقیہ اور صاحب مذہب ہونے میں کلام ہے، علامہ ابن جریر فرماتے ہیں:

انما هو رجل حديث لا رجل فقه۔ (۳) — وہ صرف محدث ہیں، فقیہ نہیں۔

علامہ ابن عبدالبر نے الانتقا میں محض ائمہ ثلاثہ کا تذکرہ کیا ہے، ابن قتیبہ نے ان کو فقہا کے زمرہ میں شامل نہیں کیا ہے، بشاری مقدسی نے ان کو فقہا کے بجائے اصحاب

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۸ (۲) امام احمد کے حالات اور کارناموں پر موجودہ زمانہ کے مشہور مصری عالم ڈاکٹر ابوزہرہ نے نہایت عمدہ کتاب تالیف کی ہے اور اردو میں اس کے کئی ترجمے ہو چکے ہیں اس کتاب کا یہ حصہ بڑا اہم اور نہایت بیش قیمت ہے، ہم نے بھی یہاں اس سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔ (۳) ضحیٰ الاسلام ج ۲ ص ۲۳۵۔

حدیث میں شامل کیا ہے(۱) مگر ان کے سوا اکثر علما متقدمین نے ان کو بلند پایہ فقیہ و مجتہد بھی مانا ہے اور امامِ فقہ و صاحب مذہب بھی تسلیم کیا ہے، امام شافعی تک نے ان کو فقہ و اجتہاد میں امام بتایا ہے،(۲) اور متاخرین تو امام احمد کو محدث کے بجائے فقیہ ہی کی حیثیت سے زیادہ جانتے ہیں، ساتویں صدی کے مشہور عالم دمیری نے اصحاب المذہب المتبوعہ میں ان کے مذہب کا ذکر کیا ہے(۳) اور اسی صدی کے مشہور مورخ علامہ ابن خلدون کا بیان ہے۔

وقد صار اهل الاسلام اليوم على تقليد هؤلاء الأيمة الاربعة. (۴)	اب مسلمان ان ہی چار اماموں کی تقلید کرتے ہیں۔

علامہ شہرستانی نے مسلمانوں کے اجتہادی مذاہب میں اس مذہب کو بھی شامل کیا ہے(۵)، صاحب مفتاح السعادۃ لکھتے ہیں ''امام احمد ان مجتہدین میں ہیں جن کے اقوال و آرا پر عمل کیا جاتا ہے اور جن کا مذہب اکثر شہروں میں مروج ہے''(۶) صاحب کشف الظنون تحریر فرماتے ہیں ''مشہور مذاہب جن کی صحت مسلم ہے چار ہیں اور وہ امام ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد کی جانب منسوب ہیں''(۷) شاہ ولی اللہ صاحب رسالۂ الانصاف میں محدثین فقہا کے متعلق تحریر فرماتے ہیں ''ان لوگوں نے گذشتہ ائمہ فقہ کی تقلید پر اکتفاء کرنے کے بجائے خود اصول و قوانین متعین کئے ......ان لوگوں میں بھی غیر معمولی فضل و کمال، فقہی بصیرت اور حدیث اور اس کے مراتب و درجات سے واقفیت کے لحاظ سے سب سے زیادہ نمایاں امام احمد ہیں''(۸) اور عقد الجید میں فقہ اسلامی کے مذاہب اربعہ میں اس مسلک کو بھی شامل کیا ہے۔

---

(۱) احسن التقاسیم ص ۴۷ (۲) مختصر صفۃ الصفوہ ص ۲۲۱ (۳) حیاۃ الحیوان ج ۱ ص ۸۱ (۴) مقدمہ ابن خلدون ص ۴۹۱ (۵) الملل والنحل شہرستانی برحاشیہ الملل ابن حزم ج ۲ ص ۴۵ (۶) مفتاح السعادۃ ج ۲ ص ۹۸ (۷) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۰۲ (۸) الانصاف فی بیان سبب الخلاف ص ۱۳۔

علامہ شبلیؒ عہد مامون کے اہل کمال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں: اور خصوصاً امام شافعیؒ اور امام احمد کا تو وہ پایہ ہے کہ اسلامی دنیا کے بڑے بڑے حصوں میں انھیں کے اجتہادی مسائل پر گیارہ سو برس سے آج تک مذہبی قانون بنے ہوئے ہیں۔"(۱)

غرض ساتویں صدی بلکہ اس کے پہلے سے اسلامی فقہ وقانون اور اس کی تاریخ وتدوین کے سلسلہ میں امام احمد کا ایک امام فقہ اور صاحب مذہب کی حیثیت سے ذکر ہوتا چلا آرہا ہے، اس لیے جس طرح ان کا فقیہ ومجتہد ہونا مسلم ہے اسی طرح صاحب مذہب اور امامِ فقہ ہونا بھی بلا ریب ثابت ہے۔

متقدمین کا امام صاحب کو فقیہ وصاحب مذہب کی حیثیت سے تذکرہ نہ کرنا اس بات کی دلیل نہیں کہ وہ آپ کے تفقہ واجتہاد کے قائل نہیں تھے، بلکہ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ امام صاحب پر حدیث کا اثر زیادہ غالب تھا، اس لیے ان بزرگوں نے ان کے نمایاں وصف وامتیاز کے اعتبار سے ان کو فقیہ کے بجائے صرف محدث ہی کہا اور لکھا۔

افتا کے شرائط: امام احمد کے نزدیک علوم قرآن، اسانید صحیحہ، سنن نبوی اور متقدم علما کے اقوال سے پوری واقفیت کے علاوہ مفتی کے اندر مندرجہ ذیل اوصاف پائے جانے ضروری ہیں:

۱۔ اس کی نیت خالص ہو، ۲۔ علم، حلم، وقار اور سکینت سے متصف ہو، ۳۔ علم میں کامل اور صاحب غلبہ واختیار ہو تاکہ جرأت کے ساتھ اپنے فیصلوں کو نافذ کر سکے، ۴۔ بذات خود مکتفی اور مستغنی ہو یعنی دوسروں کا محتاج ودست نگر نہ ہو، ۵۔ لوگوں کے حالات اور ذہنی کیفیات سے باخبر ہو(۲)

فقہ حنبلی کے اصول: حافظ ابن قیم نے امام احمد کے تفقہ واجتہاد کے حسب ذیل اصول بیان کئے ہیں۔

۱۔ نصوص: فقہ حنبلی میں سب سے اہم اور مقدم چیز یہی ہے، اس میں کتاب و

(۱) المامون ج ۲ ص ۱۸ (۲) اعلام الموقعین ج ۳ ص ۲۲۸، ۲۲۴۔

سنت دونوں شامل ہیں اس اصل کے ہوتے ہوئے کسی اور چیز کا کوئی اعتبار نہیں کیا جائے گا۔

۲- **فتاوائے صحابہ:** امام احمد کے نزدیک نصوص کے بعد اسلامی قانون کا دوسرا ماخذ صحابہ کے اقوال وفتاوئی ہیں اور وہ ان کو کتاب وسنت کے بعد ہر چیز پر مقدم قرار دیتے ہیں، اگر کسی مسئلہ میں صحابہ سے مختلف اقوال منقول ہوں تو اس قول کو ترجیح دی جائے گی جو کتاب وسنت سے قریب تر ہو، اگر اس کا اندازہ نہ ہوسکے تو صرف اختلاف صحابہ کو ذکر کر کے خاموشی اختیار کر لی جائے گی اور کسی کو ترجیح نہ دیا جائے گا (۱) دوسرا اصول یہ ہے کہ افضل صحابی کا قول مرجح سمجھا جائے گا، مثلاً:

صحابہ میں اختلاف کی صورت میں خلفا کا قول مرجح مانا جائے گا، یا ایک جانب شیخین ہوں اور دوسری طرف دوسرے خلفا تو شیخین کے قول کو اختیار کیا جائے گا، اسی طرح حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ میں اختلاف کے موقع پر حضرت ابوبکرؓ کی رائے پر عمل کیا جائے گا، ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر ایک ہی درجہ اور مرتبہ کے صحابہ کے درمیان اختلاف ہو تو ایک کا قول دوسرے کے لیے حجت نہ ہوگا، امام صاحب سے اس کی بھی روایت کی گئی ہے کہ وہ اختلاف صحابہ کی صورت میں ان سب کے اقوال پر عمل کرنے کو بہتر سمجھتے تھے اور اپنی رائے سے کسی صحابی کے قول کو مرجوح قرار دینا پسند نہیں کرتے۔ (۲)

بعض لوگ امام صاحب پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ فتاوائے صحابہ کے مقابلہ میں نصوص کی بھی پرواہ نہیں کرتے، علامہ ابن قیم ان لوگوں کے جواب میں لکھتے ہیں:

امام احمد نص کی موجودگی میں اسی کے مطابق فتویٰ دیتے تھے اور اس کے مخالف ہر چیز کو رد فرما دیتے تھے مثلاً حضرت عمرؓ کے برخلاف انھوں نے مبتوتہ کے متعلق فاطمہ بنت قیس کی حدیث اور جنبی کے تیمم کے بارے میں عمار بن یاسرؓ کی حدیث کو صحیح قرار دیا اور حضرت ابن عباسؓ اور ایک روایت کے مطابق حضرت علیؓ کے ایک فتویٰ کو جو سبیعہ اسلمی

---

(۱) اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۴ (۲) ایضاً ج ۳ ص ۴۷۸۔

کی حدیثِ صحیح کے خلاف قرار فرما دیا۔(۱)

۳۔ضعیف و مرسل روایات: تیسرا ماخذ ضعیف و مرسل روایات کو بتاتے ہیں، اسحاق بن ابراہیم ہانی نے ان سے چند مسائل دریافت کئے جن کے متعلق بعض مرسل روایتیں موجود تھیں لیکن صحابہ و تابعین سے بروایت صحیح و باتصال ان کے خلاف فتویٰ موجود تھا تو فرمایا کہ ''صحابہ سے جو کچھ باتصال ثابت ہے وہ مجھ کو زیادہ پسند ہے اور قیاس و رائے پر ان کو ترجیح دی جائے گی، آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے دریافت فرمایا کہ صحیح و صالح اور ضعیف و سقیم روایتوں میں امتیاز نہ کرنے والے محدث اور فقیہ و صاحب رائے میں کس کے فتویٰ پر عمل کیا جائے گا، فرمایا ''میرے نزدیک رائے کے مقابلہ میں ضعیف حدیث پر عمل کرنا زیادہ بہتر ہے''۔

یہ واضح رہے کہ ضعیف سے منکر، باطل اور ایسی حدیثیں مراد نہیں ہیں جن کے راوی متہم ہوں، دوسرے فقہا نے بھی اس اصول کو ایک حد تک اختیار کیا ہے، امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کے علاوہ امام اعظمؒ نے بھی قہقہہ اور نبیذِ تمر سے وضو کئے جانے کے متعلق ضعیف حدیثوں کو قیاس پر ترجیح دیا ہے۔

۴۔قیاس: سب سے آخری چیز قیاس ہے، اور امام صاحب محض ضرورت کے وقت اس کی اجازت اور ممکن حد تک اس سے پرہیز کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، اپنے ایک شاگرد کو تاکید کی کہ

ایاك ان تتكلم فى مسئلة	جس مسئلہ میں اثر موجود نہ ہو اس میں
ليس لك فيها اثر (۲)	بحث و کلام نہ کرو۔

لیکن ظاہریہ کی طرح وہ قیاس کے منکر نہیں ہیں، ان کا قول ہے کہ ''کوئی شخص قیاس سے بے نیاز نہیں ہوسکتا'' البتہ وہ اہل عراق کی طرح قیاس میں زیادہ توسع کے قائل نہ تھے۔

(۱) اعلام الموقعین ج۱ ص۳۲ (۲) ایضاً ج۱ ص۳۱ و ۳۲۔

ان اصول اربعہ کے علاوہ بھی بعض چیزوں کا امام احمد لحاظ کرتے تھے مثلاً اقوال تابعین، استصحاب، مصالح، سد ذرائع اور اجماع وغیرہ، ان کی تفصیل حنابلہ کی کتابوں میں موجود ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ اجماع کے منکر تھے لیکن علمائے حنابلہ نے اس کی جو تشریح کی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ بعض شرطوں کے ساتھ اجماع کے قائل تھے۔

فقہ حنبلی کی خصوصیات: ۱- فقہ حنبل کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کا دارومدار تمام تر حدیث وروایت اور نقل واثر پر ہے، امام صاحب مقدور بھر احادیث سے انحراف اور بے تعلقی پسند نہیں کرتے تھے اور احادیث وآثار پر وسعت نظر کی بنا پر ان کو رائے وقیاس سے بہت کم کام بھی لینا پڑتا تھا، عبدالوہاب وراق کا بیان ہے کہ امام احمدؒ نے ستر ہزار مسائل کا اخبرنا وحدثنا کہہ کر جواب دیا(۱) اس خصوصیت کی وجہ سے اول تو امام صاحب غیر وقوع پذیر مسائل کے بارہ میں فتویٰ دینے سے احتراز فرماتے تھے، دوسرے فقہی تفریعات وتخریجات پر ان کے فتوے مبنی نہیں ہوتے تھے، اس لئے اس فقہ کو تمام تر احکام شرعی پر مبنی کہا جاسکتا ہے۔

۲- حیل ومخارج کا جو دراصل مذہبی قیود اور بندشوں سے بچنے کے ذرائع ہیں حنبلی فقہ میں وجود نہیں ہے۔

۳- بعض حیثیتوں سے فقہ حنبلی میں بڑی وسعت اور لچک بھی پائی جاتی ہے کیونکہ امام صاحب کے نزدیک عبادات اور ان مسائل ومعاملات کو چھوڑ کر جن کی حلت وحرمت کی تصریح موجود ہے، اشیا کی اصل اباحت ہے، اس اصل کو تسلیم کر لینے کے نتیجہ میں حنبلی فقہ کے اندر بڑی لچک اور کشادگی پیدا ہوگئی ہے، اس لئے اگر ایک جانب نصوص شرعیہ سے شدتِ تمسک کی بنا پر اس مذہب میں فقہی استنباط کا دائرہ محدود ہوگیا ہے تو دوسری جانب حرام کرنے والی متعدد پابندیوں کو ختم کر کے اس نے بڑی سہولت بھی پیدا کر دی ہے۔

---

(۱) ترجمہ احمد بن حنبل از ابوزہرہ ص ۲۳۰۔

۴۔ حنبلی مذہب نے اجتہاد کا دروازہ کبھی بند نہیں ہونے دیا اور ہر دور میں حنابلہ کے اندر ائمہ و مجتہدین موجود رہے۔

فقہ حنبلی کے رواۃ وناقلین: امام احمد نے اپنے اقوال وفتاویٰ خود منضبط نہیں کیے بلکہ وہ دوسروں کو بھی ان کے جمع و تدوین سے منع کرتے تھے، مگر بعض ضرورتوں کی بنا پر اس کی اجازت بھی ان سے ثابت ہے اس لئے آپ کی زندگی میں آپ کے مذہب کا چرچا تو ہو گیا تھا مگر وہ آپ کے انتقال کے بعد مرتب و مدون کیا گیا، آپ سے براہ راست علوم کی تحصیل و تکمیل کرنے والے حسب ذیل حضرات ہیں۔

ابوبکر احمد بن اثر، احمد بن محمد بن حجاج مروزی، عبدالملک بن عبدالحمید، صالح بن احمد، عبداللہ بن احمد، حرب بن اسماعیل اور ابراہیم بن اسحاق حربی۔

لیکن فقہ حنبلی کے اصل جامع خلال ہیں۔(۱)

خلال: امام احمد کے اقوال وفتاوے کے اصل جامع و مرتب ابوبکر احمد بن محمد بن خلال (م ۳۱۱ھ) ہیں، انھوں نے ۲۰ سے زائد جلدوں میں امام احمد کے فتوے جمع کئے ان کو امام صاحب سے براہ راست کسب فیض کا موقع نہیں ملا لیکن مذہب میں ان کا درجہ بلند ہے، یہ فقہ حنبلی کے جامع وناقل ہی نہ تھے بلکہ اس کے ناشر بھی ہیں۔

ابوالقاسم خرقی: عمر بن حسین خرقی (م ۳۳۴ھ) بھی کبار حنابلہ میں ہیں، انھوں نے خلال کی کتابوں کی تلخیص اور ان میں اضافہ کیا، ان کی کتاب ''المختصر'' حنبلی مذہب کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے اس کی متعدد شرحوں میں موفق الدین مقدسی کی شرح المغنی زیادہ مشہور اور اہم ہے۔

غلام الخلال: ابوبکر عبدالعزیز بن جعفر (م ۳۶۳ھ) خلال کے مشہور شاگردوں میں تھے، اس لئے ان کو غلام الخلال کہا جاتا تھا، (۲) انھوں نے بھی خلال کی کتابوں کی تلخیص اور ان

(۱) اعلام الموقعین ج ۱ ص ۳۱ (۲) شذرات الذہب ج ۳ ص ۴۵۔

میں اضافہ کا کام انجام دیا۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ اوران کے شاگرد حافظ ابن قیم بھی اس مذہب کے بڑے اہم رکن اور شارح سمجھے جاتے ہیں۔

اسلامی ملکوں میں اس مذہب کی اشاعت: اس مذہب کی اشاعت بغداد سے ہوئی، شروع میں اس کو وہاں غلبہ بھی حاصل تھا، پھر بصرہ اور عراق میں پہنچا، ساتویں صدی میں مصر کے حدود میں داخل ہوا اور قاضی عبداللہ بن محمد حجاوی نے جو ۷۳۸ھ میں عہدۂ قضا پر متمکن تھے اس کی مصر میں عام نشرواشاعت کی، اندلس میں تیسری صدی ہی میں یہ حنبلی مذہب داخل ہو چکا تھا، بقی بن مخلد (۲۰۱، ۲۷۶) وہاں سے بغداد آئے اور امام صاحب سے براہ راست اس کی تحصیل کی اور اندلس واپس جا کر جامع قرطبہ میں اس مذہب کا درس دینا شروع کیا، بشاری مقدسی نے اقلیم اقور، جرجان، رحاب، ماوراء النہر اورسوس وغیرہ میں بھی اس کے (۱) وجود کا ذکر کیا ہے۔

اس زمانہ میں آل سعود کا جو مملکت عربیہ کے سربراہ ہیں یہی مذہب ہے اور سارے بلاد نجد وحجاز میں یہ سرکاری مذہب کی حیثیت سے مروج ہے۔

مذہب حنبلی کے متعلق بعض شکوک واعتراضات: امام احمد کے مذہب ومسلک پر جو شکوک عائد کیے جاتے ہیں ان کی مختصر وضاحت ذیل میں درج کی جاتی ہے:

اتباع سنت: حنبلی مذہب کے متبعین ہر زمانہ میں کم رہے اور مذاہب ثلاثہ کے مقابلہ میں اس کو زیادہ فروغ نہیں نصیب ہوسکا خود حنابلہ کو بھی اس کا اعتراف ہے، ان کا ایک شاعر معترضین کے جواب میں کہتا ہے:

یقولون لی قد قلّ تبعة احمد   وکل قلیل فی الانام ضئیل

(۱) احسن التقاسیم ص۱۲۶ الدیباج المذہب ص۱۳ ومقدمہ ابن خلدون ص۴۹۱ وحسن المحاضرہ ج۱ ص۲۰۵۔

فقلت لهم مهلا غلطتم بزعمكم　　　الم تعلموا ان الكرام قليل

وماضرّنا انا قليل وجارنا　　　عزيز وجار الاكثرين ذليل (۱)

''لوگ کہتے ہیں کہ امام احمد کے متبعین کی تعداد کم ہے اور جو گروہ کم ہوتا ہے اس کو حقیر سمجھا جاتا ہے، میں نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ تم توقف سے کام لو، تمہاری رائے صحیح نہیں ہے کیوں کہ شرفا کی تعداد ہمیشہ کم ہوتی ہے، ہمیں اپنی قلت تعداد کا غم نہیں اور نہ اس سے ہم کو نقصان پہنچ سکتا ہے، اس لیے کہ ہمارے پڑوسی غالب اور مقتدر لوگ ہیں جب کہ ان لوگوں کے جن کی تعداد زیادہ ہے، پڑوسی ذلیل وخوار ہیں۔''

اس جواب میں شاعرانہ تعلی اور مبالغہ زیادہ ہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ تعداد کی قلت وکثرت فیصلہ کن نہیں ہوا کرتی یہاں تک کہ میدانِ کارزار میں بھی صرف کثرت تعداد موثر نہیں ثابت ہوتی اس لیے نہ تو اس کو حق وانصاف کا معیار بنایا جاسکتا ہے اور نہ وہ فی نفسہ فخر ومباہات کی کوئی چیز ہے، علامہ ابن خلدون نے اس کا سبب یہ بتایا ہے کہ ''اس مذہب کو فقہی بصیرت اور اجتہادی شان سے کم سروکار ہے'' مگر یہ بھی صحیح نہیں ہے کیوں کہ عام لوگ نہ تو کسی چیز کو اس کی صحت یا خوبیوں کی بنا پر قبول کرتے ہیں اور نہ غور وفکر کے بعد اس کو اختیار کرتے ہیں، ان کا ردوقبول عموماً پروپیگنڈہ، وقتی سیاست اور بعض اجتماعی عوامل واثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، ذیل میں اس کے چند وجوہ درج کیے جاتے ہیں:

۱۔حقیقت یہ ہے کہ یہ مذہب شاہانہ سرپرستی سے اکثر محروم رہا کیوں کہ امام احمد اپنے زہد وتقویٰ کی بنا پر کبھی دنیوی اعزاز ووجاہت کے طالب نہیں ہوتے بلکہ وہ ہمیشہ امرا وسلاطین کے درباروں سے کنارہ کش رہے، ان کے پیرو بھی ان کی تقلید میں جاہ ومنصب اور سلاطین کے دربار سے بے تعلق رہے، یہ چیز حنبلی مذہب کے ارتقا واشتہار میں بڑی حد تک مانع ثابت ہوئی۔

(۱) اتحاف النبلا ص ۱۸۴ بحوالہ ریحانۃ الاولیا، خفاجی۔

۲- مذاہب اربعہ میں یہ سب سے متاخر ہے اس کی داغ بیل پڑنے سے پہلے ہی دوسرے مذاہب عوام میں مشہور و مقبول اور مختلف ملکوں میں پھیل چکے تھے، ان کی شہرت کے سامنے اس وقت کے دوسرے اجتہادی مذاہب کا جو بعد میں بالکل معدوم ہو گئے چراغ ٹمٹمانے لگا تھا، ان حالات میں کسی نئے مذہب کا لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کر لینا حیرت انگیز ہے، اس حیثیت سے حنبلی مذہب کا یہ بڑا کمال ہے کہ اس نے مذاہب ثلاثہ کی شہرت و ہمہ گیری کے باوجود نہ صرف اپنے کو باقی رکھا بلکہ ایک حد تک خود بھی عوامی اور ہمہ گیری مذہب بن گیا۔

۳- امام احمد اپنی فقہ وافتا کی نقل وتحریر کو پسند نہیں کرتے تھے اور انھوں نے شروع میں بڑی سختی کے ساتھ لوگوں کو اس کی ممانعت کر دی تھی، اس بنا پر بھی ان کے مذہب کی ترقی واشاعت میں رکاوٹ پیش آئی۔

گو حنبلی مذہب کے متبعین کی تعداد ہمیشہ کم رہی تاہم وہ خواص کا مرکزِ توجہ رہا ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں:

> ”چنداں مجتہدین کہ درطریقہ او برخاستند در ہیچ مذہب معلوم نیست
> واگر ہیچ کسے نباشد مگر ابن تیمیہ وابن قیم او برائے موازنہ با تمام علمائے زماں واہل
> سلوک جہاں کفایت است۔“ (۱)

شیخ ابو زہرہ بھی اس کی تائید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”بیشک خواص کا جہاں تک تعلق ہے ان کی کثرت یہیں ملے گی اور اس مذہب کے لیے صرف ابن تیمیہ اور ابن قیم کا وجود کافی ہے۔ (۲)

کثرت وتعدد اقوال: فقہ حنبلی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ اس میں اختلاف روایات اور کثرتِ اقوال بہت ہیں بلکہ بعض مسائل میں متضاد اقوال تک منقول ہیں حالانکہ کثرت

---

(۱) تقصار جیود الاحرار ص ۹۴ (۲) احمد بن حنبل ترجمہ اردو ص ۴۷۳۔

وتعدد اقوال سے کوئی مذہب بھی خالی نہیں اور اس کو ائمہ کی حق پرستی اور اخلاص کا ثبوت سمجھا جاتا ہے، امام صاحب سے ایک ہی مسئلہ میں کثرتِ اقوال کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے زہد واتقا کی وجہ سے کوئی بات علم وثبوت کے بغیر نہیں فرماتے تھے لیکن لوگوں کے اصرار اور کثرت سوال سے مجبور ہو کر بعض اوقات تردد کی حالت میں ان کو فتویٰ دینا پڑ جاتا تھا، اس لیے جب اس کے خلاف صحیح قول معلوم ہو جاتا تو وہ فوراً اپنے قول سے رجوع کر لیتے تھے، اسی طرح صحیح حدیث اور مستند اثرِ صحابی نہ پا کر وہ ضعیف ومرسل روایت کے مطابق بھی فتویٰ دیتے تھے مگر بعد میں جب صحیح روایت اور قولِ صحابی سامنے آتا تو اپنے پہلے فتویٰ سے رجوع فرما لیتے، اس رجوع کی جن لوگوں کو اطلاع ہو جاتی تھی وہ اس کے اور جن کو اطلاع نہیں ہوتی وہ پہلے ہی قول کے مطابق امام صاحبؒ کا مسلک بیان کرتے تھے۔

۲۔ بعض مسائل میں خود روایات اور اقوال صحابہ بھی مختلف ہوتے ہیں جو اگر قوت وصحت کے لحاظ سے یکساں ہوتے اور ان میں ترجیح کی کوئی خاص وجہ نہ معلوم ہوتی تو عام فقہا کے برخلاف امام صاحبؒ خود بھی مسئلہ کو دو قولوں پر چھوڑ دیتے اور ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کے روادار نہ ہوتے۔

قیاس سے عدم تعلق: بعض لوگوں کے نزدیک اس مذہب کو قیاس سے بہت کم سروکار ہے، اس غلط فہمی کی اصل وجہ تو یہی ہے کہ امام صاحب نصوص، آثار، اخبارِ آحاد، مراسیل اور ضعیف روایات بلکہ تابعین اور ائمہ عظام کے اقوال کی موجودگی میں بھی قیاس کرنے کے شدید مخالف تھے اور وہ شدتِ احتیاط وتورع کی بنا پر فرضی اور تقدیری مسائل میں بھی بلاضرورت قیاس کرنے کو ناپسند اور احتیاط وتقویٰ کے منافی سمجھتے تھے، اس لیے عام مذاہب فقہ کے مقابلہ میں اس حیثیت سے اس کو واقعی قیاس سے زیادہ سروکار نہیں ہے، کیوں کہ امام احمد کے نزدیک کسی حدیث کو چاہے وہ خبر واحد ہی کیوں نہ ہو قیاس سے رد نہیں کیا جا سکتا، ان کا اور ان کے متبعین کا خیال ہے کہ قیاس صحیح، حدیث کے معارض نہیں ہو سکتا ہے، علامہ ابن

تیمیہ نے رسالۂ القیاس فی الشرع الاسلامی میں متعدد ایسے مسائل پر جنھیں خلاف قیاس کہا جاتا ہے حالانکہ وہ احادیث سے ثابت ہیں، بحث کر کے دکھایا ہے کہ وہ عین قیاس کے مطابق ہیں، حافظ ابن قیم کی کتابوں میں بھی اس پر مفصل بحثیں موجود ہیں۔

تشدد اور مذہب حنبلی: بعض مسائل میں حنبلی مذہب کی سخت گیری اور تشدد کو بھی مورد طعن بنایا جاتا ہے لیکن اصل میں اس کا سبب یہ ہے کہ امام صاحب اتباع سنت کے جذبہ سے سرشار تھے اس لیے نہ تو وہ دین وشریعت کے خلاف کوئی بات کہنے سننے کے روادار ہوتے تھے اور نہ کسی حال میں احادیث وآثار صحابہ سے دستبردار ہونے کو پسند کرتے تھے، جن چیزوں کو معمولی سمجھا جاتا ہے، ان میں بھی وہ بڑی سختی اور پوری احتیاط برتتے تھے، عام حنابلہ نے بھی آپ کے اتباع میں اس سختی اور شدت کو روا رکھا، بلکہ بعض لوگ تو زہد وتقشف میں اس قدر آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے عوام پر بھی سختی کا دروازہ کھول دیا جس کے نتیجہ میں ایک زمانہ میں بڑی شورش اور ہیجان برپا ہو گیا تھا، علامہ ابن اثیر نے اپنی تاریخ میں ۳۲۳ھ کے واقعات میں اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن حنابلہ کی اس سختی اور شدت کا امام صاحب سے کوئی خاص تعلق نہیں ہے کیوں کہ وہ زیادہ تر اپنی ہی ذات تک سختی کو روا رکھتے تھے اور کمال زہد کی وجہ سے عبادت اور مشروعات میں اپنی طرح دوسروں کے لیے بھی پسند فرماتے تھے کہ وہ احتیاط اور تورع کو اپنا شعار بنائیں، ظاہر ہے ان امور میں اعتدال کے ساتھ شدت وتصلب اختیار کرنا مذموم نہیں ہے، البتہ عام لوگ اعتدال وتوازن کو برقرار نہ رکھنے کی وجہ سے افراط وتفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔

لیکن عبادات اور محظورات سے قطع نظر عقود وشروط اور غیر منصوص امور کی حلت واباحت میں امام صاحب بڑے روادار اور توسع پسند تھے اور دوسرے فقہا کی طرح ان کے یہاں ان چیزوں میں زیادہ شدت اور تنگی نہیں پائی جاتی۔

تصنیفات

امام صاحب کی جانب کئی تصنیفات منسوب ہیں جن میں چند کے علاوہ سب ناپید ہیں۔

۱۔ **کتاب الصلوۃ:** یہ مختصر رسالہ پہلی مرتبہ ہندوستان سے ۴۲ صفحات میں ۱۳۱۱ھ میں امام احمد کے ایک مکتوب کے ساتھ جو مسدد بن مسربل کے نام ہے شائع ہوا تھا، دوسری مرتبہ ۱۳۴۷ھ میں علامہ ابن قیم کے رسالہ کتاب الصلوۃ واحکام تارکیھا کے ساتھ مطبع محمد علی صبیح مصر میں چھپا، اس میں مسنون اور صحیح طریقہ نماز کی وضاحت کی گئی ہے اور متابعت امام کی اہمیت بیان کی گئی ہے رکوع وسجود اور دوسرے ارکان میں امام پر مقتدی کے سبقت کرنے کے متعلق جو ممانعت اور وعیدیں حدیثوں میں مذکور ہیں ان کو جمع کر کے ان کی تشریح کی گئی ہے۔

۲۔ **کتاب الزہد:** مسند کے بعد امام صاحب کی یہ دوسری اہم کتاب ہے، علامہ ابن تیمیہ فرماتے ہیں ''جن لوگوں نے زہد ورقاق کے متعلق حدیثیں جمع کی ہیں ان میں عبداللہ بن مبارک کی کتاب الزہد بڑی اہم ہے لیکن اس میں کمزور اور واہی روایتیں بھی ہیں سب سے عمدہ امام احمد کی کتاب ہے، جس کی ترتیب ناموں پر ہے'' حافظ ابن کثیر بیان کرتے ہیں ''اس موضوع پر متقدمین اور متاخرین علما میں سے کسی کی کتاب بھی اس کے ہم پایہ نہیں ہے'' علامہ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ''یہ مسند کے ثلث کے بقدر ہے اور اس کی متعدد حدیثیں اور آثار مسند احمد میں نہیں ہیں'' اس کا ایک قلمی نسخہ برلین میں ہے، امام احمد کی کتاب الزہد کا ایک حصہ مختصر کتاب الزہد کے نام سے حجاز سے شائع ہو گیا ہے'' آپ کے صاحبزادے عبداللہ نے اس کے زوائد تحریر کئے تھے۔(۱)

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۹، البدایہ والنہایہ ج ۱۰ ص ۳۲۹ وتعجیل المنفعۃ ص ۸ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۸

۳- کتاب التفسیر:

۴- کتاب السنۃ: اس کا مخطوطہ برلین میں موجود ہے(۱) اور غالباً طبع بھی ہو چکی ہے دوسری کتابوں اور رسائل کے نام یہ ہیں، ۵- کتاب طاعۃ الرسول، ۶- کتاب الایمان، ۷- کتاب الاعتقاد، ۸- کتاب الناسخ والمنسوخ، ۹- المقدم والموخر فی کتاب اللہ، ۱۰- کتاب الفرائض، ۱۱- کتاب الفضائل، ۱۲- فضائل الصحابہ، ۱۳- فضائل ابوبکر، ۱۴- فضائل حسنین، ۱۵- مناقب علی، ۱۶- کتاب المسائل، ۱۷- کتاب المناسک، ۱۸- کتاب العلل، ۱۹- کتاب التاریخ، ۲۰- کتاب الاشربہ، ۲۱- کتاب الرد علی الجہمیہ، ۲۲- کتاب الرد علیٰ من ادعی تناقض القرآن، ۲۳ کتاب الرد علی الزنادقہ۔(۲)

ان مستقل تصنیفات کے علاوہ امام صاحب کے فتاویٰ اور مسائل کو بھی خلال نے جامع کبیر میں جمع کیا ہے۔

مسند احمد بن حنبل: امام صاحب کی سب سے مشہور اور حدیث کی اہم ترین کتاب ہے، امام صاحب سے پہلے بھی اس طرح کی کتابیں لکھی گئیں اور بعد میں بھی لیکن کسی مجموعۂ مسانید کو اس قدر شہرت و مقبولیت اور اعتبار و استناد نصیب نہیں ہوا، اس میں عام کتب مسانید کی طرح صحابہ کی ترتیب پر حدیثیں مرتب کی گئی ہیں، ترتیب میں زیادہ تر سبقت فی الاسلام کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن اس اصول کا ہر جگہ التزام نہیں کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ترتیب میں بہت سی غلطیاں ہوگئی ہیں مثلاً مدنیوں کی روایت شامیوں میں اور شامیوں کی مدنیوں میں شامل کر دی گئی ہیں۔(۳)

مسند کے اجزا اور حدیثوں کی تعداد: مسند احمد تقریباً ۱۷/۲ اجزا پر مشتمل اور سات سو صحابہ کی حدیثوں کا مجموعہ ہے جن کی تعداد عام طور سے تیس اور چالیس ہزار بتائی جاتی ہے، شاہ عبدالعزیزؒ صاحب فرماتے ہیں کہ مسند کی اصل روایات تو تیس ہزار ہیں باقی دس ہزار

(۱) تاریخ آداب اللغۃ العربیہ ج ۲ص ۲۴۱ (۲) الفہرست (۳) بستان المحدثین ص ۳۰۔

کے قریب زوائد عبداللہ ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ مکررات کے ساتھ چالیس ہزار اور حذف مکررات کے بعد تیس ہزار حدیثیں ہیں۔(۱)

مسند کے مرویات کی قسمیں: مسند کی حدیثوں کی چھ قسمیں ہیں:

۱- وہ حدیثیں جن کو امام صاحب کے فرزند عبداللہ ان کے حوالے سے بیان کرتے ہیں یہی اصل مسند احمد ہے، اس قسم کی روایتیں ۳-۴ بلکہ اس سے بھی زیادہ ہیں۔

۲- وہ روایتیں جو عبداللہ نے آپ سے اور آپ کے علاوہ دوسرے محدثین سے روایت کی ہیں، اس طرح کی روایات بہت کم ہیں۔

۳- وہ حدیثیں جن کو عبداللہ نے آپ کے بجائے دوسرے شیوخ سے نقل کیا ہے، اس طرح کی حدیثوں کو زوائد عبداللہ کہتے ہیں، ان کی تعداد پہلی قسم سے کم مگر اور قسموں سے زیادہ ہے۔

۴- وہ روایتیں جن کو عبداللہ نے امام صاحب سے تو سنا لیکن آپ کے سامنے ان کی قرأت نہیں کی تھی، اس قسم کی روایتیں بھی بہت کم ہیں۔

۵- ایسی حدیثیں جن کو انھوں نے نہ تو امام صاحب سے سنا اور نہ آپ کے سامنے پڑھا بلکہ آپ کی کتاب یا کسی تحریر سے ان کو نقل کیا ہے، اس قسم کی حدیثیں بھی کم ہیں۔

۶- ابو بکر قطیعی کے زیادات جن کو انھوں نے عبداللہ اور امام احمد کے بجائے کسی اور محدث سے روایت کیا ہے، اس طرح کی روایتیں بہت کم ہیں۔(۲)

امام صاحب کے مسند اور زوائد کا فرق بیان کرتے ہوئے حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ ”زوائد میں ضعیف اور موضوع روایتیں بھی شامل ہوگئی ہیں جن کو ناواقف لوگ امام احمد ہی کی جانب منسوب کرتے ہیں“۔

مسند کی تالیف میں احتیاط: امام صاحب نے مسند کی ترتیب و تالیف میں غیر معمولی احتیاط

(۱) بستان المحدثین ص ۲۹، ۳۰ (۲) الفتح الربانی ص ۸۔

سے کام لیا ہے ان کا خود بیان ہے کہ انھوں نے اس کو ساڑھے سات لاکھ سے زائد حدیثوں سے منتخب ومرتب کیا تھا، علماء فن کا بیان ہے کہ انھوں نے مسند کی تدوین میں صحیح احادیث کی تخریج اپنے اوپر لازم کرلی تھی، ابوموسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ امام احمد نے مسند میں ان ہی لوگوں سے روایتیں نقل کی ہیں جن کی صداقت ودیانت مسلم تھی مطعون لوگوں کی روایات نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے، امام احمد صاحب خود فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو لوگوں کے لئے امام وحجت بنایا ہے تاکہ اختلاف کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کرسکیں، اگر اس میں ان کو کوئی حدیث مل جائے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ کسی ایسی حدیث کو صحیح نہ تسلیم کریں جو اس میں موجود نہ ہو۔(۱)

امام صاحب کی احتیاط کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مسند کے مسودہ میں کانٹ چھانٹ اور حذف وترمیم کرتے رہتے تھے اور اپنے بے نظیر حافظہ کے باوجود وہ محض اپنی یادداشت سے کوئی حدیث بیان کرنا احتیاط کے خلاف سمجھتے تھے، علی بن مدینی کا بیان ہے کہ ''ہمارے رفقا میں امام احمد سے بڑا کوئی حافظ نہ تھا لیکن وہ کتاب سے حدیثیں بیان کرتے تھے اور ہم کو بھی تاکید کرتے تھے کہ جب حدیثیں بیان کریں تو کتاب کو پیش نظر رکھیں'' ابراہیم بن خالد بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ امام احمد کی مجلسوں میں حدیثیں یاد کرتے اور ان پر بحث ومذاکرہ کرتے لیکن ان کو قلمبند کرنا چاہتے تو وہ جھپٹ کر کتاب لاتے اور فرماتے کہ کتاب بہترین یادداشت ہے۔''

فرط احتیاط کی بنا پر کوئی ایسی حدیث نہیں بیان کرتے جو صرف ایک ہی سند سے مذکور ہوتا آنکہ اس کی نظیر نہ مل جائے، احادیثِ فضائل وغیرہ میں کچھ نرمی گوارہ بھی کرلیتے تھے لیکن احکام وحدود کی روایتوں میں ذرا بھی تساہل گوارا نہیں تھا، فرماتے ہیں ''فضائل

(۱) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۱ ص ۲۱۸ ومعجم المصنفین ج ۲ ص ۳۳۴، ۳۳۵ وکشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۱ وحجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷۔

اعمال اوران کی ترغیب وجزاوغیرہ سے متعلق اگر کوئی حدیث ہم کو معلوم ہوتی ہے تو اس میں زیادہ شدت سے کام نہیں لیتے لیکن حدود، کفارات اور فرائض وغیرہ سے متعلق روایتوں میں بڑی چھان بین اور پوری سختی اور احتیاط برتتے ہیں۔''(۱)

مسند کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ: گو محدثین کے نزدیک مسانید کا درجہ سنن سے کم تر ہے لیکن مسند احمد کی حیثیت عام مسانید سے مختلف ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو دوسرے درجہ کی کتابوں یعنی سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور مجتبی النسائی کے لگ بھگ اور تیسرے درجہ کی کتابوں سے جس میں عام جوامع ومسانید شامل ہیں، اس کو اہم اور ممتاز قرار دیا ہے'' حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ'' مسند احمد کی حدیثوں کی نوعیت عام کتب مسانید سے مختلف ہے، ابوالحسن علی بن احمد ہیثمی لکھتے ہیں کہ'' وہ دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور بہتر ہے۔''(۲)

مسند احمد کا شمار ان اہم اور امہات کتب میں ہوتا ہے جن پر ملت اسلامیہ کا ہمیشہ اعتماد واعتبار رہا ہے اور جن سے محدثین نے ہر زمانہ میں اخذ واستفادہ کیا ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں'' وہ اس امت کی اساسی اور بنیادی کتابوں میں ہے'' ابوموسیٰ مدینی کا بیان ہے کہ'' مسند ایک اہم اصل اور محدثین کے لیے قابل وثوق مرجع ہے'' مسند کے بارہ میں عام فیصلہ یہ ہے کہ'' کتب صحاح ستہ بشمول مؤطا امام مالک اور مسند احمد اصل دارو مدار اور اعتماد کی چیزیں اور روز روشن کی طرح نمایاں اور مشہور ہیں''

صحت وجودت کے لحاظ سے بھی مسند کی اہمیت کم نہیں ہے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں'' مسند کے زوائدِ صحیحین، ترمذی اور ابوداؤد کے زوائدِ صحیحین کے مقابلہ میں کم ضعیف ہیں، اس کی ہر روایت مقبول اور ضعیف روایتیں بھی حسن سے قریب تر ہیں'' احمد عبدالرحمٰن

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۳۲ وتہذیب الاسماء واللغات ج اقسم اول ص ۱۱۱، الطبقات الکبریٰ شعرانی ج ۱ ص ۴۶ شذرات الذہب ج ۱ ص ۹۸ (۲) التنقیح فی اصول الحدیث ص ۴۰، حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷، تدریب الراوی ص ۵۷۔

بنا ساعاتی نے لکھا ہے کہ ''امام احمد کا قابلِ تعریف کارنامہ اور امت پر زبردست احسان یہ ہے کہ انھوں نے لوگوں کے لیے مسند جیسی مشہور کتاب کی تخریج کی جس کی اہمیت کا ہر زمانہ کے محدثین نے اعتراف کیا اور کہا ہے کہ وہ صحیحین کے بعد تمام کتب احادیث میں سب سے زیادہ صحیح حدیثوں کی جامع ہے۔''(۱)

خصوصیات: ۱-مسند احمد کی سب سے بڑی اور اہم خصوصیت تو یہی ہے کہ وہ حدیث کی اہم معتبر اور صحیح کتابوں میں ہے۔

۲-مسند سے بڑا اور ضخیم کوئی مجموعہ حدیث نہیں، حافظ ابن کثیر، ابوبکر ہیثمی اور علامہ ابن حجر نے لکھا ہے کہ اس سے زیادہ حدیثیں کسی کتاب میں نہیں ہیں۔

۳-احادیث کے دوسرے مجموعوں میں جو روایات متفرق طور پر پائی جاتی ہیں، ان کا اکثر حصہ اس میں موجود ہے، اس لحاظ سے وہ حدیث کی سب سے زیادہ جامع کتاب ہے، ایک مرتبہ ابوالحسن یونینی سے دریافت کیا گیا کہ ان کو صحاح ستہ زبانی یاد ہیں، انھوں نے کہا یاد بھی ہیں اور نہیں بھی، لوگوں نے پوچھا یہ کیسے؟ فرمایا کہ مجھ کو مسند احمد بن حنبل یاد ہے جس میں چند کے علاوہ صحاح کی تمام حدیثوں کی اصل موجود ہے اس اعتبار سے گویا میں ان کا بھی حافظ ہوں، بعض علما کا بیان ہے کہ ''اگر کسی کو تمام کتابوں کی جامع کوئی ایسی کتاب مطلوب ہو جس کا مصنف بھی عظیم و برتر ہو تو اسے مسند احمد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔(۲)

۴-مسند کا تصنیفی حسن، اخبار و روایات کا تناسب اور بہتر انتخاب بھی اس کی ایک خصوصیت ہے، اہل نظر اور مبصرین کا خیال ہے کہ وضع و تالیف کے لحاظ سے وہ بے مثال کتاب ہے، علامہ ابن حجر نے علامہ ابن صلاح کا جواب دیتے ہوئے مسند کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا ہے اور ابن کثیر فرماتے ہیں کہ حسن بیان و سیاق کے لحاظ سے کوئی کتاب اس کے برابر نہیں۔

---

(۱) الفتح الربانی ص ۱۷۸ (۲) حواشی سعدی ص ۱۵ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۰۔

۵- مسند میں تین سو ثلاثی حدیثیں ہیں۔

۶- عام کتابوں کی جملہ خصوصیات بھی اس میں موجود ہیں۔

زمانہ تصنیف: امام صاحب مسند کی جمع و تدوین میں اسی وقت سے مصروف ہو گئے تھے، جب انھوں نے علم حدیث کی طلب و تکمیل شروع کی تھی اور عمر بھر اس میں مشغول اور حذف و اضافہ کرتے رہے، صاحب المنہج نے لکھا ہے کہ ۱۸۰ھ میں مسند کی تالیف شروع کر دی تھی اور شمس الدین جزری فرماتے ہیں کہ باقاعدہ تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرما گئے تھے۔''(۱)

تہذیب و تنقیح: مسند کو امام صاحب نے مسودہ کی صورت میں چھوڑا تھا اس لیے آپ کے بعد آپ کے صاحبزادہ حضرت عبداللہ نے اس میں بعض اضافے کر کے اس کی باقاعدہ تہذیب و تنقیح کی، علامہ شمس الدین جزری کا بیان ہے ''امام احمد نے مسند کو جمع کرنا شروع کیا اور اس کو الگ الگ ورقوں میں لکھ کر جدا جدا جز میں تقسیم کیا مگر اس کی تکمیل سے پہلے ہی انتقال فرما گئے۔ البتہ آخر عمر میں انھوں نے اپنی اولاد اور گھر والوں کو جمع کر کے اس کو سنا دیا تھا، آپ کے انتقال کے بعد آپ کے صاحبزادے نے اس کو مرتب کیا اور مسند کی روایات کے مشابہ و مماثل مسموعات بھی اس میں شامل کر دیے'' مسند کا موجودہ متداول نسخہ عبداللہ ہی کا مرتب کیا ہوا ہے لیکن اس کی فروگذاشتوں کی بنا پر بعض لوگوں نے اس کو از سر نو مرتب کیا، اصفہان کے بعض محدثین نے اس کو ابواب پر ترتیب دیا تھا مگر یہ نسخہ معدوم ہے، حافظ ناصر الدین نے بھی ابواب پر مرتب کیا تھا مگر دمشق میں حادثۂ تیمور کے وقت ان کا نسخہ ضائع ہو گیا، ابوبکر محمد بن عبداللہ بن محی الدین صامت نے حروف معجم پر مرتب کیا تھا۔(۲) حال میں مصر کے ایک فاضل احمد عبدالرحمٰن البنا ساعاتی نے الفتح الربانی کے نام سے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے حاشیہ پر ان ہی کے قلم سے بلوغ الامانی کے نام سے اس کی شرح بھی ہے،

---

(۱) احمد بن حنبل لابی زہرہ بحوالہ المنہج جز اول (۲) بستان المحدثین ص ۲۹، و بلوغ الامانی ص ۲۰ و ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۱۰ بحوالہ المصعد الاحمد۔

اس کی ۵ جلدیں ۱۳۵۵ھ میں شائع ہوئی تھیں اس میں مکررات کو حذف کر دیا گیا ہے، ربوہ سے بھی ابھی حال ہی میں ایک جلد شرح و تعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

شروح وحواشی: مسند کے شروح، تعلیقات اور مختصرات کے نام یہ ہیں:

۱-شرح مسند: یہ علامہ ابوالحسن بن عبدالہادی سندی (م ۱۱۳۸ھ) کی ضخیم شرح ہے۔

۲-الدر المنتقد: یہ مسند کا مختصر اور شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن (م ۸۰۵ھ) اور شیخ زین الدین عمر بن احمد شماع جلبی کی تالیف ہے۔

۳-عقود الزبرجد: یہ تعلیق علامہ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ نے حروف معجم پر مرتب کی ہے۔

۴-غرائب مسند: ابوعمر محمد بن عبدالواحد (م ۳۴۵ھ) کی تالیف ہے۔

مجمع الزوائد ومنبع الفوائد: ابوالحسن علی بن ابوبکر ہیثمی (م ۸۰۷ھ) نے اس کو ابواب پر مرتب کیا ہے جو ۶ جلدوں پر مشتمل اور امام احمد، بزار، ابویعلی موصلی کے مسانید اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ کی ان حدیثوں کا مجموعہ ہے جو صحاح میں شامل نہیں ہیں، اس کے بعض اجزاء کے قلمی نسخے دارالکتب المصریہ میں موجود ہیں، نواب صدیق حسن خاں صاحب نے ایک جز ۱۳۰۸ھ میں ۲۸۸ صفحات میں ایک مقدمہ کے ساتھ دہلی سے شائع کیا تھا۔

۶-جامع المسانید: اس کو علامہ ابن کثیر نے ۸ جلدوں میں مرتب کیا ہے اور اس میں مسند احمد، مسند بزار، مسند ابویعلی، طبرانی کی معجم کبیر اور صحاح کی حدیثیں شامل کی ہیں، اس کے دو قلمی نسخے دارالکتب المصریہ اور کوبرلی وغیرہ میں ہیں۔

۷-جامع المسانید والالقاب بالخص الاسانید: اس میں علامہ ابن جوزی نے صحیحین، ترمذی اور مسند احمد کی حدیثیں ۷ جلدوں میں مسانید پر مرتب کی ہیں۔

۸-اطراف المسند المعتلی باطراف المسند الحنبلی: یہ حافظ ابن حجر کی تالیف اور دو جلدوں پر مشتمل ہے۔

۹-جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد: صحاح کے علاوہ احمد، دارمی، ابویعلی،

بزار کے مسانید اور طبرانی کے معاجم ثلاثہ کی روایتوں پر مشتمل ہے اور ابو عبداللہ محمد بن سلیمان مغربی متوفی ۱۰۹۴ھ کی تالیف ہے۔

۱۰- منتقی الاخبار فی الاحکام: شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے کتب صحاح اور مسند احمد کی حدیثوں کا اس میں انتخاب کیا ہے، علامہ شوکانی نے نیل الاوطار کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔(۱)

۱۱- ثلاثیات مسند: محب الدین وضیاء الدین مقدسی نے اس میں مسند کی ثلاثی روایتوں کی تخریج کی ہے، شمس الدین سفارینی حنبلی نے اس کی شرح لکھی ہے، اصل اور شرح پہلی مرتبہ مکتب اسلامی دمشق سے ۱۳۸۰ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

۱۲- فہرست رجال مسند: مولانا نجم الدین اور مولانا نور الحق نے رجال مسند کی ایک مفصل اور جامع فہرست اردو میں مرتب کی ہے جو رسالہ اورینٹل کالج لاہور میں چھپ چکی ہے۔

مسند پر بعض اعتراضات: مسند پر اعتراضات بھی کئے گئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- مسند میں مکررات ہیں لیکن درحقیقت یہ کوئی عیب نہیں بلکہ ایک طرح کی خوبی ہے کیونکہ تکرار کا مقصد کثرت اسناد، تعدد طرق، اختلاف متن اور متابعات وغیرہ کو ظاہر کرنا ہے، محدثین ایک ہی حدیث کو ایک صحابی سے متعدد طرق اور مختلف الفاظ کے ساتھ صرف اس لئے روایت کرتے ہیں کہ احادیث کا استقصا واحاطہ بھی ہو جائے اور وہ محفوظ ومدون بھی ہو جائیں اسی لئے صحیحین اور جملہ کتب معتبرہ میں بھی بکثرت مکرارت پائے جاتے ہیں اور مسانید میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں نقل کئے جانے کی وجہ سے تکرار ناگزیر بھی ہے۔

---

(۱) کشف الظنون ج دوم صفحات ۴۳۱، ۴۳۲، ۱۲۶، ۱۵۶، ۳۸۵، حصہ اول ص ۳۸۵ و بلوغ الامانی ص ۲۰ و بستان المحدثین ص ۲۲، الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۴، ۱۲۹، ۱۴۴، مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۴۰، مفتاح السنۃ ص ۱۱۱ و ۱۱۳ و معجم المطبوعات ج ۲ کالم ۱۹۰۳، فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اص ۳۲۳۔

۲- بعض صحیح روایتیں مسند میں نہیں ہیں، یعنی ایسی متعدد حدیثیں جو صحیحین اور کتب معتبرہ میں پائی جاتی ہیں مسند میں نہیں ہیں، حالانکہ امام صاحب کا دعویٰ ہے کہ اس میں جملہ صحیح احادیث درج ہیں، اگر اس دعویٰ کی نسبت امام صاحب کی جانب صحیح ہے تو غالباً اس زمانہ مین وضع حدیث کے عام فتنہ کے پیش نظر آپ نے ایسا فرمایا ہوگا تاکہ لوگ غلط روایتوں اور وضعی حدیثوں سے محتاط رہیں، دوسرے امام صاحب نے اپنے مقدور بھر مسند میں صحت کا پورا اہتمام ملحوظ رکھا تھا، اس لیے ان کے علم ویقین مین ان کا یہ دعویٰ بالکل صحیح تھا لیکن اس سے یہ ضروری نہیں ہے کہ مسند حقیقتاً تمام صحیح حدیثوں کی جامع ہو، تیسرے اکثر صحیح حدیثوں کی اصل فی الواقع اس میں موجود ہے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ ''امام صاحب کا ارشاد غالب احوال کے لحاظ سے ہے ورنہ صحیحین، سنن اور اجزا وغیرہ میں بہت سی قوی حدیثیں ایسی ہیں جو مسند میں نہیں ہیں، شمس الدین جزری کا بیان ہے کہ اس سے مقصود حدیثوں کی اصل ہے اور یہ بالکل درست ہے اس لیے کہ غالباً کوئی حدیث ایسی نہیں ملے گی جس کی اصل مسند میں موجود نہ ہو، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں کہ ''امام صاحب کی مراد ان حدیثوں سے ہے جو شہرت وتواتر کے درجہ تک نہیں پہنچی ہیں ورنہ بہت سی مشہور اور صحیح حدیثیں ان کی مسند میں نہیں ہیں۔(۱)

۳- ضعیف حدیثیں: ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ مسند میں ضعیف روایات بھی ہیں، محققین علمانے اس کو تسلیم کیا ہے اس لیے جو لوگ مطلقاً مسند کی صحت کے مدعی ہیں ان کا خیال درست نہیں، اس کا بڑا ثبوت تو یہی ہے کہ امام صاحب عمر بھر مسند کے مسودہ میں ترمیم فرماتے رہے، وہ ضعیف وغریب روایتیں متابعت، تعدد طرق اور دوسری روایتوں کی تائید کے لیے نقل کرتے تھے، اس لیے مسند ضعیف روایتوں سے خالی نہیں لیکن اتنے ضخیم مجموعہ میں اگر کچھ ضعیف حدیثیں شامل بھی ہوں تو ان سے اس کی صحت وشہرت

(۱) ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۰۹ بحوالہ المصعد الاحمد ص ۳۱، بستان المحدثین ص ۳۰۔

میں فرق نہیں آتا، مجموعی طور پر وہ ایک مستند اور اہم کتاب ہے، ضعیف وغریب روایتوں سے حدیث کی کون کتاب خالی ہے، ابن تیمیہ جیسے شخص کو یہ تسلیم ہے کہ ''صحیحین کی بعض حدیثوں میں اس قسم کے الفاظ آ گئے ہیں جو ضعف سے خالی نہیں۔''(۱)

۴- موضوع حدیثیں: مسند میں بعض موضوع حدیثیں بھی بتائی جاتی ہیں لیکن عام علمائے فن نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے، ابن حجر نے القول المسدد میں اور سیوطی نے الذیل الممہد میں ان تمام روایتوں کا جن کو موضوع بتایا جاتا ہے پوری تحقیق سے جائزہ لیا ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

''ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ مسند میں موضوع روایتیں بھی ہیں ابوالفضل عراقی نے موضوعات ابن حوزی کے تتبع سے نو حدیثوں کو موضوع بتایا ہے، میں نے جب ابن جوزی کے بیان کا مطالعہ کیا تو موضوعات کی تعداد بیس نظر آئی لیکن تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ ان میں سے اکثر حدیثیں صحیح ہیں اور ان کو موضوع قرار دینے کا فیصلہ درست نہیں، البتہ چند روایتوں کے بارے میں اس قسم کا شبہ ضرور ہوتا ہے لیکن غالب اور قوی احتمال ان کے بارے میں بھی مدافعت ہی کا ہے۔(۲)

بعض علما نے جن میں ابن تیمیہ بھی شامل ہیں، یہ تفریق کی ہے کہ عبداللہ اور قطیعی کے زوائد میں موضوع روایتیں ضرور ہیں لیکن مسند کا وہ حصہ جو امام صاحب کی طرف منسوب ہے، موضوع حدیثوں سے خالی ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ جمہور علما کے نزدیک مسند احمد بن حنبل میں موضوع حدیثیں نہیں پائی جاتیں۔

---

(۱) منہاج السنۃ ج ۴ ص ۶۳ (۲) تعجیل المنفعۃ ص ۶۔

امام محمد بن یحییٰ عدنی

(متوفی ۲۴۳ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: محمد یحییٰ بن ابوعمر۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ابوعمران کے والد کی کنیت تھی (۱) مگر پہلا قول زیادہ صحیح ہے۔(۲)

وطن: ان کے آباء واجداد کا اصل وطن عدن ہے لیکن انھوں نے مکہ میں مستقل بود وباش اختیار کرلی تھی، (۳) علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ان کی پیدائش اور نشوونما بھی یہیں ہوئی تھی، (۴) اسی وجہ سے عدنی اور مکی کہلاتے ہیں، خاندان اور سنہ ولادت کا حال نہیں معلوم ہوسکا۔

اساتذہ: انھوں نے جن برگزیدہ وبلند پایہ محدثین سے کسب فیض کیا تھا ان میں سے بعض مشہور لوگوں کے نام یہ ہیں:

داؤد بن عجلان، سفیان بن عیینہ، عبدالرحیم بن زید عمی، عبدالرزاق، عبدالعزیز دراوردی، عبدالعزیز بن عبدالصمد عمی، عبداللہ بن معاذ صنعانی، عبدالمجید بن ابی رواد، عبدالوہاب ثقفی، فرج بن سعید بن علقمہ ماربی، فضیل بن عیاض، محمد بن یحییٰ بن قیس مازنی، مروان بن معاویہ، معن بن عیسی، ولید بن مسلم، ہشام بن سلیمان، یحییٰ بن سلیم طائفی، یحییٰ بن عیسی المکی، یزید بن ہارون، یعقوب بن جعفر بن ابی کثیر اور اپنے والد یحییٰ بن ابوعمر

(۱) تقریب التہذیب ص ۲۲۷ (۲) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۸ (۳) ایضاً وخلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال ص ۳۶۰ (۴) کتاب الانساب ورق ۳۸۶۔

وغیرہ سے۔

سفیان بن عیینہ کے خاص تلامذہ میں تھے، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ والازم ابن عیینہ، پہلی مرتبہ ۱۸ سال کی عمر میں ان کے درس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔(۱)

تلامذہ: محمد بن یحییٰ عدنی کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ مؤلفین صحاح میں امام مسلم، امام ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے بلاواسطہ اور امام نسائی نے بالواسطہ روایتیں کی ہیں، امام بخاری نے بھی ان سے ایک حدیث تعلیقاً بیان کی ہے، دوسرے ممتاز تلاذہ کے نام یہ ہیں.

ابو حاتم، ابوزرعہ دمشقی، ابوزرعہ رازی، احمد بن عمرو خلال مکی، اسحاق بن ابراہیم بن اسماعیل نسفی، اسحاق بن احمد بن نافع خزاعی، بقی بن مخلد، زکریا بن یحییٰ سجزی، عبداللہ بن صالح بخاریؒ، عبداللہ بن محمد بن شیرویہ، عثمان بن خرزاذ، علی بن عبداللہ عصاریی، ابوالولید محمد بن عبداللہ ازرقی، مفضل بن محمد جندی، نعیم ازدی، ہارون بن یوسف شطوی، ہلال بن علاء اور ان کے فرزند عبداللہ بن محمد وغیرہ۔(۲)

حفظ وثقاہت: حافظہ میں امتیاز کی وجہ سے الحافظ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، عبدالرحمٰن بن محمد حاتم اپنے والد کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ صالح الحدیث اور صدوق تھے، امام احمد نے بھی ان کو معتبر قرار دیا ہے، مسلمہ کا بیان ہے کہ لا بأس بہ یعنی عدنی میں کوئی عیب نہ تھا، امام مسلم نے ان کو صدوق و حجت اور ابن حبان وابن اثیر نے ان کو ثقہ بتایا ہے۔(۳)

فضل وکمال: ان کے کمال کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اکثر اصحاب صحاح نے ان کی

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ ص ۵۱۸، ۵۱۹ وتقریب التہذیب ص ۲۲۷ (۲) ایضاً وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ وکتاب الانساب ورق ۳۸۶ (۳) تہذیب التہذیب ج۹ ص ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰ وخلاصۃ تذہیب تہذیب الکمال ص ۳۶۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ وکتاب الانساب ورق ۳۸۶

روایتوں کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے، امام مسلم نے اپنی صحیح میں ان کے واسطے سے ۲۱۶ حدیثیں ذکر کی ہیں، امام احمد کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب ان سے رواۃ مکہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ مکہ کے لوگوں میں ابن ابی عمر سے روایتیں کرو، علمائے طبقات کا بیان ہے کہ وصار شیخ الحرم فی زمانہ یعنی وہ اپنے زمانہ میں شیخ الحرم تھے۔ (۱)

عبادت وتقویٰ: علم وفضل کے ساتھ بڑے عابد وزاہد اور نہایت صالح ومتدین تھے، اکثر طوافِ کعبہ میں مشغول رہتے، (۲) تمام مورخین نے ان کے زہد وصلاح کا ذکر کیا ہے۔

حج: حج بیت اللہ سے ۷۷ مرتبہ مشرف ہونے کی سعادت میسر آئی، ان کا خود بیان ہے کہ ۷۰ مرتبہ پیدل چل کر میں نے حج کیا تھا۔ (۳)

وفات: عدنی نے بڑی طویل عمر پائی اور ذی الحجہ ۲۴۳ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ (۴)

اولاد: علمائے سیر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ان کے ایک فرزند عبداللہ کا ذکر کیا ہے، اسی لیے ان کی کنیت ابوعبداللہ ہے

تصنیفات: عدنی کی تصنیفات میں صرف مسند کا پتہ چلتا ہے، اس کے راوی ان کے مشہور شاگرد اسحاق بن احمد بن نافع خزاعیؒ تھے، اس مسند کو ایک زمانہ میں بڑی شہرت تھی اور وہ اصبہان وغیرہ میں متداول رہ چکی ہے۔ (۵)

☆☆☆

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ وتہذیب ج ۹ ص ۵۱۹، ۵۲۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۴ (۳) ایضا وتہذیب ج ۹ ص ۵۱۹، (۴) ایضاً وخلاصۃ تذہیب ص ۳۶۴ (۵) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۹ وکتاب الانساب ورق ۳۸۶۔

امام عبد بن حمید

(متوفی ۲۴۹ھ)

نام ونسب: عبدالحمید نام، ابو محمد کنیت، ایک ضعیف روایت یہ بھی ہے کہ عبدالمجید نام تھا۔ نسب نامہ یہ ہے: عبدالحمید بن حمید بن نصر، عام طور سے وہ عبدالحمید کے بجائے صرف عبد بن حمید کہے جاتے تھے۔(۱)

وطن: وطن کَش یا کِس ہے اور اسی کی نسبت سے وہ کشی یا کسی مشہور ہیں، کش جرجان کے قریب اس سے ۹ میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں کا نام ہے، محمد بن طاہر مقدسی نے لکھا ہے کہ کِس کش کی تعریب ہے لیکن ابن ماکولا کا بیان ہے کہ کش غلط ہے، جب میں بخارٰی اور سمرقند گیا تو وہاں کے لوگ اس کو کس کہتے تھے، یہ سمرقند کے قریب ایک شہر کا نام ہے، عبد بن حمید اسی کی جانب منسوب ہیں، بعض لوگوں نے کش کو اصبہان کا گاؤں بتایا ہے۔(۲)

اساتذہ: عبد بن حمید کے اساتذہ اور شیوخ میں بلند پایہ محدثین اور مقدس بزرگ شامل ہیں، اس کا اندازہ اس فہرست سے ہوگا۔

احمد بن اسحاق حضرمی، جعفر بن عون، حسن اشیب، حسین بن علی جعفی، روح بن عبادہ، سعید بن عامر، عارم، عبدالرزاق، عبدالصمد بن عبدالوارث، عبداللہ بن بکر سہمی، عبیداللہ بن موسیٰ، علی بن عاصم، عمر بن یونس یمامی، محمد بن بشر عبدی، محمد بن بکر برسانی، مسلم بن ابراہیم، مصعب بن مقدام یحیٰی بن آدم، یزید بن ہارون، یعقوب بن ابراہیم، یعلی بن

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۵ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۲۱ و بستان المحدثین ص ۴۲ (۲) معجم البلدان ج ۷ ص ۲۵۴ و کتاب الانساب مقدسی ص ۱۲۹۔

عبید، یونس بن محمد مؤدب، ابن ابی فدیک، ابواسامہ، ابوداؤد حضرمی، ابوداؤد طیالسی، ابو عامر عقدی، ابو عاصم، ابوالنضر، ابونعیم، ابوالولید طیالسی وغیرہ۔ (۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی وسیع ہے، ان میں سے اکثر کا شمار اجلہ محدثین اور ائمہ فن میں ہے، بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں: ابراہیم بن خریم شاسی، بکر بن مرزبان، سلیمان بن اسرائیل خجندی، سہل بن شاذویہ، شاہ بن جعفر، ابومعاذ عباس بن ادریس ملقب بخرک، عمر بن بجیر، عمر بن محمد اور آپ کے صاحبزادے محمد بن عبد وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین میں امام مسلم اور امام ترمذی نے اپنی اپنی کتابوں میں ان سے روایتیں لی ہیں اور امام بخاری نے دلائل النبوۃ میں بطریق تعلیق ان کی روایت نقل کی ہے۔ (۲)

طلب حدیث کی ابتدا اور سفر: آغاز شباب کے بعد ان کو تحصیل علم کا خیال اور حدیث کی طلب وجستجو کا شوق پیدا ہوا اور اس کے لیے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا، گو اس کی تصریح نہیں ملتی کہ کن کن شہروں اور ملکوں میں گئے لیکن ان کے اساتذہ مختلف ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان کا سفر کیا ہوگا۔

فضل وکمال: عبد بن حمید نامور محدثین میں تھے، ان کی عظمت کے لیے اتنا کافی ہے کہ ائمہ صحاح تک نے ان سے اپنی کتابوں میں روایتیں نقل کی ہیں، اصحاب طبقات وتراجم کا بیان ہے کہ وہ فن حدیث کے امام تھے۔ (۳)

حفظ وثقاہت: ان کے حفظ وضبط اور ثقاہت پر علما کا اتفاق ہے، علامہ ذہبی نے ان کو احفظ اور ائمہ ثقات میں بتایا ہے، ابن حبان فرماتے ہیں کہ وہ ان علمائے ثقات میں تھے جنھوں نے جمع وتصنیف کا کام کیا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ اور حافظ تھے، ابن عماد حنبلی کا بیان ہے

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۵، ۴۵۶ (۲) ایضاً ص ۴۵۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۵ وبستان المحدثین ص ۳۲ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۵ وبستان المحدثین ص ۳۲۔

کہ وہ ثقہ وثابت تھے،(۱) شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''خیلے ثقہ ومعتبر''۔

وفات: مشہور اور صحیح روایت کے مطابق ۲۴۹ھ میں اپنے وطن کش میں انتقال کیا، شاہ عبدالعزیزؒ صاحب نے ۲۴۳ھ سنہ وفات تحریر کیا ہے، بعض لوگوں کا بیان ہے کہ دمشق میں وفات پائی لیکن عام محققین کے نزدیک ان کا دمشق میں جانا ہی ثابت نہیں ہے۔

تصنیفات: عبد بن حمید کی متعدد تصنیفات ہیں مگر صرف دو کتابوں کا علمائے سیر وطبقات نے ذکر کیا ہے۔

تفسیر: ابن کثیر کے بیان صاحب التفسیر الحافل سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ فرماتے ہیں کہ ''دیارعرب میں یہ تفسیر مشہور ومتداول تھی'' اس کے راوی ابن خریم ہیں، حافظ ابن حجر کی نظر سے اس کا ایک جز گذرا تھا۔(۲)

مسند: ان کی دوسری اہم کتاب مسند ہے، مسند میں ان کی دو کتابیں کبیر وصغیر تھیں، مسند صغیر دراصل کبیر کا انتخاب اور ایک جلد پر مشتمل ہے، اس میں بعض مشاہیر صحابہ کی حدیثیں درج نہیں ہیں، عبد بن حمید کے شاگرد ابراہیم بن خریم نے اس کی ان سے روایت کی ہے، اس کی ابتدا مسند ابی بکر سے ہوتی ہے،(۳) یہ مسند ابھی تک شائع نہیں ہوئی ہے لیکن اس کے مخطوطے مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں، جرمنی کے مکتبہ جامع قردیین، ایاصوفیہ، کوپرویلو وغیرہ کے علاوہ ہندوستان کے مکتبہ سندیہ اور نیشنل پبلک لائبریری بانکی پور اور دائرۃ المعارف العثمانیہ میں بھی اس کے قلمی نسخے موجود ہیں۔(۴)

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۶ وتقریب التہذیب ص ۱۳۴ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۴ وبستان المحدثین ص ۳۴ وتہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۶ (۳) بستان المحدثین ص ۳۲ والرسالۃ المستطرفہ ص ۵۷ وتہذیب التہذیب ج ۶ ص ۴۵۶ (۴) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۵، فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ ص ۵۷، تذکرۃ النوادر ص ۳۷، ۳۸ ومفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۱۔

امام اسحاق بن بہلول

(متوفی ۲۵۲ھ)

نام ونسب: اسحاق نام، ابو یعقوب کنیت، نسب نامہ یہ ہے: اسحاق بن بہلول بن حسان بن سنان۔(۱)

وطن، ولادت اور خاندان: ان کا وطن قدیم اور مشہور شہر انبار ہے جو دریائے فرات کے کنارے بغداد سے ۱۰ فرسنگ کے فاصلہ پر واقع ہے، یہیں وہ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندانی تعلق قبیلہ تنوخ سے ہے، اسی نسبت سے تنوخی اور انباری مشہور ہوئے۔(۲)

اساتذہ: اسحاق کو جن نامور محدثین سے شرف تلمذ حاصل ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابن ابی فدیک، ابواسامہ، ابوبحر بکراوی، ابوداؤد حفری، ابوعاصم نبیل، ابوعامر عقدی، ابوعبدالرحمٰن مقری، ابومعاویہ ضریر، ابونعیم، ابویحییٰ حمانی، اسحاق بن یوسف ازرق، اسماعیل بن علیہ، ابوضمرہ انس بن عیاض، جعفر بن عون، حسین جعفی، سعید بن سالم قداح، سفیان بن عیینہ، شعیب بن حرب، عبدالرحمٰن بن مہدی، عبداللہ بن داؤد خریبی، عبداللہ بن نمیر، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، ابوقطن عمر بن ہشیم، عبیداللہ بن موسیٰ، غندر، قبیصہ بن عقبہ، محمد بن عبید، محمد بن قاسم ازدی، معاویہ بن ہشام، وکیع بن جراح، وہب بن جریر، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن آدم، یحییٰ بن سعید قطان، یعلی بن عبید اور ان کے والد بہلول وغیرہ۔(۳)

تلامذہ: مشہور تلامذہ حسب ذیل ہیں:

ابراہیم حربی، ابوبکر بن ابی الدنیا، قاضی ابوعبداللہ محاملی، عبداللہ بن محمد بن ناجیہ، قاسم بن زکریا مطرز، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ، محمد بن موسیٰ نہر تیری، یحییٰ بن صاعد اور دونوں

---

(۱) تاریخ بغداد ج۶ ص ۳۶۶ (۲) ایضاً ص ۳۶۹ (۳) تاریخ بغداد ج۶ ص ۳۶۶۔

صاحبزادے احمد، بہلول اور پوتے یوسف بن یعقوب ،جعفر فریابی وغیرہ۔(۱)

رحلت وسفر: انھوں نے علم کی جستجو اور حدیث کی طلب وتکمیل کے لئے بغداد، کوفہ، بصرہ، مدینہ اور مکہ کا سفر کیا۔(۲)

حفظ وضبط: حفظ وضبط اور صدق وثقاہت میں بڑے ممتاز تھے اسی لئے علمائے فن نے ان کو الحافظ کہا ہے، ابن صاعد کا بیان ہے کہ تقریباً ۵۰ ہزار حدیثیں انھوں نے زبانی بیان کیں مگر کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی، خطیب اور حافظ ذہبی لکھتے ہیں وکان ثقہ (یعنی وہ ثقہ ومعتبر تھے) عبدالرحمٰن نے اپنے والد ابوحاتم سے ان کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا وہ صدوق تھے۔(۳)

نقد وتمیز: حفظ وثقاہت کی طرح ان کو صحیح وغلط روایات میں امتیاز کا بھی ملکہ تھا، ذہبی نے ان کو الناقد لکھا ہے۔(۴)

فقہ: فقہ میں بھی ممتاز تھے اور اس میں کتابیں بھی لکھی ہیں، اس کی تحصیل وتکمیل حسن بن زیاد لولوئی اور امام ابویوسف کے ممتاز ترین شاگرد ہشیم بن موسیٰ سے کی تھی مگر وہ فقہائے مقلدین میں نہ تھے بلکہ مجتہد تھے اور بعض مسائل میں عام فقہا سے منفرد رائے رکھتے تھے، خطیب کا بیان ہے:

ولہ مذاھب اختارھا ینفرد بھا۔ (۵)	بعض مسائل میں ان کے مختارات وتفردات پائے جاتے ہیں۔

قرأت: قرأت کے فن سے بھی دلچسپی تھی اور اس میں بھی انھوں نے کتاب لکھی تھی۔

لغت، نحو وعربیت: حدیث وفقہ کے علاوہ ان کو لغت، نحو اور شعر وادب میں بھی دستگاہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶، ۳۶۷، وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۰ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶ (۳) ایضاً ص ۳۶۸، والعبر ج ۲ ص ۳ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۰ وتاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶ (۵) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۳۶۶، ۳۶۷۔

حاصل تھی۔(۱)

امامت: ان علوم میں کمال کی بنا پر ان کا شمار ائمہ فن میں ہوتا تھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں وکان من کبار الأیمة (یعنی وہ اکابر ائمہ(۲) میں تھے)

اخلاق وعادات: بڑے فیاض وسیر چشم تھے، ان کی آمدنی وافر تھی مگر خود بقدر کفاف پر زندگی بسر کرتے تھے اور آمدنی کا بڑا حصہ غریبوں اور ناداروں میں تقسیم کر دیتے تھے۔(۳)

وفات: اسحاق نے طویل عمر پائی ۸۸ سال کی عمر میں اپنے وطن انبار میں ماہ ذوالحجہ ۲۵۲ھ میں انتقال کیا، امیر انبار ریحونہ بن قیس شیبانی نے نماز جنازہ پڑھائی۔(۴)

اولاد: علمائے سیر نے ان کے تین صاحبزدوں احمد، بہلول یعقوب اور ایک پوتے یوسف بن یعقوب کا ذکر کیا ہے۔

آمدنی: ان کی زندگی اطمینان وفراغت سے بسر ہوتی تھی، ان کے صاحبزادے کا بیان ہے کہ متوکل نے میرے والد کو طلب کر کے ان سے سماع کیا اور اتنی زمین عطا کی جس کی پیداوار سے ۱۲ ہزار سالانہ آمدنی ہوتی تھی، اس کے علاوہ پانچ ہزار درہم سالانہ مزید دفتر شاہی سے ملتا تھا۔(۵)

تصنیفات: وہ کثیر التصانیف تھے، فقہ، حدیث اور قرأت کے علاوہ دوسرے فنون میں بھی ان کی تصنیفات تھیں، خطیب کا بیان ہے صنف فی غیر ذلك من انواع العلم لیکن وہ سب معدوم ہیں، جن کتابوں کا ذکر ملتا ہے وہ یہ ہیں:

۱-قرأت میں ایک کتاب کا تذکرہ کیا جاتا ہے لیکن اس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔

۲-فقہ میں ان کی کتاب کا نام المتضاد تھا۔

۳-حدیث میں ایک ضخیم مسند لکھی تھی۔(۶)

(۱-۲) تاریخ بغداد ج۶ ص ۳۶۶، ۳۶۷ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۰۰ والعبر ج۲ ص۳ (۴) تاریخ بغداد ج۶ ص ۳۶۵ (۵) ایضاً وتذکرہ ج۲ ص۱۰۰ (۶) ایضاً۔

امام ابومحمد عبداللہ دارمی

(متوفی ۲۵۵ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابومحمد کنیت، سلسلہ نسب یہ ہے: عبداللہ بن عبدالرحمن بن فضل بن بہرام بن عبدالصمد خزرجی نے بہرام کے بجائے مہران لکھا ہے۔(۱)

ولادت، خاندان، وطن: ۱۸۱ھ میں خراسان کے مشہور شہر سمرقند میں پیدا ہوئے، قبیلہ تمیم کی ایک شاخ دارم سے نسبی تعلق تھا، اس کی نسبت سے سمرقندی، تمیمی اور دارمی کہلائے، آخری نسبت سے جو دارم بن مالک کی جانب زیادہ مشہور ہوئے۔(۲)

اساتذہ: امام دارمی کو جن نامور علماء ومشائخ سے استفادہ کا موقع میسّر آیا ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

احمد بن اسحاق حضرمی، اسود بن عامر شاذان، اشہل بن حاتم، ابوصالح کاتب، لیث بن سعد ابوبکر حنفی، ابوالمغیرہ حمصی، ابوعاصم، ابونعیم، جعفر بن عون، حبان بن ہلال، ابوالیمان حکم بن نافع بہرانی، حیوۃ بن شریح، زکریا بن عدی، سعید بن عامر ضبعی، عبدالصمد بن عبدالوارث، عبداللہ بن موسیٰ، ابوعلی عبیداللہ بن عبدالمجید حنفی، عثمان بن عمر بن فارس، محمد بن مبارک صوری، محمد بن یوسف فریابی، مروان بن محمد، نضر بن شمیل، وہب بن جریر، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، یحییٰ بن حسان تنیسی، یزید بن ہارون اور یعلی بن عبید وغیرہ۔(۳)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں بڑے نامور محدثین اور ائمہ فن شامل ہیں، ابن ماجہ کے علاوہ

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتہذیب ج ۵ ص ۲۹۴ وخلاصہ تذہیب ص ۲۰۴ (۲) ایضاً وکتاب الانساب ورق ۲۱۸ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وکتاب الانساب ورق ۲۱۸ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۴۔

دوسرے تمام ائمہ صحاح کو ان سے تلمذ کا فخر حاصل ہے، امام مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے اپنی کتابوں میں ان کے مرویات درج کیے ہیں، مشہور محدثین اور علمائے نقد و جرح میں محمد بن یحییٰ ذہلی، ابوزرعہ، ابوحاتم اور امام احمد کے فرزند عبداللہ نے بھی ان سے روایت کی ہے، بعض اور ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

بقی بن مخلد، بندار بن بشار، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن صباح بزار، حفص بن احمد بن فارس رجاء، بن مرجی، صالح بن محمد جزرہ، عبداللہ بن واصل بخاری، عمر بن بجیر، عمر بن محمد بجیری، عیسیٰ بن عمر سمرقندی، محمد بن عبدوس بن کامل، سراج اور مطین وغیرہ۔ (۱)

طلب حدیث کے لئے سفر: امام دارمی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق حدیث کی طلب و تکمیل کے لئے شام، بغداد، مصر، عراق، خراسان اور مکہ و مدینہ کا سفر کیا، خطیب اور دوسرے مورخین نے ان کے سفر و رحلت کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ ان لوگوں میں سے ایک تھے جو حدیث کے لئے بہت زیادہ سفر کیا کرتے تھے، بعض علمائے رجال نے لکھا ہے کہ رحل وطوف یعنی طلب حدیث کے لئے سفر کیا اور ملکوں کی خاک چھانی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں "صاحب رحلت واسفارست، اکثر بلاد اسلام راگشتہ و علم حدیث را از بلدان بعیدہ جمع کردہ۔ (۲)

حفظ و ضبط: قدرت نے ان کو حفظ و ضبط کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا، ائمہ فن کے اعترافات ملاحظہ ہوں:

عبداللہ بن نمیر جیسے بلند پایہ محدث کا بیان ہے کہ "دارمی حافظہ کے لحاظ سے ہم پر فوقیت رکھتے تھے رجاء بن جابر مرجی کا بیان ہے کہ میں نے احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی اور شاذکونی وغیرہ ائمہ حدیث میں سے کسی کو عبداللہ سے بڑا حافظ نہیں پایا،

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ (۲) العبر ج ۲ ص ۸ و مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۶۱، شذرات الذہب ج ۲ ص ۱۳۰، بستان المحدثین۔

امام احمد سے ان کے فرزند عبداللہ نے حفاظ حدیث کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے چند نوجوانان خراسان کا جن میں دارمی کا نام بھی تھا، ذکر کیا، عبداللہ اپنے والد سے یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ "حفظ جن چار آدمیوں پر تمام ہوگیا، ان میں ایک یہ بھی تھے" عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ "ان کے ضبط کے متعلق جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ فائق تھے" محمد بن ابراہیم شیرازی کا بیان ہے کہ "دارمی کا حافظہ ضرب المثل ہے" ابوعبداللہ حکم فرماتے ہیں کہ "وہ مشہور و برگزیدہ حفاظ حدیث میں تھے" ابن حبان لکھتے ہیں کہ "وہ ان لوگوں میں تھے جنھوں نے حدیثیں حفظ وجمع کیں" امام نووی تحریر فرماتے ہیں کہ "دارمی اپنے زمانہ کے ان مشہور حفاظ میں تھے جن کے بہت کم لوگ فضل وکمال اور حفظ وضبط میں ہمسر تھے، خطیب بغدادی کا بیان ہے کہ "وہ ان علمائے اسلام اور حفاظ حدیث میں سے ایک ہیں جو احادیث کے حفظ وجمع کے لئے مشہور ہیں" بندار فرماتے ہیں، حفاظ دنیا چار ہیں ان میں سمرقند کے امام دارمی بھی شامل ہیں۔ (۱)

ثقاہت: ان کی ثقاہت وعدالت کے بھی علمائے فن اور ارباب کمال معترف ہیں، ابوحاتم رازی کا بیان کہ "وہ سب سے زیادہ ثقہ وثابت تھے" امام احمد کو ماورائے ثقاہت اور خطیب صاحب صدق وثقاہت بتاتے ہیں، ابن حبان نے ان کو حفاظ متقنین میں اور ابوحاتم نے ثقہ وصدوق لوگوں میں شامل کیا ہے۔ (۲)

معرفت ودرایت: وہ احادیث کی معرفت وتمیز کے لئے مشہور تھے روایت کی طرح درایت میں بھی ان کا مقام نہایت بلند تھا، رجا بن جابر مرجی فرماتے ہیں کہ "میں نے ان سے بڑا کسی کو حدیث سے واقفیت رکھنے والا نہیں دیکھا، احمد بن یسار کہتے ہیں کہ حدیث میں ان کی

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵، ۲۹۶ وتدریب الراوی ص ۲۷۲، ۲۷۷ ومقدمہ مسند دارمی ص ۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۰ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۵۶۔

واقفیت غیر معمولی اور نظر بڑی وسیع اور گہری تھی، عثمان بن ابی شیبہ ان کے حافظہ کی طرح ان کی معرفت وبصیرت کے بھی معترف تھے، ابومنصور شیرانی کا بیان ہے کہ ان کی درایت ضرب المثل تھی، علم حدیث میں ان کی واقفیت اور تمیز کا یہ حال تھا کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے امام احمد کے سامنے ابن المنذر کی تعریف کی تو انھوں نے فرمایا کہ مجھ کو ان سے کوئی واقفیت نہیں مگر حیرت ہے کہ تم لوگوں کو عبداللہ بن عبدالرحمٰن کا علم نہیں، پھر تین مرتبہ تاکید کے ساتھ فرمایا کہ (علیك بذاك السید) یعنی تم کو اس سردار کے حلقۂ فیض سے وابستہ رہنا ضروری اور لازم ہے، ایک اور شخص نے امام احمد سے حمانی کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے ارشاد فرمایا کہ دارمی کے قول کی بنا پر ہم ان کو متروک الحدیث سمجھتے ہیں، عبداللہ بن مبارک مخرمی کا بیان ہے کہ "اے اہل خراسان جب تک یہ تمہارے درمیان موجود ہیں تم کو کسی اور سے اشتغال رکھنے کی ضرورت نہیں۔" (۱)

فقہ وتفسیر: امام دارمی کو دوسرے اسلامی علوم وفنون میں بھی دستگاہ حاصل تھی، فقہ وتفسیر سے ان کی مناسبت اور تعلق کا اکثر علمائے رجال نے ذکر کیا ہے، حافظ ابن حجر ان کو باکمال مفسر اور صاحب علم فقیہ قرار دیتے ہیں، (۲) ان فنون میں انھوں نے کتابیں بھی لکھی تھیں اور فقہ میں ان کے مجتہدانہ کمالات کا ثبوت ان کی سنن سے بھی ملتا ہے۔

عقل ودانش: اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت ودانائی اور عقل وفراست سے بھی خاص طور پر بہرہ ور کیا تھا خطیب اور دوسرے مورخین کا بیان ہے کہ وکان علیٰ غایة العقل ونهاية الفضل یعنی وہ نہایت عاقل وفاضل شخص تھے، بعض علمائے رجال لکھتے ہیں کہ "وہ اپنی متانت اور دانشمندی کے لیے مشہور تھے۔ (۳)

عبادت وتقویٰ: امام دارمی علم وعمل دونوں کے جامع تھے اور زہد وتقویٰ کے لحاظ سے بھی

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱، ۳۲ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ (۲) تہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵

(۳) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶۔

ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا، ان کو عبادت واطاعت الٰہی میں بڑا انہاک تھا، عبداللہ بن نمیر فرماتے ہیں کہ "وہ ورع وتقویٰ کے اعتبار سے ہم سب پر فوقیت رکھتے تھے" خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ "وہ زہد واتقا سے متصف تھے" ابو منصور شیرازی کا بیان ہے کہ "ان کی ذات زہد وتقویٰ اور دیانت وعبادت کے لئے ضرب المثل تھی" عثمان بن ابی شیبہ فرماتے ہیں کہ لوگوں نے ان کی عصمت اور پاکیزگیِ نفس کے متعلق جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس سے زیادہ عظیم اور برتر تھے" (۱)

جاہ ومنصب اور دنیا طلبی سے پرہیز: دنیاوی عیش وتنعم سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے، قناعت اور سادگی سے زندگی بسر کرتے تھے، امام احمد فرماتے ہیں کہ "میرے سامنے کفر پیش کیا گیا میں نے اس کو ٹھکرا دیا، دارمی کے سامنے دنیا پیش کی گئی اور وہ اس کی جانب مائل اور متوجہ نہ ہوئے" دنیوی جاہ منصب سے بے نیازی کا یہ حال تھا کہ ان کو سمرقند کا محکمہ قضا پیش کیا گیا تو قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر سلطان کے اصرار پر چند دنوں کے لئے قبول کر لیا مگر بہت جلد اس سے سبکدوش ہو گئے۔ (۲)

سنت وحدیث کی مدافعت: انھوں نے حدیث کی خدمت واشاعت اور اس کی حمایت ومدافعت بھی کی اور مخالفین حدیث کا مقابلہ کر کے ان کا زور توڑ دیا، احادیث کے متعلق شکوک واعتراضات کا جواب اور کذب ودروغ کی آمیزشوں سے ان کو پاک کر کے عوام وخواص سب کے دلوں میں ان کی اہمیت وعظمت اور رسول کی محبت بٹھا دی، اس طرح مختلف حیثیتوں سے انھوں نے علم حدیث وآثار کو فروغ بخشا، علمائے رجال لکھتے ہیں "اپنے وطن سمرقند میں حدیث وسنت کا بول بالا کر کے لوگوں کو اس کی جانب مائل اور مخالفین حدیث کا قلع قمع کر دیا" (۳)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ وتہذیب التہذیب ج ۵ ص ۲۹۵ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۰ ص ۳۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۶ (۳) خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۲۰۴۔

فقہی مذہب ومسلک: کتابوں میں ان کے فقہی مذہب کی تصریح موجود نہیں ہے لیکن قیاس اور ان کی سنن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام محدثین کی طرح وہ کسی ایک امام کے مسلک سے وابستہ نہ تھے بلکہ اپنے اجتہاد وتفقہ کے مطابق حدیث وقرآن کی پیروی کرتے تھے۔

فضل وامامت: ان گوناگوں کمالات نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنادیا تھا اور وہ ائمہ مسلمین میں شمار کئے جاتے ہیں، معاصرین علما نے بھی ان کی اس حیثیت کو تسلیم کیا ہے، امام احمد ان کو امام وسید کے لقب سے موسوم کرتے تھے، ابوسعید اشج کا بیان ہے کہ ''وہ ہمارے امام ہیں'' ابوحاتم فرماتے ہیں کہ ''دارمی اپنے زمانہ کے ائمہ میں تھے'' ابوحامد بن شرقی کا خیال ہے کہ ''خراسان میں ۱۵ ائمہ حدیث پیدا ہوئے، ان میں ایک یہ بھی تھے۔''(۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق تقریباً ۷۵ سال کی عمر میں اپنے وطن سمرقند میں انھوں نے ۸/ ذی الحجہ ۲۵۵ھ پنجشنبہ کے دن بعد نماز عصر انتقال کیا اور عرفہ کے دن جمعہ کو تجہیز وتکفین ہوئی لیکن بعض مورخین کا بیان ہے کہ انتقال عرفہ کے دن اور تجہیز وتکفین نحر کے دن انجام پائی، امام بخاری کو جب وفات کی خبر ہوئی تو فرط غم سے سر جھکا کر انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے اور یہ شعر پڑھا:

ان تبق تفجع بالاحبة کلھم   وفناء نفسك لاابالك افجع

اگر تو زندہ ہوتا تو احباب کی مفارقت کے صدمے برداشت کرتا، تیرا
صفحۂ ہستی سے معدوم ہونا سب سے زیادہ دردناک سانحہ ہے۔

---

(۱) خلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص۲۰۴ وتاریخ بغداد ج۱۰ ص۳۱ وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۱۶ وتہذیب التہذیب ج۵ ص۲۹۵۔

تصنیفات

امام دارمی کی جانب حسب ذیل تصنیفات منسوب ہیں:

۱- کتاب التفسیر

۲- الجامع یا کتاب الجامع: خیر الدین زرکلی نے اس کا نام الجامع الصحیح لکھا ہے اور اس کو مطبوعہ بتایا ہے، (۱) غالب گمان ہے کہ یہ فقہ واحکام کی کتاب ہے۔

مولانا سید ابوالوزیر احمد حسن صاحب نے حاشیہ مشکوٰۃ میں امام دارمی کی رد جہمیت میں بھی کچھ کتابیں بتائی ہیں (۲) لیکن ان کے نام نہیں تحریر کیے ہیں''

اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے کہ ''علمائے سیر نے ان کی تصنیفات میں جامع، مسند تفسیر اور ان کے علاوہ کتابوں کا ذکر کیا ہے مگر غالباً موجود صرف دو کتابیں ہیں۔ (۳)

۳- سنن دارمی: یہ ان کی سب سے مشہور اور اہم کتاب ہے، صحاح ستہ کے بعد حدیث کی جو کتابیں زیادہ اہم اور مستند سمجھی جاتی ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے، شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی فرماتے ہیں ''کتاب اواز احسن کتب حدیث است'' (۴) اس کی اہمیت کی بنا پر محدثین اور علمائے فن نے اس کی حدیثوں کو قابل احتجاج اور لائق استدلال خیال کیا ہے، مشکوٰۃ میں جو منتخب کتابوں کی حدیثوں کا منتخب مجموعہ ہے، صحاح اور دوسری معتبر کتابوں کی طرح اس کی احادیث بھی شامل ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کا ذکر کیا ہے، اس کی صحت واسناد کی بنا پر اس کو صحاح ستہ میں بھی شامل کیا گیا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے۔

کتب وابواب کی تعداد: سنن دارمی ۳۵ فصول (کتب) اور ایک ہزار چار سو آٹھ ابواب

---

(۱) اعلام ج ۲ ص ۵۶۳۔ (۲) حاشیہ تنقیح الرواۃ دیباچہ مشکوٰۃ ص ۶ (۳) تدریب الراوی ص ۵۷ (۴) اکمال شرح مشکوٰۃ ص ۱۲۔

پر مشتمل ہے۔

ترتیب: عام کتب حدیث وسنن کے برعکس اس کی ابتدا "باب ماكان عليه الناس قبل مبعث النبي صلى الله عليه وسلم من الجهل والضلالة" سے ہوتی ہے، اس فصل کے مختلف ابواب میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ان اوصاف وخصائص کو جو کتب قدیمہ میں مذکور ہیں اور آپ کے معجزات، فضائل ومحامد، اتباع سنت اور علم کی اہمیت وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے، اس کے بعد عام کتب سنن کی طرح طہارت اور نماز وغیرہ کے جملہ ابواب اور آخر میں وصایا اور فضائل قرآن کے ابواب ہیں۔

خصوصیات: ۱- اس میں ۱۵ ثلاثی حدیثیں ہیں یہ تعداد بظاہر تو کم معلوم ہوتی ہے لیکن سنن کی کمیت اور دوسری کتابوں کے لحاظ سے کم نہیں ہے، اسی لیے بعض علمائے فن کا بیان ہے کہ "اس کی ثلاثیات بخاری کی ثلاثیات سے زیادہ ہیں اور رباعیات بکثرت ہیں۔(۱)

۲- اس کی ایک اہم خصوصیت صحت کا التزام اور علوئے اسناد بھی ہے، علمائے رجال کا بیان ہے وله اسانيد عالية یعنی دارمی کی سندیں نہایت عالی اور بلند پایہ ہیں۔(۲) علمائے جرح وتعدیل نے تصریح کی ہے کہ اس کے اکثر رجال ثقہ اور بیشتر حدیثیں صحیح وثابت ہیں، علامہ ابن حجر نے اسی خصوصیت کی وجہ سے اس کو سنن ابن ماجہ سے بھی زیادہ اہم اور فائق بتایا ہے۔(۳)

۳- یہ اگرچہ حدیث کی کتاب ہے لیکن اس میں فقہی مسائل ومباحث اور ان کے متعلق فقہا کے اختلافات ودلائل بھی بیان کیے گئے ہیں اور مختلف اقوال میں تطبیق وتوجیہ یا مرجح ومختار مسلک کی وضاحت بھی کی گئی ہے۔

۴- احادیث کی طرح صحابہ وتابعین کے آثار وفتاویٰ بھی نقل کیے گئے ہیں، بلکہ

(۱) الرسالۃ المستطرفہ ص۲۹ ومقدمہ مشکوۃ ص۱۵ ومقدمہ دارمی ص۷ (۲) الرسالۃ المستطرفہ ص۲۹ (۳) مقدمہ دارمی ص۷۔

بعض بعض ابواب میں صرف صحابہ وتابعین کے اقوال وآثار ہی مذکور ہیں۔

۵- عام خصوصیات اور جملہ فنی خوبیوں سے بھی یہ کتاب آراستہ ہے، مثلاً روایات کے مفہوم ومنشا کی وضاحت، ابہام کی تشریح، دقیق الفاظ اور مشکل لغات کا حل، رواۃ کے ناموں کی مختلف حیثیتوں سے وضاحت، بلاد واماکن کی تحقیق، تعدد طرق واسناد وروایات اور ان کے الفاظ کا فرق واختلاف اور متابعات وغیرہ کی تفصیل مسند، مرفوع اور منقطع وموقوف کی توضیح، خطا، شک، تردد اور اشتباہ کی تصریح، روایات اور رواۃ کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں، اساتذہ کی وضاحت وتشریح، راوی کے سماع وعدم سماع اور لقا وعدم لقا کا ذکر، احادیث کی تصویب، ان کے درمیان ترجیح واسباب ترجیح اور ان کے نسخ وعدم نسخ وغیرہ کی تفصیل موجود ہے۔

سنن یا مسند دارمی: اس کتاب کو سنن اور مسند دونوں کہا جاتا ہے، اس لیے اس کی مختصر وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔

مسند میں صحابہ کے ناموں کی ترتیب پر حدیثیں درج ہوتی ہیں اور سنن کی ترتیب فقہی ابواب پر ہوتی ہے، ایمانیات اور کتاب الطہارۃ سے لے کر وصایا تک کی حدیثیں ابواب کے ماتحت نقل کی جاتی ہیں، اس تعریف کی رو سے دارمی کا شمار سنن ہی میں ہونا چاہیے، علامہ سیوطی فرماتے ہیں ''کہا جاتا ہے کہ مسند دارمی مسند نہیں ہے بلکہ اس کی ترتیب ابواب پر ہے۔'' (۱) صاحب شرح الفیہ کا بیان ہے کہ ''ابن صلاح نے اس کو مسانید شمار کیا ہے حالانکہ یہ ان کا وہم ہے کیوں کہ اس کی ترتیب مسانید کے بجائے ابواب پر ہے'' (۲) شاہ عبدالعزیز صاحب ارقام فرماتے ہیں:

> ''وایں کتاب برخلاف اصطلاح محدثین مشہور بمسند گشتہ حالانکہ مرتب برابواب است نہ برصحابہ، پس باید کہ آنرا سنن دارمی گوید۔ (۳)

(۱) تدریب الراوی ص ۵۷ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳ (۳) بستان المحدثین ص ۴۳۔

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی اصل حیثیت سنن کی ہے تاہم ابن صلاح کے قول کو اس قدر شہرت ہوئی کہ اب وہ سنن کے بجائے مسند ہی کے نام سے زیادہ مشہور ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''کتاب السنن جو مسند دارمی کے نام سے موسوم کی جاتی ہے مرتبہ میں عام سنن سے کم تر نہیں ہے'' (۱) اس کا سبب یہ ہے کہ مسند کا اطلاق کبھی ان کتابوں پر بھی کیا جاتا ہے جن کی ترتیب صحابہ کے ناموں کے بجائے فقہی ابواب پر ہوتی ہے لیکن ان کی سندیں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم تک منتہی اور مذکور ہوتی ہیں، اسی لیے امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ وسننہ وایامہ رکھا ہے اور امام مسلم نے بھی صحیح مسلم کو مسند کے نام سے تعبیر کیا ہے، (۲) اس لحاظ سے سنن دارمی کو بھی مسند کہا جا سکتا ہے، عراقی کا بیان ہے کہ ''یہ مسند کے نام سے مشہور ہے، جیسا کہ امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا نام بھی مسند رکھا ہے کیوں کہ اس کی احادیث کی سندیں رسول اللہ تک مذکور ہیں'' (۳) یہاں ایک اور شبہ پیدا ہوتا ہے جس کا جواب دیتے ہوئے مولانا عبدالحلیم چشتی لکھتے ہیں ''اسی طرح سنن دارمی کو مسند دارمیؒ کے نام سے ذکر کرتے ہیں حالانکہ اس میں تمام حدیثیں مرفوع نہیں ہیں، مرسل، منقطع اور معضل سب ہی کچھ ہیں مگر مرفوعات کا ذخیرہ زیادہ ہے، اس لیے اس کو بھی مسند کہہ دیتے ہیں۔'' (۴)

اس تفصیل سے ثابت ہوگیا کہ اگرچہ دارمی کی تصنیف اپنی نوعیت اور ترتیب وغیرہ کے لحاظ سے سنن میں شامل ہے لیکن وہ مسند کے نام سے بھی مشہور ہے اور اس کو مسند کہنا غلط نہیں ہے۔

کیا سنن دارمی صحاح ستہ میں شامل ہے؟: جمہور علمائے اسلام کے نزدیک صحاح کی

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳ (۲) فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۵۸ (۳) تدریب الراوی ص ۵۷

(۴) فوائد جامعہ بر عجالہ نافعہ ص ۱۸۵۔

چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ ہے لیکن بعض لوگوں نے موطا امام مالک کو اور بعض نے دارمی کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دیا ہے، مغلطائی کی یہی رائے ہے، ان لوگوں کے دلائل یہ ہیں کہ دارمی کی سنن صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت رکھتی ہے، اس کی سندیں عالی، رجال ثقہ وقوی، رباعیات بکثرت اور شاذ ومنکر روایات بہت کم ہیں، علاوہ ازیں امام دارمی کا زمانہ قدیم ہے اور فضل وکمال کے لحاظ سے ان کا مرتبہ زیادہ ہے۔

لیکن بایں ہمہ جمہور کے قول کے مقابلہ میں یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا۔

ایک شبہہ کا ازالہ: مسند دارمی کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ "وہ مرسل، موقوف، منقطع اور معضل روایات پر مشتمل ہے، تو دراصل یہ امام بخاری کی صحیح کے مقابلہ میں ہے جیسا کہ عراقی کے پورے بیان سے اس کی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔

"یہ مسند کے نام سے مشہور ہے، جس طرح امام بخاری نے اپنی کتاب کا نام المسند الجامع رکھا ہے لیکن (بخاری کے مقابلہ میں) دارمی کے اندر مرسل، منقطع اور معضل روایتیں زیادہ ہیں" (۱) اور اس قول سے دارمی کی شہرت واہمیت میں بھی فرق نہیں آتا کیوں کہ اس کی صحت، علوئے اسناد وغیرہ کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے، باقی وقف، ارسال اور انقطاع وغیرہ تو حقیقت میں امام دارمی کے حزم واحتیاط کی دلیل ہے اور موطا امام مالک جیسی معتبر اور اہم کتاب میں تو اسی قسم کی روایتوں کی زیادتی ہے۔

سنن دارمی کا ایک قلمی نسخہ ۷۳۵ھ کا لکھا ہوا ۲۵۵/اوراق پر مشتمل کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے، (۲) ۱۲۸۶ھ میں نواب صدیق حسن خاں صاحب حج بیت اللہ کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے تو ان کو وہاں شاہ ولی اللہ صاحب کے ذخیرۂ کتب میں اس کا ایک نسخہ دستیاب ہوا اور انھوں نے اس کو نقل کر ڈالا، اسی نقل کو ۱۲۹۳ھ میں مولانا عبدالرشید بن محمد شاہ کشمیری نے دو اور نسخوں سے جن میں سے ایک ۸۰۰ھ کا لکھا ہوا تھا اور ا

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۳ (۲) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۱۔

س کی تصحیح صاحب حصن حصین علامہ جزری نے کی تھی مقابلہ وتصحیح کے بعد مختصر حواشی کے ساتھ مطبع نظامی کانپور سے شائع کیا۔

مولانا عبدالرشید صاحب نے حواشی میں دوسرے نسخوں سے اس کا فرق بھی ظاہر کیا ہے اور مشکل الفاظ، اعراب، اسماورجال اور بلاد واماکن کی مختصر تشریح اور حدیث کے معنی ومفہوم کی مختصر وضاحت بھی کی ہے اور اس کے شروع میں ایک مقدمہ کے اندر سنت وحدیث کی اہمیت، محدثین کی عظمت، کتب حدیث کے اقسام اور امام دارمی کے حالات وسوانح اور ان کی سنن کے مقام ومرتبہ وغیرہ سے بحث کی ہے۔

سنن دارمی کی ثلاثیات کو الگ سے بھی مرتب کیا گیا ہے، حاجی خلیفہ لکھتے ہیں:

> ''کتاب ثلاثیات دارمی ....ان پندرہ حدیثوں پر مشتمل ہے جو ان کی مسند میں بیان ہوئی ہیں۔(۱)

☆☆☆

(۱) کشف الظنون ج اول ص ۳۵۵۔

امام بخاریؒ

(متوفی ۲۵٦ھ)

نام ونسب اور ابتدائی حالات: سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن اسماعیل بن ابراہیم بن مغیرہ بن بردزبہ، ان کا اصلی نام محمد اور کنیت ابوعبداللہ ہے، ان کے جداعلی بردزبہ فارس کے رہنے والے اور مذہباً مجوسی تھے۔

امام صاحب کے جدامجد مغیرہ پہلے شخص ہیں، جو اس خاندان میں مشرف بہ اسلام ہوئے، اس زمانہ کا قاعدہ تھا کہ جس شخص کے ہاتھ پر اسلام لاتے تھے، اسی کی نسبت سے نومسلم مشہور ہوجاتے تھے، مغیرہ چونکہ امیر بخارا یمان جعفی کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے تھے، اس لئے جعفی مشہور ہوگئے، اور یہ لقب نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا ہوا امام صاحب تک پہنچا، اس بناپر امام صاحب جعفی کے لقب سے بھی مشہور ہیں۔(۱)

امام صاحب کے دادا ابراہیم کا حال کچھ نہیں معلوم ہوسکا لیکن ان کے والد اسماعیل چوتھے طبقہ کے معتبر محدثین میں شمار کئے جاتے ہیں، اسماعیل کی ثقاہت اور مرتبہ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام مالک اور حماد جیسے محدثین کی انھوں نے شاگردی کی اور ابن مبارک جیسے شیوخ کی صحبت میں مدتوں رہے، اہل عراق نے اکثر حدیثیں ان سے روایت کی ہیں، خود امام بخاری نے تاریخ کبیر میں ان کے حالات لکھے ہیں اور اپنے بزرگ والد کے فضل وکمال پر فخر کیا ہے۔(۲)

---

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸ وکتاب الانساب ورق ۱۳۲ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸۔

امام صاحب کے نام سے زیادہ ان کی وطنیت مشہور ہے، اس لئے اس قدر ہر شخص جانتا ہے کہ ان کا اصلی وطن بخارا ہے، بخارا قدیم جغرافیہ میں اقلیم پنجم کے صوبہ ماوراء النہر کا ایک جلیل القدر شہر سمجھا جاتا تھا(۱) لیکن جدید جغرافیہ کے رو سے ایشیائی ترکستان میں واقع ہے اس کی پشت پر سمرقند، داہنی طرف تاشقند، بائیں طرف صحرائے کراکورم اور سامنے صحرائے قزل خورم ہے، دوسری صدی کے اواخر میں (جب بخارا کو امام صاحب کی پیدائش کا شرف حاصل ہوا) خلفائے عباسیہ کے زیر حکومت تھا اور مقامی انتظام کے لیے دربار خلافت کی طرف سے ایک گورنر رہا کرتا تھا۔

شوال کی تیرہویں تاریخ تھی اور جمعہ کا دن تھا، جب ۱۹۴ھ میں امام بخاری پیدا ہوئے ابھی کھیل کود کے دن ختم نہیں ہوئے تھے کہ ان کے والد اسماعیل ان کو یتیمی کا داغ دے کر ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے، ان کی والدہ جن کی تنہا سرپرستی اور توجہ پر ان کی آئندہ ترقی کا دارومدار تھا، ان کو اور ان کے بڑے بھائی احمد کو لے کر بخارا سے مکہ معظمہ چلی آئیں، وہیں انھوں نے نشوونما پائی اور ابتدائی تعلیم حاصل کی۔(۲)

امام صاحب کی تحصیل علم کا زمانہ بچپن ہی سے شروع ہوتا ہے، ابتدائی تعلیم میں علم فقہ پر توجہ کی اور امام وکیع اور امام ابن مبارک جیسے اساتذۂ فن کی تصنیفات کا مطالعہ کیا، پندرہ برس کی عمر میں فقہ کی تعلیم سے فارغ ہو گئے تو اس مقدس فن کی جانب متوجہ ہوئے،(۳) جس کی پریشان اور پراگندہ حالت ان کی آئندہ توجہ اور سرپرستی کا انتظار کر رہی تھی، اگرچہ اس تفصیل کا حال نہیں معلوم ہوتا کہ امام صاحب نے کن مشائخ سے فن حدیث کو حاصل کیا لیکن اس قدر مسلم ہے کہ ان کا فضل وکمال اسحاق بن راہویہ اور علی بن المدینی کے فیضان تعلیم کا زیادہ ممنون ہے۔

---

(۱) معجم البلدان ج ۲ ص ۸۱ و ۸۲ و تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۳۲ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۸ (۳) ایضاً ص ۴۷۹ و طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۴ و ۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۴۔

ان بزرگوں کے علاوہ اور جن مشائخ کا تاریخوں میں پتہ چلتا ہے، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے شیوخ میں مختلف درجہ اور مختلف طبقے کی جماعتیں شامل تھیں، مثلاً:

۱- تبع تابعین جیسے محمد بن عبداللہ انصاری، ابو عاصم النبیل۔

۲- تبع تابعین کے معاصر، مگر کسی ثقہ تابعی سے انھوں نے حدیث کی روایت نہیں کی، جیسے آدم ابن ایاس۔

۳- تبع تابعین سے جن لوگوں کو اخذ حدیث کا موقع ملا، جیسے قتیبہ بن سعید، احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ، علی بن مدینی، یحیٰی بن معین۔ (۱)

۴- ہم درس طلبہ جیسے محمد بن یحیٰی ذہلی، ابو حاتم رازی، محمد بن عبدالرحیم صاعقہ۔

۵- امام صاحب کے معاصرین جیسے عبداللہ بن حماد آملی، عبداللہ بن ابی العاص خوارزمی (۲)

امام صاحب کے شوق علم کا یہ حال تھا کہ بغداد، بصرہ، خراسان، کوفہ، خوارزم، حجاز اور شام میں اس وقت کوئی محدث ایسا نہ تھا، جس سے امام صاحب نے کچھ نہ کچھ اخذ نہ کیا ہو، (۳) ان کے تمام شیوخ کی مجموعی تعداد ایک ہزار اسّی ہے جس میں پہلے قسم کے محدثین کا حصہ زیادہ ہے۔ (۴)

امام صاحب فطرۃً نہایت قوی الحافظہ تھے، فطرت کی اس فیاضی سے انھوں نے فن حدیث کی تحصیل میں بہت فائدہ اٹھایا، استاذ سے جو حدیث سنتے فوراً زبانی یاد کر لیتے، ابتدا میں کتابت حدیث کے سخت خلاف تھے، ان کا قول تھا کہ:

''کتابت سے انسان کی فطری قابلیت کم ہو جاتی ہے اور محض کتابوں پر

---

(۱) امام مسلم نیشاپوری نے بھی ان لوگوں سے روایت کی ہے (۲) مقدمہ فتح الباری ۴۷۹، ۴۸۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۳۴ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳ (۴) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۹۔

اعتماد کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔"(۱)

لیکن آگے چل کر جب ضروریات زمانہ متقاضی ہوئے تو ان کو اپنی رائے بدلنی پڑی۔

امام صاحب کی شہرت: امام صاحب کے فضل و کمال کی شہرت، اس سے پہلے کہ وہ فارغ التحصیل ہوں دور دور تک پہنچ چکی تھی، حفظ حدیث میں ان کا پایہ اس قدر بلند تھا کہ بڑے بڑے محدثین مقابلہ نہیں کر سکتے تھے، اس لئے ان کی تیزی ذہن اور قوت حافظہ کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا تھا، ان کے زمانہ کے وہ علما جن کے گرد و پیش ایک بڑی جماعت تلامذہ کی رہتی تھی اور جو فضل و کمال کے لحاظ سے خود امام فن کی حیثیت رکھتے تھے، ان کے کسی مجموعۂ حدیث کو امام صاحب صحیح تسلیم کرتے، تو فخریہ لہجہ میں کہتے کہ:

"ہماری ان حدیثوں کو محمد بن اسماعیل بخاری نے صحیح تسلیم کیا"(۲)

یعنی ان احادیث کی صحت میں اب کس کو کلام ہو سکتا ہے، جب امام بخاری جیسے نقاد نے صحیح قرار دیا۔

فارغ التحصیل ہونے کے بعد اس شہرت نے وہ ترقی کی کہ دور دور سے لوگ سمع حدیث کی غرض سے حاضر ہونے لگے، ائمہ حدیث درس دیتے ہوئے امام صاحب کو اپنی مسند خاص پر جگہ دیتے اور امام احمد بن حنبل جیسے بزرگ کہتے ہیں کہ "خراسان کی سرزمین نے محمد بن اسماعیل جیسا شخص پیدا نہیں کیا"(۳)

یوسف بن موسیٰ مروروزی نے بصرہ میں امام صاحب کی وسعت علم اور شہرت کا پراثر منظر دیکھا تھا، ان کا بیان ہے کہ ایک دن کسی شخص کو گلیوں میں پکارتے ہوئے سنا کہ "اے قدردانان علم! ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل آج کل بصرہ میں تشریف فرما ہیں، جو شخص ان کی زیارت کا مشتاق ہو، جامع مسجد میں حاضر ہو" یہ آواز سنتے ہی جامع مسجد میں حاضر ہوا، مسجد میں اس وقت بہت سے علما جمع تھے، ایک ادھیڑ عمر کا شخص ستون کی آڑ میں نماز پڑھ

---

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۷ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۳، ۴۸۴ (۳) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۱۔

رہا تھا، معلوم ہوا کہ امام محمد بن اسماعیل بخاری یہی ہیں، نماز سے فارغ ہو کر علما کی طرف متوجہ ہوئے، حاضرین نے درخواست کی، آج حدیث کے متعلق خطبہ دیں، امام صاحب نے منظور فرمایا، شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ فلاں وقت امام صاحب بیان فرمائیں گے، جوق جوق مسجد میں جمع ہونے لگے، جب حاضرین کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی تو امام صاحب کھڑے ہوئے اور یوں بیان کرنا شروع کیا، کہ اے علمائے بصرہ! آج میں تمہارے سامنے وہ حدیث پیش کروں گا جن کے راوی تمہارے شہر بصرہ کے رہنے والے ہیں، مگر تم کو ان کی خبر نہیں'' اس کے بعد انھوں نے جتنی حدیثیں بیان کیں، سب کے رواۃ اہل بصرہ تھے۔(۱)

امام صاحب کی اس وسعت معلومات اور معرفت حدیث کو دیکھ کر اکثر علما کہا کرتے تھے کہ:

انما هو آية من آيات الله	امام بخاری خدا کی نشانیوں میں سے
تمشي على وجه الارض	ایک نشانی ہے جو زمین پر چلتی پھرتی
ماخلق الاللحديث۔(۲)	نظر آتی ہے، خدا نے ان کو صرف حدیث ہی کے لیے پیدا کیا۔

تحصیل علم کے لئے مختلف مقامات کا سفر: امام صاحب نے تحصیل علم اور زیارت علما کے لئے دور دراز مقامات کے سفر کئے، مصر و شام میں استفادۂ حدیث کی غرض سے دوبارہ گئے، حجاز میں متواتر چھ سال تک قیام کیا، کوفہ و بغداد میں جو علما کا مسکن تھا، بار بار آیا کیے، بصرہ میں چار بار گئے اور بعض مرتبہ پانچ پانچ برس تک قیام کیا، ایام حج میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور فراغت کے بعد پھر بصرہ چلے آتے،(۳) ان تمام سفروں میں نیشاپور کا سفر خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۵، ۱۶ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۵ والبدایہ ج ۱۱ ص ۲۶ و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۵ (۳) مقدمہ فتح الباری ص ۴۷۹ و تاریخ بغداد ج ۲ ص ۴ و ۵۔

نیشاپور کا سفر: نیشاپور اس زمانے میں علم حدیث کا مرکز تھا، مسلم بن حجاج صاحب صحیح مسلم اور ان کے استاذ امام محمد بن یحییٰ ذہلی جیسے محدث اسی کی خاک سے اٹھے تھے اور ان کے علم وفضل نے نیشاپور کو دور دور تک مشہور کر دیا تھا، ایسی حالت میں امام صاحب کا نیشاپور جانا اور بڑے بڑے اساتذہ کی موجودگی میں اپنے فضل وکمال کا سکہ بٹھانا ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔

امام صاحب جس شان سے نیشاپور میں داخل ہوئے اور جس جوش سے ان کا خیر مقدم کیا گیا، اس کی تصویر خود امام مسلم ان مختصر لفظوں میں کھینچی ہے:

''امام بخاری جب نیشاپور میں تشریف لائے تو اس دھوم دھام سے ان کا استقبال کیا گیا کہ والیان ملک اور سلاطین کو بھی نصیب نہ ہوا ہوگا۔''(۱)

امام صاحب نیشاپور پہنچ کر درس وتدریس حدیث میں لگ گئے، علمائے شہر اکثر اوقات حاضر ہوا کرتے اور امام صاحب کی معلومات حدیث سے مستفیض ہوتے، خود امام مسلم کا یہ حال تھا کہ امام صاحب کی روزانہ مجلس کبھی ان سے خالی نہیں ہوتی تھی، ایک دن امام صاحب کی جامعیت اور تبحر علمی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ بے اختیار پیشانی کا بوسہ لے لیا اور جوش میں آ کر کہا کہ:

دعني اقبل رجليك يا امير المومنين في الحديث۔	اے ملک حدیث کے بادشاہ! مجھے اجازت دیجئے کہ میں قدم بوسی کا شرف حاصل کروں۔

امام محمد بن یحییٰ ذہلی اس پایہ کے شخص تھے کہ امام مسلم کے استاذ اور نیشاپور کے مسلم محدث تھے، انھوں نے اپنے تمام شاگردوں کو حکم دے دیا تھا کہ امام صاحب کی مجلس میں حاضر ہوا کریں خود امام صاحب کی شہرت اور فضل وکمال نے اس طرح لوگوں کو گرویدہ کہ امام ذہلی جیسے بزرگوں کی مجلسیں بے رونق ہو گئیں۔(۲)

(۱) مقدمہ فتح الباری ص۴۹۱ (۲) ایضاً وتاریخ بغداد ج۲ ص۳۰ وطبقات الشافعیہ ج۲ ص۱۱۔

ایک دن امام ذہلی نے اپنے مجلس میں فرمایا کہ ”میں کل محمد بن اسماعیل بخاری کی ملاقات کو جاؤں گا جس شخص کا جی چاہے میرے ساتھ چلے“ ساتھ ہی امام ذہلی کو یہ خیال ہوا کہ امام بخاری کی بدولت میری درسگاہ میں جو بے رونقی چھا گئی ہے، اس کا اثر میرے طلبہ پر بھی پڑا ہے، اس لیے میرے ساتھیوں میں سے کوئی طالب علم ایسی بات نہ پوچھ بیٹھے، جس کی بدولت مجھ میں اور محمد بن اسماعیل میں رنجش ہو جائے اور غیر اقوام کو اہل سنت کے اختلاف پر ہنسی اڑانے کا موقع ہاتھ آ جائے، اس لیے اپنے ہمراہیوں کو تاکید کر دی کہ امام بخاری سے اختلافی مسائل کے متعلق کوئی سوال نہ کیا جائے۔(۱)

دوسرے دن امام ذہلی اپنی جماعت کے ساتھ امام صاحب کے یہاں پہنچے، اتفاقاً وہی صورت پیش آ گئی جس کا انھیں خوف تھا، ایک شخص نے اٹھ کر امام صاحب سے سوال کیا کہ یا ابا عبداللہ! قرآن کے جو الفاظ ہماری زبان سے نکلتے ہیں، کیا وہ مخلوق ہیں؟ اس کے اصلی الفاظ یہ تھے ”لفظی بالقرآن مخلوق“ امام صاحب ساکت رہے، پھر اس شخص نے دوبارہ سوال کیا، امام صاحب نے مجبور ہو کر جواب دیا کہ:

القرآن کلام الله غیر مخلوق	قرآن کلام الٰہی اور غیر مخلوق ہے، اور
ولفظی بالقرآن الفاظنا	جو الفاظ ہماری زبانوں سے نکلتے ہیں وہ
والفاظنا من افعالنا وافعالنا	ہمارے الفاظ ہیں اور ہمارے الفاظ
مخلوقة.(۲)	ہماری زبان کی ایک حرکت ہے اس لئے
	ہمارا ایک فعل ہے اور افعال مخلوق ہیں۔

امام صاحب نے ان مختصر لفظوں میں درحقیقت اس بحث کا فیصلہ کر دیا تھا، ظاہر ہے کہ اگر قرآن کا مفہوم نفس کلام سے ہے، تو کلام خدا کی ایک صفت ہے، اور خدا کی صفت کیوں کر مخلوق ہو سکتی ہے؟ اگر وہ الفاظ مراد ہیں جو ہماری حادث زبانوں سے نکلتے ہیں، تو

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۱ (۲) ایضاً۔

چونکہ وہ مخلوق کا ایک فعل ہے، لہذا ان کے مخلوق ہونے میں کلام نہیں۔

لیکن اس دقیق جواب کو عوام نہ سمجھ سکے، اس لئے اس واقعہ کو اس قدر بڑھایا اور شہرت دی کہ امام صاحب کی عام ہر دلعزیزی میں فرق آ گیا مگر جو لوگ دقیقہ رس اور نکتہ سنج تھے، وہ اس جواب کی تہ کو پہنچ گئے اور پیشتر سے زیادہ وقعت کرنے لگے، انہی لوگوں میں ایک شخص امام مسلم بھی تھے، ان کو جب معلوم ہوا کہ امام ذہبی بھی اس جواب کی بدولت امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے اپنی مجلس میں منادی کرادی کہ "جو شخص لفظی بالقرآن مخلوق کا قائل ہو وہ ہماری مجلس میں شریک نہ ہو" تو سخت برآشفتہ ہوئے اور وہ تمام نوشتے اونٹوں پر لدوا کر واپس کر دیے جن میں امام ذہبی کی تقریریں قلمبند کی تھیں۔(۱)

جب یہ اختلاف ایک نازک حد تک پہنچ گیا تو امام صاحب نیشاپور کو خیرباد کہہ کر اپنے وطن مالوف بخارا کو روانہ ہوئے، اہل بخارا کو جب اطلاع ہوئی کہ ان کا ہم وطن کمال اور شہرت کے خلعت سے آراستہ ہو کر پھر اپنے وطن مالوف کی طرف واپس آ رہا ہے تو جوشِ مسرت میں استقبال کے لئے بڑھے، شہر سے دو کوس کے فاصلہ پر امرائے شہر نے خیر مقدم کیا اور درہم و دینار نثار کرتے ہوئے شہر میں لائے،(۲) اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا جب بے باپ کا ایک یتیم بچہ حسرت و یاس کی گود میں بخارا سے نکلا تھا اور ایک یہ زمانہ ہے، جب وہی یتیم بچہ امام حدیث ہو کر امرائے شہر کے غول میں خراماں خراماں اسی بخارا میں داخل ہو رہا ہے۔

جلاوطنی اور انتقال: بخارا میں امام صاحب نے ایک مدت تک آرام و راحت سے زندگی بسر کی لیکن آخر میں اپنی غیور اور خود دار طبیعت کی بدولت مصیبت میں مبتلا ہو گئے، شاہ بخارا نے حکم دیا کہ بخارا سے فوراً نکل جائیں۔

امام صاحب کے بعض رشتہ دار سمرقند کے ایک چھوٹے سے قریہ خرتنگ میں رہتے

---

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۱، ۴۹۲، (۲) ایضاً ص ۴۹۳۔

تھے، امام صاحب بخارا سے نکل کر وہیں چلے آئے اور آخر عمر تک وہیں رہے، جلا وطنی کا انھیں سخت افسوس تھا، وفور غم میں بے اختیارانہ زبان سے نکل جاتا، کہ الٰہی باوجود وسعت کے زمین میرے لئے تنگ ہو گئی ہے، اس لئے اب مجھ کو اٹھا لے۔(۱)

عجیب اتفاق ہے کہ یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ تھوڑے ہی دنوں میں خدا نے دنیا سے اٹھا لیا، (۲) ۲۵۶ھ میں .... شب کو نماز کے بعد انتقال ہوا، شوال کے مہینے میں تیرہویں تاریخ کو پیدا ہوئے اور شوال ہی کی چاندرات میں دوشنبہ کو وفات پائی اور عید کے دن ظہر کی نماز کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔

دوسرے دن جب یہ خبر مشہور ہوئی تو سمرقند میں ایک تہلکہ مچ گیا، اس دھوم دھام سے جنازہ اٹھایا گیا کہ سارا سمرقند مشایعت میں ساتھ ساتھ تھا، اور بڑے بڑے علما اور امرا باچشم پرنم نمازِ جنازہ میں شریک تھے، نماز ظہر کے بعد جنازہ دفن کیا گیا اور آسمان حدیث کا یہ منور آفتاب سرزمین سمرقند میں ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔

ایک شاعر نے اختصار کے ساتھ امام صاحب کا سال ولادت، سال وفات اور سن عمر کو ذیل کے دو شعروں میں یوں نظم کیا ہے، جو بہت دلچسپ ہے:

کان البخاری حافظا ومحدثا — جمع الصحیح مکمل التحریر

میلاده صدق و مدة عمره — فیها حمید وانقضی فی نور (۳)

امام صاحب کا حلیہ یہ تھا، جسم دبلا، پتلا، قد میانہ، رنگ گندمی۔ (۴)

عام اخلاق و عادات، وجہِ معاش اور تصنیفات

خودداری: امام صاحب کی مقدس زندگی میں بعض ایسی شائستہ خصوصیات پائی جاتی ہیں، جن سے بڑے بڑے نامور لوگوں کا اخلاقی دامن خالی ہے، ان کی طبیعت سخت درجہ غیور،

(۱) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۴ و مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۴ و تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۲ (۲) ایضاً (۳) بستان المحدثین ص ۱۳ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ و تہذیب ج ۹ ص ۴۸۔

خودداراور بے تکلف تھی، ان کے واقعات زندگی کے آخری حصہ میں تم پڑھ آئے ہو کہ امیر بخارا نے جلاوطن کر دیا تھا مگر کس لئے؟ صرف اس لئے انھوں نے علم کی عظمت کے آگے ایک دنیادار کی عزت کا لحاظ نہیں کیا، امیر بخارا کی خواہش تھی کہ امام صاحب اس کے دربار میں حاضر ہو کر صحیح بخاری اور تاریخ کبیر سنائیں، امام صاحب نے اس خواہش کو رد کر دیا کہ میں علم کو ذلیل کرنا نہیں چاہتا. کہ سلاطین کے آستانے پر لے جا کر پیش کش کروں، اگر امیر کو سچا شوق ہے، تو میری مجلس میں آکر شریک ہو، امیر بخارا کی درخواست تھی کہ وہ قصر شاہی میں آکر شہزادوں کو تعلیم دیں، امام صاحب نے فرمایا کہ میں امیر کے لڑکوں کو کوئی خصوصیت نہیں دے سکتا، میری مجلس عام ہے، جس کا جی چاہے آکر شریک ہو، امیر بخارا کو یہ استغنا ناگوار گذرا، حکم دے دیا کہ ہمارے شہر سے نکل جاؤ، امام صاحب نے اپنے وطن سے نکلنا منظور کر لیا مگر علم کی ذلت گوارا نہ کی، (۱) خودداری کا خیال اس درجہ تھا کہ خود ان کا قول ہے:

> ''میں نے اپنے استاد علی بن مدینی کے سوا اور کسی کے مقابلہ میں اپنے کو چھوٹا نہ سمجھا۔'' (۲)

سادگی وقناعت: امام صاحب نے عمر بھر کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ عام علما کی طرح کسی امیر یا بادشاہ کی فیاضی سے فائدہ اٹھائیں، کئی مرتبہ اس قسم کے مواقع ہاتھ آئے مگر انھوں نے وظیفہ قبول نہیں کیا، اپنے پدر بزرگوار کی میراث میں جو کچھ ملا، اس پر آخری عمر تک قناعت کی، اس زمانے میں تجارت کی اس خاص صورت کو کہ ایک شخص اپنا روپیہ صرف کرے اور دوسرا اپنی محنت اور مشترکہ تجارت سمجھی جائے، مضاربت کہتے تھے، امام صاحب اسی طریقہ کی تجارت میں اپنے روپے لگا دیتے اور اسی کی قلیل آمدنی سے ضروریات زندگی پوری کرتے۔ (۳)

(۱) مقدمہ فتح الباری ص۴۹۴ (۲) مقدمہ فتح الباری ص۴۸۴ وتہذیب ج۹ص۵۰ (۳) مقدمہ فتح الباری ص۴۸۰۔

انکساری: بہت کم لوگ ہوں گے، جن کو زندگی میں ایسی لا انتہا شہرت نصیب ہوئی ہوگی، جس کو خود ان کی آنکھوں نے دیکھا تھا، باوجود اس کے انھیں معمولی سے معمولی شخص سے بھی کسی نامعلوم امر کو دریافت کرنے میں عار نہیں آتا تھا، ان کے اساتذہ کی طول طویل فہرست میں بعض ان لوگوں کے نام نظر آتے ہیں، جو ان کے ہم عمر یا ہم سبق تھے۔(۱)

رواداری و بے تعصبی: امام صاحب کا ایک بے نظیر وصف ان کی بے تعصبی ہے، جب ہم ان کے مجموعہ احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو بہت سی ایسی حدیثیں پاتے ہیں جن کے راوی مذہب اہل سنت کے خلاف تھے، امام صاحب نے ان سے روایت کرنے میں کچھ تامل نہیں کیا، اگرچہ خود ان کے مذہب سے اختلاف رکھتے تھے۔

ورزش: امام صاحب کو جسمانی ورزش کا بہت شوق تھا، سواری اور تیراندازی میں اس درجہ مہارت تھی کہ ان کا نشانہ بہت کم غلط ہوتا تھا۔(۲)

صفائی: امام صاحب کوئی دنیادار آدمی نہیں تھے، ان کی زندگی بالکل سیدھی سادھی اور خالص علمی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی صفائی کا اس درجہ خیال رہتا تھا کہ فرش پر ایک تنکے کا پڑا رہنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے، اثنائے درس میں ایک شخص نے اپنی ڈاڑھی سے ایک تنکا نکال کر فرش پر ڈال دیا، امام صاحب کی جب نظر پڑی تو چپکے سے اٹھے اور تنکے کو اٹھا کر باہر صحن میں ڈال دیا۔(۳)

امام صاحب کا حلقہ درس نہایت وسیع تھا، اسلامی دنیا کے ہر حصہ سے طلبہ کی جماعت جوق جوق آکر شریک ہوتی اور بڑے بڑے پایہ کے اشخاص حلقہ تلامذہ میں شامل ہوتے، ان کی مجلس درس کبھی مسجد میں اور کبھی ان کے خاص مکان پر منعقد ہوتی تھی، ان کے شاگردوں میں حافظ ابوعیسیٰ محمد بن عیسیٰ ترمذی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، مسلم بن حجاج جیسے جید

---

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۰ وتہذیب ج ۹ ص ۴۷ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۱ (۳) مقدمہ فتح الباری ص ۴۸۲۔

محدث نظر آتے تھے جو حدیث کے ارکان ستہ کے تین جلیل القدر رکن ہیں، ابن خزیمہ، محمد بن نصر مزوری، صالح بن محمد جو آگے چل کر خود بڑے پایہ کے مصنف ہوئے، امام صاحب کے عام شاگردوں میں داخل ہیں۔(۱)

امام صاحب کو زمانہ تحصیل علم ہی میں تصنیف و تالیف کا شوق ہوا اور آخر عمر تک قائم رہا، ان کی ابھی اٹھارہ برس کی عمر تھی، جب ایک کتاب قضایائے صحابہ و تابعین نامی لکھی (۲) اور بڑے بڑے مسن مشائخ کو متحیر کر دیا۔

تاریخ کبیر مدینہ منورہ کی چاندنی راتوں میں لکھی جب آسمان کی منور اور قدرتی قندیل نے دنیا کے مصنوعی چراغوں سے مستغنی کر دیا تھا۔(۳)

صحیح بخاری کا مفصل ذکر مستقل عنوان سے آگے آرہا ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر تصنیفات کی مجمل فہرست یہ ہے:

۱- تاریخ کبیر، ۲- تاریخ اوسط، ۳- تاریخ صغیر، ۴- خلق افعال عباد، ۵- رسالہ رفع الیدین، ۶- قرأت فاتحہ خلف الامام، ۷- الادب المفرد، ۸- بر الوالدین، ۹- کتاب الضعفاء، ۱۰- الجامع الکبیر، ۱۱- التفسیر الکبیر، ۱۲- کتاب الاشربہ، ۱۳- کتاب الھبہ، ۱۴- کتاب المبسوط، ۱۵- کتاب الکنی، ۱۶- کتاب العلل، ۱۷- کتاب الفوائد، ۱۸- کتاب المناقب، ۱۹- اسامی الصحابہ، ۲۰- کتاب الواحد، ۲۱- قضایا الصحابہ۔

جامع صحیح بخاری

ہجرت کی پہلی صدی تک احادیث کی تدوین نہیں ہوئی، صحابہ کا خیال تھا کہ اگر آثار نبوی مرتب کیے جائیں تو ممکن ہے کہ آگے چل کر ایک زمانہ ایسا آئے کہ کلام الٰہی اور کلام نبوی میں کوئی امتیاز نہ رہے اور لوگ غلطی میں پڑ جائیں، علاوہ اس کے ابھی اہل عرب

(۱) مقدمہ فتح الباری ص ۴۹۳ (۲) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۷ (۳) ایضاً۔

اس قدر متمدن نہیں ہوئے تھے کہ کتابت اور جمع وتصنیف کا عام رواج ہوتا، دوسری صدی میں جب علوم وفنون کی اشاعت اور تدوین کی بنیادیں پڑیں اور کتابت کا عام رواج ہوا تو جمع حدیث پر بھی لوگوں کو توجہ ہوئی، امام مالک نے مؤطا میں اہل حجاز کی حدیثیں جمع کیں، ابن جریج نے مکہ معظمہ میں، امام اوزاعی نے شام میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں اور ابو سلمہ حماد نے بصرہ میں احادیث کے مجموعے ترتیب دیے، عبید اللہ بن موسیٰ کوفی اور نعیم بن حماد وغیرہ نے مسندیں مرتب کیں اور دوسری صدی کے اختتام تک بیسوں مجموعے تیار ہو گئے۔(۱)

تیسری صدی میں امام بخاری کو جمع حدیث پر توجہ ہوئی، کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت تک احادیث کے بے شمار مجموعے مرتب ہو چکے تھے، اس لئے امام صاحب نے اگر ان سے چھانٹ کر ایک مجموعہ تیار کر لیا، تو یہ کوئی اہم کام نہ تھا لیکن یہ خیال صحیح نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ امام صاحب سے پیشتر اگرچہ متعدد مجموعے مرتب ہو چکے تھے مگر ان کی حالت کیا تھی اور امام صاحب نے جو مجموعہ تیار کیا ہے، اس کی حالت کیا ہے، اس پہلو سے اگر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو کہ صحیح بخاری کی اصلی خصوصیت کیا ہے؟ اور امام صاحب کا یہ کام کس قدر اہم اور کس درجہ دشوار تھا، ہم اس مضمون میں اسی حیثیت سے صحیح بخاری پر نظر ڈالنی چاہتے ہیں۔

صحیح بخاری کا اصلی نام احادیث اور ابواب وغیرہ کی تعداد: صحیح بخاری کا اصلی نام یہ ہے: ''الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ وسننہ وایامہ'' حقیقت یہ ہے کہ ایک حدیث کے مجموعے کے لیے اس سے زیادہ مناسب جامع اور واقعی نام نہیں ہو سکتا۔

صحیح بخاری میں تقریباً دس ہزار حدیثیں ہیں جو چھ لاکھ حدیثوں سے منتخب کر کے درج کی گئیں،(۲) ۱۶۰ کتاب ہیں اور تین ہزار چار سو پچاس ابواب ہیں، ان تمام شیوخ کی تعداد جن سے صحیح بخاری کی حدیثیں لی گئی ہیں، دو سو نواسی ہے، تیرہ سو چالیس مشائخ

(۱) ملخص از مقدمہ فتح الباری ص ۴، ۵ (۲) مقدمہ فتح الباری ص ۴۶۵، ۴۷۰۔

ایسے ہیں جن سے مسلم نے روایت نہیں کی صرف امام بخاری نے روایت کی ہے۔

ثلاثیات اس حدیث کو کہتے ہیں جو صرف تین راویوں کے واسطہ سے امام صاحب تک پہنچی ہے، صحیح بخاری میں اس قسم کی بائیس حدیثیں ہیں جن پر امام صاحب کو فخر ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بجا فخر ہے۔

صحیح بخاری کی خصوصیات: امام صاحب جمع حدیث پر متوجہ ہوئے، تو بے انتہا مشکلات کا سامنا ہوا، انھوں نے دیکھا کہ جس قدر کتابیں مرتب ہوئی ہیں، وہ محض احادیث کا ایک مجموعہ ہیں، جن میں نہ صحت کا التزام کیا گیا ہے، نہ علت وضعف سے بحث کی گئی ہے، اس قسم کے مجموعوں کا تیار کر لینا کوئی مشکل اور اہم کام نہ تھا، مشکل یہ تھا کہ ایک صحیح اور اصح مجموعہ تیار کیا جائے، صحت کے علاوہ ترتیب کے لحاظ سے بھی منتظم اور مرتب ہو، صحیح آثار کی غیر صحیح آثار سے تمیز کی جائے، التزام ہو کہ حتی المقدور اعلیٰ اقسام کی حدیثیں اس میں درج کی جائیں۔

امام بخاری پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس التزام اور صحت سے حدیث کا ایک مجموعہ تیار کیا، اس لحاظ سے یہ جس قدر اہم تھا اسی قدر دشوار تھا، امام صاحب نے نہایت کوشش اور جانکاہی سے اول لاکھوں حدیثیں جمع کیں، پھر نہایت دقت نظر سے ان پر نقادانہ نظر ڈالی، اصول وقواعد کے ساتھ ان میں سے دس ہزار حدیثیں منتخب کیں اور ترتیب وار ایک جلد میں جمع کیا۔

امام بخاری نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ حدیث کے درجے مقرر کیے اور ان کو مختلف قسموں میں تقسیم کیا، صحت اور سند کے لحاظ سے کوشش کی کہ مستفیض، متواتر، حسن حدیثیں جمع کی جائیں، ان سے دوسرے درجہ پر صحیح حدیثوں کو لیا جائے مگر صحیح سے نیچے درجہ کی حدیثیں جیسے مطلق حسن، وغیرہ کو صحیح بخاری میں جگہ نہ دی جائے، (۱) اگرچہ

(۱) جس حدیث کو کم از کم تین جلیل القدر صحابیوں نے الگ الگ طریقوں (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

یہ التزام مسلم اور صحاح اربعہ میں بھی پایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ موطا امام مالک بھی اس خصوصیت میں شریک ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس خوبی اور عمدگی سے امام صاحب نے اس التزام کو نبھایا ہے، اس کی نظیر کوئی مجموعہ پیش نہیں کرسکتا، یہی وجہ ہے کہ اصح الکتب کے خطاب سے یہ کتاب سرفراز ہوئی۔

بخاری اور مسلم: حدیث کی چھ صحیح کتابوں میں خصوصیت کے ساتھ دو کتابیں زیادہ صحیح، مستند اور قابل اعتماد تسلیم کی گئی ہیں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم ان دونوں کتابوں کی نسبتاً زیادہ صحت میں کسی کو کلام نہیں لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ صحیحین میں اصح کون ہے، عام طور پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ان دونوں کتابوں میں صحیح ترین کتاب جامع صحیح بخاری ہے لیکن بعض اہل مغرب کو اس میں کلام ہے، ان کا خیال ہے کہ مسلم بخاری سے زیادہ صحیح اور قابل اعتماد ہے لیکن یہ خیال کسی صورت صحیح نہیں ہوسکتا، بخاری کو مسلم پر فضیلت ہے اور اکثر حیثیتوں سے ترجیح حاصل ہے، سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وجوہ ترجیح کیا کیا ہوسکتے ہیں۔

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) سے روایت کیا ہو اور اس کے رواۃ میں روز بروز ترقی ہوتی گئی ہو، تو اس حدیث کو مستفیض کہتے ہیں، حدیث کی یہ اعلیٰ قسم ہے، اگر تین سے زیادہ مگر مشہور اصحاب سے مروی ہو تو اس کو متواتر کہتے ہیں انما الأعمال بالنیات ایک مشہور حدیث ہے جس کے اول راوی صرف حضرت عمرؓ ہیں، ان سے علقمہ نے روایت کی اور علقمہ سے صرف محمد بن ابراہیم نے محمد سے فقط یحییٰ بن سعید نے اور یحییٰ سے بے شمار لوگوں نے روایتیں کیں، لہٰذا یہ حدیث متواتر ہے، متواتر کے بعد تیسرے درجہ پر حدیث حسن ہے، حسن اس حدیث کو کہتے ہیں جو مختلف طریقوں سے مروی ہو اور ہر طریق کی حدیث کا مضمون دوسرے طریق کی حدیث کی تائید کرتا ہو اگر ایک ہی طریق سے مروی ہو تو اس کو غریب مطلق کہتے ہیں، جن کی دو قسمیں ہیں، صحیح اور مطلق، حسن صحیح وہ حدیث ہے جس کے بعض یا کل طریقوں کے تمام راوی ثقہ، عادل، غیر مجروح، غیر منکر اور نیز راوی اول کوئی مشہور صحابی وساتھ ہی سلسلۂ روایت میں اتصال ہو۔ مطلق حسن وہ حدیث ہے جس میں یہ بعض شرائط نہ پائی جائیں۔

صحیح بخاری اور مسلم کا مقابلہ چند حیثیتوں سے کیا جا سکتا ہے، حسن ترتیب، احادیث اور ترجمہ کا تناسب، عدم شذوذ، اعلال، قوتِ رواۃ، استنباط مسائل، اتصال اسناد، زبان، صحت حدیث، پہلی دو حیثیتوں کو چھوڑ کر باقی ہر حیثیت سے بخاری کو مسلم پر فضیلت حاصل ہے، بخاری میں سوء ترتیب اور بعض موقعوں میں عدم مناسبت حدیث و ترجمہ باب کا عیب ضرور ہے مگر اس سے کتاب کی حقیقی خوبیوں پر پردہ نہیں پڑ سکتا، صحیح بخاری اس رنگ اور التزام کی پہلی تصنیف ہے، امام صاحب کے سامنے اس قسم کا کوئی نمونہ نہیں تھا، مسلم نقش ثانی ہے، صحیح بخاری نے اس کے لیے راستہ صاف کر دیا تھا، ایک اعلیٰ درجہ کا نمونہ پیش نظر تھا، اس لیے اگر ترتیب وغیرہ میں نسبتاً چند نقص پائے جاتے ہیں تو ان کی بنا پر امام صاحب پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا، اس قسم کی فروگذاشتوں کا ایک ایسی کتاب میں جس کے لیے پہلے سے کوئی نمونہ نہ رہا ہو، رہ جانا کوئی مستبعد نہیں ہے اور اس لحاظ سے امام صاحب کی معذوری ظاہر ہے۔

صحیح مسلم کے مقابلہ میں صحیح بخاری کی خوبیاں بے شمار ہیں لیکن جن حیثیتوں کو ہم نے پیش کیا ہے ان کو پیش نظر رکھ کر اگر دیکھا جائے، تو سات خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں جو صرف بخاری کا حصہ ہیں، مسلم کو ان میں شرکت کا شرف حاصل نہیں ہوا۔

۱- امام بخاری کا اصلی مقصود اگرچہ احادیث صحیحہ کی تدوین ہے، مگر ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ترتیب احادیث میں فقہی فوائد کو بھی ملحوظ رکھا اسی لیے صحیح بخاری کی ترتیب فقہی ابواب اور مسائل کے موافق رکھی گئی ہے اور بعض ایسے باب پائے جاتے ہیں جن کو مسائل قرار دے کر ان کے جواز یا عدم جواز میں قرآن مجید کی آیات پیش کی ہیں، کہیں کہیں معلقات اور مرفوعات سے حلت اور حرمت پر استدلال کیا ہے اور ان کے متعلق اگر حدیثیں ملی ہیں تو ان کو بھی پیش کر دیا، مثلاً صحیح بخاری کی ابتدا میں، الایمان یزداد وینقص کو ایک مسئلہ فرض کر کے لِیَزدادُوا ایماناً اور لیطمئن قلبی وغیرہ آیات

اور اقوال صحابہؓ سے زیادت ونقص ایمان کو ثابت کیا ہے، اس خصوصیت کی بدولت صحیح بخاری تحقیق مسائل کا بھی ایک عمدہ ذریعہ ہے، برخلاف مسلم کے کہ اس کی اصلی غرض صرف احادیث صحیح کو ابواب فقہیہ کی حیثیت سے مرتب کرنا ہے، اس لیے مسائل کی تحقیقات کے حصہ سے بالکل خالی ہے۔

۲- ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری احادیث سے اس زمانہ کی معاشرت کا پتہ لگاتے ہیں اور معمولی واقعات سے نہایت مفید نتائج نکال کر ہر نتیجہ کو الگ الگ بابوں میں درج کرتے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ بریرہ کو جو حضرت عائشہؓ کی لونڈی تھی، کسی نے کچھ گوشت صدقہ کے طور پر دیا، حضرت عائشہؓ نے وہ گوشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر نہیں دیا کہ ''یہ گوشت صدقہ کا ہے اور آپ صدقہ نہیں کھاتے'' آنحضرت نے فرمایا کہ ''بریرہ کے لیے بیشک صدقہ ہے لیکن اگر بریرہ مجھے دے تو میرے لیے ہدیہ ہے۔''

امام مسلم نے اس حدیث کو باب الصدقہ میں درج کیا ہے، مگر امام بخاری نے اس ایک حدیث سے متعدد نتائج پیدا کیے ہیں اور مختلف بابوں میں نقل کیا ہے، ایک موقع پر یہ نتیجہ نکالا ہے، کہ جن لوگوں پر صدقہ حرام ہے، ان کی لونڈیوں کو صدقہ دینا جائز ہے، کیونکہ ازواج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لونڈیوں نے صدقہ لیا اور آنحضرتؐ مانع نہیں ہوئے، ایک اور موقع پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو صدقہ دیا جائے اور وہ کسی ایسے شخص کو وہ چیز ہدیہ کے طور پر دے، جس پر صدقہ حرام ہے تو اس کا قبول کرنا جائز ہے۔

۳- ایک باریک فرق صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں یہ ہے کہ جب کسی ایک شیخ کے شاگردوں سے یہ دونوں بزرگ روایت کرتے ہیں تو اس میں شک نہیں کہ ان کے شرط کے مطابق ان میں عدل، ثقاہت، قوتِ حافظہ، سلامتی ذہن، تقویٰ یہ تمام شرطیں ضرور پائی جاتی ہیں لیکن چونکہ تمام شرطیں ہر راوی میں برابر درجہ کی نہیں ہوسکتیں، کوئی عادل ہے، کوئی زیادہ عادل ہے، کوئی بہت زیادہ عادل ہے، اس لئے امام بخاری جس احتیاط اور دقت نظر کے

ساتھ ان سے روایت کرتے ہیں، وہ امام مسلم میں نہیں پائی جاتی، امام زہری کے تلامذہ کے پانچ طبقے ہیں، اگرچہ سب کے سب معتبر رواۃ میں سے ہیں لیکن اوصاف کی کمی اور زیادتی کے لحاظ سے ان کے مدارج باہم متفاوت ہیں، امام بخاری اول طبقہ سے اصولاً اور دوسرے طبقہ سے ضمناً روایت کرتے ہیں، مگر امام مسلم دوسرے طبقہ سے اصولاً اور تیسرے طبقہ سے ضمناً اور پہلے طبقہ سے کبھی کبھی روایت کرتے ہیں، اسماء الرجال کے ماہرین کو اس کا پتہ آسانی سے لگ سکتا ہے۔

۴- بخاری کی قدر ومنزلت کا اندازہ مسلم کے مقابلہ میں اس حیثیت سے بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے رواۃ کی تعداد جن سے امام صاحب نے صحیح میں روایت کی ہے ۴۳۰ سے کچھ زائد ہے، اس تعداد میں سے صرف ۸۰ راوی ایسے ہیں جن میں علما نے کلام کیا ہے لیکن مسلم کے خاص راوی ۶۲۰ ہیں، ان میں ۱۶۰ راویوں کو علما نے ضعیف قرار دیا ہے، اس سے صاف ظاہر ہے کہ امام صاحب کے کمزور راویوں سے مسلم کی ضعیف رواۃ کی تعداد بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔

یہاں یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ بخاری کے ضعیف رواۃ زیادہ تر بخاری کے شیوخ میں سے ہیں، جن سے امام صاحب کی مدتوں صحبت رہی، ان کے حالات اور خیالات سے اطلاع حاصل کی، اس لئے قیاس اس امر کو تسلیم نہیں کرتا کہ امام بخاری جیسے نقاد مدتوں کی صحبت پر ان کے ضعف سے واقف نہ ہوئے ہوں اور روایت حدیث میں تامل نہ کیا ہو، اس بنا پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ان راویوں کو ضعیف قرار دینا صحیح نہیں، برخلاف امام مسلم کے کہ ان کے ضعیف راوی اکثر قدما میں سے ہیں، جن کی تنقید کا نہ ان کو موقع مل سکتا تھا، نہ ان کے حالات کی کافی اطلاع تھی، اس لئے اس صورت میں ان کے ضعف سے بے خبر رہنا زیادہ قرین قیاس ہے۔

۵- علما نے صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی تمام حدیثوں میں سے ۲۱۰ حدیثوں کو ضعیف

قرار دیا ہے، ان میں سے صرف اسی بلکہ اس سے بھی کم ضعیف حدیثیں بخاری کی ہیں اور ۱۳۰ حدیثیں صحیح مسلم کی۔

۶- بخاری و مسلم میں ایک بڑا نازک اور باریک فرق، ادبی حیثیت کا بھی ہے، ایک ہی حدیث کے مضمون کو دونوں کتابوں میں دیکھئے، بخاری کی طرز ادا، نشست الفاظ، سلاست بیان، جس قدر پسندیدہ اور اعلیٰ ہوگی، اس کی نظیر مسلم میں کم ملے گی، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ امام صاحب نے اس زبان کو پیش نظر رکھا، جو عہد رسالت یا اس سے قریب تر زمانے میں مستعمل تھی، یعنی امام صاحب نے معانی حدیث کے ساتھ الفاظ حدیث کا بھی اوروں سے زیادہ خیال رکھا۔

۷- امام مسلم حدیث معنعن کے (۱) اتصال اسناد کے لئے راوی اور مروی عنہ (۲) کی صرف ہم عصری کافی سمجھتے ہیں، بشرطیکہ راوی مدلس (۳) مشہور نہ ہو، چنانچہ صحیح کے مقدمہ میں انھوں نے خود تصریح کردی ہے لیکن امام بخاری سلسلہ روایت کے اتصال کے لئے صرف معاصرت کو کافی نہیں سمجھتے، ان کے نزدیک مدلس مشہور نہ ہونے کے ساتھ دونوں کی ملاقات بھی ضروری ہے، چنانچہ امام صاحب نے تاریخ کبیر میں اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، ہم اس موقع پر اس اختلاف کے نتیجہ کو دکھلانا کافی سمجھتے ہیں۔

امام صاحب چونکہ ملاقات کو شرط قرار دیتے ہیں، اس لئے ایسی حدیث معنعن کو جس کے راوی اور مروی عنہ کی باہم ملاقات ثابت نہ ہوئی ہو، اگرچہ راوی مدلس مشہور نہ ہو، متصل الاسناد تسلیم نہیں کرتے اور اس بنا پر اس کو صحیح بھی نہیں قرار دیتے، کیونکہ صحیح ہونے کے لئے بالاجمال اتصال اسناد کی ضرورت ہے، مگر امام مسلم متصل مان کر صحیح احادیث درج

---

(۱) معنعن: اس حدیث کو کہتے ہیں جس کی اسناد عن فلاں عن فلاں کے ساتھ بیان کی گئی ہو۔ (۲) یعنی جس سے روایت کی جائے۔ (۳) مدلس: اس راوی کو کہتے ہیں جو روایت میں اپنے شیخ کا نام درمیان سے چھوڑ دے۔

کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صحت اور احتیاط کے لحاظ سے جس قدر صحیح بخاری کا اصول تنقید موافق عقل ہے، اسی قدر مسلم کا اصول، قرائن صحیح اور قواعد احتیاط سے دور ہے۔

امام صاحب اس پہلو پر غور کرتے ہیں کہ صرف معاصرت کیوں کر روایت حدیث کے لئے ہم کو اطمینان دلا سکتی ہے، جب کہ ممکن ہے کہ ایک ہی زمانے میں دو شخص ہوں، مگر ان کی باہمی ملاقات نہ ہوئی ہو اور ایک تیسرے شخص کی وساطت سے کوئی حدیث ایک شخص تک پہنچ گئی ہو، یہ سچ ہے کہ راوی مدلس مشہور نہیں ہے لیکن مدلس نہ ہونا اس امر کے لئے کافی دلیل نہیں ہو سکتی کہ بغیر کسی واسطہ کے بذاتہ راوی نے مروی عنہ سے سماعت حدیث کی ہے، صرف ایک یہی اختلاف اس امر کے لئے کافی ہے کہ مسلم کے مقابلہ میں امام بخاری جمع حدیث میں کس قدر احتیاط سے کام لیتے ہیں اور جو اصول تنقید قائم کئے ہیں، وہ کس درجہ مطابق عقل اور قیاس صحیح کے مؤید ہیں۔

ہم نے یہاں صحیح بخاری کی سات ایسی خصوصیتیں دکھلائی ہیں جو صحیح مسلم کے مقابلہ میں قابل توجہ ہیں، اصح الکتب بعد کتاب اللہ کے خطاب سے تمام کتابیں محروم رہیں، مگر صحیح بخاری کی صحت احتیاط، قوت رواۃ، اتصال اسناد، اور اسی قسم کی بے نظیر خوبیوں نے خود کو اس معزز خطاب کا مستحق ثابت کیا، علما نے اس استحقاق کو بجا تسلیم کیا اور کلام اللہ کے بعد جگہ دی۔

امام صاحب نے اس کا بڑا حصہ مدینہ منورہ میں لکھا ہے، ترتیب سے پہلے تمام ضروری عنوان لکھ لئے تھے، ہر عنوان کے نیچے حدیثیں درج کرتے جاتے تھے، جس عنوان کے متعلق کوئی حدیث نہ ملتی، تو اس کو چھوڑ کر دوسرے بابوں کی ترتیب پر متوجہ ہو جاتے، چنانچہ صحیح بخاری میں بعض عنوان ایسے پائے جاتے ہیں، جن کے متعلق کوئی حدیث درج نہیں ہوئی۔

صحیح بخاری جب مرتب ہو گئی، تو امام صاحب نے اپنے استاد علی بن المدینی اور

امام احمد بن حنبل جیسے اکابر محدثین کی خدمت میں اس غرض سے پیش کیا کہ ان بزرگوں کی نظر ثانی سے مزین ہو جائے لیکن امام صاحب کی احتیاط اور تنقید نے صحیح کو اس درجہ اصح مرتب کیا تھا، کہ صرف چار حدیثوں کو انھوں نے اس قابل بتایا کہ صحیح سے خارج کر دی جائیں، اگرچہ وہ چار حدیثیں بھی دراصل صحیح ہیں۔

صحیح بخاری کی شرحین: صحیح بخاری کو جو حسن قبول حاصل ہوا، اس کی ایک ادنیٰ دلیل یہ ہے کہ شارحین کی جتنی بڑی اور جس درجہ کی جماعت اس کو نصیب ہوئی، شاید کسی کتاب کو ملی ہو، نامعلوم شرحوں کو چھوڑ کر کشف الظنون سے ان ۵۳ شرحوں کا پتہ لگتا ہے، جو امام ابوسلیمان خطابی صاحب معالم السنن، علامہ ابن حجر عسقلانی، علامہ بدرالدین احمد عینی، امام فخرالدین یحییٰ نووی اور حافظ جلال الدین سیوطی جیسے اکابر علما اور محدثین کے قلموں سے نکلی ہیں۔(۱)

☆☆☆

(۱) حضرت سید صاحبؒ نے طوالت کی وجہ سے ان شرحوں کے نام تحریر نہیں فرمائے، حقیقت یہ کہ بخاری کے شروح وحواشی کی تعداد بہت زیادہ ہے، عربی، فارسی اور اردو کے علاوہ انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں بھی اس کی شرحیں لکھی گئی ہیں اور ترجمے کیے گئے ہیں، مولانا عبدالسلام مبارکپوری مرحوم نے سیرت البخاری میں ۱۴۳ شرحوں کے نام لکھے ہیں لیکن یہ تعداد بھی مکمل نہیں، (ض)

امام ابومسعود رازی

(متوفی ۲۵۸ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابومسعود کنیت، اورنسب نامہ یہ ہے: احمد بن فرات بن خالد۔

وطن، خاندان وولادت: آخری عمر میں اصبہان میں سکونت اختیار کر لی لیکن اصلی وطن رے ہے، اسی لیے رازی کہلاتے تھے، ضبی کی نسبت سے جو قبیلہ مضر کے ایک شخص ضبہ بن رد کی جانب ہے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عربی النسل تھے، (۱) ان کے سن ولادت کا پتہ نہیں چلتا۔

اساتذہ وشیوخ: ان کے چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابن ابی فدیک، ابوداؤد طیالسی، ابوصالح کاتب لیث، ابوعامر عقدی، ابویمان حمصی، ازہر بن سمان، جعفر بن عون حسین بن علی جعفی، ابواسامہ حماد بن اسامہ، شبابہ بن سوار، عبداللہ بن نمیر، عبدالرزاق بن ہمام، محمد بن عبداللہ بن ابی جعفر رازی، محمد بن عبید، محمد بن یوسف فریابی، یعلی بن عبید، یزید بن ہارون وغیرہ۔ (۲)

تلامذہ: ابومسعود رازی کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں؛

ابن ابی عاصم، امام ابوداؤد، جعفر فریابی، عبدالرحمٰن بن یحییٰ بن مندہ، عبداللہ بن جعفر بن احمد، ابوخلیفہ عبداللہ بن خلیفہ بصری، محمد بن عبدالرحمٰن بن مندہ۔ (۳)

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۴۳ و ۳۶۱ واللباب ج ۱ ص ۴۵۰ و ج ۲ ص ۷۱ (۲) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۴۳ وتہذیب ج ۱ ص ۶۶ (۳) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۶۔

رحلت وسفر: حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۲ سال کی عمر میں انھوں نے حدیث کی تحریر وکتابت شروع کردی تھی، اس کے بعد انھوں مختلف ملکوں اور دور دراز کے مقامات کا سفر کیا، ان کے کثرت اسفار کا اندازہ ذہبی کے ان الفاظ واکثر الترحال فی لقی الرجال (محدثین سے ملاقات کے لئے انھوں نے بہت سارے سفر کیے) اور "طوف النواحی" وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے، خطیب بغدادی نے بصرہ، کوفہ، حجاز، یمن، شام، جزیرہ اور بغداد وغیرہ جانے کا ذکر کیا ہے، بغداد امام احمد کی زندگی میں گئے تھے اور وہاں کے نامور علما سے مذاکرہ کیا تھا۔(۱)

حفظ وثقاہت: ابومسعود کے حافظہ کی جودت کا علما نے اعتراف کیا ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں احد حفاظ الحدیث ومن کبار الأیمة فیه (وہ اکابر حفاظ اور ائمہ محدثین میں تھے) امام احمد فرماتے ہیں کہ "اس آسمان کے نیچے احادیث نبوی کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں" ابوبکر بن شیبہ کا ارشاد ہے کہ میرے نزدیک جو تین آدمی سب سے بڑے حافظ حدیث ہیں، ان میں ابومسعود بھی ہیں، ابوالشیخ کا بیان ہے کہ وہ حفاظ کبار میں تھے، ابونعیم کا بیان ہے کہ وہ ائمہ حفاظ میں تھے، ابوبکر اعین اور امام احمد سے مروی ہے کہ مسند روایتوں کا ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں۔

یحیٰی بن معین فرماتے ہیں کہ میں نے کسی کمسن کو ان سے زیادہ بہتر یادداشت والا نہیں دیکھا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ۱۸ سال کی عمر ہی میں ان کے حافظہ کی شہرت ہوگئی تھی، ان کے حفظ وضبط کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب وہ مصر تشریف لے گئے تو لوگوں سے کہا کہ مصریوں کی حدیثیں سنو، چنانچہ وہاں کے ہر ہر شیخ کی حدیثیں بیان کرنا شروع کیا حالانکہ ابھی یہاں کے علما سے ملاقات بھی نہیں کی تھی۔

ان کے صدق وثقاہت کا بھی ائمہ محدثین کو اعتراف ہے، امام ذہبی اور حافظ ابن

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۴ و ۱۲۵ والعبر ج ۲ ص ۱۶ وتاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۴۳۔

حجر نے ان کو ثقہ، حافظ اور حجت کہا ہے، علامہ ابن حبان نے بھی ان کی ثقاہت اور ان کے حفظ وضبط، مذاکرہ واستحضار اور جمع وتصنیف احادیث کا ذکر کیا ہے، ابوعروبہ کا بیان ہے کہ وہ حافظہ میں ابوبکر بن ابی شیبہ اور تثبت میں احمد بن سلیمان رہاوی کے ہم پایہ تھے، ابراہیم بن اورمہ فرماتے ہیں کہ اس وقت تین ہی حفاظ رہ گئے ہیں، ان میں بھی ابومسعود احسن الحدیث ہیں، امام احمد سے بھی ان کی توثیق منقول ہے، ایک مرتبہ فرمایا کہ تم لوگ ان سے حدیثیں لکھو وہ صدوق ہیں، خلیلی اور حاکم نے ان کو ثقہ کہا ہے۔(۱)

فضل وکمال: ابومسعود رازی کے فضل وکمال اور حدیث میں امتیاز وتبحر کے متعلق کتابوں میں بہت سے علمائے فن اور ماہرین حدیث کے اعترافات موجود ہیں، امام احمد ان کی بڑی تعظیم وتوقیر اور ہمیشہ مدح وتوصیف کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے، جب یحیٰی بن معین اور امام احمد کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور احادیث کا بحث ومذاکرہ شروع ہوتا تو یہ حدیثیں بیان کرتے تھے اور امام احمد خاموشی سے سنتے تھے، ایک دفعہ پانچ آدمیوں نے پانچ حدیثیں بیان کیں جب انھوں نے چھٹی حدیث بیان کی تو امام بہت مسرور ہوئے کیوں کہ ان کو اس کا علم نہ تھا، علی بن مدینی ان کو علمائے راسخین میں بتاتے ہیں اور حجاج بن شاعر کہتے ہیں کہ میں نے اس فن میں ان سے زیادہ ماہر اور صاحب کمال آدمی نہیں دیکھا، مورخین اور اصحاب سیر نے احد الاعلام محدثِ اصبہان اور من کبار الائمہ وغیرہ لکھا ہے۔(۲)

احادیث کی حمایت: ان کے زمانہ میں احادیث کی مخالفت ووضع کا فتنہ بپا تھا، اس لیے ائمہ محدثین کی طرح یہ بھی اس کی مخالفت اور احادیث کی حفاظت ونصرت کے لیے کمر بستہ رہتے تھے۔(۳)

زہد واتقا: خطیب نے لکھا ہے کہ وہ نیک اور صاحب خیر لوگوں میں تھے اور ابن حبان کا

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۴۳ وتہذیب ج ۱ ص ۶۶ و ۶۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۱۱ (۲) ایضاً (۳) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۷۔

بیان ہے کہ سنن وآداب نبوی کے اتباع وتمسک کا بڑا التزام رکھتے تھے۔(۱)

وفات: شعبان ۲۵۸ھ میں انتقال کیا۔(۲)

تصنیفات: ابومسعود رازی کثیر التصانیف تھے مگر ان کی تصنیفات دستبرد زمانہ سے محفوظ نہیں رہیں اور نہ ان کا کوئی ذکر ملتا ہے، صرف تفسیر وحدیث کی کتابوں کا علمائے سیر نے ذکر کیا ہے، تفسیر کی کتاب کا بھی نام نہیں معلوم ہوسکا۔

مسند: اس کا سب نے تذکرہ کیا ہے(۳) مگر نام کے علاوہ اور کچھ نہیں معلوم، بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جمع وتالیف میں انھوں نے بڑی چھان بین اور نہایت حزم واحتیاط سے کام لیا تھا، ابومسعود کا خود بیان ہے کہ میرے استاذ عبدالرزاق ایک ایک حدیث کا مجھ سے ۵۰۰ مرتبہ تکرار کرتے تھے، ایک اور موقعہ پر فرمایا کہ میں نے ایک ہزار سات سو پچاس اشخاص سے حدیثیں سنیں اور لاکھوں حدیثیں تحریر کیں لیکن اپنی تصنیف میں صرف ۳۱۰ شیوخ کی روایتیں شامل کی ہیں جن کی تعداد پانچ ہزار ہے۔(۴)

☆☆☆

(۱) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۷ وتاریخ بغداد ج ۴ ص ۲۴۳ (۲) ایضاً (۳) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۶، العبر ج ۲ ص ۱۶ ومرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۹۹ (۴) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۶۶، ۶۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۲۵ الرسالۃ المستطرفۃ ص ۳۷۔

(متوفی ۲۶۱ھ)

نام ونسب اور ابتدائی حالات: سلسلۂ نسب یہ ہے: مسلم بن حجاج بن مسلم بن ورد بن کوشاد، ان کا اصلی نام مسلم اور ابوالحسین کنیت اور عساکر الدین لقب ہے،(۱) مولد ومسکن کے لحاظ سے اگرچہ ان کے مایہ خمیر میں عجم کی خاک کا عنصر بھی شامل ہے لیکن دراصل ان کا سلسلۂ نسب عرب کے مشہور قبیلہ بنی قشیر سے ملتا ہے، اسی بنا پر ان کو قشیری بھی کہتے ہیں۔(۲)

امام مسلم تیسری صدی کے اوائل یعنی ۲۰۶ھ میں خراسان کے مشہور شہر نیشاپور میں پیدا ہوئے،(۳) یہ وہ مبارک زمانہ تھا، جس میں علم حدیث نے صحابہؓ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر مستقل فن کا قالب اختیار کر لیا تھا اور ہزاروں مجتہد اور امام پیدا ہو گئے تھے، اس لئے عام طور پر علم حدیث کا غلغلہ بلند تھا اور اس کے ساتھ خوش قسمتی سے امام صاحب کی ولادت نیشاپور جیسے شہر میں ہوئی تھی جو اس زمانہ میں محدثین کا پایہ تخت تھا، اس لحاظ سے لازمی طور پر امام صاحب نے بھی اس مقدس فن کی طرف ایسے مناسب وقت میں توجہ کی جو ہر قسم کے علمی نشوونما کا اصلی زمانہ تھا، چنانچہ(۴) اگر سال ولادت کے متعلق عام روایتوں کا اعتبار کیا جائے تو انھوں نے بارہ برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کر دی تھی، محدثین کے گروہ میں اگرچہ بہت سے ایسے بزرگ ہیں، جنھوں نے پانچ ہی

(۱) بستان المحدثین ص۱۰۴ (۲) کتاب الانساب ورق ۴۵۴ و۴۵۳ (۳) تاریخ ابن خلکان ج۲ ص۳۵۷ وتہذیب الاسماء واللغات ص۹۱ جلد دوم قسم اول (۴) امام صاحب (بقیہ آئندہ صفحہ پر)

سات برس کی عمر میں حدیث کی سماعت شروع کردی تھی اور یہ واقعہ ان کے کارناموں میں غیر معمولی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، خود امام بخاری کی سماعت کا ابتدائی زمانہ ۲۰۵ھ سے شروع ہوتا ہے،(۱) جس میں ان کا سن دس برس سے زائد نہ تھا لیکن درحقیقت یہ فخر و مباہات کا ذریعہ نہیں ہوسکتا کیونکہ بالکل کم سنی کے زمانہ میں کوئی شخص ایسے عظیم الشان فن کا پورے طور پر متحمل نہیں ہوسکتا، امام صاحب کو بھی اس زمانہ کی حالت اور نیشاپور کی علمی وسعت کے لحاظ سے اس قسم کے مواقع حاصل تھے، تاہم انھوں نے علم حدیث کی سماعت کو اس زمانے پر موقوف رکھا جو ہر قسم کی اہلیت کا زمانہ ہوتا ہے، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے اس فن کے نشیب و فراز اور اس نکتہ کو پیش نظر رکھ کر اس میدان میں قدم رکھا لیکن افسوس ہے کہ امام صاحب کی طالب علمی کے حالات اس قدر کم معلوم ہیں کہ اس کا پتہ بھی نہیں چل سکتا کہ انھوں نے سب سے پہلے کس کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا مگر انھوں نے جس سرگرمی کے ساتھ اس مقدس فن کی طرف توجہ کی، اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس زمانہ میں اگرچہ خود خراسان اور نیشاپور میں، اسحاق بن راہویہ اور امام ذہلی جیسے اساتذۂ فن موجود تھے، تاہم امام صاحب نے ان بزرگوں کو چھوڑ کر ان تمام مقامات کی خاک چھانی، جہاں جہاں علم حدیث کا جلوہ نظر آتا تھا، رے کے محدثین میں سے محمد بن مہران حمال اور

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) کے سال ولادت کے متعلق اگرچہ عام تذکرے متفق اللفظ ہیں تاہم علامہ ذہبی نے تذکرۃ الحفاظ میں ان کا سال ولادت ۲۰۴ھ بتایا ہے اور ان کے سماعت حدیث کی ابتدا ۲۱۸ھ میں قرار دی ہے، اس لحاظ سے ان کی سماعت کا زمانہ ۱۴برس کی عمر سے شروع ہوتا ہے، اس سے اگرچہ ہمارے قیاس کی اور زیادہ تائید ہوتی ہے لیکن ہم نے سال ولادت کے متعلق ابن خلکان کا زیادہ اعتبار کیا ہے کیوں کہ انھوں نے بطور خود زیادہ تحقیق سے کام لیا ہے، اس کے علاوہ ذہبی کے الفاظ بھی ضعف پر دلالت کرتے ہیں، حافظ ابن حجر، علامہ ابن کثیر اور بعض مورخین نے بھی ۲۰۴ھ کی روایت کی ہے اور شاہ عبدالعزیز نے ان دونوں کے علاوہ ۲۰۲ھ کی بھی روایت کی ہے ص(۱۰۶) (۱) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۳۴۔

ابوغسان وغیرہ سے سماعت کی، عراق میں امام احمد بن حنبل اور ابوعبداللہ بن مسلمہ قعنبی سے فائدہ اٹھایا، حجاز میں سعید بن منصور اور ابومصعب سے روایتیں حاصل کیں، مصر میں عمرو بن سواد اور حرملہ بن یحییٰ جو امام شافعیؒ کے ممتاز شاگرد تھے کے خرمن فیض کی خوشہ چینی کی، (۱) بغداد میں آخر عمر تک سفر کا سلسلہ قائم رکھا، چنانچہ ۲۵۹ھ میں بغداد کا سفر امام صاحب کا آخری سفر تھا۔ (۲) کیوں کہ اس کے بعد موت نے دو برس سے زیادہ جینے کا موقع نہیں دیا، بغداد میں یحییٰ بن صاعد اور محمد بن مخلد سے استفادہ کیا، احمد بن سلمہ کی رفاقت میں بصرہ اور بلخ کا بھی سفر کیا (۳) امام بخاری سے بھی ان کے نیشاپور کے سفر میں بہت کچھ فائدہ اٹھایا، (۴) ان بزرگوں کے علاوہ احمد بن یونس یربوعی، اسماعیل بن ابی اویس، عون بن سلام، اسحاق بن راہویہ، یحییٰ بن یحییٰ نیشاپوری، قیتقبہ بن سعید، علی بن جند، محمد بن رمح، ابراہیم بن منذر، ابوبکر بن ابی شیبہ، عثمان بن ابی شیبہ، وغیرہ سے بھی استفادہ کیا۔ (۵)

امام صاحب کی شہرت: امام صاحب کے زمانہ میں علم حدیث کے عام مذاق اور مذہبی احساس کے باہمی اختلاط نے اگرچہ سیکڑوں ہزاروں ائمہ فن پیدا کر دیئے تھے، جن کی شہرت اور فضیلت کا عموماً اعتراف کیا جاتا تھا اور جن میں اکثر بزرگوں کو امام صاحب کی استادی کا بھی شرف حاصل تھا، تاہم امام صاحب کی فطری قابلیت اور قوت حافظہ نے ان تمام بزرگوں کو اپنے فضل وکمال کا معترف بنالیا، یہاں تک کہ وہ محدثین بھی جو امام صاحب کے ہم درجہ

(۱) مقدمہ صحیح مسلم للنووی (۲) ابن خلکان نے اس سفر کا ذکر ان کے اساتذہ اور تحصیل علم کے ضمن میں کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کا سفر بھی اسی غرض سے ہوا تھا اگرچہ اس کی خود تصریح نہیں کی، خطیب نے بھی سفر بغداد کا اسی طور پر ذکر کیا ہے مگر ان کے یہاں یہ لفظ بھی ملتا ہے ''حدث بہا'' ج ۱۳ ص ۱۰۱، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب سے بغداد کے لوگوں نے بھی کسب فیض کیا تھا (۳) تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۱۰ و تذکرہ احمد بن سلمہ (۴) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۵۲۷ (۵) تہذیب الاسماء جلد ۲ قسم اول ص ۹۱۔

اور فن حدیث کے امام تھے، ان سے روایت کرنے میں مطلق دریغ نہیں کرتے تھے، چنانچہ ابوحاتم رازی، موسیٰ بن ہارون، احمد بن سلمہ، ابوعیسیٰ ترمذی، یحییٰ بن صاعد، ابوعوانہ اسفرائینی، اسی قسم کے بزرگ ہیں، ان بزرگوں میں احمد بن سلمہ وہ بزرگ ہیں جو بصرہ اور بلخ کے سفر میں امام صاحب کے رفیق اور ۱۵ برس تک صحیح مسلم کی ترتیب میں شریک رہ چکے ہیں، امام صاحب کی طباعی اور ذہانت نے خود ان کے اساتذہ کو اس قدر گرویدہ بنالیا تھا کہ اسحاق بن راہویہ جیسے امام فن ان مختصر الفاظ میں ان کے فضل وکمال کی نسبت پیشین گوئی کرتے تھے:

ای رجل یکون ھذا؟ خدا جانے یہ کس بلا کا شخص ہوگا۔

امام صاحب کی تنقید اور حقیقت شناسی کا اس قدر شہرہ تھا کہ ابوزرعہ اور ابوحاتم جیسے اداشناس بزرگ ان کو معرفت حدیث میں اس زمانے کے تمام مشائخ پر ترجیح دیتے تھے، (۱) اسحاق کوسج خود امام صاحب سے خطاب کر کے فرماتے تھے:

لـن نـعـد م الخير مابقاك الله للمسلمين۔ (۲) جب تک خدا آپ کو مسلمانوں کے لئے زندہ رکھے گا بھلائی ہمارے ہاتھ سے نہ جانے پائے گی۔

ابوقریش نے ان کو دنیا بھر کے حفاظ اربعہ میں شمار کیا ہے۔ (۳)

غرض کہ امام صاحب کی مقبولیت اور شہرت اس درجہ کو پہنچ گئی کہ اہل مغرب نے ان کے نام کو امام بخاری جیسے مسلّم امام کے نام سے بھی اونچا اچھالا۔

وفات: امام صاحب کے واقعات زندگی میں ان کی وفات کا واقعہ جس قدر افسوس ناک ہے، اس سے زیادہ حیرت انگیز اور قابل لحاظ ہے، کیونکہ اس سے امام صاحب کی علمی شیفتگی کا

(۱) ایضاً و بستان المحدثین ص ۱۰۴ و تہذیب الاسماء قسم اول جز ۲ ص ۹۱ و تاریخ بغداد ج ۱۳ و مقدمہ نووی ص ۱۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۵ و تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۷ (۳) تذکرۃ ذہبی ج ۲ ص ۱۲۶ و تہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۸۔

پتہ چلتا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ عین مجلس حدیث میں لوگوں نے امام صاحب سے ایک حدیث پوچھی، سوء اتفاق سے امام صاحب کو وہ حدیث یاد نہ تھی، اس لئے مکان پر آکر اپنے مجموعہ حدیث میں اس کی جستجو شروع کی، اس چھان بین میں اس قدر محو ہوئے کہ سامنے خرما کا ایک ڈھیر رکھا ہوا تھا، اس سے نکال نکال کر کھاتے جاتے تھے لیکن حدیث کی فکر میں اس کی مطلق ان کو خبر نہیں ہوئی کہ اس بے خودی کی حالت میں کتنے خرمے کھا گئے، یہی واقعہ ان کی موت کا سبب ہوا۔(۱)

عام طور پر تذکرہ نویسوں نے اگرچہ اس واقعہ سے نفیًا یا اثباتًا کچھ تعرض نہیں کیا، لیکن اس قسم کے واقعے عقلاً ممکن بلکہ واقع ہوتے رہتے ہیں، اس لئے اس سے انکار کی کوئی وجہ نہیں، بہر حال امام صاحب نے ۲۵/رجب ۲۶۱ھ کو یکشنبہ کے دن نیشاپور میں بوقت شام ۵۵ برس کی عمر میں (۲) وفات پائی، دوشنبہ کے دن جنازہ اٹھایا گیا اور نیشاپور کے باہر ایک مقام مصراباد میں سپرد خاک کر دیے گئے۔(۳)

اخلاق وعادات: امام صاحب نہایت پاکیزہ خو اور انصاف پسند تھے، اس زمانہ میں اگرچہ عام طور پر مسلمانوں کی اخلاقی حالت نہایت مہذب اور شائستہ تھی تاہم جس طرح اس زمانے کے اہلِ کمال میں باہم ان بن رہتی ہے، اسی طرح اُس زمانہ کے مقدس اصحاب بھی اس سے خالی نہ تھے، اسی بنا پر رجال کی کتابوں میں یہ تصریح کر دی گئی ہے کہ باہم معاصرین کی جرح وقدح قابل قبول نہیں کیوں کہ وہ لوگ ایک دوسرے کی نسبت رشک وحسد سے بہت کچھ برا بھلا کہہ دیا کرتے تھے، یہ محض معمولی درجہ کے لوگوں کا شیوہ نہ تھا بلکہ یحیٰی بن معین جیسے مقدس اصحاب بھی اس زمرہ میں شامل ہیں مگر امام صاحب کا دامن ہمیشہ اس قسم

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و تہذیب ج ۱۰ ص ۱۲۷ (۲) صحیح روایت کے مطابق امام صاحب کی عمر انتقال کے وقت ۵۵ سال تھی مگر بعض مورخین نے جن میں ابن کثیر بھی شامل ہیں ۵۷ سال عمر بتائی ہے

(۳) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۱۲۷۔

کے دھبوں سے پاک رہا اور انھوں نے ہمیشہ نہایت فیاضی سے اس کا عملی ثبوت دیا، نیشاپور کے سفر میں امام بخاری کی مجلس میں ضرور آتے تھے اور ان سے استفادہ کرتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ ان کے تبحر علمی سے متاثر ہو کر نہایت بے خودی کی حالت میں پکار اٹھے، دعنی اقبل رجلیك یاامیر المومنین فی الحدیث (۱) یعنی اے ملک حدیث کے بادشاہ! مجھ کو قدم بوسی کی اجازت دیجئے، اسی طرح اپنی کتاب مسلم کو خود ابوزرعہ رازی کی خدمت میں پیش کیا، وہ جن حدیثوں کو صحیح بتاتے تھے، ان کو بعینہ قائم رکھتے تھے اور جن حدیثوں پر نکتہ چینی کرتے تھے، ان کو بے تکلف چھوڑتے جاتے تھے (۲) لیکن ان کا حقیقی وصف، ان کی آزادی اور حق گوئی ہے اور اس کی وقعت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے، جب مسلمانوں کی عام حالت کا اندازہ کیا جائے، آج تو مسلمانوں کا رواں رواں تقلید کے شکنجے میں جکڑا ہوا ہے لیکن اس زمانے میں بھی قرون اولیٰ کے بعد ہی سے بے جا طرف داری اور ناجائز رعایت کا مادہ پیدا ہو گیا تھا اور امتداد زمانہ کے ساتھ روز بروز اس کو ترقی ہوتی جاتی تھی لیکن امام صاحب پر اس کا بالکل اثر نہ پڑ سکا وہ اس قدر حق پرست تھے کہ اس کے مقابلہ میں اپنے اساتذہ کا بھی خیال نہیں کرتے تھے، چنانچہ جب امام بخاری نے نیشاپور کا سفر کیا اور سوء اتفاق سے ایک جزئی سوال، یعنی مسئلہ خلق قرآن کے متعلق عوام اور عوام کے ساتھ امام ذہلی جیسے نکتہ سنج محدث بھی امام صاحب کے مخالف ہو گئے اور اس مخالفت کا یہ اثر ہوا کہ امام ذہلی نے اپنی مجلسِ حدیث میں عام اعلان کر دیا۔

الا من قال باللفظ فلایحل له ان یحضر مجلسنا۔	خبردار جو شخص قرآن مجید کے الفاظ کو مخلوق کہے گا اس کو ہماری مجلس میں آنا حرام ہے۔

---

(۱) خطیب اور ابن کثیر کے الفاظ یہ ہیں دعنی حتی اقبل رجلیك یااستاذ الاستاذین وسیدالمحدثین وطبیب الحدیث فی علله دیکھو تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ اوالبدایہ ج ۱۱ ص ۳۴ (۲) مقدمہ مسلم نووی ص ۲۶۔

اس موقع پر امام صاحب نے اپنی اسی حق پرستی سے کام لیا، وہ امام بخاری کی رائے کو صحیح سمجھتے تھے، اس لیے ایک حق بات پر امام ذہلی کے شاگردانہ تعلق کو بالکل بھلا دیا اور سر مجلس اپنی چادر تان کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی مجلس کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہا اور گھر پر جا کر ان کی تقریروں کے تمام نوشتے اونٹوں پر لدوا کر بھجوا دیے۔ (۱)

امام بخاری کی یہ تائید اور حمایت بھی ایک خاص مسئلہ بھی تھی، ورنہ عام طور پر وہ امام بخاری کے بھی ہم زبان نہیں، چنانچہ معنعن روایتوں میں امام بخاری ہم عصری کے ساتھ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات کی جو ایک ضروری شرط قرار دیتے ہیں، امام صاحب اس کے سخت مخالف ہیں، چنانچہ صحیح مسلم کے مقدمہ میں جہاں اس مسئلہ کی بحث کی ہے، اس کو پڑھ کر سخت حیرت ہوتی ہے، یا تو یہ حال تھا کہ ایک جزئی مسئلہ پر امام ذہلی کے قدیم شاگردانہ تعلق کو چھوڑ کر امام بخاری کے ہم خیال بن گئے اور اپنی عمر کی کمائی (یعنی امام ذہلی کے مجموعۂ حدیث) کی بھی کچھ پروا نہ کی یا خود امام بخاری کی تردید ان الفاظ میں کرتے ہیں:

وقد تكلم بعض منتحلی	یعنی ہمارے زمانہ کے بعض مدعیان
الحديث من اهل عصرنا في	حدیث اسانید کی صحت اور سقم کے
تصحيح الاسانيد وسقمها	متعلق ایک ایسے قول کے قائل ہوئے
بقول لوضربنا عن حكايته	ہیں کہ اگر ہم اس کے ذکر اور اس کی
وذكر فساده لكان رأيا متينًا	تردید سے اعراض کرتے تو اچھا
ومذهبًا صحيحًا اذا	ہوتا کیوں کہ مردود اقوال سے اعراض
الاعراض عن القول المطرح	کرنا ہی مناسب ہے۔
احرى (۲)	

کہاں یہ خوش اعتقادی کہ ان کے فضل و کمال سے متاثر ہو کر نہایت جوش کے

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۳ ص ۱۰۳ و تاریخ ابن خلکان ص ۵۲۷ (۲) مقدمہ مسلم مصر ص ۱۲۷، ۱۲۸۔

ساتھ فرماتے تھے۔

دعنی اقبل رجلیك یا امیر المومنین فی الحدیث ۔	یعنی اے علم حدیث کے بادشاہ مجھ کو قدم بوسی کی اجازت دیجئے۔

کہاں یہ کیفیت کہ ان ہی کا ذکر اس بے پروائی کے ساتھ کرتے ہیں۔

زعم القائل الذی افتتحنا الکلام علی الحکایة عن قوله والاخبار عن سوء رویته۔(۱)	ہم نے جس قائل کے قول اور اس کی غلط فہمی کا ذکر کیا ہے وہ گمان کرتا ہے ....

الغرض ان کی حق پسند روش، ان کو تقلید، تعصب اور بے جا طرف داری کا مطلق خوگر نہیں ہونے دیتی تھی، اس لیے وہ اسی شاہراہ پر چلتے تھے جس کی طرف ان کا حق پرست دل رہ نمائی کرتا تھا۔(۲)

تصنیفات وتالیفات: امام صاحب کو تصنیف وتالیف کا فطری شوق تھا، صحیح مسلم کو جس تحقیق اور جامعیت کے ساتھ لکھا اس کا ذکر ایک مستقل عنوان سے آگے آئے گا لیکن اس

(۱) مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۲۹۔ (۲) اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عموماً محدثین کا گروہ اگر چہ کسی امام کا مقلد نہ تھا اور نہ اس کو ہونا چاہیے تھا تاہم اُن میں کسی بزرگ کا مذہب، کسی خاص امام سے زیادہ ملتا جلتا تھا تو ان کو تقلید پرست لوگ اس امام کی طرف منسوب کر دیتے تھے، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھتے ہیں:

وکان صاحب الحدیث ایضاً قد ینتسب الیٰ احدالمذاهب لکثرة موافقته به کالنسائی والبیهقی ینسبان الی الشافعی غالباً اسی بنا پر یا اور کسی وجہ سے صاحب کشف الظنون نے امام صاحب کو ایک ضمنی تذکرے میں امام شافعی کی طرف منسوب کر دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ بجائے خود ایک مستقل امام تھے اور ہر مسئلہ کے متعلق اپنی آزادانہ رائے رکھتے تھے اس لیے ان کو کسی مجتہد کی طرف منسوب کرنا ان کی تحقیر ہے۔

کے علاوہ اور بھی نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں جن کے موضوع اور اجمالی حالت کا اندازہ خود ان کے نام کی فہرست سے ہوگا:

۱-مسند کبیر، ۲-الاسماء (الکنی)، ۳-جامع کبیر، ۴-کتاب العلل، ۵-کتاب التمیز، ۶-کتاب الوحدان، ۷-کتاب الافراد، ۸-کتاب الاقران، ۹-کتاب سوالات لاحمد بن حنبل، ۱۰-کتاب حدیث عمرو بن شعیب، ۱۱-کتاب الانتفاع باھب السباع، ۱۲-کتاب مشائخ مالک، ۱۳-کتاب مشائخ ثوری، ۱۴-کتاب مشائخ شعبہ، ۱۵-کتاب من لیس لہ الارادواحد، ۱۶-کتاب المخضرمین، ۱۷-کتاب اولاد الصحابہ، ۱۸-کتاب اوہام المحدثین، ۱۹-کتاب الطبقات، ۲۰-کتاب افراد الشامیین۔

صحیح مسلم

امام صاحب نے اگرچہ جیسا کہ ہم ابھی لکھ آئے ہیں، علم حدیث کے متعلق خاص خاص موضوع پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں لیکن ان کو صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت نے اس طرح دبالیا ہے کہ آج کوئی شخص ان کا نام بھی نہیں جانتا، امام صاحب کی تصنیفات سے قطع نظر کرکے، حدیث کی عام کتابوں کا بھی قریب قریب یہی حال ہے، خود صحیح بخاری کو اگرچہ ائمہ فن نے متعدد حیثیتوں سے مسلم پر ترجیح دی ہے، تاہم مسلم کو یہ شرف قبول حاصل ہے کہ ہمیشہ بخاری کے ساتھ ساتھ اس کا بھی نام لیا جاتا ہے، اس لئے ہم مسلم کی ان خصوصیات کو دکھانا چاہتے ہیں، جنھوں نے اس کو اس قدر شہرت دی ہے۔

اس سلسلہ میں جو چیز سب سے زیادہ قابل ذکر ہے وہ اس کتاب کا مقدمہ ہے، کیوں کہ اس سے ایک طرف جرح وتعدیل اور اصول حدیث کے متعلق نہایت مہتم بالشان نکتے معلوم ہوتے ہیں اور دوسری طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں

اس کو مرتب کیا، اس میں کس قدر موضوع حدیثیں پیدا ہو گئی تھیں، اس لئے ایسی حالت میں ایسی صحیح کتاب کا مرتب کرنا کس قدر دشوار اور اہم تھا، اس بنا پر ہم سب سے پہلے اسی کو پیش نظر رکھتے ہیں۔

مقدمہ مسلم: مذہب اگر چہ دنیا کی تمام قوموں کو عزیز ہے، تاہم مسلمانوں نے اس کو جس عزت کی نگاہ سے دیکھا، دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ علمی حیثیت سے مسلمانوں نے سب سے پہلے جس چیز کی طرف توجہ کی وہ یہی مذہبی علوم وفنون تھے، ان میں نحو، ادب، تفسیر، اصول فقہ اگر چہ سب کے سب بالذات یا بالواسطہ مذہبی علوم ہیں اور اس لئے مسلمانوں نے ان سب میں کمال پیدا کیا، تاہم ان میں علم حدیث چونکہ مذہب کا سب سے زیادہ ضروری عنصر تھا، اس لئے یہ مقدس فن ایک مدت تک عام طور پر مسلمانوں کے دل ودماغ کا جولانگاہ رہا، اس عام مذاق نے اگر چہ نہایت مفید نتائج پیدا کئے، تاہم چونکہ مذہبی حیثیت سے یہ گروہ نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اس لئے نااہل اور خود غرض لوگوں کی ایک بہت بڑی جماعت نے اس فن کو محض نام ونمود کا ذریعہ قرار دے کر موضوع اور غیر معتبر روایتوں کا ایک طوفان اٹھا دیا، چنانچہ خود امام صاحب اپنے مقدمہ میں ضعیف راویوں کا استقصا کر کے لکھتے ہیں:

ولا احسب كثيرًا ممن يعرج	ہمارا خیال ہے ان مجہول الاسناد اور
من الناس على ما وصفنا من	ضعیف روایتوں پر جن کو ہم نے بیان
هذه الاحاديث الضعاف	کر دیا ہے، ان کے ضعف کے ظاہر
والاسانيد المجهولة ويعتد	ہونے کے بعد بجز ان لوگوں کے جن کو
بروايتها بعد معرفته	عوام کے نزدیک کثرت سے حدیثیں
وبما فيها من التوهن	بیان کرنے کا شوق ہوتا ہے، تاکہ یہ
والضعف الا ان الذى يحمله	کہا جائے کہ فلاں نے کس کثرت
عن روايتها والاعتداد بها	سے حدیثیں جمع کی ہیں، اکثر لوگ
ارادة التكثير بذلك عند	اعتبار نہ کریں گے لیکن جو لوگ علم

العوام ولان یقال ماا کثر	حدیث میں یہ مسلک اختیار کرتے
ماجمع فلان من الحدیث	ہیں، ان کو اس فن میں ذرا بھی دخل نہیں
والف من العدو ومن ذھب فی	اور ان کو بجائے عالم کے جاہل کہنا
العلم ھذا المذھب ومسلك ھذا	اچھا ہے۔
الطریق فلانصیب له فیه	
وکان بان یکنی جاھلا اولیٰ	
من ان ینسب الیٰ العلم۔	
(ص ۱۲۷)	

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ اس زمانے میں محض شہرت کے لئے ہر قسم کی رطب ویابس حدیثوں کے روایت کرنے کا مذاق پیدا ہو چلا تھا لیکن ان خودغرض لوگوں سے گذر کے جو دفتر غیر معتبر اور موضوع حدیثوں کی روایت میں شہرت عام رکھتا تھا، وہ متقشف زاہدوں اور مسجد نشینوں کا مقدس فرقہ تھا، چنانچہ اس زمانہ کے نکتہ سنج لوگ، ان بزرگوں کو جس نگاہ سے دیکھتے تھے، اس کا اندازہ ذیل کی روایتوں سے ہوگا:

حدثنی محمدؒ بن ابی عتاب	مجھ سے محمد بن ابی عتاب اور ان سے
قال اخبرنی عفان عن محمد	عفان اور ان سے محمد بن یحییٰ بن سعید
بن یحییٰ بن سعید القطان	بن قطان اور ان سے ان کے باپ
عن ابیه قال لم نر الصالحین	نے حدیث بیان کی کہ ہم حدیث میں
فی شئ اکذب منھم فی	صالحین سے زیادہ جھوٹا کسی کو نہیں
الحدیث قال ابن ابی عتاب	دیکھتے، دوسری روایت میں ہے کہ ابن
فلقیت ابامحمدؒ بن یحیٰ بن	ابی عتاب کا بیان ہے کہ میں نے محمد بن
سعیدالقطان فسالتهٗ عنه	یحییٰ بن سعید بن قطان سے ملاقات کی

فقال عن ابیه لم تراهل الخیر فی شئ اکذب منهم فی الحدیث قال مسلم یقول یجری الکذب علی لسانهم ولا یتعمدون الکذب (ص۹۴،۹۵)

اور اس حدیث کو پوچھا تو انھوں نے اپنے باپ کے ذریعہ سے بیان کیا کہ تم حدیث میں اہل خیر سے زیادہ جھوٹا نہ پاؤ گے، امام مسلم کا بیان ہے کہ ان کے قول کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ جھوٹ بول جاتے ہیں مگر اس کا قصد نہیں کرتے۔

حدثنا الحلوانی قال سمعت عفان قال حدثت حماد بن سلمة عن صالح المری بحدیث عن ثابت فقال کذب وحدثت هماما عن صالح المری بحدیث فقال کذب۔ (مقدمہ مسلم ص۱۱۰،۱۱۱)

حلوانی نے ہم سے روایت کی کہ میں نے عفان سے سنا کہ انھوں نے حماد بن سلمہ کے پاس صالح مری کے ذریعہ سے ثابت سے ایک روایت بیان کی، انھوں نے کہا کہ صالح جھوٹ کہتا ہے، اسی طرح ان کا بیان ہے کہ میں نے صالح مری کے ذریعہ سے ہمام کے پاس ایک حدیث بیان کی، انھوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے۔

حالانکہ صالح مری اتنے بڑے زاہد، خدا ترس اور رقیق القلب تھے جن کی نسبت شارح نووی نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

وکان صالح رحمه الله حسن الصوت بالقرآن وقد مات

صالح رحمہ اللہ نہایت خوش الحانی سے قرآن پڑھتے تھے، یہاں تک کہ بہت

بعض من سمع قرأته وكان	سے لوگ ان کی قرأت سن کر مر گئے، وہ
شديد الخوف من الله تعالىٰ	خدا کا سخت خوف کرتے تھے اور اکثر
كثيرا البكاء قال عفان ابن	روتے رہتے تھے، عفان بن مسلم کا
مسلم كان صالح اذا اخذ في	بیان ہے کہ جب وہ قصے بیان کرتے
قصصه كانه رجل مذعور	تھے تو اس خوف زدہ آدمی کی طرح
يفزعك امره من حزنه وكثرة	معلوم ہوتے تھے جو اپنے کثرت خوف
بكائه كانه ثكلى	سے تم کو بھی خوف و دہشت میں مبتلا کر
(حاشیہ مقدمہ مسلم ص ۱۱۱)	دے گا اور ان کی نوحہ زاری سے معلوم
	ہوتا تھا کہ گویا وہ ایک عورت ہیں جو
	اپنے لڑکے کا ماتم کر رہی ہے۔

صالح مری کی طرح اور بھی بہت سے بزرگ تھے جو مذہب کے سخت پابند تھے لیکن احادیث میں بہت کچھ طمع سازی کیا کرتے تھے۔

حدثني محمدبن عبدالله بن	مجھ سے محمد بن عبداللہ بن قہزاد مروزی
قهزاد من اهل مرو قال	نے روایت کی کہ مجھ کو علی بن حسین بن
اخبرني علي بن حسين بن	واقد نے خبر دی کہ عبداللہ بن مبارک
واقد قال قال عبدالله بن	فرماتے تھے کہ میں نے سفیان ثوری
المبارك قلت سفيان الثورى	سے کہا کہ آپ تو عباد بن کثیر کا حال
ان عباد بن كثير من تعرف	خوب جانتے ہیں، جب وہ حدیث
حاله واذا حدث جاء	بیان کرتے ہیں تو قیامت ڈھاتے
بامر عظيم فترى ان اقول	ہیں، تو کیا آپ اس کو پسند کرتے ہیں
للناس لاتاخذواعنه قال	کہ میں لوگوں سے کہہ دوں کہ ان کی

سفیان بلی قال عبدالله فکنت اذا کنت فی مجلس ذکر فیه عبادٌ اثنیت علیه فی دینه واقول لاتاخذوا عنه۔ (مقدمہ مسلم ص ۲۴)

حدیثیں نہ قبول کرو، انھوں نے کہا ہاں، عبداللہ بن مبارک کا بیان ہے کہ اس کے بعد جب کسی مجلس میں عباد کا ذکر آتا تھا تو میں ان کے تدین کی تعریف کرتا تھا لیکن اسی کے ساتھ ہی لوگوں سے یہ بھی کہتا تھا کہ ان کی حدیثیں قبول نہ کرو۔

حدثنا محمد حدثنا عبدالله بن عثمان قال قال ابی قال عبدالله بن المبارك انتهیت الیٰ شعبة فقال هذاعباد بن کثیر فاحذروه۔ (مقدمہ صحیح مسلم ص ۲۴)

ہم سے محمد اوران سے عبداللہ بن عثمان نے حدیث بیان کی کہ ان کے باپ نے کہا کہ ہم سے عبداللہ بن مبارک نے فرمایا کہ میں شعبہ کے پاس گیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ عباد بن کثیر ہے اس سے بچتے رہو۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض محدثین نے صاف صاف تصریح کر دی ہے کہ یہ لوگ اس فن میں اہلیت نہیں رکھتے تھے۔

حدثنی احمد بن ابراهیم قال حدثنی سلیمان بن الحرب عن حماد بن زید قال ذکر فرقد عند ایوب فقال ان فرقداً لیس صاحب حدیث۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۲۲)

ہم سے احمد بن ابراہیم اور ان سے سلیمان بن حرب اوران سے حماد بن زید نے روایت کی کہ ایوب کے یہاں فرقد کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا کہ فرقد اہل حدیث نہیں۔

حالانکہ فرقد تابعی اور بہت بڑے عابد شخص تھے، چنانچہ شارح نووی کہتے ہیں:

التابعی العابد لایحتج بحدیثه عند اهل الحدیث لکونه لیس صفته کما قدمنا فی قوله لم نر الصالحین فی شئ اکذب منهم فی الحدیث۔ (حاشیہ مقدمہ ص ۱۲۲)	یعنی فرقد تابعی اور عابد شخص تھے، اہل حدیث کے نزدیک ان کی حدیثوں کا اس بناپر اعتبار نہیں کیا جاتا کہ یہ ان کا فن نہیں تھا، جیسا کہ ہم نے لم نر الصالحین فی شیء اکذب منهم فی الحدیث کے ذکر میں بیان کیا۔

اس موقع پر یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چوں کہ یہ تمام بزرگ نہایت خداترس، متقشف اور عبادت گذار ہوتے تھے، اس لیے محدثین نے ان کی دروغ گوئی اور ضعیف روایت کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہ لوگ اہل فن نہ تھے، چنانچہ پہلی حدیث میں خود امام صاحب نے تصریح کردی ہے کہ یہ لوگ عمداً جھوٹ نہیں بولتے تھے، چنانچہ شارح نووی اس قول کی شرح میں لکھتے ہیں:

معناه ماقاله مسلم انه یجری الکذب علی السنتهم ولایتعمدون ذلك لکونهم لایعانون صناعة اهل الحدیث فیقع الخطا فی روایاتهم ولایعرفونه ویروون الکذب ولایعلمون انه کذب۔ (حاشیہ مقدمہ ص ۹۴)	یعنی مسلم نے جو یہ کہا ہے کہ وہ لوگ یوں ہی جھوٹ بول جاتے ہیں لیکن اس کا قصد نہیں کرتے، اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ لوگ صاحب فن نہ تھے، اس لیے ان کی روایتوں میں غلطی واقع ہوجاتی ہے لیکن وہ لوگ اس کو نہیں جانتے جھوٹ روایت کردیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ یہ جھوٹ ہے۔

اس وجہ کی صحت میں کوئی شبہ نہیں لیکن ہم کلیۃً اس سے اتفاق نہیں کرسکتے

کیوں کہ جس طرح اس زمانے کے عام واعظ، مریدین کو خوش اور مجلس وعظ کے گرمانے کے لیے نہایت عجیب وغریب حدیثیں بیان کر جاتے ہیں، اسی طرح ان لوگوں کی نسبت بھی اس قسم کا خیال پیدا ہوسکتا ہے، بہر حال واقعہ جو کچھ ہو لیکن ان بزرگوں کی یہ تمام خانہ برانداز یاں چوں کہ مذہب اور مذہب کے ساتھ زہد کے پردے میں تھیں، اس لیے عام طور پر کوئی شورش نہیں پیدا ہوئی خیر، اس بنا پر محدثین کے گروہ میں زیادہ تر شور وغل اس وقت ہوا جب عقائد کے متعلق مبتدعانہ خیالات ظاہر ہوئے، اسلام میں اختلافی مسائل کی بنیاد اگر چہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہی پڑ گئی تھی لیکن بدعت کا آغاز صحابہؓ کے آخری زمانہ میں ہوا، چنانچہ معبد جہنی، غیلان دمشقی، یونس اسواری نے اسی زمانہ میں قضاوقدر کا انکار کیا (۱) تابعین کے زمانے میں اس قسم کے اور بھی بہت سے گمراہ پیدا ہوئے، چنانچہ جعد بن درہم نے بنی امیہ کے زمانے میں ایک عجیب وغریب خیال ظاہر کیا، اس نے صراحۃً دعویٰ کیا کہ خدا نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خلیل بنایا اور نہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا (۲) اس جرم پر اس کو خالد بن عبداللہ قسری نے جو ہشام بن عبدالملک کی طرف سے عراق کا گورنر تھا، عیدالضحیٰ کے دن عجیب شان سے قتل کیا، پہلے اس نے ایک عام اعلان کیا کہ میں آج خدا کی راہ میں قربانی کرنا چاہتا ہوں، جس کو شریک ہونا ہو شریک ہو، اس طور پر اس نے مسلمانوں کے مجمع عام میں قربانی کی، (۳) اس کے بعد اس کا عام مذاق پیدا ہوگیا اور نہایت کثرت سے لوگوں نے محدثین کے خلاف اپنے خیالات ظاہر کرنا شروع کیے، جہم بن صفوان نے جس کی طرف فرقۂ جہمیہ منسوب ہے، نصر بن سیار کے زمانے میں

(۱) ملل ونحل شہرستانی ص ۳۱ بر حاشیہ ملل ابن حزم جلد اول مطبعہ ادبیہ مصر طبع اول ۱۳۱۷ھ وشرح مواقف ج ۲ ص ۴۷۹ (۲) میزان الاعتدال ذہبی جلد ا ص ۱۸۵ مطبعہ سعادت مصر ۱۳۲۵ھ (۳) اس کا واقعہ نہایت مشہور ہے، اسی کی طرف علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے فقتل علی ذلك بالعراق یوم النحر والقصة مشهورة میزان الاعتدال جلد اول ص ۱۸۵

ترمذ میں اپنی بدعت کی اشاعت کی، وہ جبریہ اعتقاد رکھتا تھا، اس لیے بندے کو مجبور محض قرار دیتا تھا، اس جرم پر سالم بن احوز المازنی نے اس کو بنی امیہ کے آخری زمانے میں مرو میں قتل کرڈالا، (۱) تقریباً اسی زمانے میں بصرہ میں واصل بن عطا الغزال جو حسن بصری کا شاگرد تھا اور اس کے شاگرد عمرو بن عبید نے اعتزال کی بنیاد قائم کی، مقاتل بن سلیمان مفسر نے خراسان میں خدا کے لیے ہر قسم کے صفات ثابت کیے اور جسمیت کا قائل ہوا، ان سب کے بعد سجستان میں ابوعبداللہ بن کرام نے چند مذاہب - کچھ مسائل اخذ کرکے ایک جدید مذہب قائم کیا اور اس کو ایک کتاب کے ذریعہ سے خراسان وغیرہ میں رواج (۲) عام دیا، اس کا خیال تھا کہ ایمان محض قول باللسان کا نام ہے، اس لحاظ سے اگر کوئی شخص دل میں کفر کا اعتقاد رکھے اور زبان سے خدا اور شریعت کا اقرار کرے تو وہ مومن ہے، اس بنا پر نیشاپور میں آٹھ سال تک قید رہا، اس کے بعد بیت المقدس چلا گیا اور شام میں ۲۵۵ھ میں وفات پائی اور اس کے مقلدین واصحاب نے اس کی قبر پر اعتکاف کیا (۳) اس کے علاوہ اور بھی بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے لیکن ہم کو جہاں تک معلوم ہے، ان گمراہ سازوں میں روایتوں کے گڑھنے میں صرف عمرو بن عبید، مقاتل بن سلیمان اور کرامیہ مشہور ہیں، جہم بن صفوان کے متعلق تو علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں صاف تصریح کر دی ہے:

وماعلمته روی شیئاولکنه زرع شرا عظیما (جلداول ص ۱۹۷)	ہمارے خیال میں اس نے کوئی روایت نہیں کی، البتہ بہت بڑی برائی کا بیج بو گیا۔

اسی طرح غیلان دمشقی، یونس اسواری، جعد بن درہم وغیرہ کا بھی رواۃ حدیث میں شمار نہیں، کرامیہ عموماً ترغیب وترہیب کے متعلق وضع احادیث کو جائز رکھتے تھے اور بعض

(۱) ملل ونحل شہرستانی جلداول ص ۱۰۹ (۲) ملل ونحل شہرستانی جلداول ص ۱۴۵ و ۱۴۴ (۳) میزان الاعتدال ذہبی ج ۳ ص ۱۲۷۔

ریا کار زاہد بھی اس خیال میں انہی کے ہمزبان تھے، ان کا یہ دعویٰ محض زبانی نہ تھا، بلکہ اس کو استدلال سے بھی ثابت کرتے تھے، مثلاً ایک روایت میں ہے:

منْ كذب على متعمدًا ليضل به فليتبوّأ مقعده من النار۔	یعنی گمراہ سازی کے لئے جو میری طرف جھوٹ باتیں منسوب کرتا ہے اس کو جہنم میں اپنا ٹھکانا بنالینا چاہیے۔

اور چونکہ ترغیب وترہیب کے لئے جھوٹ بولنا گمراہ سازی میں داخل نہیں اس لئے اس کا مرتکب، شرعی مجرم نہیں قرار پا سکتا، اسی طرح بعض کا یہ بھی خیال تھا کہ چونکہ اس دروغ مصلحت آمیز سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی نقصان نہیں ہوتا (۱) اس لئے اس پر من كذب على (۲) کا حکم نہیں جاری ہوسکتا لیکن اس کا مجرم صرف کرامیہ اور زہاد کو قرار دینا خلاف انصاف ہے، خود ہمارے علما بھی اس قسم کی حدیثوں میں بہت کچھ سہل نگاری کرتے ہیں، (۳) مقاتل بن سلیمان کا وضع حدیث میں جو پایہ تھا، اس کا اندازہ میزان الاعتدال کی اس عبارت سے ہوسکتا ہے:

عن النسائى قال والكذابون المعروفون بوضع الحديث ابن ابى يحيىٰ بالمدينة والواقدى ببغداد ومقاتل بن سليمان بخراسان ومحمد بن سعيد الشامى	یعنی امام نسائی نے فرمایا کہ مدینہ میں ابن ابی یحییٰ بغداد میں واقدی، خراسان میں مقاتل بن سلیمان اور شام میں محمد بن سعید نہایت جھوٹے اور وضع حدیث میں مشہور ہیں۔

(جلد۳ص۲۴)

---

(۱) نووی حاشیہ مقدمہ مسلم ص۷۰ (۲) مطلب یہ کہ علیّ ضرر کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اس لئے جب ترغیب وترہیب سے شرعی فائدے حاصل ہوتے ہیں، تو اس قسم کے جھوٹ بولنے میں کیا حرج ہے (۳) حاشیہ نووی مطبوعہ ہند ص۲۱۔

معتزلہ کا گروہ چونکہ زیادہ تر عقلیات کا شیفتہ تھا، اس لئے روایتوں سے بہت کم اعتنا رکھتا تھا لیکن اس گروہ میں صرف عمرو بن عبید ننگ خاندان ہے، اس کو حسن بصری کی صحبت کا شرف حاصل تھا، اس لئے اکثر روایتوں کو غلط طور پر ان کی طرف منسوب کر دیتا تھا اور اسی کے ساتھ بعض اس قسم کی روایتیں بھی بیان کرتا تھا، جس سے معتزلہ کے مذہب کی تائید ہوتی تھی:

حدثني عمرو بن علي ابو	مجھ سے عمرو بن علی حفص نے روایت
حفص قال سمعت معاذ بن	کی کہ میں نے معاذ بن معاذ سے یہ
معاذيقول قلت لعوف بن	کہتے ہوئے سنا کہ میں نے عوف بن
جميلة ان عمرو بن عبيد	جمیلہ سے کہا کہ ہم سے عمرو بن عبید نے
حدثناعن الحسن ان رسول	حسن بصری سے روایت کی کہ
الله صلى الله عليه وسلم	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
قال من حمل عليناالسلاح	کہ جو شخص ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم
فليس مناقال كذب والله	سے نہیں، انھوں نے کہا کہ خدا کی قسم
عمر وولكنه اراد ان يحوز ها	عمرو جھوٹ کہتا ہے، لیکن وہ چاہتا ہے
الى قوله الخبيث.	کہ اس روایت کو اپنے مردود قول کی
(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۰۹)	طرف الٹ پھیر کر لائے۔

اس حدیث کی صحت میں کوئی کلام نہیں لیکن چونکہ عمرو بن عبید نے اس کو غلط طور پر حسن بصری کی طرف منسوب کر دیا تھا، اس لئے عوف بن جمیلہ نے اس کو مردود قرار دیا، کیونکہ عمرو بن عبید کو اس حدیث سے معتزلہ کے ایک خیال کی تائید منظور تھی، معتزلہ کا مذہب ہے کہ گناہ کبیرہ کا مرتکب دائرۂ ایمان سے نکل کر ہمیشہ کے لئے جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے، وہ لوگ اس قسم کے مجرم کو فاسق کا خطاب دیتے ہیں، چنانچہ عمرو بن عبید کو اس حدیث کے

ظاہری معنی سے اسی خیال کی تائید کرنا منظور تھی، اس کے علاوہ عمرو بن عبید میں یہ کمال بھی تھا کہ خفیف تغیر وتبدل سے احادیث کے اصلی معنی بدل دیا کرتا تھا:

حدثنی حجاج بن الشاعر قال حدثنا سلیمان بن حرب حدثنا ابن زید یعنی حماد قال قیل لایوب ان عمروبن عبید روی عن الحسن قال لایجلد السکران من النبیذ فقال کذب انما سمعت الحسن یقول یجلد السکران من النبیذ۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۱۰)

مجھ سے حجاج بن شاعر اور ان سے سلیمان بن حرب اور ان سے ابن زید یعنی حماد نے بیان کیا کہ ایوب سے کہا گیا کہ عمرو بن عبید نے حسن بصری سے روایت کی ہے کہ تاڑی سے نشہ کرنے والے شخص کو کوڑے نہیں مارے جائیں گے، انھوں نے فرمایا کہ وہ جھوٹ کہتا ہے، میں نے تو ان سے سنا ہے کہ ایسے شخص کو کوڑا مارا جائے گا۔

اس روایت میں عمرو بن عبید نے صرف لفظ ''لا'' کے بڑھا دینے سے ایسا عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا، مختصر یہ کہ اعتزال کی وجہ سے عمرو بن عبید روایت حدیث میں سخت بدنام تھا:

حدثنی حجاج قال نا سلیمان بن حرب قال سمعت سلام بن ابی مطیع یقول بلغ ایوب انی آتی عملاً فاقبل علی یوماً فقال ارأیت رجلاً لاتأمنه علی دینه کیف تأمنه

مجھ سے حجاج اور ان سے سلیمان بن حرب نے بیان کیا، کہ میں نے سلام بن ابی مطیع کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ ایوب کو معلوم ہوا کہ میں عمرو کے پاس آمد ورفت رکھتا ہوں، تو وہ میرے پاس آئے اور فرمایا کہ تمہیں جس شخص

علی الحدیث۔	کے مذہب پر اعتماد نہیں اس کی
(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۱۰)	حدیثوں پر کیوں کر اعتماد کرتے ہو۔

اسی سلسلہ میں محمد بن سعید مصلوب اور عبداللہ بن مسعود ابو جعفر المدنی بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، محمد بن سعید مصلوب کو وضع حدیث میں جو جرأت اور بے باکی تھی، اس کا اندازہ شارح نووی کی اس عبارت سے ہوسکتا ہے:

قال خالدبن یزید سمعته	یعنی خالد بن یزید کا بیان ہے کہ میں
یقول اذاکان کلام حسن لم	نے خود اس کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ
اربأساً ان اجعل له اسناداً۔	جب کوئی اچھا کلام مل جاتا ہے تو مجھے
	اس کے لئے اسناد گڑھنے میں ذرا بھی
	تامل نہیں ہوتا۔

اسی ضعف روایت کی وجہ سے مدلسین نے اس کے سیکڑوں نام بدلے ہیں، تاکہ انھیں مصنوعی ناموں کے پردے میں اس کا عیب چھپ جائے، اس کے ساتھ یہ مذہبی حیثیت سے بھی مہتم تھا، چنانچہ احمد بن حنبل کا بیان ہے کہ اس کو زندقہ کی تہمت میں ابوجعفر نے قتل کر ڈالا، (۱) عبداللہ بن مسور اگرچہ مذہبی حیثیت سے بدنام نہ تھا، تاہم وضع حدیث میں وہ بھی محمد بن سعید کا ہم خیال تھا:

حدثناعثمان بن ابی شیبة	ہم سے عثمان بن ابی شیبہ نے اور ان
قال نا جریر عن رقبة ان	سے جریر نے رقبہ کے ذریعہ سے
اباجعفر الهاشمی المدنی کان	روایت کی کہ ابو جعفر ہاشمی مدنی اچھے
یضع احادیث کلام حق	کلام کو حدیث کے قالب میں ڈھال کر
ولیست احادیث النبی ﷺ	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت

(۱) نووی ص ۵۶۔

وكان يرويهامن النبي ﷺ	کرتا تھا، حالانکہ وہ آنحضرتؐ کا کلام
(مقدمہ مسلم ص ۱۰۸، ۱۰۷)	نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح عبدالقدوس شامی بھی عام طور پر کذاب خیال کیا جاتا تھا۔

حدثنی احمدؒ بن یوسف	مجھ سے احمد بن یوسف ازدی نے
الازدی قال سمعت عبد	بیان کیا، کہ میں نے عبدالرزاق
الرزاق یقول ماراأیت ابن	سے سنا کہ ابن مبارک کسی شخص کو
المبارك يفصح يقوله كذاب	کذاب نہیں کہتے تھے، لیکن میں
الالعبد القدوس فاني سمعت	نے ان کو عبدالقدوس کو کذاب کہتے
يقول له كذاب۔	ہوئے سنا۔

(مقدمہ مسلم ص ۱۱۷)

اس فرقہ مبتدعہ میں روافض کا بھی شمار ہے، بلکہ اہل حدیث زیادہ تر اسی گروہ سے نالاں ہیں، کیونکہ یہی لوگ زیادہ تر اپنے مذہب کی تائید میں موضوع اور غلط حدیثیں روایت کرتے تھے، چنانچہ اسی بنا پر امام شافعیؒ ان کی حدیثوں کو مطلقاً دائرۂ اعتبار سے خارج سمجھتے ہیں، حالانکہ ان کو عام طور پر اہل بدعت کی روایتوں کے قبول کرنے میں اس قدر تشدد نہیں:

حدثنی سلمة بن شبيب قال	مجھ سے سلمہ بن شبیب اوران سے
نا الحميدی قال نا سفيان	حمیدی اوران سے ابوسفیان نے بیان
قال كان الناس يحملون عن	کیا کہ قبل اس کے کہ جابر اپنا خیال
جابر قبل ان مايظهر ما اظهر	ظاہر کرے، لوگ اس سے حدیثیں
فلما اظهر مااظهر اتهمه الناس	روایت کرتے تھے لیکن جب اس نے
فی حديثه وتركه بعض	اپنا خیال ظاہر کیا تو لوگ اس کو متہم
الناس فقيل له ومااظهر	کرتے تھے بلکہ بعض لوگوں نے اس

قال الایمان بالرجعة۔ (۱)	کو بالکل متروک الحدیث قرار دیا، پھر ان سے پوچھا گیا کہ اس نے کیا خیال ظاہر کیا، فرمایا ایمان بالرجعۃ۔
حدثنی حسن الحلوانی قال نا ابویحییٰ الحمانی قال ناقبیصة واخوه انهما سمعا الجراح بن مليح يقول سمعت جابر بن یزید عندی سبعون الف حدیث عن ابی جعفر عن النبی ﷺ کلها۔	مجھ سے حسن حلوانی اور ان سے ابویحییٰ حمانی اور ان سے قبیصہ اور ان کے بھائی نے روایت کی کہ ہم دونوں نے جراح بن ملیح سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ میں نے خود جابر بن یزید سے یہ سنا کہ میرے پاس ۷۰ ہزار حدیثیں ہیں جو کل کی کل آنحضرتؐ سے ابوجعفر کے ذریعہ سے مروی ہیں۔

لیکن بایں ہمہ ہم کو اس گروہ کا ممنون ہونا چاہیے کہ اس نے علم حدیث کے متعلق قدما کی رائے میں ایک نہایت مفید انقلاب پیدا کر دیا، چنانچہ اس کے پہلے اسناد کا اس قدر التزام نہ تھا، یا تھا تو کم از کم اس کے متعلق اس قدر تشدد سے کام نہیں لیا جاتا تھا لیکن جب بدعت نے زیادہ زور پکڑا تو محدثین نے اس کی طرف خاص توجہ کی اور اس کو لوازم مذہب سے قرار دیا۔

حدثنا ابوجعفر محمد بن الصباح قال ثنا اسماعیل بن زکریا عن عاصم الاحول عن	ہم سے ابوجعفر محمد بن صباح اور ان سے اسماعیل بن زکریا اور ان سے عاصم احول نے ابن سیرین سے

(۱) روافض کا خیال ہے کہ حضرت علی بادلوں کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں، چنانچہ جب وہ آسمان سے پکاریں گے تو ہم ان کی اولاد کے ساتھ خروج کریں گے۔

ابن سیرین قال لم	روایت کی کہ لوگوں سے پہلے اسناد نہیں
یکونوایسئلون عن الاسناد	پوچھے جاتے تھے لیکن جب فتنہ پھیلا تو
فلما وقعت الفتنة قالوا	لوگ کہنے لگے کہ ہم کو اپنے راویوں
سموالنا رجالکم فینظر الیٰ	کے نام بتاؤ تا کہ اہل سنت کو دیکھ کر
اهل السنة فیوخذ حدیثهم	حدیثیں قبول کی جائیں اور اہل بدعت
وینظر الیٰ اهل البدع	کی حدیثیں نہ لی جائیں۔
فلایوخذ حدیثهم.	

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۸۴)

سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اسی گروہ کی برکت سے احادیث کی تالیف وتدوین کا سلسلہ قائم ہوا کیوں کہ عمرو بن عبید، جہم بن صفوان، واصل بن عطا، مقاتل بن سلیمان کے ظہور کا زمانہ وہ پرآشوب زمانہ تھا جس میں ملکی انقلاب کا حشر برپا تھا، حوادثِ زمانہ نے بنوامیہ کا دفتر الٹ کر بنی عباس کو صاحب تخت وتاج قرار دیا تھا، علما ومحدثین بھی اس قیامت خیز انقلاب سے محفوظ نہ تھے، خراسانی لشکر نے سیکڑوں اہل علم کو تہ تیغ کر دیا تھا، اس لیے خوف تھا کہ ملکی تغیر کے ساتھ، ان خانہ برانداز وں کے خیالات سے اسلام کے اصلی عقائد میں کہیں انقلاب نہ پیدا ہو جائے، اس بنا پر علما نے تدوین کتب کی طرف توجہ کی اور علوم شریعت صحابہ اور تابعین کے مقدس سینوں سے نکل کر منظر عام پر آ گئے، یہ سچ ہے کہ اس ذریعہ سے مسلمانوں کا اصلی جوہر قوت حافظہ مٹ گیا لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ آج ہمارے پاس جو کچھ بچا کھچا سرمایہ رہ گیا ہے، وہ انہیں کوششوں کا نتیجہ ہے۔

بہر حال یہاں تک جو بحث تھی، اس کا تعلق ایک خاص گروہ کے ساتھ تھا لیکن ایک عام بات جس کا تعلق ہر گروہ اور ہر شخص کے ساتھ ہو سکتا ہے، یہ ہے کہ کثرت روایت سے احتراز کیا جائے اور اسی کے ساتھ ہر شخص کے فہم ودرایت کے موافق روایتیں کی جائیں

اور عموماً ہر کس و ناکس سے روایتوں کے قبول کرنے میں سختی اور احتیاط سے کام لیا جائے چنانچہ صحابہ اور تابعین میں جو لوگ نکتہ سنج اور حقیقت شناس تھے، وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے۔

حدثنا یحییٰ بن یحییٰ قال نا هشیم عن سلیمان التیمی عن ابی عثمان النهدی قال قال عمر بن الخطاب بحسب المرء من الکذب او یحدث بکل ماسمع۔

(مقدمہ مسلم ص ۷۴، ۷۵)

ہم سے یحییٰ بن یحییٰ نے روایت کی کہ ہم کو ہشیم نے سلیمان تیمی سے اور ان سے عثمان نہدی نے خبر دی کہ حضرت عمرؓ بن الخطاب فرماتے تھے کہ آدمی کے لیے یہی جھوٹ بہت ہے کہ جو کچھ سنے اس کو روایت کر دے۔

حدثنی ابو الطاهر احمد بن عمرو بن عبدالله بن عمرو بن سرج قال نا ابن وهب قال قال لی مالك اعلم انه لیس یسلم رجل حدث بکل ماسمع ولا یکون اماما وهو یحدث بکل ماسمع۔

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۷۵)

ہم سے ابو طاہر احمد بن عمرو بن عبداللہ بن عمرو بن سرج نے روایت کی کہ ہم کو ابن وہب نے خبر دی کہ مجھ سے امام مالک نے فرمایا کہ تم خوب سمجھ لو کہ جو شخص جو کچھ سنتا ہے اور اس کی روایت کرتا ہے وہ خطا سے نہیں بچ سکتا اور وہ شخص امام نہیں ہو سکتا۔

حدثنی ابو الطاهر وحرملة بن یحییٰ قالا نا ابن وهب قال اخبرنی یونس عن ابن شهاب عن عبیدالله بن

ہم سے ابوالطاہر اور حرملہ بن یحییٰ نے روایت کی کہ ہم دونوں کو ابن وہب نے خبر دی کہ ہم سے یونس نے اور ان سے ابن شہاب نے اور ان سے

عبدالله بن عتبة ان عبدالله بن مسعود قال ما انت بمحدث قوماً حديثاً لاتبلغه عقولهم الاكان لبعضهم فتنة.
(مقدمہ مسلم ص ۷۶)

عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ نے روایت کی کہ عبد اللہ بن مسعود فرماتے تھے کہ جب تم کسی قوم کے مبلغ عقل سے باہر حدیث بیان کرو گے تو وہ یقیناً ان میں سے بعض کے لیے فتنہ و فساد ہوگی۔

حدثني الفضل بن سهل قال حدثني عفان بن مسلم قال نا همام قال قدم علينا ابوداؤد الاعمىٰ فجعل يقول ثنا البراء وثنا زيدبن ارقم فذكرنا ذلك لقتادة فقال كذب ماسمع منهم انما كان ذلك سأل يتكفف الناس زمن الطاعون الجارف.
(مقدمہ مسلم ص ۱۰۴)

مجھ سے فضل بن سہل نے بیان کیا کہ مجھ سے عفان بن مسلم نے روایت کی کہ ہم کو ہمام نے خبر دی کہ میرے پاس ابوداؤد اعمیٰ آئے اور کہنے لگے کہ مجھ سے براء نے حدیث بیان کی اور زید بن ارقم نے حدیث بیان کی تو میں نے اس کا ذکر قتادہ کے سامنے کیا انھوں نے کہا وہ جھوٹ کہتا ہے، اس نے ان میں سے کسی سے نہیں سنا، وہ تو طاعون جارف کے زمانے میں لوگوں سے بھیک مانگا کرتا تھا۔

اور درحقیقت قدما کے یہ اقوال بالکل دوراندیشی پر مبنی ہیں، کیوں کہ عادۃً ہر شخص جھوٹی سچی باتیں سنا کرتا ہے، اس لیے کثرت روایت سے کوئی شخص جھوٹ سے نہیں بچ سکتا، اسی طرح بہت سی حدیثیں عام لوگوں کے دائرہ عقل سے خارج ہوتی ہیں، اس لیے ان کے سامنے اس قسم کی حدیثوں کے بیان کرنے میں نہایت دقیق اور خطرناک غلطیوں کا احتمال ہے۔

ان ہی عام غلطیوں میں تدلیس اور واقعہ تاریخی کے خلاف روایتیں بھی ہیں
تدلیس کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ اکثر لوگ روایت حدیث میں مجہول اور ضعیف ہوتے تھے، اس لیے اکثر رواۃ ان کے عیوب کی پردہ پوشی کے لیے ان کے نام کو کنیت اور کنیت کو نام سے بدل کر روایات کیا کرتے تھے تاکہ وہ لوگ جس نام اور کنیت کے ساتھ ضعیف مشہور ہیں، ان میں التباس اور اشتباہ پیدا ہو جائے، اسی طرح بہت سے لوگ واقعہ تاریخی کے خلاف روایتیں کیا کرتے تھے۔

حدثنا اسحاق بن ابراهيم الحنظلي قال سمعت بعض اصحاب عبدالله قال قال ابن المبارك نعم الرجل بقية لولا انه يكني الاسامي ويسمى الكنى كان دهرا يحدث عن ابى سعيدالوحاظى فاذا هو عبدالقدوس۔ (مقدمہ مسلم ص ۱۷)	ہم سے اسحاق بن ابراہیم حنظلی نے روایت کی کہ میں نے عبداللہ بن مبارک کے بعض اصحاب سے سنا کہ وہ فرماتے تھے کہ بقیہ کیا اچھا آدمی تھا اگر وہ ناموں کو کنیت اور کنیت کو ناموں سے نہ بدلتا، ایک زمانے تک وہ ابوسعید وحاظی سے روایت کرتا تھا آخر وہ عبدالقدوس نکلا۔
حدثني عبدالله بن عبدالرحمن الدارمي قال سمعت ابانعيم وذكر المعلى بن عرفان فقال قال حدثنا ابووائل قال خرج علينا ابن مسعود بصفين فقال ابونعيم اتراه بعث بعدالموت۔	ہم سے عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی نے روایت کی کہ ہم نے ابونعیم سے معلّٰی بن عرفان کا ذکر سنا وہ فرماتے تھے کہ معلّٰی نے ہم سے ابووائل کی سند سے روایت کی کہ ہم پر حضرت ابن مسعود نے جنگ صفین میں چڑھائی کی راوی کا بیان ہے کہ ابونعیم نے اس سے

(مقدمہ صحیح مسلم ص ۱۱۷، ۱۱۸) کہا کہ کیا تمہارے نزدیک وہ قبر سے اٹھ کر آئے تھے۔

مطلب یہ کہ معلیٰ نے ابووائل کی طرف اس حدیث کی غلط نسبت کی کیونکہ حضرت ابن مسعودؓ نے حضرت عثمانؓ کی خلافت ختم ہونے سے تین برس پہلے ۳۲ یا ۳۳ھ میں وفات پائی اور جنگ صفین حضرت علیؓ کے زمانے میں واقع ہوئی، اس لئے ابووائل جیسے ثقہ اور ضابط شخص ایسی خلاف عقل حدیث کیوں کر روایت کر سکتے تھے، ان تحقیقات کے بعد امام صاحب نے معنعن حدیث کی بحث چھیڑی ہے اور نہایت سختی کے ساتھ امام بخاری کے مذہب کو باطل کیا ہے، معنعن روایتوں کے متعلق محدثین کی رائیں نہایت مختلف ہیں، امام بخاری کا مذہب یہ ہے کہ راوی اور مروی عنہ میں ملاقات ثابت ہوئی چاہیئے، متاخرین نے اس سے بھی زیادہ سختی سے کام لیا ہے، چنانچہ قابسی کے نزدیک مطلق لقا بھی کافی نہیں بلکہ اچھی طرح ملاقات کرنی چاہیے، ابوالمظفر سمعانی نے امتداد صحبت کی قید لگائی، ابوعمرو الدانی المقری نے ان تمام شرائط پر اس شرط کا بھی اضافہ کیا ہے کہ دونوں میں روایت بھی ثابت ہو لیکن امام مسلم کے نزدیک صرف راوی اور مروی عنہ کی ہم عصری اور امکان ملاقات صحت روایت کے لیے کافی ہوسکتا ہے بشرطیکہ راوی مدلس نہ ہو۔(۱)

اور ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس پر اجماع کا دعویٰ کیا ہے، (۲) ان کا استدلال یہ ہے کہ ثبوت لقا کے بعد معنعن روایت عموماً متصل الاسناد سمجھی جاتی ہے، حالانکہ اس صورت میں ارسال کا احتمال قائم رہتا ہے، فرض کرو زید نے عمرو سے عمرو نے بکر سے روایت کی، زید اور عمر میں لقا بھی ثابت ہے، زید ثقہ بھی ہے لیکن پھر بھی یہ احتمال باقی ہے کہ زید اور عمرو کے درمیان میں کوئی واسطہ ہو، مگر صحت روایت پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا، اسی طرح امکان لقا کی صورت میں راوی کے غیر مدلس اور ثقہ ثابت ہونے کے بعد ارسال اور انقطاع کا شبہہ قابل

(۱) مقدمہ مسلم نووی ص ۳۲ و تدریب الراوی ص ۷۴ (۲) ایضاً۔

اعتبار نہیں لیکن درحقیقت امام صاحب کا یہ مذہب صحیح نہیں، کیونکہ راوی ثقہ اور غیر مدلس ہے اور لقا بھی ثابت ہے تو اس صورت میں ظن غالب ہے کہ وہ بلا واسطہ روایت کرتا ہے، کیونکہ ثقہ اور غیر مدلس راویوں کے حالات کے تتبع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس طور پر حدیثیں اسی وقت روایت کرتے تھے، جب بذات خود سن لیتے تھے لیکن عدم لقا کی صورت میں اس قسم کا غلبہ ظن نہیں پیدا ہوسکتا، اب اس تحقیق کے بعد ہم مسلم کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

صحیح مسلم اور اس کی خصوصیات: اوپر گذر چکا ہے کہ امام صاحب نے جس زمانے میں صحیح مسلم کو مرتب کیا، اس میں موضوع، ضعیف، غلط ہر قسم کی حدیثیں موجود تھیں، اس بنا پر انھوں نے صحیح کے مقدمہ میں احادیث کی تین قسمیں اور راویوں کے تین طبقے قرار دیے ہیں۔

۱- وہ حدیثیں جو بالکل صحیح ہوں، اور ان کے رواۃ عموماً متقن، حافظ، ضابط اور ثقہ تسلیم کیے گئے ہوں۔

۲- وہ حدیثیں جن کے رواۃ کو باعتبار ثقاہت اور حفظ واتقان پہلے قسم کے راویوں سے کم درجہ رکھتے ہوں۔

۳- وہ حدیثیں جن کے رواۃ کو عموماً یا اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہو۔

امام صاحب نے تصریح کی ہے، کہ میں پہلی قسم کی حدیثوں کے بعد دوسری قسم کی روایتوں کو درج کروں گا لیکن مجھ کو تیسری قسم کی حدیثوں سے کچھ تعلق نہیں (۱) اس تصریح کے موافق طبقہ ثالثہ کی روایتوں کے متعلق تو کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا تھا، البتہ اس مسئلہ میں اہل علم نہایت مختلف الرائے ہیں کہ صحیح مسلم میں دوسرے طبقہ کی حدیثیں درج ہوئیں یا نہیں۔

حافظ ابوعبداللہ حاکم اور حافظ ابوبکر بیہقی کا خیال ہے کہ امام صاحب کو موت نے دوسرے طبقے کی حدیثوں کے تخریج کا موقع نہیں دیا، اس لیے صحیح مسلم میں صرف طبقۂ اول

(۱) مقدمہ مسلم ص ۴۸ تا ۵۰۔

کی حدیثیں درج ہوسکیں، امام ابوسفیان کا (جو خود امام صاحب کے ہم صحبت ہیں، بیان ہے کہ امام صاحب نے ہر طبقہ کے لیے الگ الگ کتابیں مرتب کیں اور ان میں بالاستقلال ہر طبقہ کی روایتیں جمع کیں، چنانچہ انھیں کتابوں میں سے ایک صحیح مسلم بھی ہے۔

لیکن قاضی عیاض کی تحقیق یہ ہے کہ صحیح مسلم میں دونوں طبقہ کی حدیثیں موجود ہیں، البتہ فرق یہ ہے کہ دوسرے قسم کی حدیثیں متابعۃً یا شواہداً درج کی گئی ہیں، اسی طرح ان ابواب میں بھی اس قسم کی حدیثیں آ گئی ہیں، جن میں پہلے طبقہ کی حدیثیں دستیاب نہ ہوسکیں، اسی طور پر ان راویوں کی روایتوں سے بھی تعرض کیا گیا ہے، جن کو بعض محدثین نے معتبر اور بعض نے غیر معتبر قرار دیا ہے یا یہ کہ ان کے رواۃ متہم بالبدعہ ہیں، جیسا کہ خود امام بخاریؒ نے کیا ہے، اس تحقیق کے موافق صحیح مسلم میں بجز ان حدیثوں کے جن کے رواۃ کو عموماً اکثر محدثین نے مردود قرار دیا ہے، ہر قسم کی روایتیں درج ہیں۔(۱)

بہر حال صحیح یعنی قسم اول کی حدیثوں میں امام صاحب کی شرط یہ ہے کہ حدیث متصل الاسناد ہو، شروع سے اخیر تک ثقہ راویوں کے ذریعہ سے مروی ہو، شذوذ وعلۃ سے خالی ہو، اس میں امام صاحب کی خصوصیت نہیں، بلکہ عموماً محدثین کے نزدیک جب کسی حدیث میں یہ تمام شروط پائے جاتے ہیں تو وہ صحیح تسلیم کی جاتی ہے، البتہ اختلاف اس وقت ہوتا ہے، جب ان شرائط میں سے کوئی شرط موجود نہ ہو، اور ان میں باہم اس شرط کے اشتراط میں اختلاف زیادہ ہو، زیادہ تر اختلاف ان روایتوں میں ہوتا ہے، جن میں ایک فریق کے نزدیک صحیح کے تمام شرائط موجود ہوں اور دوسرے کے نزدیک معدوم، مثلاً امام بخاری کے نزدیک ابوزبیر مکی، سہیل بن ابی صالح، حماد بن سلمہ وغیرہ میں صحیح کے تمام شرائط موجود نہیں، اس لئے وہ ان سے روایت نہیں کرتے، اس کے بخلاف یہ لوگ امام مسلم کے نزدیک قابل اعتبار ہیں، اسی طرح عکرمہ عمرو بن مرزوق سے امام بخاری روایت کرتے ہیں لیکن امام مسلم

(۱) مقدمہ نووی ص ۳۳ تا ۳۵۔

ان کو قابل روایت نہیں قرار دیتے، اس بنا پر امام مسلم نے امام بخاری کے چار سو چونتیس راویوں سے اور امام بخاری نے امام مسلم کے چھ سو پچیس راویوں سے روایت نہیں کی۔(۱)

اس موقع پر اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بخاری کو قوت اسناد کے لحاظ سے مسلم پر ترجیح ہے، تاہم مسلم میں بھی چند خصوصیتیں ایسی پائی جاتی ہیں، جو امام بخاری کے مقابل میں مرجحانہ حیثیت سے پیش کی جاتی ہیں، چنانچہ ہم ان کو ایک خاص ترتیب سے درج کرتے ہیں۔

۱۔حسن ترتیب: صحیح مسلم کو جن حیثیتوں سے ایک بے نظیر تصنیف کا خطاب دیا گیا ہے، ان میں ایک عام وصف اس کتاب کی طرز ادا اور حسن ترتیب ہے،(۲) امام بخاری نے اگرچہ روایتوں کی تنقید میں نہایت احتیاط اور نکتہ سنجی سے کام لیا ہے تاہم چونکہ وہ متون حدیث سے ایک خاص نتیجہ پیدا کرنا چاہتے ہیں، اس لئے ان احادیث کو متعدد طریقوں سے مختلف بابوں میں درج کرتے ہیں، بلکہ اکثر احادیث کو ان ابواب میں درج کر دیتے ہیں جو بظاہر ان کے بالکل مناسب نہیں ہوتے، اس لحاظ سے بخاری میں اس قدر سوء ترتیبی پیدا ہوگئی ہے کہ متاخرین کے ایک گروہ نے بخاری کی ان روایتوں کا کلیۃً انکار کر دیا، جو نامناسب ابواب میں درج تھیں، کیوں کہ ابواب کے عدم تناسب اور غیر موزونی سے ان کی طرف خیال بھی مائل نہیں ہو سکتا تھا، اس کے بخلاف امام مسلم ہر حدیث کو ایک خاص اور مناسب باب میں درج کرتے ہیں، اور اسی کے ساتھ طرق مختلفہ اور اسانید کی تشریح اور رواۃ کے خاص خاص الفاظ کی طرف بھی اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس لئے مسلم میں حسن ترتیب کے ساتھ احادیث کی تحقیق اور تفتیش کا موقع بھی نہایت آسانی سے مل سکتا ہے۔(۳)

۲۔امام بخاری چونکہ فقہی مسائل کے استنباط کی غرض سے احادیث پر مجتہدانہ نظر ڈالتے ہیں، اس لئے اسناد کے متصل ہونے کا بہت کم خیال رکھتے ہیں، چنانچہ بخاری میں

(۱) نووی ص ۱۵،۱۶ (۲) ایضاً ص ۱۱ (۳) ایضاً ص ۱۴،۱۵۔

غیر مسند روایتیں اور تعلیقات کی کثرت اسی کا نتیجہ ہے،(۱) اسی طرح وہ اجتہاد کے موقعوں پر اکثر ان احادیث کی طرف جو پہلے گذر چکی ہیں، نہایت خفیف اشارہ کرتے جاتے ہیں، اس بنا پر اس طریقہ سے اگر چہ ان کی دقت نظر اور اجتہادی قوت کا پتہ چلتا ہے اور وہ حدیثیں بھی درحقیقت متصل الاسناد اور صحیح ہوتی ہیں تاہم بظاہر ان کے متعلق بہت سے خدشے پیدا ہوجاتے ہیں، چنانچہ ابن حزم ظاہری نے حرمت ملاہی کا اسی بنا پر انکار کر دیا کہ بخاری میں اس کے متعلق جو حدیث مروی ہے، وہ منقطع یعنی معلق ہے لیکن امام مسلم نے چوں کہ احادیث کو محض محدثانہ حیثیت سے دیکھا ہے، اس لیے مسلم میں یہ ظاہری فروگذاشت بہت کم نظر آتی ہے، چنانچہ تحقیقی رائے کے مطابق اس میں صرف بارہ جگہ تعلیقات یعنی منقطع روایتیں پائی جاتی ہیں۔

۳- امام بخاری اہل شام سے جو روایتیں کرتے ہیں ان کے نام اور کنیت میں اکثر ان کو اشتباہ ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ نام اور کنیت کے لحاظ سے ان کو مختلف موقعوں پر دو شخص سمجھ جاتے ہیں لیکن امام مسلم کو کسی موقع پر اس قسم کا دھوکا نہیں ہوا، اس سے امام صاحب کی قوت ممیزہ اور وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے۔

۴- امام بخاری کی حدیثوں میں تقدیم وتاخیر، حذف اور اسقاط کی وجہ سے اکثر تعقید اور پیچیدگیاں پیدا ہوگئی ہیں لیکن مسلم کی نشست الفاظ میں کہیں اس قسم کی تعقید نہیں پائی جاتی، یہ سچ ہے کہ بخاری کی دوسری روایتوں کی اعانت سے تعقید کی یہ گرہ کھل جاتی ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلم کا طرز ادا بخاری کی بہ نسبت زیادہ صاف ہے، واضح اور قریب الفہم ہے، ان خصوصیتوں کے علاوہ امام صاحب نے عموماً صحیح مسلم میں حزم اور احتیاط کے جو پہلو اختیار کیے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- محدثین کی درسگاہ میں عموماً درس وتدریس کے دو طریقے معین تھے، ایک تو یہ

(۱) مقدمہ نووی ص ۱۶۔

کہ اساتذہ خود حدیثوں کو پڑھتے تھے اور ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی کرتے جاتے تھے، دوسرے یہ کہ اساتذہ اپنے مجموعہ حدیث کو خود شاگرد کے ہاتھ میں دے دیتے تھے، وہ اس کو پڑھتا تھا اور شیخ کو محض تشریح مطلب کی زحمت گوارا کرنی پڑتی تھی، ان دونوں طریقوں سے اگرچہ احادیث کی صحت اور قطعیت پر مساویانہ اثر پڑتا ہے، تاہم راویانہ حیثیت سے یہ بحث آپڑتی ہے کہ دوسری قسم کی حدیثوں کو "حدثنا" کے ساتھ روایت کرسکتے ہیں یا نہیں؟ امام بخاری امام زہری، یحییٰ بن سعید قطان وغیرہ کے نزدیک اس لفظ کے ساتھ روایت کرسکتے ہیں لیکن محدثین کا ایک بہت بڑا گروہ جن میں امام شافعیؒ، امام اوزاعیؒ، امام نسائی جیسے اکابرِ فن داخل ہیں، ان دونوں قسموں میں تفریق کرتا ہے اور دوسری قسم کی روایتوں کو صرف "اخبرنا" سے جائز رکھتا ہے، امام مسلم بھی انہی بزرگوں کے ہم خیال ہیں (۱) اس لیے ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ یہ طریقہ کس قدر حزم، احتیاط اور دوراندیشی پر مبنی ہے۔

اس مسئلہ کو طے کرنے کے لیے سب سے پہلے لفظ ''حدیث اور خبر'' کی حقیقت پر غور کرنا چاہیے، خبر ایک عام لفظ ہے کیوں کہ اس کے لیے بالذات یا بواسطہ محض اظہار واقعہ کی ضرورت ہے، اس کے بخلاف حدیث (گفتگو) ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا وجود بغیر اپنی زبان کے ہو ہی نہیں سکتا اور اگر کسی دوسرے ذریعہ سے ہو تو وہ محض ترجمانی یا اخبار ہوگا، اس بنا پر صرف انہی حدیثوں کو "حدثنا" سے روایت کرسکتے ہیں جن کو شیخ نے خاص اپنی زبان سے بیان کیا ہو، (۲)

۲- اکثر روایتوں میں راویوں کے الفاظ، متن حدیث کے بعض حروف اور رواۃ کے اوصاف اور نام ونسب میں اختلاف ہو جاتا ہے، اس لیے امام صاحب نہایت احتیاط کے ساتھ ہر ایک کی تفصیل کر دیتے ہیں، جن سے متعدد نتائج پیدا ہوتے ہیں، اولاً تو خود امام صاحب کی وسعت نظر اور صداقت کا پتہ چلتا ہے، دوسرے یہ کہ اختلاف لفظ کی وجہ سے

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۱ (۲) ایضاً ص ۲۲۔

بعض موقعوں پر معنوی اختلاف بھی پیدا ہو جاتا ہے۔(۱)

۳- محدثین کے زمانے میں علمِ حدیث کی وسعت نے بعض ایسے مجموعے پیدا کر دیے تھے جن میں صرف ایک ہی روایت اور ایک ہی اسناد سے تمام حدیثیں مروی ہوتی تھیں، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس قسم کے مجموعوں سے متعدد روایتیں کی جائیں تو بوقتِ روایت ہر حدیث کے لیے تجدیدِ اسناد کی ضرورت ہوگی یا احادیث کے متحد الاسناد ہونے کی وجہ سے بعد کی، دوسری حدیثیں اسی پہلی اسناد پر محمول کر دی جائیں گی، وکیع بن جراح اور یحییٰ بن معین کے نزدیک تجدیدِ اسناد کی کوئی ضرورت نہیں لیکن استاذ ابواسحاق اسفرائینی جو اصولِ حدیث کے بہت بڑے امام ہیں، اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور ہر حدیث کو بقیدِ اسناد روایت کرنا ضروری سمجھتے ہیں، امام مسلم بھی انھیں کے ہم زبان ہیں اور اپنی خاص روایتوں میں اس کی تفریق کر دیتے ہیں، چنانچہ صحیفۂ ابن ہمام سے جو روایتیں کی ہیں، اسی اصول پر کی ہیں (۲) اب غور کرنا چاہیے کہ امام صاحب کا یہ طرزِ عمل، کس قدر دور اندیشی پر مبنی ہے، اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ تجدیدِ اسناد سے راوی کی احتیاط اور دیانت کا ٹھیک پتہ چل جاتا ہے لیکن اس سے قطع نظر کر کے اگر عام طور پر اس طریقہ سے سہل انگاری کی جائے تو آئندہ چل کر رواۃ کی بے احتیاطی سے اکثر حدیثوں میں اختلاط پیدا ہو جائے، اس لیے صداقت اور تورع کے علاوہ امام صاحب کا یہ اصول بالکل عقل کے موافق ہے۔

۴- امام صاحب احادیث کی روایت میں اس قدر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں کہ لغزش کا گمان بھی نہیں ہوسکتا، چنانچہ سلسلۂ روایت میں ایک موقع پر سلیمان بن بلال اور یحییٰ بن سعید کا نام آگیا ہے لیکن چوں کہ امام صاحب نے اپنے شیخ سے ان راویوں کا نام بقیدِ نسب نہیں سنا تھا، اس لیے سلسلۂ روایت میں ان کے نسب کا ذکر اس تصریح کے ساتھ کیا

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۲ (۲) ایضاً۔

ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خود امام صاحب کا ذاتی اضافہ ہے، اس سے امام صاحب کی صداقت اور دیانت کا پتہ چلتا ہے۔(۱)

صحیح مسلم کا طریق روایت: ان اصول وشرائط ہی کے لحاظ سے صحیح مسلم ایک بے نظیر اور مستند تصنیف نہیں بلکہ جن ذرائع سے ہم تک پہنچی ہے، ان میں بھی وہی قطعیت اور قوت پائی جاتی ہے جو اس کتاب کے لیے موزوں تھی، عام طور پر جن بزرگوں کی متصل الاسناد روایتوں کے ذریعہ سے اس کتاب نے شہرت پائی ہے ان کے نام یہ ہیں: ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان، ابواحمد محمد بن عیسیٰ الجلودی، ابوالحسین عبدالغافر فارسی، ابوعبداللہ محمد بن الفضل فراوی، امام فقیہ الحرمین ابوالفتح منصور بن عبدالمنعم فراری، ابواسحاق ابراہیم بن ابی حفص، عمرو بن مفرالواسطی، ان بزرگوں میں سب سے پہلے امام ابواسحاق ابراہیم بن محمد بن سفیان نے خود امام مسلم سے روایت کی اس کے بعد علی سبیل الترتیب یہ مبارک سلسلہ امام ابواسحاق واسطی تک پہنچا، چنانچہ شیخ محی الدین نووی شارح مسلم نے جامع دمشق میں انہی سے پوری کتاب کی سماعت کی، ان بزرگوں میں فضل وکمال اور ثقاہت کے علاوہ جو بات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ یہ تمام اصحاب نیشاپوری اور سن رسیدہ ہیں، ان میں اگرچہ امام ابواسحاق ابراہیم، واسطی ہیں لیکن چوں کہ انھوں نے ایک مدت تک نیشاپور میں اقامت کی ہے، اس لیے یہ بھی درحقیقت اسی سلسلہ میں داخل ہیں، طرق روایت کی اس خصوصیت نے مسلم کو اور بھی قطعی اور یقینی بنادیا ہے لیکن اس کے علاوہ اہل مغرب کے نزدیک یہ کتاب ابی محمد بن علی القلانسی کی روایت سے بھی مشہور ہے، ابومحمد قلانسی سے ابوبکر احمد بن یحییٰ کے توسط سے ابی العلا عبدالوہاب بن عیسیٰ نے روایت کی تھی، چنانچہ ابوعبداللہ محمد بن یحییٰ نے مصر میں ان سے اس کتاب کی سماعت کی اور اس کو خاص اپنی روایت کے ذریعہ سے مغرب میں پہنچایا، مگر مغرب کے سوا یہ طریقۂ روایت عام طور پر نہ پھیل سکا، اس

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۳۔

لیے تمام تر دار و مدار ابو اسحاق ابراہیم بن سفیان کی روایت پر آجاتا ہے۔(۱)

مسلم کے شروح وغیرہ: صحیح مسلم کی شہرت اور مقبولیت کا اندازہ اس امر سے بھی ہوسکتا ہے کہ تعلیقات اور شروح کے علاوہ اہل علم کے ایک بہت بڑے گروہ نے جن میں وہ اصحاب بھی شامل ہیں، جنھوں نے مسلم کے اکثر شیوخ کی آنکھیں دیکھی تھیں، مسلم کے طرز پر نہایت کثرت سے کتابیں لکھیں اور مسلم کی احادیث کو خاص اپنی اسانید سے جمع کیا، ان کتابوں میں اگرچہ مسلم کی خصوصیتیں نہ پیدا ہوسکیں، تاہم چوں کہ اسی پیمانہ پر لکھی گئی تھیں، اس لیے صحت اور قطعیت کی جھلک ان میں بھی نظر آتی ہے اور اسی کے ساتھ چوں کہ وہ لوگ اپنی خاص خاص اسانید سے روایتیں کرتے ہیں، اس لیے روایت کے متعدد طرق پیدا ہوجاتے ہیں اور اس ذریعہ سے علو اسناد کے ساتھ احادیث میں نہایت قوت آجاتی ہے، چنانچہ ان میں چند کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

۱- تخریج ابی جعفر احمد بن حمدان بن علی النیشا فوری المتوفی ۳۱۱ھ

۲- تخریج ابی نصر محمد بن محمد الطوسی الشافعی المتوفی ۳۴۴ھ

۳- مسند الصحیح لابی بکر محمد بن محمد بن رجا النیشا فوری الاسفرائینی المتوفی ۲۸۶ھ

۴- مختصر المسند الصحیح علی مسلم للحافظ ابی عوانہ یعقوب بن اسحاق الاسفرائینی المتوفی ۳۱۶ھ

۵- تخریج ابی حامد احمد بن محمد الشاذکی الفقیہ الشافعی الہروی المتوفی ۳۰۵ھ

۶- مسند صحیح لابی بکر محمد بن عبداللہ الجوزقی النیشا فوری الشافعی المتوفی ۳۸۸ھ

۷- المسند المستخرج علی کتاب مسلم للحافظ ابی نعیم احمد بن عبداللہ الاصبہانی المتوفی ۴۳۰ھ

۸- المخرج علی صحیح مسلم لابی الولید حسان بن محمد القرشی الفقیہ الشافعی ۳۴۹ھ (۲)

---

(۱) مقدمہ نووی ص ۱۱ (۲) مقدمہ نووی ص ۲۲ و ۲۷۔

شروح کی تعداد ان کتابوں سے بھی زیادہ ہے اوران میں بعض شرحیں قاضی عیاض اورامام جلال الدین سیوطی جیسے ائمہ فن کے قلم سے نکلی ہیں لیکن آج کل عام طور پر شیخ محی الدین نووی کی شرح زیادہ مشہوراور عام طور پر متداول ہے، شروح کی کثرت کے ساتھ شراح کے سلسلے مین شافعی، مالکی، حنفی، غرض ہر مذہب کے لوگ داخل ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ ہر فرقہ بلاتخصیصِ مذہب مسلم کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔(۱)

مسلم پر اعتراضات: اہل فن نے تنقیدی حیثیت سے مسلم پر جونکتہ چینیاں کی ہیں، وہ اگرچہ اس کی خوبیوں کے مقابل میں اس قدر کم وقعت اور بے حقیقت ہیں کہ ان کی طرف خیال بھی نہیں مائل ہوسکتا تاہم چوں کہ اس سے اس امر کا اندازہ ہوگا کہ مسلم کی صحت اور خصوصیات کے مقابل میں جب اس زمانہ میں اس سے زیادہ نہ ہوسکا، تو اب اس سے بڑھ کرنہیں ہوسکتا، اس لیے ہم خاص طور پر ان کا ذکر کرتے ہیں۔

مسلم پر ایک عام اعتراض جس میں امام بخاری بھی شامل ہیں، یہ ہے کہ امام مسلم اور بخاری نے بہت سی حدیثوں کو چھوڑ دیا جن کے راویوں کی سند سے وہ خود صحیحین میں روایت کرتے ہیں، یہاں تک کہ اکثر ان حدیثوں سے بھی اعراض کر گئے ہیں، جن کو صحابہ کی ایک جماعت نے خود آنحضرت ﷺ سے روایت کی تھی اور صحابہ کے بعد وہ حدیثیں نہایت صحیح طور پر مروی ہوئیں، اس سے بڑھ کر یہ کہ صحیفہ ابن ہمام کو یہ دونوں بزرگ بالاتفاق صحیح تسلیم کرتے ہیں لیکن روایتوں میں خاص خاص حدیثیں منتخب کر لیتے ہیں، حالانکہ صحت اور قطعیت میں وہ تمام مساوی ہیں، اس لحاظ سے بخاری اور مسلم کو احادیث صحیحہ کا کامل مجموعہ نہیں کہا جاسکتا، اس کے علاوہ مسلم نے ضعفا اور طبقہ ثانیہ کے رواۃ سے بھی روایتیں کی ہیں، حالانکہ صحیح مسلم میں طبقۂ اولیٰ کی روایتوں کا التزام کیا گیا ہے۔(۲)

امام ابوالحسن دارقطنی نے خاص اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے جس کا

(۱) اس سلسلہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم کی فتح الملہم بھی قابل ذکر ہے (۲) مقدمہ نووی ص ۲۴۔

نام الاستدراکات والتتبع ہے، اس میں انھوں نے استقرا کر کے صحیحین کی ان روایتوں کی تعداد دو سو بتائی ہے (۱) لیکن یہ اعتراضات درحقیقت محض عامیانہ اعتراضات ہیں کیوں کہ بخاری اور مسلم کو اگر احادیث صحیحہ کا مجموعہ تسلیم کیا گیا ہے تو صرف اس بنا پر تسلیم کیا گیا ہے کہ ان میں جو حدیثیں درج ہیں وہ تمام صحیح اور منقح ہیں، اس لیے اگر بہت سی صحیح حدیثیں، ان کتابوں میں نہ درج ہو سکیں تو ان پر کوئی الزام نہیں آ سکتا کیوں کہ ان میں تمام صحیح حدیثوں کا حصر مقصود نہیں، اسی طرح مسلم پر ضعف رواۃ اور عدم صحت کا الزام بھی نہیں دیا جا سکتا، کیوں کہ انھوں نے اس قسم کی روایتوں کو متابعات اور شواہد کے سلسلہ میں قوت اسناد کے لیے درج کر دیا ہے، اس لیے اس ذریعہ سے اصل حدیث پر کوئی حرف نہیں آ سکتا اور اس کے ساتھ اکثر راویوں کا ضعف امام صاحب کی روایت کے بعد ظاہر ہوا ہے، چنانچہ احمد بن عبدالرحمٰن بن وہب اسی قسم کے راوی ہیں، اس لیے اس ضعف کا اثر خود امام صاحب کی روایت پر نہیں پڑ سکتا۔

ان اعتراضات سے قطع نظر کر کے جوبات خاص لحاظ کے قابل ہے، وہ یہ ہے کہ معنعن روایتوں کے متعلق اگرچہ امام صاحب کا مذہب صحیح نہیں، تاہم اس کا اثر خود ان کی کتاب پر کچھ نہیں پڑ سکتا، کیوں کہ طرق روایت کی کثرت سے صحیح مسلم میں کوئی ایسی حدیث نہیں مل سکتی جس میں اس غلط اصول پر عمل کیا گیا ہو، چنانچہ نووی شرح مسلم میں لکھتے ہیں:

وان کنا لانحکم علی مسلم بعمله فی صحیحه بهذا المذهب لکونه یجمع طرقاً کثیرة یتعذر معها وجودهذا الحکم الذی جوزه.(۲)

بہرحال ان معمولی اعتراضات کی بنا پر مسلم کی صحت، تنقید اور احتیاط کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

---

(۱) مقدمہ نووی ص ۲۷ (۲) مقدمہ نووی ص ۱۴۔

امام ابن ماجہؒ

(متوفی ۲۷۳ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، ابن ماجہ لقب اور سلسلۂ نسب یہ ہے؛ محمد بن یزید بن عبداللہ۔(۱)

ماجہ کو بعض لوگوں نے آپ کے دادا اور بعض نے آپ کی ماں کا نام بتایا ہے لیکن علمائے محققین کے نزدیک آپ کے والد کا لقب تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''ماجہ لقب پدر ابوعبداللہ است نہ لقب جداو نہ نام مادر او۔''

قزوین کے مشہور مورخ خلیلی کا بیان ہے کہ ''ماجہ یزید کا عرف تھا'' اور محدث رافعی لکھتے ہیں ''ان کا نام محمد بن یزید ہے اور ماجہ یزید کا لقب ....اور ان کا شجرۂ نسب اس طرح بھی بیان کیا جاتا ہے ''محمد بن یزید بن ماجہ'' مگر پہلی بات زیادہ ثابت ہے۔''(۲)

ولادت: ان کا خود بیان ہے کہ میں ۲۰۹ھ میں پیدا ہوا۔(۳)

خاندان ووطن: ماجہ سے جو دراصل ماہ یا ماہچہ کا معرب ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ امام ابن ماجہ عجمی نژاد تھے لیکن عرب کے مشہور قبیلہ ربیعہ سے ان کا رشتۂ موالات تھا، اس لیے ربعی اور مولیٰ ربیعہ کہلاتے ہیں، عراق، عجم وایران کے مشہور اور مردم خیز شہر قزوین کو آپ کے وطن

(۱) بستان المحدثین ص۱۱۲ (۲) عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ ص۲۳ والبدایہ والنہایہ ج۱۱ ص۵۲ وتہذیب ج۹ ص۵۳۲ (۳) وفیات الاعیان ابن خلکان ج۲ ص۲۸۴ وشروط الائمۃ الستہ ص۹۔

ہونے کا فخر حاصل ہے، اس نسبت سے آپ قزوینی کہے جاتے ہیں۔(۱)

اساتذہ اور شیوخ: ان کے شیوخ کی تعداد بکثرت ہے، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سو سے زیادہ شیوخ سے استفادہ کیا تھا، امام مالک اور لیث کے تلامذہ سے بھی آپ کو روایت کرنے کا شرف حاصل ہے، حافظ ابوالقاسم علی بن حسن متوفی ۵۷۱ھ نے ائمہ صحاح کے شیوخ پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا تھا، اس میں ابن ماجہ کے اساتذہ کا بھی ذکر ہے، چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں۔

ابراہیم بن منذر حزامی م ۲۳۶ھ، ابوبکر بن ابی شیبہ م ۲۳۵ھ، جبارہ بن مغلس م ۲۴۱ھ، حمدون بن عمارہ بغدادی، داؤد بن رشید م ۲۳۹ھ، سہل بن اسحاق بن ابراہیم واسطی، عبداللہ بن محمد معروف بحافظ ابوبکر بن ابی الدنیا بغدادی، عبداللہ بن معاویہ م ۲۴۳ھ، علی بن حسن جرثمی، علی بن سعید نسائی، محمد بن احمد جوزجانی، محمد بن رمح م ۲۴۲ھ، محمد بن سعید بغدادی، محمد بن عبداللہ بن نمیر م ۲۳۴ھ، ابوجعفر محمد بن ہارون بغدادی اور ہشام بن عماد م ۲۴۵ھ۔(۲)

تلامذہ: ابن ماجہ کے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن دینار جرشی، احمد بن ابراہیم قزوینی، ابوالطیب احمد بن روح شعرانی، احمد بن محمد مدنی، اسحاق بن محمد قزوینی، جعفر بن ادریس، ابوبکر حامد ابہری، حسین بن علی، سعدون، سلیمان بن یزید قزوینی، ابوالحسن علی بن ابراہیم قطان قزوینی، علی بن سعید غدالی، محمد بن عیسیٰ صفار۔(۳)

رحلت وسفر: امام ابن ماجہ کے زمانہ میں محدثین اطراف عالم میں پھیلے ہوئے تھے، اس لیے انھوں نے حصول حدیث کے لئے مختلف ملکوں کا سفر کیا، خراسان، عراق، حجاز، مصر، شام،

(۱) وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۸۴ والمنتظم ابن جوزی ج ۵ ص ۹۰ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ (۳) ایضاً۔

بصرہ، کوفہ، مکہ، رے اور بغداد وغیرہ کی تصریح کتابوں میں موجود ہے، شروع میں اکیس، بائیس سال کی عمر تک اپنے وطن قزوین ہی میں جو خود علم وفن کا گہوارہ اور علما و محدثین کا بڑا مرکز تھا، حدیث اور دوسرے علوم کی تکمیل فرماتے رہے، ۲۳۰ھ میں علم کی تلاش وجستجو میں اپنے وطن سے باہر نکلے۔(۱)

حدیث میں امتیاز: انھوں نے جب آنکھیں کھولیں تو اس وقت ہر طرف حدیث کے درس وتدریس اور اس کی کتابت وتحریر کا کام سرگرمی سے جاری تھا اور اسی کی طلب تکمیل کو فضیلت وکمال کا اصلی معیار خیال کیا جاتا تھا، اس لئے ان کی دلچسپی اور توجہ کا مرکز بھی یہی فن بنا اور اکابر حفاظ ومحدثین کی کثرت کے باوجود انھوں نے اس میں اتنا امتیاز وکمال اور ایسی شہرت حاصل کی کہ ان کی علمی جلالت کا سکہ بیٹھ گیا اور بڑے بڑے ائمہ فن ان کی عظمت وبرتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے، اس کا اندازہ درج ذیل اقوال سے ہوتا ہے۔

اعتراف کمال: حافظ ابو یعلی خلیل فرماتے ہیں، وہ ایک بلند پایہ معتبر اور لائق حجت محدث تھے، ان کی عظمت وثقاہت پر اتفاق ہے، ان کو فن حدیث سے پوری واقفیت تھی اور وہ اس کے جلیل القدر حافظ تھے، ابو القاسم رافعی فرماتے ہیں، کہ ''ائمہ مسلمین میں ابن ماجہ بھی ایک بڑے معتبر امام ہیں، ان کی قبولیت پر سب کا اتفاق ہے'' علامہ ابن جوزی تحریر فرماتے ہیں ''وہ حدیث وتاریخ اور تفسیر کے ممتاز ماہر تھے'' علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں ''وہ فن حدیث کے امام اور اس کے متعلقات پر بڑا عبور رکھتے تھے'' علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ''ابن ماجہ عظیم الشان حافظ وضابط صادق القول اور وسیع العلم تھے'' علامہ ابن اثیر قمطراز ہیں کہ وہ ذی عقل، صاحب علم اور امام حدیث تھے، جمال الدین تغری بردی لکھتے ہیں ''ابن ماجہ امام، حافظ، حجت اور ناقد حدیث تھے...... ان کو متعدد فنون میں مہارت حاصل تھی'' ابن ناصر الدین،

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ وخلاصہ تذہیب تہذیب الکمال ص ۳۴۔

ارشاد فرماتے ہیں ''مشہور علمائے اسلام میں ایک ابن ماجہ بھی ہیں.......... وہ حدیثوں کے حافظ اور اس میں نہایت معتبر اور بلند پایہ شخص تھے'' حافظ ابن حجر عسقلانی کا بیان ہے کہ ''وہ صاحب سنن، حافظ حدیث اور امام فن تھے'' (۱)

ان اقوال سے ان کے محدثانہ کمال وعظمت کا پورا اندازہ ہو جاتا ہے۔

فقہی مسلک: ان کے فقہی مسلک کے بارے میں یقینی طور سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی، گمان غالب یہ ہے کہ وہ بھی عام محدثین کی طرح کسی خاص مذہب فقہ سے وابستہ نہ رہے ہوں گے، البتہ اہل عراق کے مقابلہ میں ان کا رجحان اہل حجاز کی طرف زیادہ تھا، اس کا اندازہ ان کی سنن سے بھی ہوتا ہے، اسی بنا پر بعض علما ان کو حنبلی اور شافعی کہہ دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے، علامہ ابن طاہر جزائری فرماتے ہیں ''ابن ماجہ وغیرہ علمائے حدیث ائمہ مجتہدین میں سے کسی کے مقلد نہیں تھے، البتہ فقہا محدثین امام شافعی، احمد اور اسحاق بن راہویہ وغیرہ کے قول کی طرف میلان رکھتے تھے''۔ (۲)

اعمال واخلاق: امام ابن ماجہ کے حالات زندگی پردۂ خفا میں ہیں، اس لئے ان کے اعمال واخلاق کے بارہ میں کوئی تفصیل نہیں بیان کی جاسکتی، حافظ ابن کثیر نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ ''وہ علم وفضل کی طرح تدین وتقویٰ اور زہد وصلاح کے بھی جامع تھے، احکام شریعت کی شدت سے پابندی کرتے تھے، اور اصول وفروع میں پورے طور پر متبع سنت تھے، اس پر خود ان کی سنن شاہد ہے''۔ (۳)

متعلقین اور اہل خاندان: ان کے خاندانی حالات اور ازواج واولاد کی بھی تفصیل نہیں ملتی، صرف ان کے ایک صاحبزادے عبداللہ اور دو بھائیوں ابوبکر، اور ابوعبداللہ کا محمد بن

---

(۱) وفیات الاعیان خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱، المنتظم فی اخبار الملوک والامم ج ۵ ص ۹۰ کامل ابن اثیر مطبوعہ لیڈن ج ۷ ص ۲۹۸ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶۴ وغیرہ (۲) توجیہ النظر ص ۱۸۵ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲۔

طاہر نے ان کی وفات اور تجہیز و تکفین کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے۔(۱)

وفات: امام ابن ماجہ نے دوشنبہ ۲۲ رمضان المبارک ۲۷۳ھ کو ۶۴ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا دوسرے دن سہ شنبہ کو تجہیز و تکفین ہوئی،(۲) ایک روایت یہ بھی ہے کہ ۲۷۵ھ میں وفات پائی، ان کے سانحہ وفات پر بعض شعرا نے نہایت پردرد مرثیے کہے، محمد بن اسود قزوینی کے مرثیہ کا پہلا شعر یہ ہے:

لقد اوهى دعائم عرش علم ۔۔۔ وضعضع ركنه فقد ابن ماجه

ترجمہ: ابن ماجہ کی وفات سے علم کے پایہ تخت کے ستون ڈھے گئے۔

یحییٰ بن زکریا طرائفی کہتا ہے:

ايا قبر ابن ماجة غثت قطرا ۔۔۔ ملثا بالغداة وبالعشى (۳)

ترجمہ: اے ابن ماجہ کی قبر تو صبح و شام باران رحمت سے سیراب ہو۔

تصنیفات: ابن ماجہ کی علمی و تصنیفی یادگاروں میں تین اہم اور مشہور تصنیفات ہیں۔

تفسیر: اس کی اہمیت کا اندازہ علامہ ابن کثیر کے اس بیان سے ہوتا ہے:

ولابن ماجة تفسير حافل. ۔۔۔ یعنی ابن ماجہ کی ایک ضخیم و جامع تفسیر ہے۔

علامہ سیوطی نے دور صحابہ و تابعین کے بعد کی تفسیروں کا تذکرہ کرنے کے بعد تفسیر ابن جریر کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ایک اہم ماثوری و منقولی تفسیر اور ابن جریر کی طرح اس میں بھی احادیث و آثار صحابہ و تابعین کو بالاسناد نقل کیا گیا تھا۔

تاریخ: ان کو تاریخ میں بھی درک تھا اور تاریخ میں بھی کوئی کتاب لکھی تھی، ابن خلکان نے تاریخ ملیح اور حافظ ابن کثیرؒ نے تاریخ کامل کے وصف سے اس کا ذکر کیا ہے، حافظ ابوزرعہ

(۱) شروط الائمہ الستہ ص ۹ (۲) ایضاً (۳) تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱۔

فرماتے ہیں کہ ”میری نظر سے قزوین میں ابن ماجہ کی تاریخ گذری تھی، یہ دراصل عہد صحابہ سے لے کر مصنف کے زمانہ تک کی تاریخ اور بلاد اسلامیہ اور راویان حدیث کے حالات پر مشتمل ہے“(۱) اس سے اس تاریخ کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، مگر افسوس ہے کہ یہ دستبرد زمانہ سے معدوم ہوگئی۔

سنن: ابن ماجہ کا سب سے بڑا علمی و تصنیفی اور دینی کارنامہ ان کی ممتاز اور شہرۂ آفاق تصنیف سنن ہے، اس کی بدولت ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، موجودہ کتب حدیث میں یہ ایک اہم اور متداول کتاب خیال کی جاتی ہے اور اکثر مدارس کے نصاب میں بھی شامل ہے۔

ترتیب و تعداد احادیث: عام کتب سنن کی طرح اس میں بھی ایمانیات سے وصایا تک کے جملہ ابواب فقہی ترتیب کے مطابق درج ہیں اور یہ ۳۲ کتب، ۱۵۰۰ ابواب اور چار ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے۔(۲)

رواۃ: رافعی کا بیان ہے کہ ابن ماجہ سے ان کے جن تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے ان میں چار اشخاص زیادہ مشہور ہیں:

۱-ابوالحسن قطان، ۲-سلیمان بن یزید، ۳-ابوجعفر محمد بن عیسیٰ، ۴-ابوبکر حامد ابہری۔ حافظ ابن حجر نے اس فہرست میں دو ناموں کا اور اضافہ کیا ہے سعدون، ابراہیم بن دینار (۳) ان تمام رواۃ میں حافظ ابوالحسن قطان کی روایت کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

”ابوالحسن قطان کہ صاحب روایت سنن اوست از جملہ شاگردان رشید اوست۔“(۴)

سنن کا جو نسخہ ابوالحسن سے مروی ہے اس کی بہت سی روایتیں خود ان کی سند سے

---

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ وشروط الائمہ الستہ ص ۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۰ وبستان المحدثین ص ۱۱۲ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲ (۳) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۲ (۴) بستان المحدثین ص ۱۱۲۔

بھی منقول ہیں۔

اہمیت: سنن ابن ماجہ، حدیث کی ان چھ مشہور اور معتبر کتابوں میں شمار کی جاتی ہے جو صحاح ستہ کہلاتی ہیں، علمائے فن کو اعتراف ہے کہ ''یہ اسلامیات کی عظیم ترین اور حدیث کی امہات کتب میں ہے'' حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ ''سنن سے ابن ماجہ کے علمی تبحر اور کثرت معلومات کا پتہ چلتا ہے'' حافظ ابوزرعہ جیسے باکمال محدث کا ارشاد ہے کہ ''اگر یہ لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچی تو حدیث کی سب یا اکثر کتابیں بالکل معطل ہو جائیں گی'' حافظ ابن حجر کا بیان ہے کہ ''یہ نہایت جامع وجید کتاب اور بے شمار ابواب وغرائب پر مشتمل ہے'' سنن ابن ماجہ کی اس عظمت واہمیت کی بنا پر اس کو ہر زمانہ میں نہایت مستند اور قابل حجت خیال کیا گیا ہے، رافعی فرماتے ہیں ''محدثین نے اس کو صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے اور اس کے مرویات کو حجت و مستند قرار دیا ہے۔''(۱)

خصوصیات: سنن ابن ماجہ کو صحاح میں آخری درجہ پر رکھا گیا ہے تاہم اس میں بھی بعض اہم خصوصیات پائے جاتے ہیں۔

۱- اس میں بہت سی ایسی حدیثیں ہیں جن سے صحاح ستہ کی دوسری کتابیں خالی ہیں، علمائے فن نے اس کی اسی خصوصیت کی بنا پر اس کو صحاح میں شامل کیا ہے۔(۲)

۲- حسن ترتیب وتبویب کے لحاظ سے تمام کتب حدیث اور صحاح میں اس کو امتیاز حاصل ہے، یعنی جس خوبی کے ساتھ احادیث کو ابواب کے اندر بلاتکرار، اختصار کے ساتھ اس میں نقل کیا گیا ہے، دوسری کتابیں اس سے خالی ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

> ''فی الواقع از حسن ترتیب وسرد احادیث بے تکرار آنچہ کہ ایں کتاب دارد ہیچ از کتب ندارد۔''(۳)

---

(۱) شذرات ج ۲ ص ۱۶۴ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۲ وتذکرہ ج ۲ ص ۲۱۰ وتہذیب ج ۲ ص ۵۳۱ (۳) بستان ص ۱۱۲۔

اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''اس مفید ترین کتاب کی تبویب فقہی اعتبار سے نہایت عمدہ ہے۔''

۳- عدم تکرار اور اختصار کے باوجود سنن کی ابن ماجہ نہایت جامع کتاب ہے اور دوسری کتابوں کی بہ نسبت زیادہ مسائل و معلومات پر مشتمل ہے، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں، ابن ماجہ کی کتاب سنن، واحکام کی حیثیت سے بہت عمدہ اور جامع ہے، غالباً اسی خوبی کی بنا پر حافظ ابوزرعہ نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اس کے سامنے حدیث کے دوسرے جوامع اور مصنفات بے کار ہو جائیں گے، ان کا یہ خیال بڑی حد تک صحیح ثابت ہوا، چنانچہ حدیث کی بہت سی کتابیں جو صحت وجودت کے لحاظ سے اس سے زیادہ اہم اور بلند پایہ ہیں لیکن ان کو اس کے جیسی شہرت و مقبولیت نہیں حاصل ہو سکی، حضرت شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں کہ ''اگر کسی شخص کو بہت زیادہ متون پر مشتمل کتاب کی تلاش ہو تو اس کو سنن ابن ماجہ کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس وصف میں وہ دوسری کتب حدیث سے منفرد و ممتاز ہے'' (۱)

۴- سنن ابن ماجہ میں ۵ ثلاثی روایتیں ہیں، اس خصوصیت میں اس کو صحیح بخاری کے سوا تمام کتب صحاح پر فوقیت حاصل ہے۔

۵- کتب حدیث کی عام خصوصیت یعنی متعدد اور گوناگوں تشریحات اور حدیثوں کے متعلق مختلف قسم کی وضاحتیں اس میں بھی موجود ہیں بعض حدیثوں کے بارے میں اس قسم کی تصریح بھی ہے کہ ''یہ فلاں شہر والوں کی حدیث ہے۔''

کیا سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل نہیں ہے؟: اگر چہ جمہور اور متاخرین علما کے نزدیک یہ صحاح ستہ میں شامل ہے تاہم بعض لوگوں نے اس کے بجائے مؤطا امام مالک اور سنن دارمی کو یہ درجہ دیا ہے، اس لیے اس مسئلہ کی مختصر وضاحت کی جاتی ہے:

شروع میں صرف صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کو حدیث کی اہم ترین

(۱) حواشی سعدی ص ۱۵۔

کتابیں خیال کیا جاتا تھا، حافظ ابن السکن اور حافظ ابن مندہ وغیرہ سے اس کی تصریح منقول ہے،(۱) اس کے بعد حافظ ابو طاہر سلفی نے جامع ترمذی کو بھی ان کتابوں میں شامل کرلیا، ساتویں صدی ہجری کے نامور محدثین میں علامہ ابن صلاح اور علامہ نووی نے بھی ان ہی پانچوں مصنفین کی وفیات ذکر کی ہیں لیکن غالباً پہلی مرتبہ محمد بن طاہر مقدسی م ۵۰۷ھ نے جو شروط الائمۃ الستۃ اور اطراف الکتب الستۃ کے مصنف ہیں، امام ابن ماجہ کو بھی مصنفین صحاح کے زمرہ میں شامل کرلیا اور حافظ عبدالغنی مقدسی م ۶۰۰ھ نے پانچوں کتابوں کی طرح اس کے رجال کو بھی مدون کیا، ان کے بعد جمہور متاخرین کے نزدیک یہ روایت چل نکلی، علامہ سیوطی فرماتے ہیں کہ ''ابن طاہر کے بعد مصنفینِ اطراف و رجال نے ان کی متابعت کی'' (۲) اسی بنا پر ساتویں صدی ہجری کے نامور محدث نووی کے متعلق جنھوں نے ابن ماجہ کی سنن کو نظر انداز کردیا تھا حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں (۳) ''مصنف نے سنن ابن ماجہ کو صحاح میں داخل نہیں کیا حالاں کہ خود ان کے عہد میں اور اس کے بعد کا چھ اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار ہونا شہرت پذیر ہو چکا تھا'' اس سلسلہ میں دوسرے علما اور ائمہ فن کے اقوال یہ ہیں:

علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''صحاح ستہ کی ایک کتاب سنن ابن ماجہ بھی ہے'' ابن عماد نے بھی اس قول کو نقل کیا ہے، علامہ ابن ناصر الدین فرماتے ہیں ''ابن ماجہ کی سنن اسلامیات کی بنیادی کتابوں میں ہے'' علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں ''ابن ماجہ اُس سنن کے مصنف ہیں جو صحاح ستہ میں شامل ہے۔'' ابو القاسم رافعی فرماتے ہیں ''محدثین نے سنن ابن ماجہ کو صحیحین اور سنن ابی داؤد و سنن نسائی کے ساتھ شامل کیا ہے'' صاحب مرآۃ الجنان لکھتے ہیں '' کہ ان کی کتاب ان چھ کتابوں میں سے ایک ہے جس کو بنیادی کتب اور امہات فن میں شمار کیا جاتا ہے'' حافظ عبدالقادر قرشی کا بیان ہے کہ ''جب محدثین کسی روایت کے

(۱) شروط الائمۃ الستۃ ص ۸ (۲) تدریب الراوی ص ۳۰ (۳) ایضاً۔

متعلق رواۃ الائمۃ الستہ کہتے ہیں تو اس سے امام بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ کو مراد لیتے ہیں'' حافظ سخاوی لکھتے ہیں ''علما نے سنن ابن ماجہ کو موطا پر اس لیے مقدم اور صحاح میں شامل کیا ہے کہ اس میں کتب خمسہ سے بہت سی روایتیں زیادہ ہیں'' شارح سندی ارشاد فرماتے ہیں ''عام متاخرین اس بات کے حق میں ہیں کہ ان کی سنن صحاح کی چھٹی کتاب ہے'' شاہ عبدالعزیز صاحب رقمطراز ہیں کہ ''ابن ماجہ جن مفید اور نفع بخش کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں یہ سنن بھی ہے جو صحاح ستہ میں ہے'' نواب صدیق حسن خاں صاحب لکھتے ہیں ''شاہ عبدالحق صاحب دہلوی کا بیان ہے کہ ''ابن ماجہ کی سنن کا شمار ان اہم ترین اسلامی وحدیثی کتابوں میں ہوتا ہے جن کو اصول ستہ، کتب ستہ اور صحاح ستہ کہا جاتا ہے، میں اس میں امہات ستہ کا اضافہ کرتا ہوں اور جب محدثین رواہ الجماعۃ کہتے ہیں تو اس سے یہی چھ اشخاص مراد ہوتے ہیں اور جب رواہ الاربعہ کہتے ہیں تو ان کی مراد شیخین کے بجائے، امام ابوداود، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ سے ہوتی ہے۔(۱) دوسرے علماءِ تراجم وفہرست نے بھی اس کو صحاح ستہ میں شامل کیا ہے۔(۲)

لیکن علما کی ایک جماعت کو موطا کو صحاح کی چھٹی کتاب ماننے پر اصرار ہے، رزین بن معاویہ عبدری م ۵۲۵ھ نے کتاب التجرید للصحاح والسنن میں کتب خمسہ اور موطا امام مالک کی روایتیں درج کی ہیں، ابن اثیر جزری م ۶۰۶ھ نے بھی اپنی کتاب جامع الاصول میں اسی کی تقلید کی ہے، حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی کہتے ہیں ''ان سب میں بہتر وہ کتابیں ہیں جن کے اعتماد پر مسلمانوں کا اتفاق ہے اور یہی کتب خمسہ اور موطا ہے جو تصنیف میں ان پر مقدم اور مرتبہ میں کمتر نہیں، عبدالغنی نابغی کا بیان ہے کہ اہل

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶۴ والباعث الحثیث ص ۹۰ ومرآۃ الجنان ج ۲ ص ۱۸۸ ومقدمہ شرح سندی باب ذکر الدیلم وفضل قزوین فتح المغیث ص ۳۳ وبستان المحدثین ص ۱۱۲ والحطہ فی ذکر الصحاح الستہ ص ۱۱۰۔ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴ واعلام ج ۳ ص ۱۰۰۲۔

مشرق کے نزدیک چھٹی کتاب سنن ابن ماجہ اور اہل مغرب کے نزدیک امام مالک کی موطا ہے۔(۱)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابن ماجہ کے مقابلہ میں موطا کے ماننے والوں کی تعداد بہت کم ہے، اس لیے یہ قول مرجوح سمجھا جائے گا لیکن جہاں تک موطا کی صحت وجودت اور اہمیت وعظمت کا سوال ہے، اس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں، وہ حدیث کی طرح فقہ، آثار اور فتاوائے صحابہ وتابعین سب کا مجموعہ ہے اور مرفوع، موقوف، مرسل ومسند ہر قسم کی روایتوں پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی موجودہ شکل وصورت میں اس کا حدیث کی مروج ومتداول کتابوں سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس کا جو مقام ومرتبہ ہے اس میں حدیث کی کوئی کتاب بھی اس کی ہمسری نہیں کرسکتی، اس کی قدامت، عظمت اور صحت کی وجہ سے اکثر محققین علمانے صحیحین پر بھی اس کو فوقیت دی ہے، خطیب کے نزدیک وہ تمام جوامع ومسانید سے بڑھ کر ہے،(۲) شاہ ولی اللہ صاحب کا بھی یہی خیال ہے، نواب صدیق حسن خاں صاحب فرماتے ہیں "شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی اور ان لوگوں کے نزدیک جو ان کے ہمنوا ہیں، حدیث وفقہ میں صحیح ترین کتاب موطا ہے، پھر بخاری پھر مسلم، شاہ صاحب نے شرحِ موطا یعنی مصفّٰی کے شروع میں روئے زمین کی تمام کتابوں پر موطا کی ترجیح کے سلسلہ میں بڑی لمبی بحث کی ہے اور یہی صحیح ہے۔"(۳)

سنن ابن ماجہ کو موطا پر مقدم کرنے کی وجہ اس کی مزید افادیت ہے جو بہت سی زائد حدیثوں کے درج کرنے سے اس میں پیدا ہوگئی ہے، ورنہ صحت وقوت کے اعتبار سے سنن ابن ماجہ کیا صحاح ستہ کی کوئی کتاب بھی موطا کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جاسکتی۔

رہا سنن دارمی کا معاملہ تو اس کے قائل صرف حافظ صلاح الدین خلیل علائی

---

(۱) بحوالہ ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۲۴ (۲) تدریب الراوی ص ۳۶ (۳) مسک الختام شرح بلوغ المرام ص ۱۸۔

م ۷۶۱ھ ہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ ''اس میں ضعیف رواۃ اور شاذ و منکر روایتیں بہت کم ہیں، اس لیے سنن ابن ماجہ کے بجائے اس کو صحاح کی چھٹی کتاب قرار دینا بہتر ہے۔''(۱) حافظ ابن حجر کی جانب بھی اس قسم کا قول منسوب کیا جاتا ہے، مگر ان سے اس کے برعکس باتیں بھی منقول ہیں، محمد بن اسماعیل امیر یمانی کا بیان ہے کہ وہ مؤطا امام مالک کو صحاح ستہ میں شامل کرتے تھے، اس کے علاوہ شارح سنن علاؤ الدین مغلطائی پر جن کے قول پر علامہ خلیل علائی کی رائے کی بنیاد ہے، ابن حجر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''دارمی کو مغلطائی سے پہلے کسی نے صحاح میں شامل نہیں کیا اور وہ بھی اس بنیاد پر کہ انھوں نے حافظ منذری کے قلم سے یہی لکھا دیکھا تھا۔''(۲) حافظ ابن حجر کے ان مختلف اقوال کی بنا پر ان کو علائی کا مؤید نہیں کہا جا سکتا لیکن علائی کے قول کا دارومدار مغلطائی کے ایک خیال پر مبنی ہے، جس کے متعلق محمد امیر یمانی لکھتے ہیں کہ علائی کو مغلطائی کے قول سے مغالطہ ہوا ہے حالاں کہ مغلطائی کے قول میں اس کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ وہ سنن دارمی کو صحاح ستہ میں داخل کرتے تھے، بلکہ اصلی احتمال یہ ہے کہ انھوں نے اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے کہ اس کے رجال و روایات اکثر و بیشتر صحیح ہیں، سنن ابن ماجہ پر اس کو مقدم اور اہم قرار دیا ہے۔''(۳)

بہر حال سنن دارمی کو خواہ صحت و قوت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی سنن پر فوقیت کیوں نہ حاصل ہو لیکن تنہا اس خصوصیت کی بنا پر اس کو ابن ماجہ کی جگہ صحاح ستہ میں نہیں رکھا جا سکتا اور نہ علائی کے ایک منفرد خیال کی وجہ سے جمہور کی رائے کو مسترد کیا جا سکتا ہے۔

صحاح ستہ میں سنن ابن ماجہ کا درجہ: ان بیانات سے اتنا تو واضح ہو گیا کہ ابن ماجہ کی سنن صحاح ستہ میں شامل ہے لیکن اس کا مرتبہ پانچوں سے کمتر ہے، شارح سندی کہتے ہیں ''وہ کتب خمسہ سے کمتر ہے'' ابن وزیر یمانی کا بیان ہے کہ اس کا درجہ سنن نسائی و سنن ابی داؤد کے بعد ہے لیکن یہ ترجیح مجموعی حیثیت سے ہے، یعنی اس میں دوسری کتابوں کے مقابلہ میں

(۱) مقدمہ سنن دارمی ص ۷ (۲) تدریب الراوی ص ۵۷، (۳) ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۶ و ۳۷۔

ضعیف روایتیں زیادہ ہیں مگر کتب خمسہ کی ہر روایت صحت کے لحاظ سے ابن ماجہ کی ہر روایت پر فوقیت نہیں رکھتی، بعض علما کا بیان ہے کہ ابن ماجہ کی بعض روایتیں صحیح بخاری کی بعض حدیثوں سے بھی اصح ہیں۔(۱)

سنن ابن ماجہ کی ضعیف ومنکر روایتیں: امام ابن ماجہ کی احتیاط اور کوشش کے باوجود سنن میں ضعیف روایتیں بھی شامل ہوگئی ہیں مگر علمائے فن کے ایک گروہ کے نزدیک ان کی تعداد بہت کم ہے، چنانچہ ابوزرعہ رازی کا بیان ہے کہ ''مجھے اس میں بہت کم ایسی حدیثیں ملیں جن میں کسی قسم کا شک یا خرابی ہو، دس سے کچھ زیادہ روایتیں ایسی ہوں گی، ان کی دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے تیس سے کم حدیثوں کو ضعیف الاسناد قرار دیا، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ سنن ابن ماجہ کی تھوڑی حدیثوں کے سوا سب بہتر اور عمدہ ہیں۔''(۲)

مگر حافظ ابن حجر کہتے ہیں ''اس میں ضعیف روایتیں بہت زیادہ ہیں۔'' علامہ ذہبی، حافظ ابوزرعہ کے مذکورہ بالا قول پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۳۰ سے ان کی مراد ساقط الاسناد حدیثیں ہوں گی، ورنہ جن حدیثوں سے حجت قائم نہیں ہوتی، ان کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے، شاید ایک ہزار کے قریب ہوں، اسی طرح علامہ سیوطی نے لکھا ہے، ابن طاہر نے ابوزرعہ سے جو روایت کی ہے وہ صحیح نہیں ہے، اس کی سند منقطع ہے، اگر اس کو محفوظ تسلیم کیا جائے تو غالباً اس سے ابوزرعہ کی مراد ساقط الاعتبار روایتیں ہوں گی، یا ان کی نظر سے اس وقت تک اس کتاب کا تھوڑا حصہ گذرا تھا، ورنہ ابوزرعہ نے سنن ابن ماجہ کی بہت ساری روایتوں کو منکر، باطل اور ساقط بتایا ہے۔''

ان اقوال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ابن ماجہ میں بھی دوسری کتابوں کی طرح ضعیف روایات ہیں اور ان کی تعداد کتب خمسہ کے مقابلہ میں یقیناً زیادہ ہے، اسی لیے اس کا

---

(۱) توضیح الافکار ج ۱ ص ۲۲۲ و ۲۲۳ بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۴۲ (۲) شروط الائمۃ الستۃ ص ۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۰۰ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۲۔

درجہ ان کے مقابلہ میں کمتر سمجھا جاتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس سے اس کی اہمیت اور عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا، کیوں کہ کسی کتاب کا صحاح ستہ میں ہونا اس کی تمام روایتوں کی صحت واستناد کا ثبوت نہیں ہے بلکہ مجموعی حیثیت کے اعتبار سے ان کو صحاح میں شامل کیا گیا ہے، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں "ان چاروں کتابوں (ترمذی، ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ) میں حدیث کی جملہ اقسام، یعنی صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی روایتیں پائی جاتی ہیں اور ان کو صحاح کا نام علی وجہ التغلیب دیا جاتا ہے۔"(۱)

۲- محدثین اور علماء رجال نے اس بات کی بھی تصریح کی ہے کہ سنن کے اندر منکر، واہی اور موضوع روایتیں بھی ہیں، صرف حافظ ابن حجر کی رائے ہے کہ اس کی منکر حدیثوں کی تعداد زیادہ ہے، ورنہ سیوطی اور ذہبی کے گذشتہ بیانوں سے ظاہر ہے کہ ساقط الاعتبار روایتوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ذہبی نے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سنن ابن ماجہ بہترین کتاب ہے، کاش اس کو چند واہی حدیثیں جن کی تعداد زیادہ نہیں ہے خراب نہ کردیتیں، علامہ ابن جوزی نے ۳۴ حدیثوں کو موضوع قرار دیا ہے، مولانا عبدالرشید نعمانی نے ان سب کو اور آٹھ مزید روایات یعنی کل ۴۲ حدیثیں نقل کر کے ان پر فنی حیثیت سے بحث کی ہے۔(۲)

اس تفصیل سے اگرچہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنن میں منکر روایتیں بھی ہیں لیکن ان کی تعداد زیادہ نہیں ہے اور نہ اتنے بڑے ذخیرہ میں چند منکر و واہی روایات کا پایا جانا کوئی خاص عیب ہے۔

۳- اس سلسلہ کی آخری مگر اہم بحث یہ ہے کہ "ابن ماجہ کے تفردات ضعیف

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ وتوضیح الافکار ص ۲۲۳ بحوالہ امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۳۹ ومقدمہ زہر الربی علی المجتبیٰ ص ۸ وحواشی سعدی ص ۱۵ (۲) تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۰ ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۸، ۴۵۔

ہیں۔'' حافظ ابن حجر نے ابوالحجاج مزی۔ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ ''ابن ماجہ کی وہ سب روایتیں ضعیف ہیں جن میں وہ ائمہ خمسہ سے منفرد ہیں لیکن حافظ ابن حجر کو خود اس اصول وکلیہ سے اتفاق نہیں ہے وہ لکھتے ہیں کہ ''اگر چہ سنن ابن ماجہ میں ضعیف ومنکر روایتیں زیادہ ہیں لیکن میرے استقصا وتتبع کے مطابق ان کے تفردات کے بارے میں مطلقاً یہ حکم لگانا درست نہیں ہے ..... مزی کے قول کو رجال پر محمول کرنا زیادہ بہتر ہے، حدیثوں پر اس کا اطلاق صحیح نہیں ہے، کیوں کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ جن روایتوں میں ابن ماجہ منفرد ہیں ان میں صحیح وحسن ہر قسم کی حدیثیں ہیں'' (۱) شارح سندی کا بیان ہے کہ ''سنن ابن ماجہ میں صحاح خمسہ پر زوائد بہت ہیں اور مشہور یہ ہے کہ ان کے تفردات ضعیف ہوا کرتے ہیں حالانکہ یہ کلیہ صحیح نہیں ہے'' مولانا عبدالرشید نعمانی نے حافظ ابن حجر کے قول پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رجال کے متعلق بھی کلی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا اور اس کی چند مثالیں دے کر تردید کی ہے۔ (۲)

خلاصہ بحث یہ ہے کہ ضعیف اور بعض منکر روایتوں کے باوجود سنن ابن ماجہ صحاح ستہ میں شامل ہے اور جن حدیثوں میں انھوں نے ائمہ خمسہ سے تفرد کیا ہے ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں۔

شروح وتعلیقات: سنن ابن ماجہ کے ساتھ علمانے بڑا اعتنا کیا اور اس کے متعدد حواشی وشروح لکھے جن کی تعداد نسائی کے شروح وحواشی سے زیادہ ہے۔

۱- شرح سنن ابن ماجہ: سب سے پہلے علاؤالدین مغلطائی بن قلیج م ۷۶۲ھ نے سنن ابن ماجہ کی ایک جامع شرح لکھنا شروع کی تھی، مگر وہ اس کو مکمل نہ کر سکے، یہ نامکمل شرح پانچ جلدوں میں ہے، (۳) اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ ٹونک میں موجود ہے۔ (۴)

(۱) تہذیب ج ۹ ص ۵۳۱ (۲) ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۸ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۴ (۴) امام ابن ماجہ اور علم حدیث ص ۲۴۵۔

۲- ماتمس الیہ الحاجۃ علیٰ سنن ابن ماجہ: شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن م۸۰۴ھ نے سنن کی ان حدیثوں کی جو کتب خمسہ میں نہیں ہیں، ۸ جلدوں میں ایک مفصل شرح لکھی۔

۳- شرح سنن ابن ماجہ: ابن رجب زبیری کی یہ شرح نایاب ہے، شیخ ابوالحسن سندی نے اپنے حواشی میں اس کا ذکر کیا ہے۔

۴- الدیباجہ فی شرح سنن ابن ماجہ: شیخ کمال الدین محمد بن موسیٰ دمیری م۸۰۸ھ نے ۵ جلدوں میں شرح لکھی مگر تسوید و تبییض سے پہلے ہی انتقال کر گئے۔

۵- شرح سنن ابن ماجہ: ابن سبط عجمی یہ برہان الدین ابراہیم بن محمد حلبی م۸۴۱ھ کی سنن پر یہ ایک لطیف تعلیق ہے۔

۶- مصباح الزجاجہ: علامہ جلال الدین سیوطی م۹۱۱ھ کا مختصر حاشیہ جو نہایت مقبول و متداول اور سنن کے ساتھ طبع ہو چکا ہے، مصر سے اس کا اختصار بھی شائع ہوا ہے۔

۷- شرح سنن ابن ماجہ: ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی م۱۱۳۸ھ نے صحاح کی دوسری کتابوں کی طرح اس کا بھی حاشیہ لکھا جو سنن کے ساتھ چھپ کر بہت مقبول ہوا، اس میں مشکل اور غریب الفاظ اور اعراب کی وضاحت کا بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔(۱)

۹- شرح انجاح الحاجۃ: شیخ عبدالغنی بن ابوسعید مجددی دہلوی م۱۲۹۵ھ کی یہ مختصر مگر جامع شرح ہے اور سنن کے ساتھ حاشیہ پر دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

۱۰- حاشیہ بر سنن ابن ماجہ: مولانا فخرالحسن گنگوہی نے اس تعلیق کے اندر علامہ سیوطی اور مولانا مجددی دونوں شرحوں کو مفید اضافہ کے ساتھ جمع کیا ہے جو کئی مرتبہ چھپ چکی ہے۔

۱۱- مفتاح الحاجۃ: یہ شیخ محمد علوی کا حاشیہ ہے جو اصح المطابع لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔

۱۲- رفع العجاجۃ عن سنن ابن ماجہ: مشہور عالم اور مترجم حدیث مولانا وحیدالزماں

(۱) کشف الظنون ج۲ص۳۴ والضوء اللامع ج۱ص۱۴۱۔

وقار نواز جنگ نے سنن ابن ماجہ کا اردو ترجمہ اور اس کی مختصر شرح اردو میں لکھی ہے، جو متوسط تقطیع کی تین ضخیم جلدوں میں مطبع صدیقی لاہور سے ۱۳۱۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

شرحوں اور حواشی کے علاوہ سنن کے زوائد، رجال اور اس کی دوسری حیثیتوں پر بھی کام کئے گئے ہیں۔

۱۳- المجرد فی اسماء رجال ابن ماجہ: علامہ ذہبی نے اس میں ابن ماجہ کے اُن رواۃ کا تذکرہ کیا ہے، جن سے صحیحین میں کوئی روایت درج نہیں ہے، اس کا قلمی نسخہ دمشق کے کتب خانہ ظاہریہ میں بیس ورقوں میں موجود ہے۔

۱۴- زوائد ابن ماجہ: یہ حافظ شہاب الدین بوصیری م ۸۴۰ھ کی تالیف ہے، اس میں ہر روایت کے اسناد کی قوت وضعف کو بیان کیا گیا ہے، یہ کتاب اگرچہ ناپید ہے لیکن علامہ سندی نے اپنی شرح میں اس کی اہم اور ضروری باتیں نقل کر دی ہیں۔

۱۵- ماتمس الیہ الحاجہ لمن یطالع سنن ابن ماجہ: یہ دونوں مفید کتابیں مولانا عبدالرشید نعمانی .... ابن ماجہ اور علم حدیث .... نے عربی اور اردو میں لکھی ہیں، ان میں ابن ماجہ کے حالات وسوانح اور سنن پر مبسوط تبصرہ کے علاوہ، حدیث کی حجیت، تاریخ وتدوین اور ائمہ اربعہ اور مصنفین صحاح کے شرائط اور امام ابن ماجہ کے عہد تک کے بعض اکابر محدثین کا مختصر تذکرہ بھی ہے۔

☆☆☆

امام ابوداؤد سجستانی

(متوفی ۲۷۵ھ)

نام ونسب: سلیمان نام، ابوداؤد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: سلیمان بن اشعث بن اسحاق بن بشیر بن شداد بن عمرو بن عمران۔ (۱)

بعض مورخین سے نسب نامہ میں معمولی اختلاف بھی منقول ہے۔

امام کے جداعلیٰ عمران کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ جنگ صفین میں حضرت علیؓ کے ساتھ تھے اور اسی میں ان کی شہادت ہوئی۔ (۲)

ولادت وخاندان: امام ابوداؤد کا خود بیان ہے کہ وہ ۲۰۲ھ میں پیدا ہوئے تھے، (۳) اور مشہور قبیلہ ازد سے ان کا نسبی تعلق تھا، اس لیے ازدی کہلاتے ہیں۔

وطن: خراسان کے مشہور علاقہ سجستان (سیستان) کو امام صاحب کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن بعض لوگوں نے بصرہ کے ایک گاؤں سجستان یا سجستانہ کو آپ کا وطن بتایا ہے جو صحیح نہیں، محمد بن طاہر مقدسی لکھتے ہیں ''میں نے محمد بن نصر، قل ھو اللہ خاں سے سنا کہ امام ابوداؤد کا وطن بصرہ کا ایک گاؤں سجستان ہے جو خراسان کے سجستان سے الگ ہے، اسی طرح کی ایک اور روایت بھی ہے لیکن ابن نصر کا یہ بھی بیان ہے کہ انھوں نے جب بصرہ

(۱) تاریخ بغداد ج۹ ص۵۵ وکتاب الانساب تا ورق ۲۹۲ وتاریخ ابن خلکان ج۱ ص۲۸۱ (۲) کتاب الانساب ورق ۲۹۲ وتہذیب التہذیب ج۴ ص۱۶۹ (۳) تاریخ بغداد ج۹ ص۵۶۔

والوں سے اس کی تحقیق کی تو پتہ چلا کہ وہاں کے لوگ اس نام کے کسی گاؤں سے واقف نہیں، یہ روایات نا قابل اعتماد ہیں، دوسرے معتبر علما وحفاظ حدیث میں سے بھی کسی نے اس طرح کی تصریح نہیں کی ہے کہ ان کا وطن مشہور بجستان کے علاوہ کسی اور جگہ ہے۔(۱) علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ''بجستان کی جانب نسبت ہے جو کابل کے ایک مشہور شہر کا نام ہے۔''

(۲) شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں ''ابن خلکان کو انساب میں مہارت اور تاریخ دانی میں کمال کے باوجود اس نسبت کے متعلق غلط فہمی ہوگئی ہے اور بقول صاحب طبقات علامہ تاج الدین سبکی یہ وہم ہے، صحیح یہ ہے کہ یہ نسبت سیستان (بجستان) کی جانب ہے جو ایک مشہور ملک اور سندھ و ہرات کے درمیان قندھار کے قریب واقع ہے، چشت بھی جو بزرگان چشت کا مسکن ہے، اسی ملک کے اندر ہے اور قدیم زمانہ میں اس ملک کا پایہ تخت بست تھا۔(۳)

مگر علامہ ابن خلکان بھی جمہور کے قول کو راجح سمجھتے ہیں، ان کا بیان یہ ہے ''بجستانی..... کی نسبت مشہور شہر بجستان کی جانب ہے لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ بصرہ کے ایک گاؤں بجستان یا بجستانہ کی جانب منسوب ہے، واللہ اعلم۔

علامہ ذہبی نے بھی دونوں اقوال ذکر کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں ''ابوداؤد کا وطن بجستان ہے جو مکران اور سندھ کے اطراف وجوانب اور ہران کے مقابل میں واقع ہے لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا تعلق بصرہ کے ایک گاؤں بجستان سے تھا۔'' (۴)

اس غلط فہمی کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ امام صاحب نے آخر عمر میں بصرہ میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، اس لیے بعض لوگوں نے ان کا اصلی وطن بھی اس کے قرب وجوار ہی کے علاقہ کو سمجھ لیا۔

---

(۱) کتاب الانساب مقدسی ص ۱۰۹ (۲) کتاب الانساب سمعانی ورق ۲۹۲ (۳) بستان المحدثین ص ۱۰۷ والحطہ ص ۱۲۵ (۴) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۷۰۔

اساتذہ وشیوخ: حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کے اساتذہ کی تعداد تین سو کے قریب ہے، ان میں امام احمد بن حنبل، اسحاق بن راہویہ اور ابوثور جیسے بلند پایہ فقہائے محدثین اور یحییٰ بن معین، ہشام بن عبدالملک طیالسی، ابوبکر بن ابی شیبہ اور عثمان بن ابی شیبہ جیسے نامور ناقدینِ فن اور ائمہ محدثین شامل ہیں، چند اور مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

حیوۃ بن شریح، خلف بن ہشام بغدادی، ربیع بن نافع حلبی، زہیر بن حرب، سعید بن سلیمان بزار واسطی، سعید بن منصور، سلیمان بن حرب، سلیمان بن عبدالرحمٰن دمشقی، شجاع بن مخلد، صفوان بن صالح دمشقی، عبداللہ بن رجاء بصری، عبداللہ بن محمد نفیلی دمشقی، عمرو بن عون ہزار واسطی، ابورجاء قتیبہ بن سعید، محمد بن بشار بندار بصری، محمد بن صباح بزار دولابی، محمد بن منہال، مسدد بن مسرہد، ہشام بن خالد ازرق دمشقی، ہناد بن عمرو اور ابومحمد وہب بن بقیہ وغیرہ۔(۱)

تلامذہ: امام صاحب کے تلامذہ کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے، سنن کے رواۃ میں ابوعمرو احمد بن علی حسن بصری، ابوعلی محمد بن احمد بن عمرو لؤلؤی، ابوالطیب احمد بن ابراہیم اشنائی، ابوسعید احمد بن محمد بن زیاد اعرابی، ابوبکر محمد بن عبدالرزاق بن داسہ ابوالحسن علی بن حسن بن عبدانصاری، ابوعیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید رملی اور ابواسامہ محمد بن عبدالملک بن یزید رواس۔

دوسری کتابوں کے رواۃ میں: ابوعبداللہ محمد بن احمد بصری، ابوبکر احمد بن سلیمان بخارا، اسماعیل بن محمد صفار، ابوعبید محمد بن علی بن عثمان آجری اور دوسرے مشہور علما میں آپ کے صاحبزادے ابوبکر بن ابی داؤد، ابوعوانہ، یعقوب بن اسحاق الفرائینی، حرب بن اسماعیل کرمانی، زکریا ساجی، ابوبکر احمد بن محمد خلال اور احمد بن محمد بن یٰسین ہروی وغیرہ۔

صحاح ستہ کے مصنفین میں امام ترمذی اور امام نسائی کو بھی آپ سے تلمذ حاصل

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۲، ۱۶۹، ۱۷۰ و مقدمہ غایۃ المقصود ص ۶،۵۔

ہے اور امام احمد نے بھی جو ان کے اساتذہ میں تھے، ایک حدیث ان سے روایت کی ہے،(۱) امام ابوداؤد کے تلامذہ میں چار اشخاص زیادہ مشہور و ممتاز ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''و چہار کس از جملہ شاگردان او خیلے سرآمد محدثین شدند اول پسرش

ابوبکر بن ابی داؤد، دوم لولوی، سوم ابن الاعرابی، چہارم ابن داستہ۔(۲)

سماع حدیث کے لیے سفر: ابوداؤد نے اپنے زمانہ کے دستور کے مطابق حصولِ حدیث کے لیے مختلف مقامات کا سفر کیا، وہ سجستان میں پیدا ہوئے لیکن بصرہ کو مسکن بنایا جو اس زمانہ میں علم وفن اور محدثین وفقہا کا بہت بڑا مرکز تھا، کئی بار بغداد تشریف لے گئے، حجاز، عراق، خراسان، مصر، شام، جزیرہ نیشاپور، مرو اور اصبہان وغیرہ کے محدثین کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر ان سے استفادہ کیا۔(۳)

حفظ وضبط: ان کا حافظہ نہایت قوی اور ذہن بڑا رسا تھا، محمد بن یٰسین ہروی فرماتے ہیں ''حفاظ حدیث میں ابوداؤد بھی ایک مشہور حافظ ہیں'' ابو حاتم کا بیان ہے کہ ''وہ حفظ کے اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے'' محمد بن مخلد فرماتے ہیں کہ ابوداؤد ہزاروں حدیثوں کا مذاکرہ کرتے تھے، اور جب انھوں نے سنن مرتب کی تو تمام اہل زمانہ ان کے حفظ وتقدم کے معترف ہو گئے، امام نووی فرماتے ہیں کہ جمہور علمائے اسلام کو ان کے کمال حفظ کا اعتراف ہے۔(۴)

جرح وتعدیل: حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت کی طرح جرح وتعدیل میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا اور صحیح وسقیم، قوی وضعیف، مشہور ومنکر اور حسن وشاذ ہر قسم کی روایتوں کے

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۲ و ۱۶۹ و ۱۷۰ ومقدمہ غایۃ المقصود ص ۵، ۶ (۲) بستان المحدثین ص ۱۰۷ (۳) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۶ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۴، ۵۵ (۴) تہذیب ج ۴ ص ۱۷۲ وتہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۲۴۔

پرکھنے میں ان کو پورا ملکہ حاصل تھا، ان کی قوتِ تمیز، نقد ونظر اور ثقاہت وعدالت پر اساطین فن کا اتفاق ہے، محمد بن یٰسین ہروی فرماتے ہیں کہ ''وہ احادیث نبوی کے حافظ وواقف کار بھی تھے اور ان کی اسناد وعلل کے ماہر بھی'' ابوعبداللہ بن مندہ کا بیان ہے کہ ''احادیث کی تخریج، معلول وثابت اور غلط وصحیح میں تمیز کرنے والے چار آدمی ہیں، امام بخاری اور امام مسلم اور ان کے بعد ابوداؤد اور نسائی'' حافظ ابن جوزی جیسے سخت گیر کو بھی علل حدیث میں ان کی معرفت کا اعتراف ہے'' ابوحاتم فرماتے ہیں کہ ''وہ احادیث میں نہایت معتبر ومتقن اور امام تھے۔''(۱)

حدیث میں کمال: ابوداؤد اس دور میں پیدا ہوئے تھے، جب دنیائے اسلام نامور محدثین سے معمور تھی، اس زمانہ میں انھوں نے اس فن میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ائمہ حدیث اور اساطین فن میں ان کو امتیازی درجہ حاصل ہوگیا اور سب نے ان کی جلالتِ قدر کا اعتراف کیا، ابراہیم حربی کہتے ہیں کہ ''فن حدیث ان کے لیے اس طرح آسان ہوگیا تھا، جس طرح حضرت داؤدؑ کے لیے لوہا نرم اور موم بن گیا تھا، موسیٰ بن ابراہیم فرماتے ہیں کہ ''وہ دنیا میں تحصیل حدیث اور عقبیٰ میں جنت کے لیے پیدا کیے گئے تھے، میں نے ان سے زیادہ افضل وبرتر کوئی آدمی نہیں دیکھا'' احمد بن محمد بن یٰسین ہروی نے ان کو فرسان حدیث میں شمار کیا ہے، حاکم صاحب مستدرک کی رائے ہے کہ ''وہ اپنے دور میں امام المحدثین تھے'' امام نووی فرماتے ہیں کہ ''علمائے اسلام ابوداؤد کی مدح وتوصیف ان کے وفورِ علم حدیث میں فہم صائب اور ذہن رسا پر متفق ہیں'' محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ ابوداؤد کے معاصرین اور اہل زمانہ ان کی امامت فن کے معترف تھے۔''(۲)

فقہ واجتہاد: اگرچہ امام ابوداؤد کی شہرت محدث کی حیثیت سے زیادہ ہے لیکن فقہ واجتہاد

(۱) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۰ و ۱۷۱ و المنتظر ج ۵ ص ۵۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۹ ص ۵۸ وابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۲، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۶۹ وتہذیب الاسماء واللغات ج ۲ ص ۲۴۴۔

میں بھی ان کو بڑی بصیرت حاصل تھی اور حدیث کی طرح فقہ میں بھی ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، ابو حاتم ان کو امام فقہ قرار دیتے ہیں، صاحب شذرات اور یافعی نے لکھا ہے کہ ''وہ حدیث وفقہ دونوں میں ممتاز اور بلند حیثیت رکھتے تھے'' بعض علما کا بیان ہے کہ اصحاب صحاح میں امام بخاری کے بعد اجتہاد و تفقہ کے لحاظ سے ابوداؤد کا مرتبہ سب سے بلند ہے'' ان پر فقہی ذوق اتنا غالب تھا کہ تمام ارباب صحاح ستہ میں صرف ان ہی کو ابو اسحاق شیرازی نے طبقات الفقہا میں شامل کیا ہے، اسی فقہی ذوق کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب میں صرف احکام ومسائل کے متعلق حدیثیں درج کی ہیں۔

تفسیر و دیگر علوم: تفسیر کے بھی عالم تھے، اس موضوع پر انھوں نے ایک کتاب بھی لکھی تھی، حدیث، فقہ وتفسیر کے علاوہ دوسرے علوم سے بھی ان کو پوری واقفیت تھی، ابوبکر خلال کا بیان ہے کہ ''ابوداؤد اپنے زمانہ کے صاحب فضیلت اور پیش رو امام تھے، علوم کی تخریج ومعرفت اوران کے مواقع ومقامات کی واقفیت وآگاہی میں ان کا کوئی ہم سر نہ تھا۔

فقہی مذہب: ابو اسحاق شیرازی نے طبقات الفقہا میں ابوداؤد کو حنابلہ میں شمار کیا ہے، ان کے حنبلی ہونے کا ایک قوی قرینہ یہ ہے کہ وہ امام احمد کے خاص شاگرد اور متعدد مسائل میں ان کے ہمنوا تھے لیکن بعض لوگوں نے ان کو شافعی المذہب قرار دیا ہے۔(۱)

تدین وتقویٰ: علم وفن کی طرح وہ زہد وتقویٰ کے بھی امام تھے، ابو حاتم کا بیان ہے کہ وہ فقہ وعلم، حفظ وضبط اور عبادت وتقویٰ ہر اعتبار سے دنیا کے اماموں میں ایک امام تھے، یٰسین ہروی فرماتے ہیں کہ ''وہ بے مثال عالم وحافظ ہونے کے علاوہ عبادت وریاضت، عفت وپاکدامانی، خیر وصلاح اور ورع وتقویٰ میں بھی منفرد خصوصیات کے مالک تھے'' (۲) آداب شریعت کی پابندی اور سنت نبوی کے اتباع کا خاص اہتمام تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

---

(۱) اتحاف النبلاء ص ۲۵۶ (۲) تہذیب التہذیب ج ۴ ص ۱۷۲۔

''درحفظ حدیث واتقان روایت وعبادت وتقویٰ وصلاح واحتیاط درجہ عالی داشت''۔ (۱)

علامہ ابن کثیر کا بیان ہے:

وکان فی اعلیٰ درجۃ البنک والعفاف والصلاح والورع۔(۲)

دنیوی جاہ وحشمت سے بے زاری: امام صاحب کو دنیا اور اس کے لذائذ ومرغوبات سے کوئی دلچسپی نہ تھی، امرا وسلاطین کے دربار سے ہمیشہ کنارہ کش رہے اور دنیاوی جاہ وحشمت اور اعزاز واکرام کی کبھی طلب نہیں کی، خلفا کی وجاہت کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں تھا اور وہ ان کو عام لوگوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور نہ ان کے ساتھ کوئی امتیاز برتتے تھے، ان کے خادم ابوبکر بن جابر کا بیان ہے کہ ''میں امام صاحب کے ساتھ بغداد میں مقیم تھا، ایک دن جب وہ مغرب کی نماز پڑھ کر گھر میں داخل ہوئے تو کچھ دیر کے بعد دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز سنائی دی، میں نے دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ امیر ابواحمد موفق امام صاحب سے ملنے کے خواہش مند ہیں، میں نے اطلاع کی، آپ نے ان کو اندر بلوالیا اور پوچھا کہ کیسے زحمت فرمائی؟ انھوں نے کہا کہ میں تین درخواستیں لے کر حاضر ہوا ہوں، ایک تو یہ کہ آپ بصرہ میں مستقل قیام فرمائیں تاکہ مختلف مقامات کے طالبانِ حدیث آپ سے استفادہ کرسکیں، دوسرے میرے بچوں کو سنن کی تعلیم دیں، تیسرے روایت اور درسِ حدیث کے حلقہ میں میرے بچوں کے لیے مخصوص نشست کا انتظام فرمادیں، امام صاحب نے فرمایا کہ پہلی دونوں باتیں مناسب ہیں لیکن تیسری بات ناممکن ہے، علم کے معاملہ میں شریف ووضیع، اعلیٰ وادنیٰ سب برابر ہیں، اس لیے کوئی امتیاز نہیں برتا جاسکتا، چنانچہ امیر کے لڑکے بھی عام لوگوں کی طرح حلقۂ درس میں شریک ہوکر سماع حدیث کرتے۔(۳)

وفات واولاد: بہتر سال کی عمر میں بروز جمعہ ۱۶/شوال ۲۷۵ھ کو امام صاحب نے عالم

---

(۱) بستان المحدثین ص ۱۰۸ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۵ (۳) دیباچہ غایۃ المقصود۔

آخرت کا سفر اختیار کیا، عباس بن عبدالواحد نے جنازہ کی نماز پڑھائی،(۱) اولاد میں ایک صاحبزادہ ابوبکر عبداللہ کا جو آپ کے شاگرد اور نامور محدث تھے ذکر ملتا ہے۔

تصنیفات: امام صاحب کی جن تصنیفات کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱- کتاب الرد علیٰ اہل القدر: اس کے راوی ابوعبداللہ بصری ہیں۔

۲- کتاب الناسخ والمنسوخ: ابوبکر نجار اس کے راوی ہیں۔

۳- کتاب المسائل: ابوعبید آجری نے اس کی روایت کی ہے اور اس میں ان کے وہ سوالات درج ہیں جو انھوں نے اپنے استاذ امام احمد سے کیے تھے۔(۲)

۴- مسند مالک: اسماعیل بن محمد صفار اس کے راوی ہیں۔

۵- کتاب المراسیل: یہ رسالہ ۱۳۱۰ھ میں مطبع علمی سے شائع ہوا ہے اور ۵۶ صفحات پر مشتمل ہے۔(۳)

۶و۷- کتاب المصابیح وکتاب المصاحف: صاحب کشف الظنون نے ان دونوں کو امام صاحب کے صاحبزادہ ابوبکر عبداللہ کی تصنیف بتایا ہے لیکن ابن ندیم نے امام صاحب کی تصنیفات میں ان کو شمار کیا ہے۔(۴)

۸- کتاب البعث والنشور، ۹- کتاب التفسیر، ۱۰- کتاب نظم القرآن، ۱۱- کتاب فضائل القرآن، ۱۲- کتاب شریعۃ التفسیر، ۱۳- کتاب شریعۃ المقاری، ۱۴- سنن ابی داؤد، یہ امام صاحب کی سب سے مشہور و مقبول اور فن حدیث کی بڑی اہم اور مستند کتاب ہے، اس کا مفصل تعارف درج ذیل ہے۔

سنن ابی داؤد: یہ چار ہزار آٹھ سو منتخب حدیثوں پر مشتمل ہے، امام صاحب نے اس کی ترتیب وتالیف کا کام ۲۴۱ھ سے پہلے بغداد میں انجام دیا،(۵) سنن ابی داؤد سے پہلے

---

(۱) اتحاف النبلاء ص ۲۵۷ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۹۰ (۳) معجم المطبوعات کالم ۳۱۰ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۰۱ و ۴۴۵ والفہرست ص ۳۲۴ (۵) معالم السنن ج ۱ ص ۶ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۴۸ وتاریخ بغداد ص ۵۶۔

حدیث کی جو کتابیں لکھی گئیں ان کا تعلق جوامع اور مسانید سے ہے، یعنی ان میں سنن، احکام، تفسیر، قصص، اخبار، مواعظ، وآداب ہر قسم کی روایتیں ہیں لیکن امام ابوداؤد نے اپنی راہ سب سے الگ نکالی، تمام محدثین میں .... ان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے صرف سنن و احکام کی روایات اپنے مجموعہ میں درج کی ہیں، اہل مکہ کے نام اپنے رسالہ میں تحریر فرماتے ہیں ''میں نے سنن میں صرف احکامی روایات جمع کی ہیں، زہد اور فضائلِ اعمال وغیرہ کی حدیثیں اس میں شامل نہیں ہیں، اس کی جملہ چار ہزار حدیثیں احکام ومسائل سے متعلق ہیں۔''(۱)

سنن کی اہمیت: سنن ابی داؤد کا شمار حدیث کی امہات کتب اور صحاح ستہ میں ہوتا ہے، اکثر علمائے اسلام نے صحیحین کے بعد تمام کتب حدیث میں اس کو سب سے اہم بتایا ہے، اس کتاب کو مرتب کرنے کے بعد جب اس کو امام احمد کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے اس کو بہت پسند کیا اور اس کی تعریف کی، زکریا ساجی کا بیان ہے کہ قرآن مجید، اسلام کی اصل بنیاد اور سنن ابوداؤد اس کا ستون ہے، ابن الاعرابی فرماتے ہیں ''مصحف یعنی کتاب اللہ اور سنن ابوداؤد کے بعد کسی اور چیز سے واقفیت کی ضرورت نہیں'' محمد بن مخلد کہتے ہیں کہ ''ابوداؤد نے سنن مرتب کرنے کے بعد جب لوگوں کے سامنے اس کو بیان کیا تو محدثین نے اس کو مصحف کی طرح قابل اتباع سمجھا'' امام خطابی فرماتے ہیں ''سنن ابوداؤد ایک عمدہ اور نفیس کتاب ہے، علوم دینیہ میں ایسی بے نظیر کتاب نہیں لکھی گئی، تمام لوگوں میں اسے حسن قبول حاصل ہوا اور وہ اہل علم اور فقہا کے مختلف طبقات میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہے، اس میں ہر ایک کی آسودگی کا سامان موجود ہے اور عراق، مصر، بلاد مغرب اور اکثر ملکوں کے لوگوں کا اس پر اعتماد و دار و مدار ہے، علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں ''ابوداؤد کبار محدثین اور ماہرین فن علما میں تھے اور ان کی سنن جیسی کتاب کسی 'ور نے نہیں لکھی'' حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں ''سنن ابی داؤد علما کے درمیان مشہور و متداول اور مقبول تصنیف خیال کی جاتی ہے، ابوالعلا محسن کا بیان

(۱) رسالۃ ابی داؤد الی اہل مکہ ص ۸۔

ہے کہ انھوں نے خواب میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا:

من اراد ان یستمسك بالسنن — سنن کی اتباع کی آرزو رکھنے والوں کو

فلیقرأ سنن ابی داؤد. — سنن ابی داؤد کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

امام ابوداؤد خود فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ کے بعد اس کتاب سے زیادہ کسی اور چیز کا علم ضروری نہیں، اگر کسی شخص کو ان دونوں کے علاوہ کسی اور چیز سے واقفیت نہ ہو تو اس کو کوئی نقصان نہ ہوگا۔(۱)

خصوصیات: ۱-سنن ابی داؤد کی سب سے اہم خصوصیت اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف احکام ومسائل سے متعلق روایات واخبار پر مشتمل ہے، امام ابوداؤد سے پہلے اس قسم کی حدیث کی کتابیں لکھنے کا رواج نہ تھا، امام نووی کا بیان ہے کہ اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ ائمہ حدیث اور علمائے آثار کی توجہات کا مرکز بن گئی اور گو اس تخصیص کی بنا پر وہ احادیث کے بہت سے ابواب سے خالی ہے لیکن فقہی احادیث کا جتنا بڑا ذخیرہ اس کتاب میں موجود ہے، وہ صحاح ستہ کی کسی اور کتاب میں نہیں، حافظ ابوجعفر بن زبیر غرناطی متوفی ۷۰۸ھ نے صحاح ستہ کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

ولابی داؤد فی حصر — اور فقہی حدیثوں کے حصر واستیعاب

احادیث الاحکام واستیعابها — کے سلسلہ میں ابوداؤد کو جو خصوصیت

لیس لغیرہ۔(۲) — حاصل ہے وہ دوسرے مصنفین کو نہیں۔

احکام ومسائل میں اس کی جامعیت کی بنا پر علمائے امت نے کتاب اللہ کے بعد دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کی تعلیم کو زیادہ ضروری قرار دیا ہے اور اسی خصوصیت کی

(۱) تاریخ بغداد ج۹ ص۵۶، ابن خلکان ج۱ ص۳۸۲ والبدایہ والنہایہ ج۱۱ ص۵۵ وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۱۲۹ ومقدمہ معالم السنن ج۱ ص۹۷۸ وتہذیب التہذیب ج۴ ص۱۷۱، صفۃ الصفوۃ ج۵ ص۵۱ (۲) کتاب الاسماء واللغات ج۲ ص۲۲۷، تدریب الراوی ص۷۶۔

وجہ سے وہ فقہاو مجتہدین کا معتمد علیہ ماخذ رہی ہے، زاہد الکوثری لکھتے ہیں "حلال وحرام کے متعلق احکامی احادیث کے لیے یہ نہایت مفید اور نفع بخش کتاب ہے" بعض علمائے اصول کا بیان ہے کہ "مجتہدین کے لیے اس کی احادیث سے واقفیت کافی ہے" ابوبکر جصاص کی احکام ومسائل کے متعلق جملہ کتابوں (احکام القرآن، جامع کبیر، شرح مختصر طحاوی اور شرح مختصر کرخی وغیرہ) کا خاص ماخذ ومرجع یہی کتاب ہے۔(۱)

۲۔ فقہ واستنباطِ احکام ومسائل کے لحاظ سے بھی یہ بڑی بلند پایہ کتاب ہے کیونکہ امام ابوداؤد کا درجہ فقہ واجتہاد میں بھی نہایت بلند تھا۔

۳۔ امام ترمذی کی طرح ابوداؤد کی بھی اکثر وبیشتر روایتیں علما وائمہ مجتہدین، فقہاءِ امصار، صحابہ وتابعین اور تبع تابعین وغیرہ کی معمول بہا ہیں، خصوصاً امام مالک، سفیان ثوری اور امام اوزاعی وغیرہ محدثین اور فقہا کے مسالک ومذاہب کے لیے تو وہ اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے، علامہ خطابی کا بیان ہے کہ "وہ فقہا ومجتہدین کے اختلاف کے درمیان حکم اور حجت ہے اور عراق، مصر، بلادِ مغرب اور دیگر ممالک کے لوگوں کا اس پر دارو مدار ہے"۔(۲)

۴۔ سنن میں صحیح الاسناد، قوی، متصل اور مرفوع حدیثوں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے، اس کی صحت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ امام صاحب نے پہلے پانچ لاکھ حدیثیں جمع کی تھیں، پھر ان میں کل چار ہزار آٹھ سو حدیثیں منتخب کیں، اس سلسلہ میں خود لکھتے ہیں "سنن میں چار ہزار آٹھ سو حدیثیں شامل ہیں، جو سب صحیح یا قریب قریب صحیح ہیں، میں نے اپنے علم ویقین بھر صحیح بلکہ اصح روایتیں نقل کرنے کی کوشش کی ہے اور ہمیشہ ان حدیثوں کو ترجیح دی ہے جو سند کے اعتبار سے بلند اور اعلیٰ درجہ کی ہیں، مرسل حدیثیں اس وقت نقل کرتا ہوں جب مسند اور متصل روایتیں نہیں ملتیں کیوں کہ مراسیل بھی ائمہ متقدمین، مالک،

---

(۱) دیباچہ رسالہ ابی داؤد ص۲ (۲) مقدمہ معالم السنن ص۲۔

ثوری اور اوزاعی وغیرہ کے نزدیک لائق حجت اور قابل استناد ہیں، البتہ امام شافعی اور امام احمد کو ان کی حجیت میں کلام ہے، میرے نزدیک مسند و متصل روایات کے نہ ہونے کی صورت میں وہ معتبر و مستند ہیں لیکن ان کی طرح ان کو قوی نہیں سمجھتا، میں نے اس میں کوئی ایسی حدیث نہیں درج کی جس کے متروک اور ساقط ہونے پر اہل علم کا اتفاق ہو۔ اسی طرح متروک الاحادیث راویوں سے روایت کرنے میں بھی پرہیز کیا ہے، منکر اور ضعیف الاسناد روایتوں کو میں قابل اعتنا ہی نہیں سمجھتا لیکن صحیح روایتوں کے نہ ہونے کی صورت میں ان کو ان کے ضعف اور وجوہِ نکارت کی تصریح کے بعد نقل کیا ہے، جن غیر صحیح الاسناد روایتوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، وہ قابل احتجاج اور صالح سمجھی جائیں گی، اسی طرح غریب اور شاذ روایات کے بجائے مشہور اور معمول بہ روایتیں جمع کرنے پر خاص دھیان دیا ہے۔(۱)

۵- امام ابوداؤد کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی سند اور ایک ہی متن میں متعدد اسانید اور مختلف متون کو جمع کر دیتے ہیں اور ہر حدیث کے الفاظ کو علاحدہ علاحدہ بیان کرتے ہیں۔

۶- روایتوں کے تکرار سے حدیث کی کوئی کتاب خالی نہیں لیکن امام ابوداؤد نے حتی الامکان تکرار سے احتراز، کثرت طرق کو نظر انداز اور طویل حدیثوں کو مختصر کر دیا ہے، تکرار سے اسی وقت کام لیا ہے، جب روایت میں کوئی خاص اور نئی بات نظر آئی ہے۔

۷- نقلِ روایات میں استقصا و جامعیت کے علاوہ اس میں حسنِ ترتیب و تالیف کی بھی شان پائی جاتی ہے، علامہ خطابی فرماتے ہیں:

الاان کتاب ابی داؤد احسن رصفا یعنی ابوداؤد کی سنن ترتیب وحسنِ تالیف کے لحاظ سے سب میں عمدہ ہے، پڑھنے والوں کے مذاق وطبیعت کے لحاظ ہی کی وجہ سے

(۱) رسالہ ابی داؤد بجستانی ص ۷۔

انھوں نے تکرار، کثرت طرق اور طول بیان سے پرہیز کیا ہے۔

۸- سنن ابی داؤد میں ایک ثلاثی روایت بھی ہے۔

۹- رواۃ کے ناموں، کنیتوں اور القاب کے اجمال وابہام کی تفصیل وتوضیح، ان کی ثقاہت وعدم ثقاہت کی نشاندہی اور روایات کے حسن وقبح اور صحت وسقم وغیرہ کی وضاحت بھی کی ہے۔

سنن ابی داؤد کی چار حدیثیں: امام ابوداؤد فرماتے ہیں کہ میرے اس منتخب مجموعۂ احادیث میں صرف چار حدیثیں انسان کو دین پر عمل کرنے کے لیے کافی ہیں اور وہ یہ ہیں، انما الاعمال بالنیات، من حسن اسلام المرء ترکہ مالایعنیہ، لایکون المومن مومنا حتی یرضیٰ لاخیہ مایرضاہ لنفسہ اور الحلال بین والحرام بین وبینہما مشتبہات۔

امام صاحب کی اس تصریح میں بڑی بصیرت وحکمت پوشیدہ ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''ایک مجتہد ومرشد کو شریعت کے کلی قاعدوں اور مہمات امور سے واقف ہونے کے بعد جزئی مسائل اور واقعات میں ان کے سوا کسی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہتی، کیوں کہ پہلی حدیث عبادات کی صحت ودرستگی، دوسری عمر عزیز کے اوقات کی حفاظت، تیسری پڑوسیوں، قرابتداروں، متعارف لوگوں اور دوسرے متعلقین وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اور چوتھی ان تمام شکوک وشبہات کے ازالہ کے لیے کافی ہے جو علما کے اختلافات ودلائل کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔(۱)

سنن کے متداول نسخے اور ان کے رواۃ: امام ابوداؤد سے ان کے سات تلامذہ نے سنن کی روایت کی ہے لیکن ان میں چار تلامذہ زیادہ مشہور ہیں اور ان کی نسبت سے ہر زمانہ میں سنن کے چار نسخے مشہور ومتداول رہے ہیں۔(۲)

۱- نسخۂ لولوی: یعنی ابوعلی محمد بن احمد بن عمرو لولوی کا نسخہ جو ہندوستان اور بلاد مشرق میں رائج

---

(۱) بستان المحدثین ص ۱۰۷ (۲) مقدمہ معالم السنن۔

ومقبول ہے اور سب زیادہ مستند ومعتبر سمجھا جاتا ہے کیوں کہ امام صاحب نے آخر عمر یعنی ۲۷۵ھ میں اس کا املا کرایا تھا، اس کے بعد ان کی وفات ہوگئی تھی، اس لیے یہ گویا آخری نسخہ ہے۔

۲۔نسخۂ ابن داسہ: یعنی حافظ ابوبکر محمد بن بکر تمار، بصری کا نسخہ، یہ بلاد مغرب میں مشہور ومقبول تھا، اس میں اور لولوی کے نسخے میں بڑی یکسانیت ہے، کہیں کہیں محض تقدیم وتاخیر کا جزوی اختلاف ہے، کمی بیشی کا کوئی فرق نہیں، بعض علما کے نزدیک سب سے زیادہ کامل اور جامع یہی نسخہ ہے، مشہور شارحِ سنن علامہ خطابی کے پیش نظر یہی تھا، انھوں نے ابن داسہ سے براہ راست تحصیل علم اور روایت کی تھی۔

۳۔نسخۂ رملی: یعنی حافظ ابوعیسیٰ اسحاق بن موسیٰ بن سعید آملی کا نسخہ، یہ تقریباً ابن داسہ کے نسخہ سے ملتا جلتا ہے، آملی ابوداود کے وراق تھے۔

۴۔نسخۂ ابن اعرابی: اس میں اور دوسرے نسخوں میں بڑا فرق واختلاف ہے اور ان کے مقابلہ میں اس میں کمی بھی ہے، کتاب الفتن والملاحم، کتاب الحروف، کتاب الخاتم وغیرہ مکمل اور کتاب اللباس کا نصف حصہ اور کتاب الوضوء، کتاب الصلوٰۃ اور کتاب النکاح کے بھی بیشتر حصے اس میں درج نہیں ہیں۔(۱)

شروح وتعلیقات: سنن ابی داود کی اہمیت اور افادیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، اس کے مختصرات مرتب کیے، اس کی شرحیں اور حواشی لکھے، جن میں اہم مباحث ومشکلات کا حل رواۃ اور غریب الفاظ وغیرہ کی تحقیقات کی گئی ہیں، ان کے نام یہ ہیں:

معالم السنن: مشہور محدث امام ابوسلیمان حمد بن محمد خطابی (م ۳۸۸ھ) کی شرح جو سب سے قدیم اور مشہور اور سب میں ممتاز ہے، اس کو مطبعہ علمیہ حلب نے ۱۳۵۱ھ میں نہایت اہتمام سے شائع کیا۔

---

(۱) مقدمہ غایۃ المقصود ص ۷ مقدمہ معالم السنن ص ۲۳۔

شرح قطب الدین: قطب الدین ابوبکر بن احمد بن دعین یمنی شافعی م۶۵۲ھ نے اس کی چار ضخیم جلدوں میں شرح لکھی تھی، مگر نایاب ہے۔

تلخیص منذری: ابومحمد زکی الدین عبدالعظیم بن عبدالقوی مصری م۶۵۶ھ نے سنن ابی داؤد کا اختصار کیا تھا اور اس کا نام مجتبیٰ رکھا، غایۃ المقصود کے ساتھ اس کو بھی شائع کیا گیا ہے۔

شرح نووی: مشہور محدث اور باکمال شارح حدیث ابوزکریا محی الدین یحییٰ ابن شرف نووی م۶۷۶ھ نے بھی اس کی شرح لکھنا شروع کی تھی مگر مکمل نہیں کر سکے۔(۱)

شرح ابن قیم: حجۃ الاسلام شمس الدین محمد بن ابوبکر قیم جوزی م۷۵۱ھ نے منذری کی تہذیب کے مطابق ابوداؤد کی شرح وتہذیب کی تھی جو نہایت بلند پایہ اور مفید کتاب ہے، اس میں اس کے مشکلات سے تعرض اور معلول احادیث پر فاضلانہ بحثیں کی گئی ہیں، یہ کتاب شائع ہو چکی ہے، غایۃ المقصود کی پہلی جلد کے ساتھ یہ بھی شامل ہے:

شرح مغلطائی: یہ حافظ علاؤ الدین مغلطائی بن قلیج م۷۶۲ھ کی ناتمام شرح ہے۔

انتحاء السنن یا عجالۃ العالم: ابومحمود شہاب الدین احمد بن محمد مقدسی م۷۶۵ھ نے خطابی کی معالم السنن کی تلخیص کی اور اس کا نام انتحاء السنن واقتفاء السنن رکھا، بعض لوگوں نے اس کا نام عجالۃ العالم من کتاب العالم بتایا ہے، مکتبہ آستانہ سے چار جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔

شرح ابن ملقن: شیخ سراج الدین عمر بن علی بن ملقن شافعی م۸۰۴ھ نے زوائد علی الصحیحین کے نام سے دو جلدوں میں ابوداؤد کی ان روایتوں کی شرح کی ہے جو صحیحین میں نہیں ہیں۔

شرح عراقی: ابوزرعہ ولی الدین احمد بن عبدالرحیم زین الدین عراقی م۸۲۶ھ نے بھی اس کی ایک ناتمام شرح لکھی جو ابتدا سے سجدۂ سہو تک سات جلدوں میں ہے، ایک اور جلد میں صیام، حج اور جہاد وغیرہ ابواب کی بھی شرح ہے، اگر یہ شرح مکمل ہوتی تو تقریباً چالیس

---

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۶۲۔

جلدوں پر مشتمل ہوتی۔

شرح ابن رسلان: ابوالعباس احمد بن حسین رملی مقدسی معروف بہ ابن رسلان م ۸۴۴ھ نے سنن ابوداود کی بڑی مکمل اور جامع شرح لکھی تھی، جو سخاوی کے بیان کے مطابق ۱۱ جلدوں میں ہے لیکن علامہ حسین بن محسن انصاری کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ شرح عرب ممالک میں آٹھ ضخیم جلدوں میں دیکھی ہے جو نہایت مفید اور عمدہ مطالب پر مشتمل ہے، مولانا شمس الحق مرحوم لکھتے ہیں کہ میں نے اس کا ایک حصہ دیکھا تو ہے، اس سے اندازہ ہوا کہ وہ نہایت عمدہ شرح ہے، زاہد الکوثری کا بیان ہے کہ وہ ابوداود کی نہایت عمدہ شرحوں میں ہے اور کتب خانہ آستانہ میں اس کی چار جلدیں پائی جاتی ہیں، ابن رسلان حافظ ابن حجر کے ارشد تلامذہ میں تھے، اس لیے انھوں نے اس شرح میں ان کے اقوال وآرا بھی نقل کیے ہیں۔

شرح عینی: علامہ بدرالدین عینی م ۸۵۵ھ کی شرح جو صرف ایک جز پر مشتمل ہے۔

شرح سیوطی: علامہ جلال الدین سیوطی م ۹۱۱ھ نے مرقاۃ الصعود الی سنن ابی داود کے نام سے شرح لکھی۔

شرح سندی: علامہ ابوالحسن سندی م ۱۱۳۹ھ نے دیگر کتب صحاح کی طرح فتح الودود علی سنن ابی داود کے نام سے اس کا بھی حاشیہ لکھا تھا جو نہایت مشہور اور مقبول ہے، صاحب کشف الظنون نے اس کو شرح لطیف کہا ہے۔(۱)

غایۃ المقصود: مولانا شمس الحق عظیم آبادی مرحوم نے ۳۲ جلدوں میں سنن ابی داود کی ایک نہایت مبسوط و جامع اور مفصل شرح لکھی، اس کی صرف ایک ہی جلد دہلی کے مطبع انصاری سے شائع ہوئی ہے، یہ نہایت عمدہ شرح ہے، اس کے شروع میں ایک طویل مقدمہ بھی ہے جس میں ابوداود اور سنن کے متعلق بڑے مفید معلومات درج ہیں، اس کی اہمیت مولانا خلیل احمد سہارنپوری کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے "میں نے شیخ ابوالطیب شمس الحق کی شرح

---

(۱) کشف الظنون ومقدمہ غایۃ المقصود ص ۷ تا ۱۰ واتحاف النبلاء ص ۹۰ و ۹۱۔

غایۃ المقصود کا ایک حصہ دیکھا، وہ سنن ابوداؤد کے اسرار وغوامض کے کشف واظہار کے لیے کافی ہے، واللہ یہ خوب شرح ہے، مصنف نے اس میں پوری کاوش کی ہے اور تلاش وجستجو کا حق ادا کردیا ہے(۱) اس شرح کے ساتھ ابن قیم کی شرح اور......کی تلخیص بھی شامل ہے۔

عون المعبود: یہ بھی مولانا شمس الحق ہی کی شرح ہے اور سنن ابی داؤد کے متن کے ساتھ ۴ جلدوں میں مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، یہ دراصل غایۃ المقصود کا خلاصہ ہے۔

عام طور سے اس کے مؤلف اور شارح مولانا شمس الحق ڈیانوی سمجھے جاتے ہیں لیکن شرح کی جلد اول کے خطبہ اور اسی جلد کے خاتمہ اور دوسری جلد کے خاتمہ میں مولانا کے چھوٹے بھائی مولانا شرف الحق صاحب نے اس کو اپنی تصنیف بتایا ہے، مگر خود مولانا شمس الحق صاحب نے چوتھی جلد کے خاتمہ وآغاز اور تیسری جلد کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ ان کی تصنیف ہے، مولانا خلیل احمد سہارن پوری اور صاحب معجم المطبوعات نے اس کو مولانا اشرف ہی کی تصنیف قرار دیا ہے،(۲) مگر مولانا تلطف حسین صاحب نے جو مولانا شمس الحق صاحب کے ہم عصر وہم سبق اور عون المعبود کے ناشر بھی ہیں لکھا ہے کہ ''مولانا شمس الحق صاحب کو شرح ابی داؤد لکھنے کا مبارک خیال مولانا سید نذیر حسین صاحب دہلوی کی ترغیب سے ہوا، انھوں نے سنن کے گیارہ نسخے جمع کیے اور ان کا مقابلہ کرکے ایک صحیح نسخہ تیار کیا اور اسی کو اصل قرار دیا، مزی کی تحفۃ الاشراف، منذری کی تلخیص اور امام خطابی کی معالم السنن اور ابن اثیر کی جامع الاصول وغیرہ کو بھی پیش نظر رکھ کر غایۃ المقصود کی تالیف وترتیب شروع کی مگر بعض وجوہ سے اسی درمیان میں ایک مختصر شرح لکھنے کا خیال بھی ان کو ہوا تو عون المعبود کی تالیف شروع کی اور چند ممتاز علما کو اس کام میں معاون بنایا، جنھوں نے متن کی تصحیح اور شرح کی تالیف میں ان کا ہاتھ بٹایا اور مولانا نے ان سب سے ان کی استعداد کے مطابق کام لیا، ان علما کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

---

(۱) مقدمہ بذل المجہود ج اول ص ا۔ (۲) ایضاً و معجم المطبوعات کالم ص ۳۱۰۔

۱- مولانا ابوعبدالرحمٰن شرف الحق محمد اشرف ڈیانوی جو شارح کے چھوٹے بھائی تھے، ۲- شیخ الحدیث مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری صاحب تحفۃ الاحوذی، ۳- مولانا ابو عبداللہ محمد ادریس ڈیانوی جو شارح کے صاحبزادے ہیں، ۴- مولانا عبدالجبار بن نور احمد ڈیانوی جو مصنف کے ماموں زاد بھائی تھے۔(۱)

اس تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام حضرات بھی عون المعبود کی تالیف میں کسی نہ کسی حیثیت سے مصنف مولانا شمس الحق کے شریک تھے اور بقول مولانا تلطف حسین ''یہ تمام لوگ شارح عون المعبود مولانا شمس الحق صاحب کے حکم کی تعمیل کرتے اور شب و روز اس خدمت کو انجام دیتے جو مولانا ان کے سپرد کرتے (۲) لیکن اصل شارح مولانا شمس الحق ہی تھے، البتہ چند اور علما نے ترتیب و تالیف میں ان کی اعانت کی تھی، مگر اس اعانت کی بنا پر ان کی جانب اس شرح کو منسوب کرنا صحیح نہیں ہے، یہ عام قاعدہ ہے کہ اساتذہ و شیوخ اپنے شاگردوں سے مواد و معلومات اکٹھا اور مآخذ و حوالے تلاش کراتے اور تصنیف و تالیف کے سلسلہ کے بعض امور ان کے سپرد کرتے ہیں بلکہ بعض ابواب و فصول بھی ان سے لکھا کر ان میں حسب منشا معمولی یا غیر معمولی ترمیم کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود اصل کتاب اساتذہ ہی کی جانب منسوب کی جاتی ہے اور اس کو معیوب نہیں خیال کیا جاتا، اس لیے مولانا شرف صاحب کو اس کا مصنف و شارح قرار دینا غلط ہے، وہ صرف اس علمی بورڈ کے ایک رکن تھے، مولانا شمس الحق نے ان کی دلدہی کی وجہ سے کچھ اجزا ان کی جانب منسوب ہو جانے کو ناپسند نہیں کیا۔

التعلیق المحمود: اس کو شیخ فخر الحسن گنگوہی نے مرتب کیا ہے۔

---

(۱) خاتمہ عون المعبود جلد رابع ص ۵۵۳، اس جماعت میں اور بھی بعض حضرات شامل تھے، مولوی ابویحیٰ امام خاں نوشہروی نے اس فہرست میں قاضی یوسف حسین خان پوری ہزاروی اور مولوی محمد شاجہان پوری کے نام بھی تحریر کیے ہیں (تراجم علمائے اہل حدیث ص ۴۰۲) (۲) خاتمہ عون المعبود جلد رابع ص ۵۵۳۔

الہدی المحمود لترجمۃ سنن ابی داؤد: مشہور مترجم حدیث وقار نواز جنگ مولانا وحید الزماں ابن مسیح الزماں م ۱۹۲۰ء نے دو ضخیم جلدوں میں ایک شرح لکھی جو سنن کے اردو ترجمہ اور تشریحی فوائد پر مشتمل اور چھپ چکی ہے، صاحب شرح کے حالات میں مولانا عبدالحلیم چشتی نے ایک جامع کتاب لکھی ہے جو مکتبہ نور محمد آرام باغ کراچی سے شائع ہوئی ہے۔

بذل المجہود فی حل ابی داؤد: مشہور حنفی عالم ومحدث مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری کی شرح جو پانچ جلدوں پر مشتمل اور شائع ہو چکی ہے، یہ شرح مفید علمی وفنی مطالب پر مشتمل ہے۔

المنہل المورد: یہ مفید ومختصر شرح حال ہی میں حجاز سے شائع ہوئی ہے لیکن ہماری نظر سے نہیں گذری۔

ایک اعتراض کا جواب: بعض علمائے جرح وتعدیل نے سنن ابی داؤد میں موضوع روایتوں کی بھی نشاندہی کی ہے، علامہ ابن جوزی کے نزدیک اس قسم کی حدیثوں کی تعداد نو ۹ ہے لیکن علمائے محققین نے اس اعتراض کو تسلیم نہیں کیا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

> ''سنن ابی داؤد کی اعلیٰ ومستند ترین روایتیں وہ ہیں جن کی شیخین نے تخریج کی ہے اس قسم کی حدیثیں نصف کتاب پر مشتمل ہیں، اس کے بعد ان روایتوں کا نمبر ہے جن کی شیخین میں سے کسی ایک نے تخریج کی ہے، تیسرا درجہ ان روایتوں کا ہے جن کی گو صحیحین میں تخریج نہیں کی گئی ہے تاہم وہ علت وشذوذ سے پاک اور سنداً قوی وجید ہیں، اس کے بعد وہ روایتیں ہیں جو صحیح الاسناد اور صالح سمجھی جاتی ہیں اور دو تین طرق سے مروی ہونے کی بنا پر علما نے ان کو قبول کیا ہے، بعض ایسی روایات بھی ہیں جو رواۃ کے سوء حفظ کی بنا پر ضعیف ہیں اور ان کے بارے میں ابوداؤد نے سکوت اختیار کیا ہے، بعض احادیث باعتبار رواۃ ضعیف ہیں مگر ابوداؤد نے ان کے ضعف کی تصریح کر دی ہے لیکن بعض اوقات وہ

ضعف کے متعلق اس لیے خاموش رہتے ہیں کہ نکارت کا پہلو بہت واضح اور نمایاں ہوتا ہے۔''(۱)

امام خطابی تحریر فرماتے ہیں:

''محدثین کے نزدیک حدیث کی تین قسمیں ہیں ۱۔صحیح، ۲۔حسن، ۳۔سقیم، امام ابوداود کی کتاب صحیح اور حسن دونوں قسموں کی جامع اور سقیم کی مختلف بڑی اور اہم قسموں مثلاً موضوع، مقلوب اور مجہول وغیرہ سے یکسر خالی ہے، اگر شاذ ونادر سقیم کی معمولی اور چھوٹی قسموں کی روایتیں درج ہوگئی ہیں تو امام صاحب اس کی حقیقت ونوعیت بیان کر کے اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوگئے ہیں''(۲)

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ سنن ابی داؤد موضوع روایتوں سے پاک ہے، البتہ ضعیف ومرسل روایتوں کے پائے جانے کا خود امام صاحب نے اپنے رسالہ میں ذکر واعتراف کیا ہے لیکن اس سے اس کی اہمیت، شہرت، وثوق اور اعتبار واستناد میں کوئی فرق نہیں آتا۔

امام صاحب کا یہ بیان کہ ''مالم یذکر فیه شیء فهو صالح ''یعنی جن روایتوں کے بارے میں سکوت اختیار کیا گیا ہے، وہ صالح ہیں، علمائے فن کی بحث ونظر کا خاص موضوع رہا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عام طور سے علما نے اس طرح کی حدیثوں کو صحیح وحسن تسلیم کیا ہے لیکن مکمل استقصا وتتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی بعض حدیثیں ضعیف بھی ہیں۔ واللہ اعلم۔

---

(۱) سیر النبلا (۲) شرح معالم السنن ج۱ ص۶۔

امام بقی بن مخلد قرطبیؒ

(متوفی ۲۷۶ھ)

نام ونسب: بقی نام، ابوعبدالرحمٰن کنیت اور شیخ الاسلام لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے: بقی بن مخلد بن یزید۔

ولادت ووطن: اندلس کے مشہور شہر اور اسلامی علوم وفنون اور تہذیب وثقافت کے مرکز قرطبہ میں ۲۰۱ھ میں پیدا ہوئے۔(۱)

اساتذہ وشیوخ: بقی بن مخلد نے تقریباً تین سو اساتذہ سے کسب فیض کیا تھا، ان کا شمار امام احمد کے خاص اور مایۂ ناز شاگردوں میں ہوتا ہے، ان کے اکثر شیوخ کو امام مالک، سفیان بن عیینہ، امام شافعی اور حماد بن زید وغیرہ جلیل القدر محدثین اور فقہا سے شرف تلمذ حاصل تھا، چند ممتاز مشائخ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن محمد شافعی، ابراہیم بن منذر حزامی، ابوثور، ابومصعب زہری، احمد بن ابراہیم دورقی، ابوطاہر احمد بن سرح، بکار بن عبداللہ، حارث بن مسکین، خلیفہ بن خیاط، دحیم، ابوخیثمہ زہیر بن حرب، زہر بن حماد، سحنون بن سعید، سلمہ بن شعیب، صفوان بن صالح، ابوبکر عبداللہ بن ابی شیبہ، عبداللہ بن ذکوان، عون بن یوسف، محمد بن بشار بندار، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن عبید بن حسان، محمد بن عیسیٰ اعشی، محمد بن عمر عدنی، محمد بن محمد مصطفیٰ حمصی، ہارون بن عبداللہ حمال، یحییٰ بن عبداللہ بن بکیر، یحییٰ بن عبدالحمید حمانی، یحییٰ بن یحییٰ لیثی وغیرہ(۲)

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۷ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ وتاریخ العلماء والرواۃ الاندلس لابن الفرضی ص ۱۰۹۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، بعض کے نام حسب ذیل ہیں:

''احمد بن بقی، احمد بن عبداللہ اموی، اسلم بن عبدالعزیز، حسن بن سعید (یا سعد) عبداللہ بن یونس قیری مرادی، (۱) محمد بن عمر لبابہ، محمد بن وزیر وغیرہ۔

طلب علم کے لیے سفر: انھوں نے علم کی تحصیل و تکمیل کے لیے مغرب و مشرق کے اکثر شہروں کا سفر کیا تھا، مورخین نے ان کو ذو رحلة واسعة (یعنی کثیر الاسفار بتایا ہے) ابن مندہ اور حمیدی کا بیان ہے کہ ''رحلت اور طلب حدیث کے لیے ان کے سفر مشہور ہیں''

علم کی طلب و تحصیل میں تن آسانی کو ناپسند کرتے تھے، اپنے شاگردوں سے کہتے تھے کہ تم لوگ طالب علم بنتے ہو؟ اس طرح بھی علم کی طلب کی جاتی ہے کہ جب تم فارغ ہوتے ہو اور تم کو کوئی ضرورت نہیں ہوتی تو حصول علم کے لیے نکلتے ہو، میں نے ایسے جانباز اور شوقین طالب علم دیکھے ہیں جن کے پاس کھانے کے لیے درخت کے پتوں کے سوا کچھ نہ تھا اور انھوں نے کاغذ خریدنے کے لیے اپنے پائجامے تک بیچ دیے۔

حدیث میں درجہ و مرتبہ: امام بقی نے اس زمانہ کے دستور کے مطابق علم حدیث کی جانب زیادہ توجہ کی اور اس میں اتنا کمال پیدا کیا کہ ان کا شمار اکابر محدثین میں ہوتا ہے، مورخین اور علمائے سیر نے لکھا ہے کہ بالغ فی الجمع والروایة یعنی حدیث کی روایت و تحریر میں ان کو بڑا انہماک تھا، حفظ و ضبط اور صدق و ثقاہت میں بھی ممتاز تھے، علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ حجت اور ثبت اور حافظ ابن عساکر نے الحافظ اور حمیدی نے من الحفاظ المحدثین لکھا ہے، حدیث کے ضبط و نقل میں ان کی احتیاط اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ ان کو کم سنی میں سفیان ثوریؒ کے بعض تلامذہ سے ملاقات و استفادہ کا موقع ملا تھا مگر ان سے روایت کرنے سے احتراز کیا۔ (۲)

تفقہ و اجتہاد: فقہ و اجتہاد میں بھی بلند مرتبہ رکھتے تھے، کسی خاص امام یا مذہب کے پابند نہ

---

(۱) یہ امام بقی کے بڑے ممتاز شاگرد اور ان کے راویہ کہلاتے تھے، بقی کی کتابوں کی نشر و اشاعت میں ان کا بڑا ہاتھ ہے (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹۔

تھے بلکہ خود فقیہ و مجتہد اور صاحب اختیارات تھے، حافظ ذہبی اور علامہ ابن عساکر وغیرہ نے لکھا ہے وکان مجتهدا متخيرا لايقلد احدا، (۱) یعنی وہ مجتہد، صاحب اختیارات اور کسی امام کے مقلد نہ تھے۔

علوم کی اشاعت: ایک بڑا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ممالک مشرق سے واپسی کے بعد اندلس کی سرزمین کو احادیث و روایات کی نشر و اشاعت سے معمور کر دیا، حافظ ابن عساکر وغیرہ کا بیان ہے:

رجع الى الاندلس فملأها علما جما۔	یعنی اندلس واپس آ کر اس کو علوم سے مملو کر دیا۔

متعدد اہم اور امہات کتب کو اندلس میں متعارف کرایا، مورخین کا بیان ہے:

كتب المصنفات الكبار وادخلها الاندلس ونشربها علم الحديث۔ (۲)	وہ بڑی اور بلند پایہ کتابوں کو نقل کر کے اندلس لائے اور یہاں علم کی اشاعت کی۔

ابن الفرضی نے تصریح کی ہے کہ مصنف ابن ابی شیبہ، کتاب الفقہ (الام) امام شافعی، کتاب التاریخ و کتاب الطبقات لخلیفہ بن خیاط اور سیر عمر بن عبدالعزیز کو وہی اندلس لائے اور اہل اندلس کو اس سے متعارف کرایا۔ (۳)

علم و فضل کا اعتراف: محدثین اور ارباب کمال نے امام بقی کے دینی و علمی کمالات کا اعتراف کیا ہے، علامہ ذہبی نے ان کو امام، قدوہ، احدالائمۃ الاعلام، عدیم المثال اور یکتائے روزگار لکھا ہے، احمد بن ابی خیثمہ فرماتے ہیں کہ ''جس شہر میں بقی جلوہ فرما ہوں، وہاں کے کسی آدمی کو ہم لوگوں کے پاس آنے کی کیا ضرورت؟'' علامہ ابن حزم لکھتے ہیں کہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۷۹

(۳) تاریخ العلماء والرواۃ للاندلس ص ۱۰۸ و ۱۰۹۔

''وہ امام احمد کے مخصوص اور ارشد تلامذہ میں تھے اور امام بخاری، مسلم اور نسائی کے ہمسر ومثیل تھے'' طاہر بن عبدالعزیز کا بیان ہے کہ میں نے مسند بقی کا ایک جز محمد بن اسماعیل صائغ کو دکھایا تو انھوں نے فرمایا کہ ''یہ شخص بحر علم کا شناور ہے'' وہ خود بیان کرتے ہیں کہ ''عراق سے واپسی کے بعد میں اپنے محترم استاذ یحییٰ بن بکیر کی خدمت میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا تو انھوں نے مجھے اپنے پہلو میں بٹھایا اور مجھ سے سات حدیثیں سنیں۔(۱)

بعض فقہا کی مخالفت: دوسرے ارباب کمال کی طرح ان کو بھی علما وفقہا کی ایک جماعت کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا، وہ بڑے متبع سنت تھے، اس لیے مجتہدین اور فقہا کی تقلید کے بجائے براہ راست احادیث وآثار کی پیروی کرتے تھے، اس زمانہ میں اندلس میں فقہ مالکی کا غلبہ تھا، اس لیے عموماً لوگوں کو مؤطا اور اہل مدینہ کی حدیثوں سے زیادہ واقفیت تھی اور اس کے مقابلہ میں اہل عراق کے متعلق یہ بدگمانی تھی کہ وہ قلیل الاحادیث ہیں، چنانچہ بقی نے جب مصنف ابن ابی شیبہ کا جس کو وہ لائے تھے درس دینا اور احادیث کی نشر واشاعت شروع کی تو فقہا کی ایک جماعت مسائل میں اختلاف کو برداشت نہ کر سکی اور بقی کی مخالفت شروع کر دی، عوام کو بھی ان کے خلاف بھڑکا دیا، ان کو مخالفت کے اس طوفان سے مجبور ہو کر درس وتدریس کا مشغلہ ترک کر دینا پڑا، جب فرمانروائے اندلس محمد بن عبدالرحمٰن بن حکم اموی کو جو خود بھی صاحب علم اور علم وفن اور علما کا بڑا قدر شناس تھا، اس ہنگامہ کی خبر ہوئی تو اس نے شیخ الاسلام اور ان کے مخالفین کو طلب کیا اور مصنف ابن ابی شیبہ کو منگا کر خود اس کا مطالعہ کیا اور اس قدر پسند کیا کہ اپنے کتب خانہ کے لیے اس کی نقل فراہم کرنے کا حکم دیا اور کہا کہ ہمارا کتب خانہ ایسی اہم کتاب سے خالی نہ ہونا چاہیے اور شیخ الاسلام سے کہا کہ آپ علم کی نشر واشاعت جاری رکھیں اور احادیث رسول کا جو ذخیرہ آپ کے پاس ہے اس سے لوگوں کو فیض یاب فرمائیں اور مخالفین کو بھی تنبیہ کی کہ ان سے آئندہ کسی قسم کا تعرض نہ کریں۔(۲)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۰۴و۲۰۵ وتاریخ ابن عساکر ج ۳ص ۲۷۹ وتاریخ العلماء والرواۃ ص ۱۰۸ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ص ۲۷۸۔

زہد و تقویٰ: زہد و ورع میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، مورخین اور علمائے سیر نے ان کو متدین، زاہد اور صاحب تقویٰ قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ ائمہ محدثین اور زہاد صالحین میں تھے۔

نماز: شب بیدار اور نوافل و تہجد کے پابند تھے، یافعی نے متبتل اور ذہبی نے عابد و متہجد لکھا ہے۔

تلاوت قرآن: تلاوت قرآن سے اتنا شغف تھا کہ ہر رات کو تہجد کی نماز میں پورا قرآن ختم کر دیتے تھے۔

روزہ: رمضان کے علاوہ بھی اکثر مسلسل روزے رکھتے تھے لیکن جمعہ کو افطار کرتے تھے۔

حج بیت اللہ: تیس یا پینتیس مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے وطن سے دو بار بلاد مشرق تشریف لے گئے، پہلی مرتبہ بیس اور دوسری دفعہ چودہ سال تک وہاں مقیم رہے، دونوں مرتبہ ان کا معمول تھا کہ وہ سال بھر مختلف شہروں کے علمائے فن اور محدثین کی خدمت میں حاضر ہو کر علم و فن کی تحصیل کرتے تھے اور حج کے زمانہ میں مکہ معظمہ چلے جاتے اور حج و زیارت سے شرف اندوز ہوتے تھے۔

جہاد: ان میں جہاد کا بھی جذبہ تھا، چنانچہ کئی جنگوں میں شریک ہوئے۔

دعا کی برکت: مستجاب الدعوات تھے اکثر لوگ ان کی دعا کی برکت و تاثیر کی وجہ سے ان سے دعا کی فرمائش کرتے تھے۔

اخلاق و عادات: بڑے ستودہ صفات، متواضع اور خلیق تھے، لوگوں کے درد و غم میں شریک رہتے، ان کی حاجت روائی کرتے، مریضوں کی عیادت اور جنازوں میں شرکت معمول تھا، ہر نیک کام سے رغبت تھی، کبھی کسی سائل کو واپس نہ کرتے، اگر کچھ نہ ہوتا تو کپڑے تک دے دیتے۔

حق پسندی: بڑے حق پسند اور حق گو تھے سچی بات کہنے میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ (1)

---

(1) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ و ۲۰۵ و تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۸۔

وفات: مشہور اور صحیح روایت کے مطابق انھوں نے سہ شنبہ ۲۹ر جمادی الاخریٰ ۲۷۶ھ کو اندلس میں وفات پائی، امام دارقطنی نے ۲۷۳ھ کی بھی روایت کی ہے لیکن یہ ضعیف ہے، محمد بن یزید نے نماز جنازہ پڑھائی اور بنو عباس کی جانب منسوب ایک قبرستان میں دفن کیے گئے۔(۱)

حلیہ: دراز قد تھے، داڑھی گھنی تھی، بالوں میں خضاب لگاتے تھے۔(۲)

تصنیفات: علامہ بقی کثیر التصانیف اور صاحب کمال مصنف تھے، ابن عساکر نے لکھا ہے، انھوں نے نہایت عمدہ کتابیں لکھیں جو ان کی جامعیت، دقت نظر، کثرت مطالعہ اور وسعت معلومات پر شاہد ہیں، ان کی تصنیفات بے نظیر اور اسلام کی اہم اور بنیادی کتابوں میں شمار کی جاتی ہیں'' (۳) مگر افسوس ہے کہ بہت سے قدما کی طرح ان کی کتابیں بھی ناپید ہوگئیں جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

۱- فتاوائے صحابہؓ وتابعینؒ ومن دونہم۔

۲- کتاب التفسیر: اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ علامہ ذہبی ویافعی نے اس کو جلیل القدر بتایا ہے، علامہ ابن حزم کے خیال میں یہ لاجواب اور عدیم المثال تفسیر تھی، وہ اس کو تفسیر ابن جریر پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

۳- ان کی تصنیفات میں مسند کبیر سب سے اہم اور عظیم الشان تصنیف ہے، جو ایک ہزار تین سے زیادہ صحابہؓ کی حدیثوں پر مشتمل ہے، حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ سولہ سو سے زیادہ صحابہؓ کی حدیثیں اس میں درج تھیں، اس کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، اس لیے اس کو مصنف ومسند دونوں کہا جاتا ہے، ابن حزم کے حسب ذیل بیان سے اس کی اہمیت اور صحت واعتبار کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ:

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹ وتاریخ العلماء الاندلس ص ۱۰۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۴ (۳) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۲۷۹۔

''اس کتاب کو انھوں نے صحابہ کے ناموں پر مرتب کیا ہے، اس میں ایک ہزار تین سو سے زیادہ کی روایات ہیں، ہر صحابی کی حدیث کو فقہ و احکام کے ابواب و عنوانات کے تحت نقل کیا گیا ہے، اس اعتبار سے یہ مسند بھی ہے اور مصنف بھی، میرے علم میں اس مرتبہ و اہمیت کی اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں لکھی گئی، انھوں نے اپنی ثقاہت، ضبط، اتقان، حدیث میں جامعیت اور جودتِ شیوخ کے باوجود ایک سو چوراسی راویوں سے اس کی روایت کی ہے جو قریب قریب سب مشہور اور بلند پایہ محدث ہیں۔''(۱)

علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''ابن حزم نے اس کو مسند احمد بن حنبل پر ترجیح دی ہے، جو میرے خیال میں محل نظر ہے، مسند ابن حنبل اس سے بھی زیادہ جامع وجید کتاب ہے۔''(۲)

☆☆☆

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۲۷۹ و کشف الظنون ج ۲ ص ۴۳۱ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۶۔

امام ابوعیسیٰ ترمذیؒ

(متوفی ۲۷۹ھ)

نام ونسب: امام موصوف نسباً قبیلۂ بنی سلیم سے تعلق رکھتے تھے، محمد نام، ابوعیسیٰ کنیت ہے اور نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن سورہ بن موسیٰ بن ضحاک، سلمی ترمذی بوغی، علامہ سمعانی نے ضحاک کے بجائے شداد لکھا ہے۔(۱)

وطن: خراسان اور ماوراء النہر کا خطہ ہمیشہ سے علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہا ہے، تاریخ اسلام کے بہت سے نامور علما اسی خاک سے اٹھے، امام ابوعیسیٰ ترمذی بھی اسی مردم خیز سرزمین کے ایک فرزند تھے، صنعانیان کے مشہور شہر ترمذ کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہے، ترمذ کا لفظ ترمذ، تَرمذ، تُرمذ تینوں طریقوں سے ہے لیکن عام طور پر ترمذ ہی مشہور ہے، یاقوت نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے،(۲) یہ شہر دریائے جیحون کے مشرقی کنارے پر بلخ کے محاذ میں کسی زمانہ میں بڑا آباد اور بارونق شہر تھا، یہاں بڑے بڑے ارباب کمال پیدا ہوئے، سمعانی اور یاقوت نے بعض کے مختصر حالات لکھے ہیں، بوغی ایک قریہ بوغ کی جانب نسبت ہے، جو ترمذ سے چھ فرسخ کی مسافت پر ہے، بعض روایتوں کے مطابق امام ترمذی اسی میں آسودۂ خواب ہیں۔(۳)

---

(۱) دیکھو کتاب الانساب نسبت ترمذی ورق ۱۰۶ (۲) معجم البلدان ج ۲ ص ۳۸۲ ذکر ترمذ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۳۔

پیدائش: امام موصوف ۲۰۹ھ میں ترمذ میں پیدا ہوئے، اس کی تفصیل نہیں ملتی کہ انھوں نے ابتدائی تعلیم کہاں حاصل کی لیکن اس زمانہ میں خراسان اور ماوراء النہر کا علاقہ علم و فن کا مرکز بن چکا تھا اور امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث کی مسندِ علم بچھ چکی تھی اور دور دور کے تشنگان علم یہاں کھچ کھچ کر آتے تھے، اس سے قیاس یہی ہے کہ امام ترمذی نے ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی ہوگی۔

سماع حدیث کے لیے سفر: اسلام کی تعلیمات اور علم دین کی بنیاد کتاب اللہ کے بعد حدیث نبوی پر ہے، اس کے بغیر دین کا صحیح اور پورا علم نہیں ہوسکتا، اس لیے ہر دور میں مسلمانوں نے اس کی جانب بڑا اعتنا کیا، خصوصاً ابتدائی چند صدیوں میں اس کی اشاعت وحفاظت کا اتنا اہتمام کیا جس کی مثال دنیا کی کوئی قوم پیش نہیں کرسکتی، نفس حدیث کے متعلق بہت سے علوم ایجاد ہوگئے، حجاز، عراق، خراسان، ماوراء النہر، شام و مصر و مغرب وغیرہ دنیائے اسلام کے گوشہ گوشہ میں مرکز حدیث قائم ہوگئے تھے، حجاز کے بعد عراق و خراسان کو اس باب میں ایک خاص امتیاز حاصل رہا ہے، اکثر بڑے بڑے محدثین یہیں پیدا ہوئے، اس لیے ان مقامات میں حدیث کا ذوق و شوق عام تھا، امام بخاری کے علم و شہرت نے اس شوق کو اور بڑھایا، اسی ماحول میں امام ترمذی کا نشو و نما ہوا، خود ان کے وطن میں امام بخاری جیسے جلیل القدر محدث پیدا ہوچکے تھے، اس لیے امام ترمذی کو بھی حدیث نبوی کا شوق دامن گیر ہوا، چنانچہ انھوں نے خراسان اور ماوراء النہر کے علاوہ سماع حدیث کے لیے دنیائے اسلام کے مختلف حصوں کا سفر کیا، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں طاف البلاد وسمع خلقاً من الخراسانيين والعراقيين والحجاز۔ (۲) یعنی انھوں نے متعدد شہروں کا سفر کیا اور خراسان و عراق اور حجاز کے ارباب کمال سے سماع کیا۔

اساتذہ: ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، ان کے ناموں پر نظر ڈالنے سے اندازہ

ابن خلکان ج ۲ ص ۴۸۳ (۲) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۳۸۷۔

ہوتا ہے کہ انھوں نے اس دور کے ہر خرمن حدیث سے خوشہ چینی کی، ان میں امام بخاری ومسلم کے شیوخ بھی ہیں، ان سب کا استقصا دشوار ہے، سمعانی اور ذہبی نے بعض ممتاز شیوخ کے نام لکھے ہیں، امام بخاری، مسلم، علی بن حجر مروزی، ہناد بن سری، ابوکریب، محمد بن العلا، محمد بن موسیٰ الزمن، محمد بن بشار، عبداللہ بن عبدالرحمٰن الدارمی، قتیبہ بن سعید، ابومصعب، ابراہیم بن عبداللہ ہروی، اسماعیل بن موسیٰ، سوید بن نصر، محمد بن عبدالملک، عبداللہ بن معاویہ جمحی، وغیرہ (۱) یہ تمام شیوخ اپنے عہد کے جلیل القدر محدث تھے، اکثر اصحاب صحاح نے ان سے استفادہ کیا ہے، ان کے مختصر حالات یہ ہیں:

۱- ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس سعدی مروزی بڑے متبحر عالم اور اکابر حفاظ حدیث میں تھے، شعر وادب کا بھی ذوق رکھتے تھے، حدیث کے علاوہ قرآن کے بڑے عالم تھے، ذہبی نے ان کی کتاب احکام القرآن کا ذکر کیا ہے ۲۴۴ھ میں وفات پائی۔ (۲)

۲- ابوالسری ہناد بن سری تمیمی، بڑے عابد ومرتاض محدث تھے، ذہبی انھیں قدوہ، زاہد اور شیخ الکوفہ لکھتے ہیں، ساری عمر علائق دنیوی سے آزاد ہو کر، عبادت وریاضت میں بسر کی، زہد وعبادت کی وجہ سے کوفہ کے راہب کہلاتے تھے، امام احمد لوگوں کو ان کی جانب رجوع کرنے کا مشورہ دیتے تھے، زہد پر ایک کتاب بھی لکھی تھی، ۲۴۳ھ میں وفات پائی (۳)

۳- ابوکریب محمد بن العلا بڑے جلیل القدر حافظ تھے، کوفہ میں ان کا کوئی مقابل نہ تھا، حفظ حدیث میں وہ اپنے شیوخ سے بھی زیادہ معتبر مانے جاتے تھے، انھوں نے کوفہ میں تین لاکھ حدیثوں کی اشاعت کی، ان کے ایک شاگرد موسیٰ بن اسحاق نے ان سے ایک لاکھ حدیثیں سنی تھیں، ۲۴۸ھ میں وفات پائی۔ (۴)

۴- ابوبکر محمد بن بشار بن عثمان عبدلی، بصرہ کے بڑے حافظ حدیث تھے، ان کے

(۱) کتاب الانساب نسبت ترمذی وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۶ (۳) ایضا ص ۹ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۸۰۔

تلامذہ کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے، ان کی روایات میں بعض محدثین نے کلام کیا ہے لیکن ان کا درجہ اس سے ظاہر ہے کہ بخاری و مسلم ان سے حدیثیں لیتے تھے، ۲۵۲ھ میں وفات پائی۔ (۱)

۵- ابو محمد عبداللہ بن عبدالرحمٰن تمیمی، دارمی، سمرقند کے جلیل القدر عالم اور حافظ حدیث تھے، ان کی علمی جلالت اور حفظ حدیث پر محدثین کا اتفاق ہے، امام احمد بن حنبل انھیں امام حدیث کہتے تھے، فقہ و تفسیر میں بھی کمال حاصل تھا، زہد وورع میں بھی ممتاز تھے، محمد بن ابراہیم کا بیان ہے کہ وہ عقل و دیانت کے انتہائی درجہ پر تھے، ان کا علم حفظ و درایت اور زہد و عبادت ضرب المثل تھا، سمرقند میں انہی کی ذات سے حدیث و آثار کی اشاعت ہوئی، وہ مفسر کامل اور فقیہ عالم تھے، فن حدیث و تفسیر مین ان کی تصانیف ہیں، ابن حبان لکھتے ہیں کہ وہ حافظ و متقن اور زاہد و متورع تھے، انھوں نے حفظ کے ساتھ حدیثوں کو جمع کیا، ان کو سمجھا، اس پر کتاب لکھی، سنت کو پھیلایا، اس کی حفاظت کی، اس کی دعوت دی، اس کے مخالفوں کو مٹایا، خطیب لکھتے ہیں کہ انھوں نے حدیث کی تلاش میں بڑے طویل سفر کیے، وہ حفظ واتقان، صدق وورع، زہد و عبادت تمام کمالات کے جامع تھے، بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی سب نے ان سے فیض حاصل کیا ہے، دنیاوی وجاہت سے بھاگتے تھے، ایک مرتبہ اصرار سے مجبور ہوکر عہدۂ قضا قبول کرلیا تھا لیکن پھر ایک ہی فیصلہ کے بعد مستعفی ہوگئے، ۲۵۵ھ میں وفات پائی۔ (۲)

۶- ابورجا قتیبہ بن سعید بلخی بغلانی، خراسان کے نامور حافظ حدیث تھے، حافظ ذہبی انھیں شیخ الحفاظ اور محدث خراسان لکھتے ہیں، ان کے حفظ پر محدثین کا اتفاق ہے، دولت علم کے ساتھ دولت دنیا سے بھی بہرہ ور تھے، ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔ (۳)

۷- ابو مصعب احمد بن ابی بکر زہری امام مالک کے شاگرد رشید اور مدینہ منورہ

---

(۱) تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۷۰-۷۱ (۲) تہذیب ج ۵ ص ۲۹۶ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۳۳۔

کے مشہور محدث، فقیہ اور قاضی تھے، فقہ میں ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی انھیں امام الفقہ لکھتے ہیں، اہل مدینہ کے مذاہب پر بڑی وسیع نظر تھی، ابن حجر نے سنہ وفات ۲۴۲ھ اور ذہبی نے ۲۹۹ھ لکھا ہے۔(۱)

۸- ابو اسحاق ابراہیم بن عبدالرحمٰن ہروی، اصل وطن ہرات تھا لیکن بغداد میں متوطن ہو گئے تھے، ہرات کے ممتاز حفاظ میں تھے۔(۲)

۹- ابو محمد اسماعیل بن موسیٰ فزاری کوفہ کے محدث تھے، ان کے تشیع کی وجہ سے بعض محدثین نے ان کی روایات میں کلام کیا ہے لیکن ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے اور بخاری، ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے ان سے روایت کی ہے، ۲۴۵ھ میں وفات پائی۔(۳)

۱۰- ابوبکر محمد بن عبدالملک، امام احمد بن حنبل کے خاص اصحاب میں ہیں، بغداد کے محدث تھے، طلب حدیث میں بڑے طویل سفر کیے، تمام اصحاب سنن نے ان سے روایتیں لی ہیں ۲۵۸ھ میں وفات پائی۔(۴)

۱۱- ابوجعفر عبداللہ بن معاویہ جمحی بصرہ کے محدث تھے، ابن حبان نے ثقات میں لکھا ہے، اصحاب صحاح میں ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ کے شیخ تھے ۲۴۳ھ میں وفات پائی (۵)

حافظہ: امام ترمذی کے لیے قدرت کی جانب سے حفظ کے تمام سامان فراہم ہو گئے تھے، ایک طرف شیوخ میں ایسے اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، دوسری طرف حافظہ نہایت قوی تھا اس کا ایک حیرت انگیز واقعہ رجال کی تقریباً سب کتابوں میں موجود ہے کہ انھوں نے ایک شیخ سے ایک جزو کے بقدر حدیثیں قلم بند کیں، اتفاق سے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ان کو پھر ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا، انھوں نے شیخ مذکور سے دوبارہ سماع حدیث کی

---

(۱) تہذیب ج ۱ ص ۲۰ وتذکرہ ج ۲ ص ۲۷ (۲) تہذیب تذکرۂ ابراہیم (۳) تہذیب ج ۱ ص ۳۳۵ و ۳۳۶ (۴) تذکرہ ج ۲ ص ۱۳۳ (۵) تہذیب ج ۶ ص ۳۸۔

درخواست کی، شیخ نے سنانا شروع کی، امام ترمذی کے ہاتھ میں ایک سادہ بیاض تھی، شیخ کو شبہ ہوا کہ اس میں وہ حدیثیں لکھی ہوئی ہیں، ابوعیسیٰ امتحاناً ایسا کر رہے ہیں، اس لیے ان کو ناگوار ہوا، ابوعیسیٰ نے یہ غلط فہمی دور کر کے کہا کہ مجھے آپ کی حدیثیں حفظ ہیں اور اسی وقت کل حدیثیں سنا دیں، شیخ نے کہا معلوم ہوتا ہے تم نے میرے پاس آنے سے پہلے ان کو حفظ کر لیا تھا، ابوعیسیٰ نے کہا نہیں، اگر آپ کو شبہ ہو تو دوسری حدیثیں سنا کر امتحان کر لیجیے، شیخ نے امتحاناً چالیس غریب حدیثیں سنائیں، ابوعیسیٰ نے صرف ایک مرتبہ سن کر اسی وقت چالیسوں حدیثیں دہرا دیں، یہ غیر معمولی حافظہ دیکھ کر شیخ کو بھی اس کا اعتراف کرنا پڑا۔(۱)

اعتراف کمال: یوں تو امام ترمذی نے بہت سے شیوخ سے استفادہ کیا تھا لیکن جس سے ان کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچا، وہ امام بخاری ہیں، وہ امام بخاریؒ کے خاص تلامذہ میں تھے، ان کے فیض اور امام ترمذی کے حافظۂ ذوق وشوق اور تلاش وجستجو نے ان کو اس عہد کا امام بنا دیا، ان کے علم وکمال پر تمام محدثین اور علما کا اتفاق ہے، ابن حبان لکھتے ہیں کہ امام ترمذی ان لوگوں میں تھے جنھوں نے حدیثوں کا ذخیرہ جمع کیا، اس پر تصنیف کی اور انھیں حفظ کیا، حافظ ذہبی اور ابن حجر دونوں ان کو امام حدیث لکھتے ہیں، امام بخاری کے بعد خراسان میں ان سے بڑا کوئی محدث نہ تھا، "مات البخاری ولم یخلف بخراسان مثل ابی عیسی فی العلم والورع" وہ امام بخاری کے خلیفہ شمار کیے جاتے تھے، خود امام بخاری کو لائق شاگرد پر ناز تھا اور انھوں نے ان الفاظ میں ان کے کمال علم کی سند عطا کی تھی کہ تم نے مجھ سے جتنا فائدہ حاصل کیا، اس سے زیادہ میں نے تم سے حاصل کیا، (۲) اس سند کے بعد امام ترمذی کے لیے اور کسی سند کی ضرورت نہیں رہ جاتی، امام بخاری نے ان سے ایک حدیث روایت کی ہے۔

تلامذہ: ان کے علمی کمالات نے ان کی ذات کو طالبان حدیث کا مرجع بنا دیا تھا، ان کے

---

(۱) بستان ص ۱۲۱ (۲) تہذیب ج ۹ ص ۳۸۹ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸ و بستان المحدثین ص ۱۲۱۔

تلامذہ میں خراسان اور ترکستان کے علاوہ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں کے آدمیوں کے نام ملتے ہیں، چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابو حامد احمد بن عبداللہ بن داؤد مروزی، ہیثم بن کلیب الشامی، محمد بن محبوب، ابو العباس محبوبی مروزی، احمد بن یوسف نسفی، ابو الحارث اسد بن حمدویہ، داؤد بن نصر بن سہل بزدوی، عبد بن محمد بن محمود نسفی، محمود بن نمیر، محمد بن محمود، محمد بن مکی بن نوح، ابو جعفر محمد بن سفیان بن النظر، محمد بن المنذر وغیرہ۔(۱)

تفسیر: حدیث امام ترمذی کا خاص فن تھا، اس کے علاوہ تفسیر میں پورا درک اور فقہ میں کمال رکھتے تھے، ترمذی میں انھوں نے ابواب تفسیر کے تحت میں آیات قرآنی کے متعلق جو احادیث نبوی اور آثار صحابہ جمع کیے ہیں ان سے تفسیر کے متعلق ان کے علم ونظر کا اندازہ ہوتا ہے۔

فقہ: حفظ حدیث کے ساتھ وہ مجتہد فقیہ تھے، ان کے تفقہ پر جامع ترمذی شاہد ہے، ترمذی کا خاص امتیاز یہی ہے کہ وہ محض احادیث کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ فقہی اجتہاد کی کتاب بھی ہے، اس میں امام ترمذی نے مختلف ائمہ کے فقہی مذاہب، ان کے استنباطات اور دلائل کو جمع کر دیا ہے اور جا بجا اس پر تنقید بھی کرتے گئے ہیں، مزید بحث آئندہ آئے گی۔

عملی زندگی: امام ترمذی میں جس درجہ کا علم تھا، اسی درجہ کا عمل اور زہد وتقویٰ بھی تھا، وہ زہد وورع میں بھی امام بخاری کے جانشین تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

مات البخاری ولم یخلف بخراسان مثل ابی عیسیٰ فی العلم والحفظ والورع والزھد۔(۲)

خشیت الٰہی: ان کا دل خشیت الٰہی سے اتنا لبریز تھا کہ ہر وقت رویا کرتے تھے اور روتے روتے آنکھوں کی بینائی جاتی رہی تھی (۳) لیکن دل کی آنکھیں روشن ہوگئی تھیں، بعض

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ ص۳۸۷ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۰۸ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۰۸

روایتوں میں ہے کہ وہ پیدائشی نابینا تھے لیکن یہ صحیح روایتوں کے خلاف ہے اور یوں بھی خلاف قیاس ہے، اس لیے کہ ایک نابینا کا ایسے زمانہ میں جب کہ سفر کی سہولتیں نہ تھیں ساری دنیائے اسلام کی خاک چھاننا عقل سے بعید ہے اور طلب حدیث کے لیے امام ترمذی کی سیاحت مسلم ہے۔

امام ترمذی کا مذہب: امام ترمذی کا زمانہ ائمہ اربعہ کے بعد ہے لیکن وہ ان میں سے کسی کے مقلد نہ تھے بلکہ خود مجتہد تھے، بعض مسائل میں امام احمد بن حنبل اور امام شافعی کی تائید سے بعضوں کو یہ گمان ہوا کہ وہ شافعی یا حنبلی تھے لیکن اس سے ان کی تقلید کا نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے، انھوں نے بعض مسائل میں ان کی مخالفت بھی کی ہے، مثلاً گرمی کی شدت میں نماز ظہر کی تاخیر کے مسئلہ میں ان کی رائے امام شافعی کے خلاف ہے، وہ اپنی تحقیق سے جو رائے دیتے تھے، کبھی کسی کے موافق پڑ جاتی تھی اور کبھی مخالف، اس لیے کسی امام کی تائید سے ان کو اس کا مقلد سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

ایک التباس کا ازالہ: امام ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ دو اور محدثین ترمذی کی نسبت سے مشہور ہیں، ایک ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف بحکیم الترمذی، دوسرے ابوالحسن احمد بن حسن ترمذی، یہ دونوں صاحب تصنیف ہیں، حدیث میں حکیم ترمذی کی نوادر الاصول مشہور کتاب ہے لیکن یہ بہت غیر معتبر ہے، اس لیے نام سے دھوکا نہ کھانا چاہیے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

''حکیم ترمذی ابوعیسیٰ ترمذی کے علاوہ دوسرے شخص ہیں، حکیم ترمذی کی نوادر الاصول کی اکثر حدیثیں غیر معتبر ہیں، ناواقف حکیم ترمذی کو ابوعیسیٰ ترمذی سمجھ کر ان کی غیر معتبر حدیثیں امام ترمذی کی جانب منسوب کر دیتے ہیں، ان دونوں میں فرق کرنا ضروری ہے (۱) ابوالحسن ترمذی البتہ بڑے پایہ کے محدث ہیں امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں

(۱) بستان المحدثین ص ۶۸۔

تھے، بخاری، ترمذی اور ابن ماجہ وغیرہ نے ان سے روایتیں کی ہیں، ۲۴۰ھ میں وفات پائی۔(۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق امام ترمذی نے ۲۷۹ھ میں وفات پائی۔(۲)

تصانیف: مورخین کے اجمالی بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام ترمذی کی بہت سی تصانیف تھیں لیکن ان کی تین تصانیف کا علم ہے، جامع یا سنن ترمذی، شمائل ترمذی اور کتاب العلل، ابن ندیم نے تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، ان میں دو تو ترمذی اور کتاب العلل ہیں لیکن تیسری کا نام اس نے کتاب التاریخ لکھا ہے۔(۳)

جامع ترمذی سے پہلے کی کتب حدیث: امام ترمذی سے بہت پہلے مسلمانوں میں نہ صرف حفظ وطلب حدیث بلکہ اس کی تدوین کا بھی شوق پیدا ہو گیا تھا اور محدثین کی یادداشتوں کے علاوہ باقاعدہ مرتب ومبوب کتابیں مرتب ہو چکی تھیں، خود ترمذی کے زمانہ میں بھی حدیث کی مختلف قسموں کے مجموعے مرتب ہوئے، ان میں اولیت کا سہرا امام دار الہجرۃ امام مالک کے سر ہے۔

موطا کے علاوہ اس وقت تک حدیث کی جو کتابیں تالیف ہو چکی تھیں، اُن میں سے بعض قابل ذکر کتابوں کے نام یہ ہیں:

مسند ابوداؤد طیالسی المتوفی ۲۰۴ھ، مصنف عبدالرزاق بن ہمام المتوفی ۲۱۱ھ، مسند عبداللہ بن زبیر حمیدی المتوفی ۲۱۹ھ، سنن سعید بن منصور المتوفی ۲۲۷ھ، مصنف عبداللہ بن محمد المعروف بہ مصنف ابن ابی شیبہ المتوفی ۲۳۵ھ، مسند عبداللہ بن حمید الکشی المتوفی ۲۴۰ھ، مسند احمد بن حنبل المتوفی ۲۴۱ھ، مسند عبداللہ بن عبدالرحمٰن تمیمی دارمی المتوفی ۲۵۵ھ، صحیح محمد بن اسماعیل بخاری المتوفی ۲۵۶ھ، صحیح مسلم بن حجاج المتوفی ۲۶۱ھ، سنن ابن ماجہ المتوفی ۲۷۳ھ، سنن ابی داؤد المتوفی ۲۷۵ھ، مسند یحییٰ بن عبدالحمید حمانی المتوفی ۲۲۸ھ، مسند

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۱۷ (۲) اتحاف النبلاء ص ۴۸۷ (۳) فہرست ابن ندیم ص ۳۲۵۔

نعیم بن حماد خزاعی المتوفی ۲۲۸ھ، مسند مسدد بن مسرہد المتوفی ۲۲۸ھ، مسند اسحاق بن راہویہ المتوفی ۲۳۸ھ۔(۱)

ان کے علاوہ اور بھی کتابیں ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ترمذی سے پہلے کتنے راہ رواس دشوار گذار منزل سے گذر چکے تھے، گوان میں سے زیادہ تر مؤطا امام مالک، صحیح بخاری اور صحیح مسلم کو حسن قبول کا درجہ حاصل ہوا لیکن اعتبار اور استناد سے بعض اور کتابیں بھی محروم نہ رہیں، ان کی موجودگی میں حدیث کی کسی اور کتاب کی تالیف کا خیال اور اس کا حسن قبول پانا اور بھی دشوار تھا، اس لیے امام ترمذی نے گذشتہ کتابوں سے الگ اپنی راہ نکالی اور اپنی کتاب میں ایسی خصوصیات پیدا کیں جن سے گذشتہ کتابیں خالی تھیں، اس سے نہ صرف یہ کتاب اپنی ماسبق کتابوں سے ممتاز ہوگئی، بلکہ فائدہ کے لحاظ سے بھی سب سے بڑھ گئی، اس کی تفصیل آئندہ آئے گی۔

جامع ترمذی: تمام فنون خصوصاً فن حدیث میں کمیت سے زیادہ اس کی کیفیت نقص وکمال کا معیار ہے، یعنی روایت اور درایت کے اصول کے اعتبار سے صحیح حدیثوں کا مختصر مجموعہ معلل حدیثوں کے ضخیم مجموعوں سے کہیں بہتر ہے، اسی معیار سے ہم کو جامع ترمذی کا جائزہ لینا چاہیے، ترمذی کا درجۂ صحت اس سے ظاہر ہے کہ امت نے اس کو صحاح کا درجہ دیا اور ترتیب میں اس کو صحیحین کے بعد ہی جگہ ملی۔

حدیث کی صحت وعدم صحت کا مدار دو چیزوں پر ہے، رواۃ کی حیثیت اور سلسلۂ سند کی کیفیت، اصول حدیث کے رو سے رواۃ کے بارے میں سب اصحاب صحاح کے بنیادی شرائط تقریباً یکساں ہیں، یعنی راوی کا اسلام، فہم وفراست، صداقت، عدم تدلیس، عدالت مع جملہ شرائط حفظ، ضبط، تیقظ، عدم وہم، سلامت ذہن اور صحت عقیدہ سب کے نزدیک ضروری شرائط ہیں۔(۲) پھر ان اوصاف میں کمی وزیادتی کے اعتبار سے رواۃ کے

(۱) ان کتابوں کی تفصیل کے لیے دیکھو بستان المحدثین شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ (۲) اصحاب ستہ کے شرائط بہت سی کتابوں میں ہیں، ہمارے پیش نظر ابو بکر حازمی کی شروط الائمۃ الخمسہ ہے۔

مدارج قائم ہو جاتے ہیں اور ان مدارج اور سند کی حیثیت اور اس کے اقسام کے اعتبار سے حدیث کی صحت وعدم صحت اور نقص وکمال سے اختلاف شروع ہو جاتا ہے، مثلاً امام بخاری اور مسلم عموماً وہی حدیثیں قبول کرتے ہیں جن کے راویوں کی ثقاہت وعدالت متفق علیہ ہو، جرح وتعدیل کے رو سے بالکل مامون ومصئون ہوں، سند نقائص سے پاک ہو، بلکہ حاکم نے صحیحین کے شرائط میں ایک روایت کے لیے ان اوصاف کے دو راویوں کے ہونے کا ذکر کیا ہے لیکن یہ شرط کلیہ کی صورت میں صحیح نہیں ہے کیوں کہ امام بخاری کی تمام روایتیں اس شرط کے مطابق نہیں ہیں، البتہ اس کا بڑا حصہ اسی قسم کا ہے۔

امام ترمذی کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ روایت کسی نہ کسی امام یا محدث کی معمول بہا ہونا چاہیے، خواہ راوی اور سند اصول حدیث کے رو سے یکسر نقائص سے پاک نہ ہو، چنانچہ وہ چوتھے طبقہ تک کے راویوں کی روایتیں قبول کر لیتے ہیں اور صحیح، مسلسل اور مرفوع روایتوں کے ساتھ ضعیف، مرسل، منقطع اور مضطرب روایتوں کو بھی رد نہیں کرتے لیکن عموماً اس قسم کی روایتوں کو وہ شواہد اور متابعات کی حیثیت سے لیتے ہیں یعنی ایک صحیح روایت کے ساتھ اس کی تائید میں دوسری معلل روایت قبول کرتے ہیں لیکن وہ ہر روایت کا عیب وہنر اور نقص وکمال بھی ظاہر کر دیتے ہیں، اس لیے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے، یہ خصوصیت ترمذی کے علاوہ صحاح کی اور کسی کتاب میں نہیں ہے۔

جامع ترمذی کی خصوصیات: گو صحاح میں ترتیب کے لحاظ سے ترمذی کا درجہ صحیحین کے بعد ہے لیکن اس کی خصوصیات کی وجہ سے اس کا افادہ صحاح کی تمام کتابوں سے زیادہ عام ہے، شیخ الاسلام اسماعیل ہروی لکھتے ہیں کہ ترمذی بخاری اور مسلم سے زیادہ فائدہ بخش ہے، ان دونوں کتابوں سے صرف صاحب کمال اور صاحب نظر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ترمذی نے احادیث کی ضروری شرح بھی کر دی ہے، اس لیے اس سے محدثین اور فقہا وغیرہ ہر طبقہ کے

لوگ مستفید ہو سکتے ہیں،(۱) ترمذی کی یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی تمام حدیثیں کسی نہ کسی امام، محدث، یا فقیہ کی معمول بہا ہیں، یعنی ہر روایت کسی نہ کسی صاحب علم کے نزدیک صحیح، اسقام سے پاک، لائق حجت اور قابل عمل ہے، صرف دو حدیثیں اس سے مستثنیٰ ہیں، ایک یہ کہ ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر خوف وخطر یا سفر اور بارش کی رخصت کے مدینہ میں ظہر اور عصر کی نمازیں ایک ساتھ پڑھیں۔'' دوسری یہ کہ ''جب کوئی شراب پیئے تو اس کے کوڑے لگاؤ، تین مرتبہ سزا کے بعد بھی اگر باز نہ آئے تو قتل کر دو۔''(۲)

۲- دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف اس میں روایات کی تکرار بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے، دوسری طرف ایک مسئلہ کے متعلق مختلف روایتوں کی جانب اشارہ بھی کر دیا ہے، مثلاً ایک روایت نقل کرنے کے بعد لکھ دیتے ہیں کہ اس باب میں فلاں فلاں راویوں سے بھی حدیث مروی ہے اور اس روایت کے متن میں جو کمی یا زیادتی ہوتی ہے اس کو بھی ظاہر کر دیتے ہیں۔

۳- تیسری خصوصیت یہ ہے کہ جرح وتعدیل کے رو سے جس روایت یا سند میں جو عیب وہنر ہوتا ہے، اس کو ظاہر کر دیتے ہیں، مثلاً یہ حدیث صحیح ہے، حسن ہے، ضعیف ہے، مضطرب ہے، مرسل ہے، منقطع ہے، غیر محفوظ ہے، سند قوی نہیں ہے، فلاں راوی متکلم فیہ ہے، اس کے حفظ میں کلام ہے، یا نسیان ہے، وغیر ذالک، جس سے پڑھنے والے کو اس کی حیثیت اور درجہ کا علم ہو جاتا ہے۔

۴- چوتھی یہ کہ فقہی حدیثوں میں فقہا کے مذاہب، ان کے استنباطات دلائل اور ان کے اختلافات اور اس پر اپنی رائے بھی ظاہر کر دیتے ہیں مثلاً اس حدیث سے فلاں امام نے احتجاج واستدلال کیا ہے، اس میں یہ اختلاف ہے، یا اس کا استدلال صحیح نہیں ہے،

(۱) مقدمہ احوذی (۲) کتاب العلل ص ۷۴۶۔

اس سے ائمہ کے مذاہب اوران کے اختلافات کا بھی علم ہو جاتا ہے، اس خصوصیت نے ترمذی سے فقہی استفادہ کو بہت آسان کر دیا ہے۔

۵- پانچویں یہ کہ رواۃ کے ناموں، کنیتوں اور القاب کے اجمال کی تفصیل کر دی ہے۔

اس کی ان خصوصیات نے ترمذی کی افادی حیثیت کو بھی بڑھا دیا ہے، ابن اثیر جزری لکھتے ہیں کہ حسن ترتیب مکررات کی کمی اور فائدہ کی زیادتی کے لحاظ سے ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے، اس کے علاوہ اور کسی کتاب میں مختلف مذاہب، ان کے وجوہ استدلال اور حسن وغریب حدیث کے اقسام کی تفصیل نہیں ہے۔" (۱)

شمائل ترمذی کے محشی شیخ ابراہیم بن محمد شافعی باجوری کہتے ہیں کہ امام ترمذی کی جامع تمہارے لیے کافی ہے، وہ تمام حدیثی اور فقہی فوائد اور سلف وخلف کے مذاہب کی جامع، مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کو دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے۔ (۲)

شاہ ولی اللہ صاحب کے نزدیک جامع ترمذی، بخاری، مسلم اور ابوداؤد تینوں کی بعض اچھی خصوصیات کی جامع ہے اور اس میں ان سے زیادہ مفید باتیں ہیں، چنانچہ وہ بخاری، مسلم اور ابوداؤد کی خصوصیات بتانے کے بعد لکھتے ہیں:

"چوتھے ابوعیسیٰ ترمذی ہیں، انھوں نے بخاری، مسلم اور ابوداؤد کی بعض خصوصیات کو اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے، شیخین کے طریقہ پر متون اور اسناد کے ابہام کی تفصیل کر دی ہے اور ابوداؤد کے طریقہ پر ان احادیث کو جمع کر دیا ہے جن پر کسی کا عمل ہے اور ان تینوں پر یہ اضافہ ہے کہ صحابہ اور مختلف ملکوں کے فقہا کے مذاہب کا بھی ذکر کر کے اپنی کتاب کو جامع بنا دیا ہے، طرق حدیث کا نہایت لطیف اختصار کیا ہے، اس طرح کہ ایک حدیث نقل کر کے دوسرے طرق کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور ہر حدیث کے عیب و ہنر کو ظاہر کر دیا ہے کہ صحیح یا حسن یا ضعیف یا منکر ہے اور وجہ ضعف بھی بتا دی ہے تا کہ طالب کو قابل

(۱) جامع الاصول و...... ص ۱۰۳ (۲) مواہب لدنیہ ص ۷۔

اعتبار اور نا قابل اعتبار حدیث سے واقفیت ہو جائے ، جس کا نام بتانے کی ضرورت تھی ، اس کا نام لے لیا ہے جس کی کنیت کی ضرورت تھی ، اس کی کنیت بتادی ہے ، غرض انھوں نے صاحب علم کے لیے کوئی چیز مخفی نہیں چھوڑی ہے ، اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جامع ترمذی مجتہد کے لیے کافی اور مقلد کے لیے دوسری کتابوں سے بے نیاز کرنے والی ہے ، (۱) شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی رقمطراز ہیں کہ "یہ جامع ترمذی حدیث کی بہترین کتابوں میں ہے بلکہ بعضے وجوہ اور حیثیات سے حدیث کی تمام کتابوں سے بہتر ہے ، ایک ترتیب وعدم تکرار کی حیثیت سے دوسرے فقہا کے مذاہب اور ان کے استدلال کے ذکر کی حیثیت سے ، تیسرے حدیث کے اقسام صحیح ، حسن ، ضعیف ، غریب اور معلل بعلل کے ذکر کی حیثیت سے ، چوتھے رواۃ کے نام ، ان کے القاب اور کنیتوں اور علم رجال کے متعلق دوسرے فوائد کی حیثیت سے ۔ (۲)

ابن حزم کی تنقید: امام ترمذی کی علمی جلالت اور جامع ترمذی کی مذکورہ بالا خصوصیات کے باوجود اس پر بعض محدثین نے تنقید بھی کی ہے ، ان میں سب سے زیادہ حیرت انگیز امام ابن حزم کا امام ترمذی کو مجہول لکھنا ہے لیکن ان کے اس بیان کو بالاتفاق محدثین نے رد کیا ہے اور اس کو امام ترمذی سے ابن حزم کی ناواقفیت کا نتیجہ قرار دیا ہے ، چنانچہ حافظ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں :

"حافظ العلم ابوعیسیٰ ترمذی کی ثقاہت متفق علیہ ہے اور ان کے بارے میں ابو محمد بن حزم کا یہ قول کہ وہ مجہول ہیں ، ناقابل توجہ ہے ، درحقیقت ابن حزم ان سے اور ان کی کتاب جامع اور علل سے واقف ہی نہ تھے ۔" (۳)

حافظ ابن حجر امام ترمذی کے کمالات لکھنے کے بعد فرماتے ہیں :

"ابو محمد بن حزم نے ترمذیؒ ، مجہول لکھ کر اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیا ہے ، وہ غالباً

---

(۱) حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۲۱ (۲) بستان المحدثین ص ۱۲۱ (۳) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۱۱۷ ۔

ترمذی سے واقف ہی نہ تھے اور نہ ان کو ان کے حفظ اور تصانیف کی خبر تھی، ابن حزم نے اس قسم کے الفاظ بعض اور مشہور ثقات حفاظ مثلاً امام ابوالقاسم بغوی، اسماعیل بن محمد الصفار اور ابوالعباس الاصم وغیرہ کے متعلق بھی استعمال کیے ہیں، یہ البتہ تعجب انگیز امر ہے کہ حافظ ابن الفرضی نے اپنی کتاب ''المؤتلف والمختلف'' میں ترمذی کے رتبہ کے مطابق ان کا تذکرہ کیا ہے، اس پر ابن حزم کی نظر کیسے نہیں پڑی۔''(۱)

موضوعات ابن جوزی اور جامع ترمذی: اس سلسلہ میں دوسری چیز یہ ہے کہ ابن جوزی نے موضوعات میں ترمذی کی ۲۳ روایتوں کو موضوع شمار کیا ہے لیکن محدثین نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے، اس بارے میں ابن جوزی کا تشدد مشہور ہے، جس طرح حاکم حدیث کی تحسین کرنے میں غیر محتاط ہیں، اسی طرح ابن جوزی موضوع کہہ دینے میں متشدد ہیں اور ان دونوں کا یہ تشدد و تساہل مشہور ہے، ابن جوزی نے ترمذی کے علاوہ صحاح کی بعض اور کتابوں بلکہ صحیح مسلم تک کی بعض روایات کو موضوع کہہ دیا ہے، محدثین نے ان کے اس تشدد پر بحث کی ہے، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

''ابن جوزی کی موضوعات میں زیادہ تر موضوع حدیثیں ہیں اور قابل تنقید حدیثوں کے مقابلہ میں نا قابل تنقید حدیثیں بہت کم ہیں، پھر بھی اس میں ایک خرابی یہ ہے کہ ابن جوزی بعض ان حدیثوں کو بھی جو موضوع نہیں ہیں، موضوع گمان کر لیتے ہیں جس طرح حاکم میں یہ نقص ہے کہ وہ غیر صحیح حدیث کو بھی صحیح کہہ دیتے ہیں، ان دونوں کے اس تشدد و تساہل کی وجہ سے ان کی کتابوں سے ماہر فن کے علاوہ دوسرا فائدہ نہیں اٹھا سکتا، اس لیے کہ ان کی ہر نقل کردہ حدیث میں اس تساہل اور بے احتیاطی کا امکان رہتا ہے'' حافظ سیوطی نے القول الحسن فی الذب عن السنن میں ثابت کیا ہے کہ ترمذی کی روایتیں موضوع نہیں ہیں۔(۲)

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ ص۳۸۸ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۱۸۰۔

ایک اعتراض واشکال اور اس کا جواب: امام ترمذی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے جامع ترمذی کی روایات کی تحسین وتصحیح میں تساہل سے کام لیا ہے اور وہ ایک ہی حدیث کو حسن صحیح، حسن غریب اور حسن صحیح غریب تک کہہ دیتے ہیں، حالانکہ کسی ایک حدیث میں ایک ساتھ ان تینوں اوصاف یا ان میں سے کسی دو کا اجتماع نہیں ہوسکتا، محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔

درحقیقت یہ اعتراض اور اشکال اس لیے پیش آتا ہے کہ حدیث، حسن، صحیح اور غریب کے ایک متعین معنی ایک خاص تعریف اور ایک قسم کو معیار قرار دے کر اس پر ترمذی کے حسن، صحیح اور غریب کو منطبق کیا جاتا ہے جو صحیح نہیں ہے اگر ان حدیثوں کے جملہ مراتب ودرجات ان کے اقسام ان کی مختلف نوعیتوں اور اس بارے میں محدثین کے اختلافات کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ اشکال پیدا نہیں ہوسکتا، اولاً ترمذی خود مجتہد تھے، انھوں نے ان اصطلاحوں کے مروجہ معنی کو بجنسہٖ قبول نہیں کیا تھا بلکہ ان کی بعض اصطلاحوں کا مفہوم عام اصطلاحوں سے مختلف تھا، مثلاً حسن کی مشہور تعریف یہ ہے کہ جس کا مخرج معلوم ہو اور اس کے رجال مشہور ہوں، (۱) لیکن ترمذی کے نزدیک حسن وہ ہے جس کا کوئی راوی کذب سے متہم نہ ہو اور روایت شاذ نہ ہو (۲) اور جیسا کہ شاہ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے مقدمہ شرح مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ یہ بھی حسن کی محض ایک قسم کی تعریف ہے، (۳) نیز امام ترمذی نے خود اس کی تصریح کردی ہے کہ جس حدیث کو انھوں نے حسن کہا ہے، اس سے عام محدثین کی اصطلاح نہیں بلکہ ان کا حسن مراد ہے۔ (۴)

اسی طریقہ سے حدیث کی صحت کے بہت سے مدارج اور اس کی مختلف نوعیتیں ہیں اور اس کے لحاظ سے صحیح کی بہت سی قسمیں ہوجاتی ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں کہ ''حدیث

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۳ (۲) کتاب العلل ص ۶۵۳ مطبع العلوم دہلی (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی (۴) کتاب العلل ص ۶۵۴۔

صحیح وہ ہے جس کی سند شروع سے آخر تک مسلسل ہو، اس کے تمام راوی عادل وضابط ہوں اور روایت شاذ ومعلل نہ ہو، ایسی حدیث بالاتفاق تمام محدثین کے نزدیک صحیح ہے، یعنی یہ صحت کا اعلیٰ درجہ ہے، پھر کسی حدیث میں ان اوصاف کے پائے جانے یا نہ پائے جانے کے اختلاف کی بنا پر صحت کے لیے کسی امام یا محدث کے نزدیک ان شرائط میں سے کسی شرط کے ضروری نہ ہونے کی بنا پر اس حدیث کی صحت وعدم صحت میں اختلاف پیدا ہو جاتا ہے، جیسے مرسل حدیث جن ائمہ کے نزدیک حجت ہے، ان کے نزدیک وہ حدیث صحیح میں شامل ہے اور جن کے نزدیک حجت نہیں ہے، ان کے نزدیک صحیح نہیں ہے، پھر جب محدثین کسی حدیث کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ صحیح ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ان کے نزدیک صحت کے شرائط اس میں موجود ہیں، یہ ضروری نہیں ہے کہ واقع میں بھی ایسا ہی ہو...... اسی طریقہ سے جب کسی حدیث کے متعلق محدثین ہ کہتے ہیں کہ وہ صحیح نہیں ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ وہ جھوٹی ہے کیوں کہ ایسی بعض حدیثیں بھی درحقیقت سچی ہوتی ہیں بلکہ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس کی سند ان کے نزدیک صحت کے شرائط کے مطابق ہے.......... پھر صحیح حدیث کی دو قسمیں ہیں، متفق علیہ اور مختلف فیہ، پھر اس کی قسمیں مشہور اور غریب ہیں پھر کسی حدیث میں صحت کے شرائط کے تمکن کے لحاظ سے صحت کے درجات میں فرق پیدا ہو جاتا ہے یعنی جس کمال کے ساتھ یہ شرائط پائے جائیں گے، اسی قدر صحت کا درجہ بڑھ جائے گا اور اس میں جتنی کمی ہوگی اسی اعتبار سے صحت میں فرق پیدا ہو جائے گا، اس لحاظ سے صحیح حدیث کی بے شمار قسمیں ہو جاتی ہیں۔ (۱)

اسی طرح صحیح اور حسن کی دو قسمیں ہیں، صحیح لذاتہٖ اور حسن لذاتہٖ اور صحیح لغیرہ اور حسن لغیرہ، صحیح لذاتہٖ اور حسن لذاتہ کی تعریف تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی، صحیح لغیرہ وہ ہے جس میں صحیح لذاتہ کے تمام شرائط تو نہ پائے جاتے ہوں لیکن کثرت طرق نے اس کمی کو پورا

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ٦۔

کر دیا ہو، حسن لغیرہ وہ حدیث ہے جس میں ضعف ہو لیکن تعدد طرق نے اس ضعف کو دور کر دیا ہو، اسی طرح سے غرابت کی دو قسمیں ہیں، متن کی غربت اور سند کی غرابت، یعنی سند میں کوئی راوی منفرد ہو گیا ہو یا کسی حدیث کے اصل متن میں عام روایات کے خلاف کوئی جزوی کمی یا زیادتی یا تغیر ہو۔

ان تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھنے کے بعد حسن، صحیح اور غریب کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، مثلاً ایک ہی حدیث میں ایک محدث کے نزدیک حسن یا صحیح کے جملہ شرائط پائے جاتے ہیں، اس لیے اس کے نزدیک وہ حسن یا صحیح ہوگی اور دوسرے کے نزدیک نہیں پائے جاتے، اس لیے اس کے نزدیک نہ حسن ہوگی نہ صحیح، ایک کے نزدیک حسن کے شرائط پائے جاتے ہیں دوسرے کے نزدیک صحیح کے، اس لیے ایک کے نزدیک حسن ہوگی دوسرے کے نزدیک صحیح ہوگی۔

اسی طریقہ سے ایک ہی حدیث ایک کے نزدیک حسن ہو سکتی ہے اور دوسرے کے نزدیک صحیح، جس کو امام ترمذی نے حسن صحیح سے تعبیر کیا ہے بلکہ ایک شخص کے نزدیک ایک ہی حدیث حسن لذاتہ اور صحیح لغیرہ ہو سکتی ہے، یا ایک حدیث دو سندوں سے مروی ہے، ایک سند کے اعتبار سے حسن ہے، دوسری متن کے اعتبار سے صحیح، پھر صحیح کے بہت سے مدارج ہیں، ان مدارج کے اعتبار سے صحیح کے ادنیٰ درجہ کا اجتماع حسن کے اعلیٰ درجہ کے ساتھ ہو سکتا ہے اور اس لحاظ سے کہ صحیح کے اعلیٰ شرائط کے تحت میں حسن کے ادنیٰ شرائط خود بخود آ جاتے ہیں، ہر صحیح حدیث حسن کہی جا سکتی ہے اور متقدمین کے یہاں صحیح حدیث پر حسن کا اطلاق ملتا ہے، اس کے علاوہ حسن اور صحیح کے اجتماع کی محدثین نے اور صورتیں بھی نقل کی ہیں۔

اسی طریقہ سے غرابت اور حسن میں بھی کوئی تضاد نہیں ہے، ممکن ہے ایک حدیث سند کے اعتبار سے غریب ہو اور متن کے اعتبار سے حسن اور ترمذی کی مراد یہی ہے، اسی طریقہ سے صحت اور غرابت کا اجتماع بھی ہو سکتا ہے، شیخ عبدالحق صاحب محدث دہلوی نے

مقدمۂ مشکوٰۃ میں لکھا ہے کہ صحت اور غرابت کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں ہے۔(۱)

غرض صحیح حسن اور غریب کے جملہ اقسام و مدارج اور اختلاف کو پیش نظر رکھنے کے بعد ان کے اجتماع میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا، اسی سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ترمذی نے حدیثوں کی تحسین و تصحیح میں بھی تساہل سے کام نہیں لیا ہے بلکہ وہ کسی نہ کسی پہلو سے حسن و صحیح ہوتی ہے۔

یوں تو کتاب اللہ کے علاوہ کسی کتاب کے متعلق قطعی صحت کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، بخاری و مسلم تک خردہ گیری سے محفوظ نہیں ہیں، ایسی حالت میں ترمذی کیوں محفوظ رہتی لیکن مجموعی حیثیت سے سلف سے لے کر خلف تک اس کی صحت مسلمہ چلی آتی ہے جس کا ثبوت صحاح ستہ میں اس کا شمار ہوتا ہے، پھر صحاح میں بھی صحیحین کے بعد ہی اس کو جگہ ملی، ملا کاتب چلپی لکھتے ہیں "هو ثالث الكتب لستة فى الحديث" (۲) اور ائمہ حدیث اس کو احادیث حسن کی بنیاد قرار دیتے ہیں، ابن صلاح لکھتے ہیں "کتاب ابی عیسیٰ اصل فی معرفۃ الحدیث الحسن" (۳) یعنی امام ترمذی کی کتاب حدیث حسن کی معرفت کے لیے اصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

ترمذی کے متعلق اوپر بہت سے اکابر علما و محدثین کی رائیں گذر چکی ہیں، یہاں تک ان کے اعادے کی ضرورت نہیں، خود ترمذی کے زمانہ میں عراق، خراسان اور حجاز کے علما و محدثین سے اس کو حسن قبول کی سند مل چکی ہے، امام ترمذی کا بیان ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے بعد میں نے اس کو حجاز، عراق اور خراسان کے علما کے سامنے اظہار رائے کے لیے پیش کیا، ان سب نے اس کو پسند کیا اور اہل نظر نے اس کو یہ سند عطا کی کہ من كان فى بيته هذا الكتاب فكانما فى بيته نبى يتكلم یعنی جس کے گھر میں یہ کتاب موجود

(۱) تحفۃ الاحوذی بحوالہ مقدمہ مشکوٰۃ ص۲۰۰ (۲) کشف الظنون ج۱ ص۵۷۴ (۳) مقدمہ ابن صلاح ص۱۳۔

ہو، اس کے گھر میں گویا نبی بول رہا ہے،(۱) اہل علم شعرا نے اس کی تعریف میں قصائد لکھے ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی اور نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے بستان المحدثین اور حطہ میں یہ قصائد نقل کیے ہیں۔(۲)

شروحِ ترمذی: ترمذی کی اہمیت اور اس کی فائدہ رسانی کی وجہ سے علما محدثین نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا، اس کی شرحیں لکھیں، حواشی لکھے، مختصرات مرتب کیے، اس کے مشکلات حل کیے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر معلومات کا بیش قیمت ذخیرہ فراہم کردیا۔

صاحب کشف الظنون نے اس کی آٹھ شرحوں کا ذکر کیا ہے جو حسب ذیل ہیں:

۱- سب سے پہلی اور قدیم شرح حافظ ابوبکر محمد بن عبداللہ شبیلی المعروف بہ ابن العربی المتوفی ۵۴۶ھ کی عارضۃ الاحوذی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب نے بستان المحدثین میں اس کا مستقل تذکرہ کیا ہے،(۳) اس کا ایک حصہ مجموعہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپ گیا ہے،(۴) اور کامل نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۲- دوسری حافظ ابوالفتح محمد بن محمد بن سیدالناس یعمری شافعی المتوفی ۷۳۴ھ کی شرح، یہ بڑی ضخیم ہے، شارح نے اس میں حدیث کے علاوہ اور بھی بہت سے مباحث شامل کردیے ہیں، دوثلث کی یہ شرح دس جلدوں میں آئی ہے اور مصنف کے قلم سے تمام نہ ہوسکی، ان کے بعد حافظ زین الدین عبدالرحیم بن حسین العراقی المتوفی ۸۰۶ھ نے پوری کی، اس کا مکمل نسخہ بھی مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں ہے۔

۳- تیسری صحیحین اور ابوداؤد پر ترمذی کے زوائد کی سراج الدین عمر بن علی الملقن

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۸ (۲) حطہ ص ۴۰۴ و بستان المحدثین ص ۱۲۲ (۳) بستان المحدثین ص ۱۳۷ (۴) نواب محمد علی خاں مرحوم والی ٹونک کے فرزند نواب زادہ محمد عبدالوہاب خاں صاحب ترمذی کی چار شرحوں عارضۃ الاحوذی قوت المغتذی سیوطی اور ابوطیب سندھی اور سراج احمد سرہندی کی شرحوں کو مجموعہ شروح اربعہ کے نام سے چھپوایا تھا غالباً اس کی ایک ہی جلد چھپ سکی۔

المتوفی ۸۰۴ھ کی شرح ہے۔

۴- چوتھی سراج الدین عمر بن رسلان بلقینی شافعی المتوفی ۸۰۵ھ کی شرح العرف الشذی یہ بھی تمام نہ ہوسکی، صرف ایک ٹکڑے کی شرح ہے۔

۵- پانچویں حافظ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن نقیب حنبلی المتوفی .... کی شرح بیس جلدوں میں تھی، کسی ہنگامے میں ضائع ہوگئی، اب اس کا نام صرف کتابوں میں ملتا ہے۔

۶- چھٹی حافظ جلال الدین سیوطی المتوفی ۹۱۱ھ کی شرح القوت المغتذی، اس کا ایک حصہ شروح اربعہ کے ساتھ چھپا ہے۔

۷- ساتویں حافظ زین الدین عبدالرحمٰن بن احمد بن رجب حنبلی المتوفی ۷۹۵ھ کی شرح، اس کا اور کچھ حال نہیں معلوم۔

۸- آٹھویں شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادی سندی مدنی المتوفی ۱۱۳۸ھ کی شرح، شیخ مذکور نے اس کو مدینہ طیبہ میں لکھا تھا، کشف الظنون نے اسے بڑی لطیف شرح لکھا ہے۔(۱)

ملا کاتب چلپی نے صرف ان آٹھ شروح کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کے علاوہ اور شرحیں بھی ہیں، مثلاً

۹- نویں شیخ سراج احمد سرہندی کی فارسی شرح، اس کا بھی ایک حصہ شروح اربعہ میں چھپا ہے۔

۱۰- دسویں حافظ ابن حجر عسقلانی المتوفی ۸۵۲ھ کی اللباب فی مایقول الترمذی فی الباب، امام ترمذی نے فی الباب عن فلاں کہہ کر جن روایتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، اس میں اس کی تفصیل مع جرح وتعدیل ہے، اس کا نسخہ مدینہ منورہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۱- گیارہویں ابوطیب سندھی المتوفی ۱۱۰۹ھ کی شرح، یہ بھی شروح اربعہ میں ہے۔

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۷۵۔

۱۲- بارہویں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اپنی ایک شرح کا حوالہ دیا ہے۔

۱۳- تیرہویں مولانا شمس الحق مرحوم عظیم آبادی کی ہدایۃ اللوذعی بنکات الترمذی۔

۱۴- چودہویں الکوکب الدری مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی، یہ جامع ترمذی پر مولانا کے افادات ہیں، جسے مولانا محمد یحییٰ صاحب کاندھلوی مرحوم نے مرتب کیا تھا اور مولانا محمد زکریا صاحب شیخ الحدیث مظاہر العلوم نے شائع کیا ہے۔

۱۵- پندرہویں العرف الشذی کے نام سے مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری کے افادات کو ان کے ایک شاگرد نے جمع کیا ہے۔

۱۶- سولہویں مولانا عبدالرحمٰن مرحوم مبارکپوری کی التحفۃ الاحوذی، یہ چھپ گئی ہے، اس کا مقدمہ خاص طور سے اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے، کاتب سطور نے اس مضمون میں اس سے استفادہ کیا ہے۔

۱۷- مولانا اصغر حسین صاحب پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے حنفی نقطۂ نظر طلبہ کے استفادہ کے لیے نزول الثوی کے نام سے ترمذی کی احادیث کے متعلق مختلف قسم کے سوالات اور ان کے جوابات لکھے ہیں، اس کا ایک حصہ چھپ گیا ہے۔

مختصرات ترمذی: شرحوں کے علاوہ ترمذی کے مختصرات بھی کیے گئے، کشف الظنون میں تین مختصروں کا حال لکھا ہے، ایک نجم الدین محمد بن عقیل الیاسی شافعی المتوفی ۷۲۹ھ کا، دوسرا نجم الدین سلیمان بن عبدالقوی الطوفی حنبلی المتوفی ۷۱۰ھ کا، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں موجود ہے، (۱) اسی سے حافظ صلاح الدین خلیل بن کلیدی علائی نے ترمذی کی سو حدیثوں کا انتخاب کیا ہے۔

تجرید ترمذی: ابوالفضل محمد تاج الدین بن عبدالمحسن المعروف بہ قلعی نے ترمذی کی تجرید

(۱) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اول ص ۳۱۱۔

بھی کی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے۔(۱)

حواشی: ان مستقل کتابوں کے علاوہ ترمذی پر بہت سے حواشی بھی لکھے گئے، ہندوستان کی مطبوعہ ترمذی میں مولانا احمد علی صاحب محدث سہارن پوری کا حاشیہ زیادہ شائع ہے۔

شمائل ترمذی: اس مضمون کا اصل مقصد جامع پر تبصرہ تھا اور امام ترمذی کی باقی دونوں کتابیں یعنی شمائل اور کتاب العلل موضوع سے خارج ہیں لیکن شمائل کی اہمیت کی وجہ سے اس کا بھی مختصر تذکرہ مناسب معلوم ہوا۔

جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات گرامی مسلمانوں کے لیے واجب العمل ہیں، اسی طرح آپ کے اخلاق مبارک، اعمال، طور طریقے، طبعی امور، آپ کی زندگی کا ہر پہلو اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے حالات جستہ جستہ حدیث کی کتابوں میں ملتے ہیں لیکن امام ترمذی سے پہلے خاص اس موضوع پر کوئی مستقل کتاب نہ تھی، یہ سعادت سب سے پہلے امام ترمذی کے حصہ میں آئی اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حلیۂ مبارک، لباس، ساز وسامان، عادات وخصائل، رفتار وگفتار، نشست وبرخاست، اخلاق اور معمولات کے متعلق جتنی روایتیں امام ترمذی کو پہنچیں، انھوں نے ان کو شمائل میں جمع کر دیا ہے، گو یہ کتاب مختصر ہے لیکن ایسی جامع ہے کہ اس میں اخلاق نبوی کا پورا مرقع نظر آ جاتا ہے، شمائل ترمذی کے بعد اس موضوع پر اور کتابیں لکھی گئیں لیکن اولیت کا سہرا امام ترمذی کے سر رہا، کشف الظنون میں شمائل ترمذی کے علاوہ دو اور کتابوں کا نام ملتا ہے، ایک ابو العباس جعفر بن محمد المستغفری المتوفی ۴۳۲ھ کی ''شمائل النبی'' دوسری ابو الحسن علی بن محمد بن ابراہیم فزاری المعروف بہ ابن المقری غرناطی المتوفی ۵۵۲ھ کی ''شمائل بالنور الساطع الکامل''(۲) اس کے علاوہ ایک اور کتاب ''شمائل محمدی'' شیخ عبد الرسول بن عبد الصمد کی ہے(۳)

---

(۱) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج اول ص ۲۷۹ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۷ (۳) فہرست کتب خانہ رام پور ص ۹۳۔

لیکن جو حسن قبول شمائل کو حاصل ہوا وہ کسی کے حصہ میں نہ آیا۔

اس کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ جامع ترمذی کی طرح علما و محدثین نے اس کی بھی بہت سی شرحیں اور حواشی لکھے، بعض شرحوں اور ان کے شارحین کے نام یہ ہیں:

۱- اشرف الوسائل فی شرح الشمائل، حافظ ابن حجر مکی المتوفی ۹۷۳ھ، یہ شرح حرم محترم میں رمضان کے مقدس مہینے میں لکھی گئی تھی۔(۱)

۲- شرح شمائل مصلح الدین محمد بن صلاح بن جمال اللاری المتوفی ۹۷۹ھ یہ شرح عربی میں ہے، اس کے علاوہ انھوں نے فارسی میں بھی ایک شرح لکھی ہے۔

۳- زہر الخمائل علی الشمائل حافظ جلال الدین سیوطی۔

۴- جمع الوسائل، نورالدین علی بن سلطان محمد القاری المعروف بہ ملا علی قاری المتوفی ۱۰۱۶ھ شیخ محمد بن عمر بن حمزہ انطاکی نے تہذیب الشمائل کے نام سے اس کی تہذیب کر کے اس کو سلطان بایزید کی خدمت میں پیش کیا تھا، (۲) یہ شرح قسطنطنیہ میں ۱۲۹۰ھ میں چھپ چکی ہے۔

۵- شرح شمائل مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد اسفرائینی المتوفی ۹۴۳ھ (۳)

۶- شرح شمائل مولی محمد حنفی، یہ شرح ۹۲۶ھ میں لکھی گئی۔(۴)

۷- شرح شمائل حافظ زین الدین محمد المعروف بہ عبدالرؤف بن تاج العارفین مناوی المتوفی ۱۰۳۱ھ یہ شرح مولانا عصام الدین اسفرائینی اور ابن حجر مکی کی شرحوں کا

---

(۱) اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیوہ مصر اور کتب خانہ رامپور میں موجود ہے، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۴ ر۳۵۹ و فہرست کتب خانہ رام پور ص ۶۵ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۷، اس کا قلمی نسخہ مصر کے شاہی کتب خانہ میں ہے، ملاحظہ ہو فہرست کتب عربی کتب خانہ خدیویہ ج ۱ ص ۳۲۷ (۳) اس کا قلمی نسخہ مصر اور پٹنہ لائبریری میں ہے، فہرست کتب خانہ خدیویہ ج ۱ ص ۳۲۷ و مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۱۷۱ (۴) اس کا قلمی نسخہ پٹنہ اور رامپور کے کتب خانوں میں ہے، مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۱۷۱ و فہرست رامپور ج ۱ ص ۹۰۔

خلاصہ ہے اور کچھ مزید اضافے بھی ہیں، خواجہ اسحاق آفندی المتوفی ۱۱۲۰ھ نے ترکی میں اس کا ترجمہ کیا اور مصطفیٰ بن حسین حلبی المعروف بہ مظلوم زادہ نے اسے ترکی میں نظم کیا، (۱) یہ شرح مصر اور قسطنطنیہ کے مطبعوں سے شائع ہو چکی ہے، (معجم المطبوعات کالم ۱۷۹۹)۔

کشف الظنون میں صرف ان شرحوں کا تذکرہ ہے لیکن ان کے علاوہ اور بھی بعض شرحیں ہیں جن کے نام یہ ہیں:

۸- الفوائد الجلیلۃ البہیہ شیخ محمد بن قاسم بن محمد احمد بن جسوس، شارح بارہویں صدی کے آخر کے ممتاز علما میں تھے، (۲) یہ مطبع بولاق میں ۱۲۹۶ھ میں چھپ گئی ہے۔

۹- مواہب محمد یہ شیخ سلیمان بن منصور عجیلی شافعی المتوفی ۱۲۰۴ھ، اس کے قلمی نسخے کتب خانہ خدیویہ اور پٹنہ لائبریری میں ہیں۔ (۳)

۱۰- شرح شمائل شاہ میرک بخاری۔ (۴)

۱۱- اس فخر و منزلت سے ہندوستان بھی محروم نہ رہا اور یہ سعادت و شرف بھی اسی خاندان کے حصہ میں آیا، جس کے فیض سے ہندوستان میں حدیث کا سرچشمہ جاری ہوا، یعنی شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے خلف الصدق مولانا نور الحق شارح بخاری و مسلم نے شمائل ترمذی کی بھی ایک شرح لکھی، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ رام پور میں ہے۔ (۵)

۱۲- شرح حسن آفندی ۱۲۵۴ھ میں بولاق میں چھپی ہے (معجم المطبوعات کالم ۷۵۵)

۱۳- خصائل نبوی ترجمۂ اردو شمائل ترمذی مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۶۷، اس کے قلمی نسخے مصر اور پٹنہ کے کتب خانوں میں موجود ہیں، ملاحظہ ہو فہرست مصر ج اول ص ۳۶۰ و مفتاح الکنوز الخفیہ ج ۱ ص ۲۷۱ (۲) فہرست کتب خانہ مصر ج ۱ ص ۳۸۲ (۳) ایضاً ص ۴۳۶ و مفتاح الکنوز ج ۲ ص ۵۳۴ (۴) مفتاح الکنوز ج ۱ ص ۲۷۱ (۵) فہرست رام پور ص ۹۰۔

مظاہر العلوم، ترجمہ کے ساتھ احادیث کے متعلق مختلف قسم کے مفید معلومات اور مشکلات کا حل بھی ہے، یہ ترجمہ چھپ گیا ہے۔

شرحوں کے علاوہ شمائل کے متعدد حواشی بھی لکھے گئے، دو مشہور حواشی اور محشی کے نام یہ ہیں:

۱- مواہب لدنیہ شیخ ابراہیم بن محمد باجوری المتوفی ۱۲۷۶ھ یہ حاشیہ سب سے زیادہ مشہور و مقبول ہوا اور عام طور سے متداول ہے۔

۲- حاشیہ ابوالضیاء نورالدین علی بن علی شبرالمی شافعی المتوفی ۱۰۸۷ھ حاشیہ شمائل اور ابن حجر مکی کی شرح شمائل دونوں پر ہے، اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ میں ہے(۱)

کتاب العلل: امام ترمذی کی تیسری کتاب کتاب العلل ہے، یہ علل حدیث پر ایک مختصر لیکن مفید رسالہ ہے، حدیث کی صحت اور اس کے استقام کی جانچ کے لیے جرح و تعدیل کے اصول و قواعد اور مستقل فنون ہیں لیکن بعض حدیثوں میں ایسے مخفی عیوب ہوتے ہیں جن کا علم ان اصولوں اور فنون سے نہیں ہوتا اور ایک روایت اصول و قواعد کے اعتبار سے بالکل صحیح ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی ایسی مخفی علت ہوتی ہے جس اندازہ ہر شخص نہیں کر سکتا، اس کے لیے حدیث پر بڑی وسیع اور دقیق نظر کی ضرورت ہے، ان عیوب کے معلوم کرنے کے لیے علل الحدیث ہے، حاکم لکھتے ہیں:

علوم حدیث میں ایک علم حدیث کی علتوں کے جاننے کا علم ہے، یہ صحیح، سقیم اور جرح و تعدیل کے علاوہ ایک مستقل علم ہے..... حدیث مختلف وجوہ سے معلل ہو جاتی ہے جس میں جرح و تعدیل کو کوئی دخل نہیں ہوتا، اس لیے کہ مجروح حدیث تو سرے سے ساقط اور نا قابل اعتبار ہے، اکثر ثقات کی حدیثوں میں ایسی علت ہوتی ہے جو ان کی نظر سے مخفی رہتی ہے اور حدیث معلل ہو جاتی ہے، اس کے علم کا ذریعہ صرف حفظ، فہم اور معرفۃ حدیث

(۱) فہرست عربی کتب خانہ خدیویہ ص ۳۳۲۔

ہے۔(۱)

حاکم نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں، یہ ایسا دقیق علم ہے کہ اس کے لیے بڑی وسعت و دقت نظر کی ضرورت ہے، اس لیے بہت کم محدثین نے علل حدیث پر لکھا ہے جن لوگوں نے لکھنے کی ہمت کی، ان میں ایک امام ترمذی ہیں، ان کا یہ رسالہ جامع ترمذی کے آخر میں لگا ہوا ہے۔

☆☆☆

(۱) معرفۃ علوم الحدیث حاکم ص ۱۱۲۔

امام حارث بن ابی اسامہؒ

(متوفی ۲۸۲ھ)

نام ونسب: ابو محمد کنیت، حارث نام اور سلسلہ نسب یہ ہے: حارث بن محمد بن ابو اسامہ بن یزید بن عدی بن سائب بن شماس بن حنظلہ بن عامر بن حارث بن مرۃ بن مالک بن حنظلہ بن مالک بن زید مناۃ بن تمیم۔(۱)

اپنے دادا کی نسبت سے مشہور ہوکر ...... حارث بن ابو اسامہ کہلاتے ہیں، ابو اسامہ کا اصل نام داہر تھا۔(۲)

خاندان: حارث عرب نژاد اور مشہور قبیلہ بنی تمیم سے تعلق رکھتے تھے،(۳) اسی لیے تمیمی کہے جاتے تھے۔

پیدائش اور وطن: ان کا وطن بغداد ہے(۴) اور غالباً وہ یہیں ماہ شوال ۱۸۶ھ میں پیدا ہوئے،(۵) وطن کی نسبت سے بغدادی بھی کہلاتے تھے۔

اساتذہ وشیوخ: حارث بن ابی اسامہ کو جن اکابر محدثین اور علمائے اسلام سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

اسحاق بن عیسیٰ بن طباع، اسود بن عامر شاذان، حسن بن موسیٰ اشیب، روح بن

(۱) تاریخ بغداد ج۸ ص ۲۱۹ (۲) بستان المحدثین ص ۳۲ (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) تاریخ بغداد ج۸ ص ۲۱۸ وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص ۱۹۴ والمنتظم ابن جوزی ج۵ ص ۱۵۵۔

عبادہ، عبداللہ بن بکر، عبدالوہاب بن عطا، عبیداللہ بن موسیٰ عبسی، عفان بن مسلم، علی بن عاصم، محمد بن عمرو واقدی، محمد بن کناسہ، ابوالنضر ہاشم بن قاسم، ہوزہ بن خلیفہ، یزید بن ہارون، ابوبدر سکونی، ابوعاصم نبیل وغیرہ۔

تلامذہ: بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:

احمد بن سلیمان نجاد، احمد عثمان بن آدمی، احمد بن معروف خشاب، اسماعیل بن علی خطبی، جعفر خلدی، عبدالصمد بن علی طستی، محمد بن احمد حکیمی، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، محمد بن خلف بن مرزبان، محمد بن خلف وکیع، محمد بن مخلد عطار، ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوبکر بن خلاد، ابوبکر شافعی، ابوعمرو بن سماک۔ (۱)

طلب حدیث کے لیے سفر: گو ان کے سفر و سیاحت کی تصریح نہیں ملتی لیکن ان کے اساتذہ اور شیوخ کا تعلق مختلف ملکوں سے تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے علم حدیث کی تلاش و جستجو میں مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا۔

حافظہ: تذکرہ نگاروں نے ان کو الحافظ کہا ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے خصوصیت کے ساتھ ان کے حافظہ کا تذکرہ کیا ہے۔

ثقاہت: بیشتر محدثین اور علمائے جرح وتعدیل نے ان کی توثیق کی ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ "ابوحاتم ابن حبان، ابراہیم حربی اور امام دارقطنی اور اسی پایہ کے دوسرے اکابر محدثین اور علمائے محققین نے ان کی توثیق کی ہے" (۲) امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ وہ صدوق تھے، برقانی نے ان سے حارث کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ ان کے مرویات کو صحاح میں شامل کرو، ابراہیم حربی سے سوال کیا گیا کہ وہ معاوضہ لیتے ہیں، ایسی صورت میں کیا ان سے حدیثیں سنی جاسکتی ہیں، انھوں نے جواب دیا کہ ہاں سنو وہ ثقہ ہیں، ابن حبان نے ان کو ثقات میں شامل کیا ہے، ابوالعباس بناتی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ تھے، احمد بن کامل

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۸ و ۲۱۴ (۲) بستان المحدثین ص ۳۳۔

کا بیان ہے کہ حارث ثقہ اور معتبر ہیں، ابن جوزی بھی ان کو ثقہ لکھتے ہیں، علامہ ذہبی نے تذکرہ، میزان اور عبر میں ان کی ثقاہت کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی بعض سندیں نہایت عالی ہیں اور ان کے متعلق خواہ مخواہ بلا دلیل و حجت شک و تردد کیا جاتا ہے،(۱)

کثرت روایت و معرفت حدیث: حارث کے حافظہ میں احادیث کا وافر ذخیرہ محفوظ تھا، ان کو کثیر الروایات اور کثیر الحدیث شمار کیا جاتا تھا، ابوالعباس بناتی کا بیان ہے راویۃ الاخبار کثیر الحدیث نیز وہ حدیثوں کے معاملہ میں بڑے واقف کار اور ان کی اچھی پرکھ رکھتے تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کان حافظا عارفا بالحدیث (۲)

عسرت و تنگدستی: ان کی زندگی بڑی عسرت اور تنگدستی کی تھی، کثیر العیالی کی بنا پر اکثر زیر بار رہتے تھے، ان کا خود بیان ہے کہ ''میرے چھ لڑکیاں تھیں، ناداری کی وجہ سے ان کی شادی نہیں کرسکتا اور غیروں میں شادی کرنے کو غیرت گوارا نہیں کرتی، بعض لوگوں نے شادی کا پیغام بھیجا لیکن وہ بھی میری ہی طرح فقیر اور محتاج تھے، ایسے لوگوں سے شادی کر کے مجھے اور بھی زیادہ زیر بار ہونا پڑتا، عسرت ہی کی بنا پر وہ تعلیم حدیث کا معاوضہ لینے پر مجبور تھے۔

خودداری: اس عسرت و تنگدستی کے باوجود اپنے فقر و فاقہ کو ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔(۳)

وفات: چھیانوے سال کی طویل عمر میں ۲۸۲ھ کو شب عرفہ میں انتقال کیا اور عرفہ کے دن چاشت کے وقت سپرد خاک کیے گئے۔(۴)

مسند: ان کی تصنیفات میں صرف ایک مسند کا ذکر ملتا ہے، اس میں صحابہؓ کے بجائے شیوخ کی ترتیب پر حدیثیں لکھی گئی ہیں، اس قسم کی کتابوں کو اصطلاحاً معجم کہا جاتا ہے لیکن جس

(۱) میزان الاعتدال ج ۲ ص ۲۰۵، بستان المحدثین ج ۲ ص ۱۵۷ وتذکرہ ج ۲ ص ۱۹۴ (۲) لسان ومیزان حوالۂ مذکور (۳) بستان المحدثین ص ۳۳ (۴) تاریخ بغداد ج ۸ ص ۲۱۹۔

طرح بعض اور کتابیں بھی محدثین کی اصطلاح کے برخلاف مسند کہلاتی ہیں، اسی طرح یہ کتاب بھی معجم کے بجائے مسند کے نام سے مشہور ہے۔ (۱)

یہ سند طبع نہیں ہوئی، اس کا نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، احمد بن ابوبکر بوصیری متوفی ۸۴۰ھ نے ''اتحاف الخیرۃ بزوائد المسانید العشرۃ'' میں اس کی ان حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحاح ستہ میں نہیں ہیں۔ (۲)

حارث پر طعن وجرح: حدیث کی تعلیم کا معاوضہ لینے کی بنا پر بعض محدثین نے ان پر نقد کیا ہے اور ان کو مجروح، ضعیف اور متروک الحدیث قرار دیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ کچھ لوگوں کے نزدیک تعلیم حدیث کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص کی حدیثیں ناقابل قبول ہیں لیکن یہ اصول علی الاطلاق صحیح نہیں ہے، اس کے بارے میں جواز وعدم جواز دونوں قسم کی رائیں ملتی ہیں، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ:

''امام احمد، اسحاق بن راہویہ اور ابوحاتم رازی کے نزدیک اس شخص کی حدیث قبول نہیں کی جائے گی جو حدیث بیان کرنے کا معاوضہ لیتا ہو لیکن امام بخاری کے استاذ ابونعیم فضل بن دکین اور علی بن عبدالعزیز بغوی اور بعض دوسرے علما نے اس کی اجازت دی ہے، ابواسحاق شیرازی کا فتویٰ یہ ہے کہ جو لوگ حدیث کی تعلیم وتدریس کی وجہ سے اپنے متعلقین کی کفالت اور ان کی معیشت کا انتظام نہ کر سکیں، ان کے لیے اجرت ومعاوضہ لینا جائز ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ یتیم کے مال میں سے ضرورت مند اولیا اور سرپرستوں کو بقدر کفاف لینے کی اجازت دی گئی ہے۔'' (۳)

خطیب نے دونوں قسم کے اقوال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ:

''جو لوگ معاوضہ نہ لینے کے قائل ہیں ان کا مقصد راوی کو طعن اور سوء ظن سے منزہ قرار دینا ہے کیوں کہ معاوضہ لینے کے بعد آدمی میں نرمی اور مداہنت پیدا ہو جاتی ہے

(۱) بستان المحدثین ۳۲، ۳۳ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۴۴، ۱۶۴ (۳) تدریب الراوی ص ۱۲۴۔

لیکن درحقیقت ان لوگوں کے نزدیک بھی محض مکروہ تنزیہی ہے، حرام وناجائز نہیں اور اکثر سلف اس باب میں رخصت کے قائل ہیں۔ (۱)

اس لیے دونوں پہلو برابر ہیں خصوصا جو لوگ تنگدستی کی بنا پر معاوضہ لینے پر مجبور ہیں ان کے لیے پوری گنجائش موجود ہے اور اس سے ان کی ثقاہت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا، اس لیے امام حارثؒ پر محض اس بنا پر تنقید نہیں کی جا سکتی۔

☆☆☆

(۱) کتاب الکفایۃ ص ۱۵۴۔

اما احمد بن ابی عاصم نبیل

(متوفی ۲۸۷ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، احمد بن عمرو بن ابو عاصم ضحاک بن مخلد۔(۱)

ولادت: مورخین کے بیان کے مطابق وفات کے وقت اُن کی عمر ۹۰ سال تھی (۲) اس اعتبار سے وہ ۱۹۷ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

خاندان ووطن: عراق کے مشہور علمی مرکز بصرہ کو ان کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے لیکن انھوں نے اصبہان میں بودوباش اختیار کرلی تھی، قبیلۂ شیبان سے ان کا نسبی تعلق ہے، اُن کے جد امجد ابوعاصم ضحاک کا جو النبیل کے لقب سے مشہور اور نامور محدث وفقیہ تھے، امام ابوحنیفہؒ کے ممتاز اصحاب میں شمار ہوتا ہے، بخاری جیسے امام حدیث ان کے دامن فیض سے وابستہ تھے، ابن ابی عاصم کے نانا ابوسلمہ موسیٰ بن اسماعیل بھی بلند پایہ محدث تھے اور ان سے ان کو روایت کرنے کا شرف بھی حاصل ہے۔

اساتذہ: اپنے نانا کے علاوہ امام بخاری، ابوالولید طیالسی، ہدبہ بن خالد اور ہشام بن عمار جیسے نامور علما اور اکابر محدثین سے روایت حدیث کی ہے۔

تلامذہ: مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن بندار، احمد بن معید سمسار، ابومحمد بن حبان، ابواحمد غسال، عبدالرحمٰن بن محمد بن سنان، محمد بن احمد کسائی، وغیرہ۔

(۱) العبر فی خبر من غبر جلد۲ ص۷۹، البدایہ والنہایہ جلد۱۱ ص۸۴۔ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۱۴۔

سفر: علم کی تلاش وجستجو خصوصاً حدیث کی طلب کے لیے مختلف بلاد کا سفر کیا، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ولهٔ الرحلة الواسعة۔

حفظ وثقاہت: حدیث میں آپ کا پایہ اتنا بلند تھا کہ امام وحافظ حدیث کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، تمام علمائے فن کو اُن کے ضبط وحفظ، عدالت وثقاہت کا اعتراف ہے، ابن ابی حاتم نے صدوق اور ابن اعرابی نے حدیث ومسائل فقہ کا بڑا حافظ بتایا ہے، یادداشت کی قوت کا یہ حال تھا کہ ۵۰ ہزار سے زیادہ حدیثیں وہ زبانی بیان کرتے تھے، (۱)

فقہ: فقہ واجتہاد میں بھی ممتاز درجہ رکھتے تھے، علمائے طبقات نے فقہ میں اُن کے کمال کا اعتراف کیا ہے، ابن اعرابی کا بیان ہے کہ شفیق بلخی کے ایک ہزار مسائل ان کو زبانی یاد تھے۔

منصب قضا: اُن کے فقیہ ومجتہد ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ امام احمد کے صاحبزادے صالح کے بعد اصبہان کے قاضی مقرر کیے گئے اور سولہ سال تک اس منصب پر فائز رہے۔ (۲)

مذہب ومسلک: ابونعیم اور بعض دوسرے علمائے طبقات نے ان کو ظاہری المذہب بتایا ہے (۳) لیکن صاحب شذرات نے اُن کی ایک کتاب الرد علی داؤد الظاہری کا ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابتدا میں ممکن ہے وہ ظاہری رہے ہوں لیکن بعد میں اس مسلک سے رجوع کرلیا ہوگا اور شوافع اور دوسرے اصحاب حدیث کی طرح ظواہر حدیث پر عمل اور اُن سے احکام ومسائل کا استنباط کرتے ہوں گے۔

زہد وورع: علم کے ساتھ عمل کی دولت سے بھی سرفراز تھے، اصحاب طبقات وتراجم نے اُن کے زہد وورع اور تدین وتقویٰ کا بھی ذکر کیا ہے، اُن کو تصوف اور صوفیا سے بھی تعلق تھا اور بزرگانِ دین کی خدمت مین استفادہ واصلاح کے لیے جاتے تھے، ابوتراب نخشبی سے خاص تعلق تھا، اُن کی بعض کراماتیں بھی بیان کی گئی ہیں۔

اتباع سنت واجتناب بدعت: بڑے متبع سنت تھے اور مبتدعین کو سخت ناپسند کرتے تھے،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۱۴ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

فرماتے تھے ”مجھے پسند نہیں کہ میری مجلس میں کوئی مبتدع، مفتری، فحش گو، لعن وطعن کرنے والا، امام شافعی اور محدثین کے مسلک سے منحرف وبیزار شخص شریک ہو“ (۱)

اعترافِ کمال: محدثین ان کے کمالات کے معترف تھے، علامہ ذہبی نے ان کو صاحب مناقب اور کبیر القدر لکھا ہے، ابن عماد فرماتے ہیں:

جمع بين العلم والفهم والحفظ والزهد والعبادة والفقه۔	وہ علم وفہم، حفظ واتقان، حدیث، زہد وعبادت اور فقہ واجتہاد کے جامع تھے۔

وفات: امام ابنِ عاصمؒ نے ربیع الآخر ۲۸۷ھ میں انتقال کیا۔ (۲)

تصانیف: وہ کثیر التصانیف تھے، زنگیوں کی شورش کے زمانہ میں اُن کی اکثر کتابیں ضائع ہوگئیں، حسب ذیل تصانیف کے نام کتابوں میں ملتے ہیں:

۱- الرد على داؤد الظاهري: نام سے معلوم ہوتا ہے کہ امام داؤد ظاہری کے رد میں ہے۔

۲- كتاب السنة: یہ مسئلہ صفات کے متعلق احادیث کا ایک اہم مجموعہ تھا، اس کی تالیف کا انداز علمائے سلف کی کتابوں کے مطابق تھا۔ (۳)

۳- مسند: یہ ضخیم اور اہم مسند، پچاس ہزار حدیثوں پر مشتمل ہے، (۴) تمام قابل ذکر علماء مصنفین نے اس کا تذکرہ کیا ہے، حافظ منذری کے قلم کا لکھا ہوا اس کا ایک مکمل نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (۵)

۴- كتاب الديات: دیت وقصاص کے متعلق روایات کا یہ مجموعہ ۱۳۲۳ھ میں مصر سے ۸۴ صفحے میں شائع ہوا ہے۔

---

(۱) البدایہ ج۱۱ ص۸۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۱۴ (۳) البدایہ ج۱۱ ص۸۴۔ (۴) کشف الظنون ج۲ ص۳۴ (۵) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۱۶۵۔

امام ابوبکر بزارؒ

(متوفی ۲۹۲ھ)

نام ونسب: ابوبکر کنیت، بزار لقب، اور احمد نام ہے، سلسلۂ نسب صرف دادا تک معلوم ہے، یعنی احمد بن عمرو بن عبدالخالق۔

بعض اہل لغت کا بیان ہے کہ بزار تیلی کو کہتے ہیں لیکن شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''کسے را گویند کہ تخم فروشی کند وآں کس را در لغت ہندی پنساری نامند''(۱)

یعنی بزار تخم فروش کو کہا جاتا ہے جسے ہندوستانی زبان میں پنساری کہتے ہیں۔

خاندان ووطن: قبیلۂ ازد کی ایک شاخ عتیک سے آپ کا خاندانی اور بصرہ سے وطنی تعلق تھا، اسی نسبت سے عتکی اور بصری مشہور ہوئے۔(۲)

اساتذہ: بزار کے بعض اساتذہ کے نام یہ ہیں، ابراہیم بن سعید جوہری، اسماعیل بن سیف بندار، حسن بن علی بن راشد واسطی، عبدالاعلیٰ بن حماد، عبداللہ بن معاویہ جمحی، عبدالرحمٰن بن فضیل بن موفق، عمر بن موسیٰ، فلاس، محمد بن یحییٰ بن فیاض رمانی، ہدبہ بن خالد۔

تلامذہ: ان کے بعض تلامذہ اور مستفیدین کے نام درج ذیل ہیں:

ابواحمد عسال، ابوبکر بن سلم، ابوبکر بن مہندس، ابوالشیخ، ابوالقاسم طبرانی، ابوالحسن

---

(۱) لباب ج ۱ ص ۱۱۸ وتاج العروس ج ۳ ص ۴۱، وبستان المحدثین، ص ۳۴۔ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۸۴، وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۶۔

علی بن محمد مصری، حسن بن رشیق، عبدالباقی بن قانع، عبداللہ بن حسن، محمد بن ایوب بن صموت، محمد بن عباس بن نجیح۔

رحلت وسفر: ابتدائی تعلیم کے زمانہ کے سفر کا حال معلوم نہیں ہوتا، البتہ اس کا تذکرہ ملتا ہے کہ آخری زمانہ میں انھوں نے احادیث کی نشر واشاعت کے لیے بغداد، اصفہان اور شام وغیرہ کے سفر کیے اور ایک عرصہ تک ان مقامات پر قیام کر کے یہاں کے طلبہ اور شائقین کو حدیث کی تعلیم دیتے رہے۔ (۱)

حفظ وثقاہت: محدثین نے اُن کے فضل وکمال اور حفظ وثقاہت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

ابوالشیخ فرماتے ہیں کہ:

> "حفاظ دنیا میں ایک وہ بھی تھے اور علی بن مدینی کے بعد کوئی شخص ان سے زیادہ حدیثوں کا جاننے والا نہیں گذرا، بغداد کے حفاظ ومحدثین ان کے گرد جمع ہو کر ان سے روایتیں قلمبند کرتے تھے۔ (۲)

ابن قطان کا بیان ہے کہ "وہ لوگوں میں حدیثوں کے سب سے بڑے حافظ تھے،" ابن یونس اور خطیب بغدادی نے بھی اُن کے حافظہ کا خصوصیت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، ابو یوسف یعقوب بن مبارک فرماتے ہیں کہ ما رأیت ابنل من البزار ولا احفظ خطیب ذہبی اور صاحب مغنی نے اُن کو ثقہ وصدوق قرار دیا ہے اور امام دارقطنی نے اُن کی توصیف وستائش بھی کی ہے اور اُن کو ثقہ بھی بتایا ہے، ابوعوانہ نے اپنی صحیح میں اُن سے حدیث نقل کی ہے۔ (۳)

وفات: بزار نے ۲۹۲ھ میں شام کے مشہور شہر رملہ میں جہاں وہ حدیث کی تعلیم واشاعت

(۱) تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶ (۲) بستان المحدثین ص ۳۴ (۳) لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۳۸ ومیزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹ وتاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۴۔

کے لیے تشریف لے گئے تھے، انتقال کیا، ابن قانع نے ۲۹۱ھ سنہ وفات بتایا ہے، (۱) مگر پہلا قول صحیح ہے۔

اولاد: اُن کے ایک فرزند ابوالعباس محمد کا ذکر ملتا ہے جو نامور محدث تھے اور امام دار قطنی اور احمد بن عوف جیسے مشاہیر فن نے ان سے کسب فیض کیا تھا۔ (۲)

مسند: فن حدیث میں بزار کے کمال کا ثبوت مسند کی جمع و تالیف ہے، مسند میں اُن کی دو کتابیں تھیں، المسند الکبیر المعلل اس کا نام البحر الزاخر بھی ہے اور دوسری مسند صغیر، کبیر میں حدیثوں کے علل اور مخفی اسباب قادحہ کے متعلق بھی بحث و کلام کیا گیا ہے، اسی لیے اس کو کتب معلل میں شمار کیا جاتا ہے، محدثین کی اصطلاح میں معلل وہ کتابیں کہلاتی ہیں جن میں مصنف ان مخفی اسباب و علل کو بیان کرتا ہے جو صحت حدیث کے لیے موجب قدح ہیں، عراقی کا بیان ہے کہ بزار نے صحیح و غلط روایتوں سے کم اور رواۃ حدیث کے تفرد و عدم متابعت سے زیادہ تعرض کیا ہے۔ (۳)

حافظ ابن حجر نے اس کے ان زوائد کی جو کتب ستہ اور مسند احمد میں نہیں پائے جاتے، اپنے استاذ ابوالحسن ہیثمی کی کتاب سے تلخیص کی ہے، مسند کا ایک جامع و مکمل اور صحیح نسخہ حافظ ہیثمی کے قلم کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہی نسخہ حافظ ابن حجر کے استعمال میں رہا ہے۔ (۴)

بزار پر غلطی کا الزام: محدثین کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ بزار روایت حدیث میں غلطی کر جاتے تھے، امام دار قطنی اور حاکم کا بیان ہے کہ وہ متن و اسناد دونوں میں غلطی کرتے ہیں، امام نسائی نے بھی ان پر جرح کی ہے اور بعض لوگوں نے اُن کے تفرد اور عدم متابعت کا بھی ذکر کیا ہے (۵) لیکن ان اعتراضات سے اُن کے فضل و کمال میں کوئی فرق

---

(۱) لسان المیزان جلد ۱ ص ۲۳۸ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹ و تاریخ بغداد جلد ۴ ص ۳۳۴ (۲) تاج العروس ج ۳ ص ۴ (۳) بستان المحدثین ص ۳۴ (۴) مقدمہ تحفۃ الاحوذی۔ (۵) (اگلے صفحہ پر)

نہیں آتا، حافظ ابن حجر نے بزار کے بعض تفردات ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے اور یہ بھی ثابت کیا ہے کہ اکثر میں وہ منفرد نہیں ہیں، دوسرے ان کے ثقہ وثابت ہونے میں کسی کو کلام نہیں، خود ان ائمہ سے بھی جنھوں نے اُن کی تضعیف کی ہے، توثیق منقول ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ "وہ ثقہ ہیں اوران سے غلطی بھی سرزد ہوتی ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ عموماً اپنے حافظہ اور یادداشت پر اعتماد کرتے تھے اور روایت بیان کرتے وقت صحیح نسخہ کو پیش نظر نہیں رکھتے تھے۔

اور مجرد غلطی راوی کے متروک وساقط الروایت ہونے کی دلیل نہیں، اس پر پہلے مفصل بحث گذر چکی ہے۔

☆☆☆

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) (۵) لسان المیزان ج ۱ ص ۲۳۸ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۹۔

امام ابو مسلم کشیؒ

(متوفی ۲۹۲ھ)

نام ونسب: ابراہیم نام، ابومسلم کنیت، نسب نامہ یہ ہے، ابراہیم بن عبداللہ بن مسلم بن ماعز، (۱) خطیب نے ماعز کے بعد مہاجر اور سمعانی نے کش لکھا ہے۔ (۲)

ولادت: خطیب نے لکھا ہے کہ "بیان کیا گیا ہے کہ وہ ۲۰۰ھ میں پیدا ہوئے" (۳) لیکن ذہبی نے اُن کی عمر ۱۰۰ سال کے لگ بھگ بتائی ہے اور اُن کا سنہ وفات ۲۹۲ھ ہے، اس لحاظ سے اُن کی پیدائش ۲۰۰ھ سے پہلے ہوئی ہوگی۔ (۴)

خاندان ووطن: وہ بصری اور کشی کی نسبتوں سے زیادہ مشہور ہیں، بعض کا خیال ہے کہ بصرہ کے باشندہ تھے لیکن مقدسی کا بیان ہے کہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے، اس لیے ان کو بصری کہا جاتا ہے، دوسری نسبت کش کی جانب ہے جو جرجان کے ایک گاؤں کا نام ہے لیکن سمعانی نے اُن کے جداعلیٰ کا نام کش لکھا ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کش فارسی لفظ کج (گچ) کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کے معنی چونے کے ہیں اور چوں کہ وہ بصرہ میں معماری کا کام کرتے تھے اور اکثر ھات الکج (چونالاؤ) کہا کرتے تھے، اس لیے کجی لقب پڑ گیا تھا، محمد بن طاہر مقدسی اور علامہ ابن ندیم نے اسی کو ترجیح دی ہے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ اُن کے باپ بصرہ میں منتقل ہو گئے تھے اور یہ وہاں معماری کرتے تھے اور اکثر مزدوروں

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵ (۲) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۰ و کتاب الانساب ورق ۴۷۶ (۳) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۶۔

سے کج کج کہا کرتے تھے، اس لیے اُن کو کجی کہا جاتا ہے'' حافظ ابوموسیٰ کے نزدیک کج خوزستان کے ایک گاؤں کا نام ہے جس کو زیر کج کہا جاتا ہے، ابومسلم اسی کی جانب منسوب ہیں، علامہ سمعانی نے ان کی ایک نسبت لیثی بھی بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نسبی تعلق بنولیث سے تھا۔(۱)

اساتذہ وشیوخ: امام ابومسلم کشی نے جن نامور علماومحدثین سے کسبِ فیض کیا تھا، ان کے نام یہ ہیں:

ابوعاصم نبیل، ابوالولید طیالسی، بدل بن محبر، حجاج بن نصیر فساطیطی، سلیمان بن حرب، عبداللہ بن رجاء غدانی، عبداللہ بن مسلم قعنبی، عبدالرحمٰن بن حماد شعبی، عبدالملک بن قریب اصمعی، عمرو بن مرزوق، محمد بن عبداللہ انصاری، محمد بن عرعرہ، مسلم بن ابراہیم، معاذ بن عبداللہ عوذی وغیرہ۔

تلامذہ: ان سے جن لوگوں نے استفادہ کیا ہے، ان کی تعداد بے شمار ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر شافعی، ابوبکر مالک بن قطیعی، ابوسہیل بن زیاد، ابوعمر بن سماک، ابوالقاسم بغوی، ابومحمد بن مالسی، احمد بن سلیمان نجاد، اسماعیل خطبی، اسماعیل بن محمد صفار، جعفر خالدی، حبیب فزار۔ عبدالباقی بن قانع، فاروق خطابی، محمد بن جعفر آدمی اور خود اُن کے صاحبزادے ابوالحسن محمد بن ابراہیم کشی وغیرہ۔(۲)

سفر: اُن کے صرف بغداد جانے اور وہاں حدیثیں بیان کرنے کا ذکر ملتا ہے۔

حفظ وثقاہت: امام ابومسلم کے علم وفضل، حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان پر علمائے فن کا اتفاق ہے، علمائے طبقات وسیر نے ان کو الحافظ کان محدثاً حافظا اورمن

(۱) کتاب الانساب ورق ۴۷۶، معجم البلدان ج ۴ ص ۲۵۴، الفہرست ص ۳۲۴ والرسالۃ المستطرفہ ص ۳۱

(۲) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵۔

حفاظ الحدیث لکھا ہے، موسیٰ بن ہارون اور امام دار قطنی نے ان کو ثقہ صدوق قرار دیا ہے، محمد بن علی صوری کا بیان ہے کہ میں نے حافظ عبد الغنی بن سعید سے ابو مسلم کجی کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ ثقہ اور نہایت ذکی تھے، علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ وہ عالم، ثقہ اور جلیل القدر محدث تھے، ابن ندیم لکھتے ہیں کہ وہ ان اجلۂ محدثین میں تھے جن کی سندیں نہایت عالی ہوتی ہیں، علامہ سمعانی رقم طراز ہیں کہ وہ ثقہ اور اکابر محدثین میں تھے اور انھوں نے بے شمار حدیثیں بیان کیں، خطیب کا بیان ہے کہ وہ صاحب علم و فضل اور امین تھے، علامہ ذہبی فرماتے ہیں، وہ احادیث کے واقف کار اور بقیۃ الشیوخ میں تھے، ابن عماد لکھتے ہیں، وہ صاحب سنن اور مسند وقت تھے۔ (۱)

مرجعیت و مقبولیت: ابو مسلم کے علم و فضل نے اُن کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، ان کے درس میں ہزاروں اشخاص شریک ہوتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ جب وہ بغداد تشریف لائے تو تشنگانِ علم کا جم غفیر اُن کے گرد اکٹھا ہو گیا تھا، غسان کے میدان میں جو بغداد کا سب سے وسیع اور کشادہ مقام تھا، جب اُن کی مجلسِ درس آراستہ ہوئی تو سامعین کا بڑا اژدحام تھا، حاضرین کا تخمینہ ۴۰-۵۰ ہزار لگایا گیا۔ (۲)

امارت و شکوہ اور جود و سخاوت: اللہ تعالیٰ نے علم و فضل اور عزت و شہرت کے ساتھ مال و دولت اور جاہ و حشمت سے بھی نوازا تھا، طبعاً بڑے فیاض تھے، مورخین نے اُن اوصاف و کمالات کے ذکر میں، انھیں صاحب حشمت، کبیر الشان، ذی جاہ اور سخی و فیاض بتایا ہے، جب انھوں نے اپنی سنن کی جمع و تالیف کا کام ختم کر کے لوگوں کے سامنے اس کو پہلی مرتبہ پیش کیا اور پڑھا تو ایک ہزار درہم فقرا و مساکین میں تقسیم کیے اور محدثین و ائمہ فن کے علاوہ

(۱) تاریخ بغداد جلد ۶ ص ۱۲۱ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۵ و الفہرست ص ۳۲۴ و کتاب الانساب ورق ۴۷۶ و شذرات الذہب جلد ۲ ص ۲۱۰ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ و ۱۲۲ و البدایہ ج ۱۱ ص ۹۹ و تذکرہ ج ۲ ص ۱۹۶۔

دوسرے اعیان وعمائد کی ایک پرتکلف دعوت کی اور اس میں تقریباً ایک ہزار دینار صرف کیے، خطیب کا بیان ہے کہ:

انھوں نے نذر مانی تھی کہ جب حدیث بیان کرنا شروع کریں گے تو دس ہزار دینار صدقہ کریں گے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب جب وہ دس ہزار حدیثیں بیان کر لیتے تو کچھ نہ کچھ صدقہ ضرور کرتے، جب پہلی مرتبہ حدیث بیان کی تو خود بھی صدقہ وخیرات کیا اور اپنے شریک تجارت کو بغداد خط لکھا کہ تم ساری کھجوریں صدقہ کردو، اور اگر فروخت کر چکے ہو تو اُن کی قیمت غریبوں میں تقسیم کردو۔ (۱)

پیشہ: شروع میں وہ معماری کا کام کرتے تھے، پھر تجارت کرنے لگے تھے اور بصرہ سے بغداد کھجوریں بھیجتے تھے، وہاں اُن کی طرف سے ایک وکیل تھا جو ان کو فروخت کرتا تھا، ابومسلم بعض سرکاری مناصب پر بھی فائز رہے، اسی لیے مشہور شاعر بحتری نے اُن کی شان میں مدحیہ اشعار کہے ہیں۔ (۲)

وفات: تقریباً ایک سو سال کی عمر میں ۲۳ محرم الحرام ۲۹۲ھ بروز یکشنبہ بغداد میں انتقال کیا اور وہاں سے ان کی لاش بصرہ لائی گئی اور یہیں تجہیز وتکفین ہوئی۔ (۳)

تصنیفات: علامہ ابن ندیم نے ان کی دو کتابوں السنن والمسند کا ذکر کیا ہے، ان میں سنن زیادہ مشہور ہے، اس کی اکثر حدیثیں ثلاثی ہیں اور قلمی نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں پایا جاتا ہے۔ (۴)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۱ و ۱۲۲ والبدایہ ج ۱۱ ص ۹۹ وتذکرہ ج ۲ ص ۱۹۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۶ ص ۱۲۲
(۳) ایضاً ص ۱۲۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۱۹۶ (۴) الفہرست ص ۳۲۴ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۶۔

امام محمد بن نصر مروزی

(متوفی ۲۹۴ھ)

نام ونسب: نام محمد، ابوعبداللہ کنیت، شیخ الاسلام لقب، نسب نامہ کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔

ولادت، خاندان وطن: ان کی زبانی منقول ہے کہ "میں بغداد میں پیدا ہوا، میرے والد مروزی تھے، میری نشو ونما نیشاپور میں ہوئی اور اب سمرقند میں رہتا ہوں۔"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا آبائی وطن خراسان کا مشہور شہر مرو ہے، اسی لیے وہ مروزی کی نسبت سے مشہور ہیں لیکن انھوں نے سمرقند میں بود وباش اختیار کر لی تھی۔(۱)

اساتذہ: محمد بن نصر کو جن اکابر محدثین سے استفادہ کا موقع ملا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن منذر خزامی، ابوقدامہ سرخسی، اسحٰق بن راہویہ، ربیع بن سلیمان، سعید بن عمر اشعثی، شیبان بن فروخ، صدقہ بن فضل، عبدان بن عثمان مروزی، عبیداللہ بن معاذ عنبری، علی بن بحر قطان، علی بن حجر، عمرو بن زرارہ، محمد بن بشار بندار، محمد بن عبداللہ بن نمیر، محمد بن عبدالملک بن ابی الشوارب، ہدیہ بن خالد، ہشام بن عمار، یحییٰ بن یحییٰ نیساپوری، یزید بن صالح، یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ۔

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۵، تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۸۹۔

تلامذہ: ان کے چند تلامذہ اور منتسبین کے نام یہ ہیں:

ابو حامد بن شرقی، ابو العباس سراج، ابو عبداللہ بن اخزم۔ ابو علی عبداللہ ابن محمد بن علی بلخی، عثمان بن جعفر لبان، محمد بن منذر سکر، محمد بن یعقوب بن اخزم اور عزیزوں میں ان کے صاحبزادہ اسماعیل بن محمد کو ان سے روایت کرنے کا موقع ملا۔ (۱)

رحلت وسفر: ان کو علم وفن سے فطری ذوق تھا اور ہمیشہ علمی مسائل پر بحث وگفتگو کرتے تھے، عبداللہ بن محمد ثقفی کا بیان ہے کہ ''میرے دادا جوان کے ساتھ چار سال رہے، بیان کرتے ہیں کہ میں نے انھیں غیر علمی باتیں کرتے نہیں دیکھا، اس شوق کی تکمیل کے لیے انھوں نے طلب علم کے لیے مختلف شہروں کا سفر کیا، خطیب لکھتے ہیں: ''رحل الی سائر الامصار فی طلب العلم'' علامہ ابن جوزی فرماتے ہیں کہ انھوں نے طلب علم کے لیے مختلف شہروں کا سفر کیا اور خراسان، عراق، حجاز، شام ومصر کے علما سے استفادہ کیا۔ (۲)

حدیث میں درجہ: حدیث میں ان کی جلالت قدر کا اندازہ ان بیانات سے ہوگا، علامہ ذہبی نے ان کو برع فی ھذا الشان اور رأسا فی الحدیث لکھا ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ حدیث کے بحر زخار تھے'' اکابر علمائے جرح وتعدیل نے ان کے ضبط وثقاہت اور حفظ واتقان کا اعتراف کیا ہے، حافظ ابن حجر نے ان کو الحافظ، الثقہ اور ابن حبان نے ثقات میں شمار کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ اُن جامعین ومصنفین حدیث میں تھے جو مرتبۂ امامت پر فائز تھے، ابو محمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ سنن کے جامع وضابط صاحب علم اور احادیث کے مطالب کے حافظ اور مدافع تھے۔ (۳)

فقہ وخلافیات: فقہ وخلافیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے، ان کے سوانح نگاروں نے ان کے نام کے ساتھ الفقیہ احدائمۃ الفقہا اور رأسا فی الفقہ وغیرہ لکھا ہے۔

---

(۱) تہذیب التہذیب ج۹ ص۴۸۹ وطبقات الشافعیہ ج۲ ص۲۱ (۲) تاریخ بغداد ج۳ ص۳۱۶ والمنتظم ج۶ ص۶۴ (۳) تاریخ بغداد ج۳ ص۳۱۶ وتذکرۃ الحفاظ ج۲ ص۲۲۴ والمنتظم ج۶ ص۶۴۔

وہ نیشاپور کے مفتی سمجھے جاتے تھے، محمد بن یحییٰ سے جب کوئی مسئلہ دریافت کرتا تو وہ اس کو ابوعبداللہ مروزی کے پاس بھیج دیتے، خطیب بغدادی تحریر فرماتے ہیں کہ ان کو صحابہ اور مابعد کے علما کے اختلافات سے بڑی واقفیت تھی، ابومحمد بن حزم کا بیان ہے کہ وہ اجماع اور خلافیات کے بڑے عالم تھے۔(۱)

مذہب ومسلک: امام شافعیؒ سے ان کو بڑا تعلق تھا، ان کے نامور تلامذہ سے فقہ کی تحصیل کی تھی اور اسی مسلک فقہ سے وابستہ تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ ان کے زمانہ کے شوافع میں کوئی شخص ان کا ہمسر نہیں تھا۔(۲)

مقبولیت: ان کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، عوام وخواص وامرا وحکام سب ان کا بڑا احترام کرتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد کے پاس تشریف لے جاتے تو وہ احتراماً کھڑا ہوجاتا تھا۔(۳)

امامت: علمائے طبقات وتراجم نے ابوعبداللہ مروزی کو ائمہ مسلمین میں شمار کیا ہے اور احد الاعلام، احد اعلام الامة، احد ائمة الاسلام اور الامام الجلیل وغیرہ القاب سے موسوم کیا ہے، سلیمانی اور ابوبکر ضبعی نے ان کو امام بتایا ہے، محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم کا جو ان کے استاذ الفقہ تھے، بیان ہے کہ جب وہ مصر میں ہم لوگوں کے درمیان مرتبۂ امامت پر فائز ہیں تو خراسان میں کسی کو ان کی امامت میں کلام ہوسکتا ہے، ابوبکر احمد ابن اسحاق کا بیان ہے کہ میں نے دو ائمہ مسلمین دیکھے، ابوحاتم رازی اور ابوعبداللہ مروزی (۴)

زہدوعبادت: زہد وتقویٰ میں بھی ان کا درجہ بہت بلند تھا، علمی اشغال سے جو وقت بچتا، اس کو عبادت اور یاد الٰہی میں صرف کرتے تھے، نمازیں بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ص ۳۱۹ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۲۴ والمنتظم ج ۶ص ۶۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ص ۲۱

(۲) شذرات الذہب ج ۲ص ۲۱۷ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۲۵ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ص ۲۲۵ وطبقات الشافعیہ ج ۲ص ۲۱و۲۲ وتاریخ بغداد ج ۳ص ۳۱۷ وتہذیب التہذیب ج ۹ص ۴۹۰۔

پڑھتے تھے، ابوبکر ضبعی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر کسی کی نماز نہیں دیکھی، ابن اخرم فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ان کی نماز کا حسن اور خشوع وخضوع دیکھ کر سخت متعجب ہوتے تھے، استغراق ومحویت کا یہ حال تھا کہ ایک دفعہ نماز میں بھڑ نے ڈنک ماردیا اور جسم سے خون جاری ہوگیا، مگر انھوں نے کوئی حرکت اور جنبش نہیں کی، وہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوجاتے تو ایک بے حس وحرکت لکڑی کی طرح معلوم ہوتے تھے،(۱) اس انہماک کی وجہ سے ان کا شمار اکابر صلحا اور مشہور عباد وزہاد میں ہوتا تھا (۲) ان کی بعض کرامتیں بھی بیان کی جاتی ہیں۔

ذریعہ معاش اور جود وسخا: ان کی مستقل آمدنی بارہ ہزار سالانہ تھی، چار ہزار اسماعیل بن احمد امیر خراسان اور اسی قدر اس کے بھائی اسحاق اور اہل سمرقند کی جانب سے ان کو وظیفہ ملتا تھا لیکن اُن کے مزاج میں بڑی سخاوت وفیاضی تھی، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

وقد كان من اكرم الناس واسخاهم نفسا.(۳)	وہ بڑے کریم اور سخی تھے۔

اس لیے یہ کل رقم محتاجوں اور ضرورت مندوں میں تقسیم کردیتے تھے اور جو کچھ بچتا اسی معمولی رقم میں گذربسر کرلیتے، جب ناگہانی ضرورت کے لیے کچھ پس انداز کرنے کے لیے کہا جاتا تو کوئی توجہ نہ کرتے، اپنے ایک شریک کو مضاربت پر اپنا مال تجارت کے لیے بھی دیتے تھے۔(۴)

اولاد: عرصہ تک لاولد رہے، آخری عمر میں اولاد کی آرزو بہت بڑھ گئی تھی، اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے تھے جو قبول ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے ایک صالح فرزند عطا کیا جب بچہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱و۲۲ وتاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۶ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۹۰ (۲) صفۃ الصفوۃ ج ۴ ص ۱۲۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۰۲ (۴) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۷ و ۳۱۸ وتذکرہ ج ۲ ص ۲۲۵۔

کے تولد کی ان کو اطلاع ہوئی تو بے ساختہ ان کی زبان سے دعائے ابراہیمی نکل گئی، اَلْحمدُ لِلّٰہِ الذِی وھب لی علی الکبر اسماعیل اس بچہ کا انھوں نے اسماعیل ہی نام بھی رکھا۔(۱)

حلیہ: صورت نہایت حسین اور چہرہ گلاب کی طرح شاداب اور شگفتہ تھا، سپید داڑھی نے چہرہ کو اور زیادہ پُرنور بنا دیا تھا۔

وفات: محرم ۲۹۴ھ میں سمرقند میں وفات پائی۔(۲)

تصنیفات: انھوں نے متعدد کتابیں تالیف کیں، خطیب کا بیان ہے کہ "صاحب التصانیفِ الکثیرۃ و الکتب الجمۃ" یعنی وہ متعدد کتابوں کے مصنف تھے، ان کی کتابیں بڑی مفید اور بیش قیمت تھیں، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وصنف الکتب المفیدۃ الحافلۃ النافقۃ یعنی نہایت مفید کتابیں لکھیں۔

ان کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

مسند: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں عبدالقادر بن عبدالعزیز کے قلم کا لکھا ہوا ہے ۲۶۸، اوراق میں موجود ہے، سنہ کتابت ۲۵۶ھ ہے، اس کے شروع میں ایک باب نماز کا بھی ہے، اس کا عنوان ہے باب فی تعظیم قدر الصلوٰۃ وتفضیلھا علیٰ سائر الاعمال۔ (۳) جو بجائے خود ایک مستقل کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، بعض علما نے اس کا مستقل تصنیف کی حیثیت سے ذکر کیا ہے، حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں "وصنّف کتاباً عظیماً فی الصلوٰۃ" (۴) (نماز پر ایک مہتم بالشان کتاب لکھی)

کتاب القسامۃ: مروزی کی یہ دوسری اہم تصنیف ہے، ابوبکر صیرفی اس کے

(۱) المنتظم ج ۶ ص ۶۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۵، ۲۲۶ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲ (۳) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۲۰ (۴) البدایہ ج ۱۱ ص ۱۰۲۔

بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اگر انھوں نے صرف یہی کتاب لکھی ہوتی تو بھی ان کے ایک بڑے اور عظیم فقیہ ہونے کے لیے کافی تھی۔''(۱)

علامہ ابن سبکی نے ان کی ایک اور کتاب کا ذکر کیا ہے، اس میں امام ابوحنیفہؒ نے حضرت علیؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کے مسلک سے جن باتوں میں اختلاف کیا ہے اس کا ذکر ہے۔(۲)

قیام اللیل اور کتاب رفع الیدین کے نام سے بھی دو رسالے لکھے تھے، جو طبع ہو چکے ہیں۔(۳)

☆☆☆

(۱) تاریخ بغداد ج ۳ ص ۳۱۶ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱ (۳) خاتمہ سیرۃ الامام البخاری ص ۲۶۔

امام ابو محمد ابن جارودؒ

(متوفی ۲۹۹ھ)

نام ونسب: عبداللہ نام، ابو محمد کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: عبداللہ بن علی بن جارود۔

وطن: سنہ ولادت اور خاندانی حالات معلوم نہیں ہو سکے، وطن نیشاپور ہے، مکہ میں مجاورت اختیار کر لی تھی۔

اساتذہ: چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابو سعید بن اشج، احمد بن ازہر، احمد بن یوسف سلمی، اسحاق کوسج، بحر بن نصر، زیاد بن ایوب، عبداللہ بن ہاشم طوسی، عبدالرحمٰن بن بشر، علی بن خشرم، محمد بن ابی عبدالرحمٰن مقری، محمد بن آدم، محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم، محمد بن عثمان بن کرامہ، محمد بن یحییٰ، یعقوب بن ابراہیم دورقی وغیرہ۔

تلامذہ: حافظ ذہبی نے اُن کے چار تلامذہ ابو حامد بن شرقی، دعلج سجزی، محمد بن نافع مکی اور یحییٰ بن منصور کا نام تحریر کیا ہے۔

ضبط واتقان: اور ان کے علم وفضل کے بارے میں لکھتے ہیں:

هو الحافظ الامام الناقد	وہ حدیث کے حافظ، امام، ناقد ......
كان من	.... ثقہ
العلماء المتقنين المجوّدين۔	وضابط اور جید علمائے اسلام میں تھے

وفات: ان کا سنہ وفات ۳۰۷ھ ہے۔(۱)

تصنیفات: ابن جارود کی کتاب "المنتقی" احکام وسنن سے متعلق روایات واحادیث کا ایک منتخب ومختار مجموعہ ہے جو ایک جلد میں اور تقریباً آٹھ سو حدیثوں پر مشتمل ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

''یہ کتاب گویا صحیح ابن خزیمہ پر مستخرج ہے لیکن اس میں صرف اس کے اصول احادیث پر اکتفا کیا گیا ہے، اسی لیے اس کا نام منتقی ہے۔''(۲)

صاحب الرسالۃ المستطرفہ کتانی فرماتے ہیں کہ:

''اس کے استقصا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بہت کم حدیثوں میں صحیحین سے تفرد کیا گیا ہے۔''(۳)

ابن حزم کا بیان ہے کہ:

''صحیحین کے بعد ابن سکن، ابن جارود اور ابن اصبغ کی کتابوں کا درجہ ہے، اس کے بعد ابوداؤد ونسائی کی کتابوں کا نمبر آتا ہے۔''(۴)

منتقی ابن جارود پہلی مرتبہ حیدر آباد دکن سے ۵۰۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے، شروع میں جن چھ طرق سے اس کی روایت کی گئی ہے، ان کا ذکر ہے، حواشی مختصر مگر مفید مطالب پر مشتمل ہیں، ہر حدیث کے سامنے حاشیہ میں اس کے ماخذ حروف تہجی کے ذریعہ ظاہر کیے گئے ہیں، مثلاً (ط) سے مؤطا، (حم) سے مسند احمد، (خ) سے بخاری، اور (م) سے مسلم وغیرہ۔

ابوعمر واندلسی نے المرتقی فی شرح المنتقی کے نام سے اس کی شرح لکھی تھی۔(۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۶ (۲) بستان المحدثین ص ۸۵ (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۳ (۴) تدریب الراوی ص ۳۲ (۵) الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۳۔

امام ابوعبدالرحمٰن نسائیؒ

(متوفی ۳۰۳ھ)

نام ونسب: احمد نام اور ابوعبدالرحمٰن کنیت تھی، سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار۔(۱)

پیدائش: عام مؤرخین کے بیان کے مطابق امام نسائیؒ ۲۱۴ھ یا ۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے لیکن بعض نے سنہ پیدائش ۲۲۵ھ لکھا ہے(۲) جو صحیح نہیں ہے۔

وطن: امام نسائی نے بعد میں مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی لیکن ان کی پیدائش اور نشوونما خراسان کے مشہور شہر نساء میں ہوئی۔(۳) قدیم زمانہ میں نساء علم وفن اور ارباب کمال کا مرکز رہ چکا ہے اور اس کی خاک سے بہت سے نامور علما وفضلا پیدا ہوئے، اسی کی نسبت سے وہ نسائی کہلاتے ہیں، نسوی سے بھی اسی کی جانب نسبت ہے، مگر وہ زیادہ مشہور نہیں، نساء خراسان میں ہے، اس لیے امام صاحب کو خراسانی بھی کہا جاتا ہے۔(۴)

اساتذہ اور شیوخ: امام نسائی کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، بعض مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابویزید جرمی، احمد بن عبدہ، اسحاق بن راہویہ، حسین بن منصور، حمید بن سعدہ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۲۲ وتہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۲ وطبقات الشافعیہ سبکی ج ۲ ص ۸۳ (۲) حسن المحاضرہ سیوطی ج ۱ ص ۱۴۷ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۲۴۰ (۳) کتاب الانساب ورق ۵۵۹ (۴) ایضاً ووفیات الاعیان ج ۱ ص ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۶۔

سوید بن منصور، ابوالحسن علی بن حجر بن ایاس، علی بن حشرم، عمران بن موسیٰ، عمرو بن زرارہ عیسیٰ بن حماد، ابورجا قتیبہ بن سعید بلخی، مجاہد بن موسیٰ، محمد بن بشار، محمد بن رافع، ابوکریب محمد بن علاء، محمد بن نصر مروزی، ہشام بن عمار اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ افاضل اور اساطین حدیث سے احادیث نبوی کا سماع کیا اور احمد بن نصر نیشاپوری اور ابوشعیب سوسی سے فن قرأت کی تحصیل کی۔

ائمہ صحاح میں امام بخاری اور امام ابوداؤد سے بھی ان کو شرف تلمذ حاصل ہے،(۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کے ناموں کا استقصا دشوار ہے، بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن محمد بن صالح، ابوبشر دولابی، ابوعلی حسین محمد نیشاپوری، ابوالقاسم طبرانی، ابوالقاسم حمزہ بن محمد کتمانی، ابوعلی حسن بن خضر سیوطی، ابوبکر احمد بن اسحاق السنی، محمد بن معاویہ، حسن بن رشیق، ابوالحسن محمد بن عبداللہ حیویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابوبکر احمد بن محمد، ابوعوانہ، ابوجعفر طحاوی، ابوبکر احمد بن حداد، ابوجعفر عقیلی، ابوعلی محمد بن ہارون اور آپ کے صاحبزادے عبدالکریم وغیرہ، ان میں سے اکثر حضرات نے آپ کی کتاب سنن کی روایت کی ہے۔(۲)

تعلیم وتحصیل حدیث کے لیے سفر: امام نسائی کی ابتدائی تعلیم کے حالات نہیں ملے، مگر اتنا معلوم ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق انھوں نے مختلف ملکوں اور شہروں کا سفر کیا تھا، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''دور دراز شہروں میں جا کر سماع حدیث میں مصروف رہے اور ان ائمہ فن اور مشائخ کبار سے ملے جن سے بالمشافہ انھوں نے روایت کی ہے۔'' علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ ''رجال فی البلاد'' یعنی مختلف ملکوں کا سفر کیا، تذکرہ وطبقات کی کتابوں

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۳ وتہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ والحطہ ص ۱۲۷ (۲) تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴۔

میں ان کے حجاز، عراق، مصر، شام، جزائر اور خراسان جانے اور وہاں کے ائمہ کمال سے استفادہ کرنے کی تصریح ملتی ہے، امام صاحب کا خود بیان ہے کہ ''وہ پندرہ سال کی عمر میں قتیبہ کی خدمت میں حدیث سیکھنے کی غرض سے بغداد گئے اور ایک سال دو ماہ تک وہاں قیام کیا۔''(۱)

علم حدیث میں امتیاز: علم حدیث کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کا زمانہ بڑی اہمیت اور خاص امتیاز رکھتا ہے، اس زمانہ میں ہر گھر میں علم حدیث کا چرچا تھا اور اسلامی ملکوں کا ہر بڑا شہر اس کا مرکز تھا، اس دور سے زیادہ بڑے محدثین اور کسی دور میں بھی نہیں پیدا ہوئے، امام نسائی بھی اسی دور کمال میں پیدا ہوئے تھے، اس لیے قدرتی طور پر ان کی توجہ کا مرکز علم حدیث ہی قرار پایا اور اس میں ان کو جو تبحر اور کمال حاصل ہوا وہ ان کے دوسرے معاصرین کے حصہ میں نہیں آیا، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ ''امام نسائی اپنے دور کے تمام علمائے حدیث میں یکتا اور سب سے زیادہ افضل و برتر تھے۔''

حفظ وثقاہت: قدرت نے امام صاحب کو حفظ کی غیر معمولی قوت عطا کی تھی، ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ وہ احادیث کے ایک نامور حافظ تھے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ ''میں نے اپنے استاذ علامہ ذہبی سے دریافت کیا کہ حافظہ کے لحاظ سے امام مسلم اور امام نسائی میں کون بڑھا ہوا تھا، انھوں نے نسائی کا نام لیا، میں نے اپنے والد سے اس کو بیان کیا تو انھوں نے بھی اس کی تائید کی، سیوطی نے الحافظ، احد الحفاظ المتقنین کے القاب سے ان کا ذکر کیا ہے، ان کی ثقاہت واتقان پر بھی اتفاق ہے، ابن یونس کہتے ہیں ''وہ نہایت ثقہ وثابت تھے''(۲)

جرح وتعدیل: وہ فن جرح وتعدیل کے بھی ماہر تھے، ان کا شمار مشہور نقادان حدیث میں

(۱) تہذیب ج۱ص ۳۷ وطبقات الشافعیہ ج۲ص ۸۴ والبدایہ والنہایہ ج۱ص ۱۲۳ وحسن المحاضرہ ج۱ ص ۱۴۷ (۲) ایضاً۔

ہے، اس لحاظ سے بعض محدثین نے ان کو امام بخاری و امام مسلم سے بھی فائق قرار دیا ہے، حافظ حدیث ابوعلی کا بیان ہے "رجال کے باب میں امام نسائی کے شرائط امام مسلم سے بھی زیادہ سخت تھے" ابن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ "میں نے سعد بن علی زنجانی سے ایک شخص کے متعلق استفسار کیا تو انھوں نے اس کی توثیق کی، میں نے کہا امام نسائی تو تضعیف کرتے ہیں، یہ سن کر انھوں نے کہا "صاحبزادے ابوعبدالرحمٰن کی رجال کے بارے میں امام بخاری اور امام مسلم سے بھی زیادہ سخت شرطیں ہیں، احادیث کے سقم و صحت میں ان کی بصیرت و معرفت کے بارے میں دارقطنی اور حاکم کی رائے یہ ہے کہ "وہ اپنے معاصرین میں صحیح و سقیم روایات و آثار اور رجال کی معرفت و تمیز میں سب سے زیادہ واقف کار تھے" ابوبکر حداد کثیر الحدیث ہونے کے باوجود امام نسائی کے علاوہ اور کسی سے روایت نہیں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ میرے اور خدا کے درمیان حجت ہیں، مامون مصری کا بیان ہے کہ "جب ہم طرسوس آئے اور حفاظ حدیث کی خدمت میں حاضر ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان سب نے امام نسائی کے انتخاب کے مطابق حدیثیں لکھی ہیں۔" (۱)

فقہ و تفسیر: امام نسائی کا اصلی فن علم حدیث ہے لیکن دوسرے علوم دینیہ میں بھی ان کو درک تھا، قرأت و تفسیر میں ان کو پوری دستگاہ حاصل تھی اور فقہ و فقہی احکام کے استنباط میں بھی ان کا پایہ نہایت بلند تھا، امام دارقطنی اور حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں مصر کے سب سے بڑے فقیہ تھے" ابن یونس اور دوسرے علما نے بھی ان کے فقیہ و مجتہد ہونے کا اعتراف کیا ہے، ان کی سنن سے بھی ان کے اس کمال کا اندازہ ہوتا ہے۔

عہدۂ قضا: فقہ و اجتہاد میں ان کے کمال کی بنا پر حمص کے قضا و ولایت کا منصب ان کو تفویض کیا گیا تھا۔

---

(۱) تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۸ والبدایۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳ وطبقات الشافعیۃ ج ۲ ص ۸۴ (۲) بستان المحدثین ص ۱۱۱ والحطہ ص ۱۲۷۔

زہد وتقویٰ اور عبادت: امام نسائی کی عملی زندگی بھی نہایت پاکیزہ تھی، ان کا دل خشیت الٰہی سے لبریز قلب ذکر الٰہی سے معمور اور دماغ فکر عقبیٰ میں مصروف رہتا تھا، وہ بڑے عبادت گذار، متبع سنت اور صاحب ورع وتقویٰ تھے، رد بدعات واحیاء سنت ان کا خاص مشن اور نصب العین تھا، رات ودن کا بڑا حصہ خدا کی عبادت اور ذکر وفکر میں گذرتا تھا، تہجد کے پابند تھے، صوم داؤدی کے مطابق ایک دن روزہ رکھتے تھے اور ایک دن افطار کرتے تھے، حج بھی اکثر کرتے تھے، جہاد کا ولولہ بھی تھا، ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں نکلے تو اتنی شجاعت وبہادری دکھائی کہ لوگوں کو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوگئی۔ (۱)

اخلاقی کمالات: صبر ورضا، ضبط وتحمل، شجاعت وبہادری اور عزم واستقلال وغیرہ اخلاقی فضائل سے بھی آراستہ تھے، طبیعت میں بڑا استغنا اور بے نیازی تھی، کبھی عزت نفس کا سودا نہیں کیا، امیر مصر کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے لیکن اس کی مجلس اور ہمنشینی سے ہمیشہ دور رہے، ایک مرتبہ اہل شام نے ان سے امیر معاویہؓ کے فضائل بیان کرنے کا مطالبہ کیا، انھوں نے انکار کردیا، ان کے انکار پر ان کو بے دردی کے ساتھ پیٹا گیا، انھوں نے اس کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، مگر ان کے استقلال میں کوئی فرق نہیں آیا، احمد بن نصر کا بیان ہے کہ ''امام نسائی کی طرح کون صبر کرسکتا ہے، حالانکہ ان کے پاس امیر معاویہؓ کی فضیلت میں ابن لہیعہ کی حدیث موجود تھی لیکن انھوں نے اس کو نہیں بیان کیا، کیوں کہ وہ ابن لہیعہ کو ضعیف سمجھتے تھے۔ (۲)

امامت وتقدم: ان کمالات کی بناپر دوسرے اصحاب علم وکمال آپ کو مسلمانوں کا امام ومقتدا مانتے تھے، ابن عدی کا بیان ہے کہ میں نے منصور فقیہ اور احمد بن محمد طحاوی کی زبانی سنا کہ ''وہ مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک ہیں'' حافظ ابوالحسین محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ ''میرے کانوں نے اپنے مصری اساتذہ کی زبان سے امام نسائی کے فضل ومرتبت اور امامت

---

(۱) تہذیب ج ۱ ص ۳۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸ والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳ (۲) ایضاً۔

وتقدم کا اعتراف کرتے ہوئے سنا" محمد بن سعد باوردی فرماتے ہیں کہ "وہ مسلمانوں کے اماموں میں تھے، میں نے چار ائمہ حدیث دیکھے، ان میں سے ایک مصر کے امام نسائی بھی تھے۔"(۱)

فقہی مذہب: علامہ ابن سبکی نے طبقات شافعیہ میں ان کا ذکر کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب اور نواب صدیق حسن خاں صاحب نے بھی ان کو شافعی بتایا ہے لیکن بعض حنابلہ نے ان کو حنبلی قرار دیا ہے، ہمارے خیال میں وہ کسی خاص فقہی مسلک کے پابند نہ تھے، بلکہ وہ خود فقیہ و مجتہد تھے اور جزئیات مسائل میں محدثین کی طرح ظواہر احادیث کے مطابق عمل کرتے تھے اور جن ائمہ کے مسلک کو کتاب وسنت سے زیادہ قریب پاتے تھے اسی کی تائید فرماتے تھے"۔

عقیدہ: امام نسائی اعتقاد میں اہل سنت والجماعت کے ہمنوا تھے لیکن ان پر شیعیت کا الزام لگایا جاتا ہے، عام مؤرخین اور اصحاب سیر نے اس الزام کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے، اس کی شہرت غالباً ابن خلکان کے ایک بیان سے ہوئی ہے بعض دوسرے مورخین نے بھی ابن خلکان ہی کی روایت کو ماخذ بنایا ہے، اس لیے ان کے بیان کا جائزہ لیا جاتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

قال محمد بن اسحاق	محمد بن اسحاق اصبہانی فرماتے ہیں کہ
الاصبهانی سمعت مشائخنا	میں نے مصر میں اپنے استادوں سے
بمصر یذکرون ان ابا	سنا کہ ابوعبدالرحمٰن نسائی آخر عمر میں مصر
عبدالرحمن فاروق مصر فی	چھوڑ کر دمشق چلے گئے وہاں ان سے
آخر عمره وخرج الی دمشق	حضرت معاویہؓ اور ان کے فضائل کے
فسئل عن معاوية وماروی	متعلق روایات کے بارے میں پوچھا
فی فضائله فقال اما یرضیٰ	گیا تو انھوں نے جواب دیا کہ کیا

(۱) تہذیب ج ا ص ۳۸ و تذکرۃ ج ۲ ص ۲۶۸ والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳۔

معاویة ان یخرج رأسا برأس حتی یفضل وفی روایة اخری ماأعرف له فضیلة الا لااشبع الله بطنه وکان یتشیع فمازالوا یدفعون فی حضنه حتی اخرجوہ من المسجد وفی روایة اخری یدفعون فی خصیه۔ (۱)

معاویہؓ کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ سربسر نجات پا جائیں، ان کے فضائل کہاں ہیں جو بیان کیے جائیں، ایک دوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے جواب دیا کہ میں ان کی کوئی فضیلت اس کے علاوہ نہیں جانتا کہ ''اللہ اس کو شکم سیر نہ کرے، ان میں شیعیت تھی لوگوں نے یہ جواب سن کر ان کی کمر اور کوکھ میں مارنا شروع کیا اور مسجد سے نکال دیا، دوسری روایت میں ہے کہ ان کے خصیتین میں مارنا شروع کیا تھا،

اس روایت کی صحت محل نظر ہے، متقدمین علما میں سے کسی نے اس کو قابل اعتنا نہیں سمجھا ہے اور نہ اس کی سند مسلسل ہے، ابن خلکان اور امام نسائی کے درمیان کئی صدیوں کا فرق ہے، امام نسائی کا انتقال ۳۰۳ھ میں ہوا ہے اور ابن خلکان کا ۶۸۱ھ یعنی دونوں کے درمیان تقریباً چار صدیوں کا فرق ہے، ایسی حالت میں امام نسائی کے بارے میں ابن خلکان کی روایت بغیر کسی سند کے کیسے قبول کی جا سکتی ہے، اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، یا ان کو ان کے فضائل کی روایات کا علم نہ تھا اور حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل کا انکار شیعیت نہیں ہے، بہت سے اکابر کا یہ مسلک رہا ہے، پھر ابن خلکان نے "کان شیعیا" نہیں بلکہ "کان یتشیع" لکھا ہے، یعنی ان میں شیعیت کا اثر تھا۔

(۱) وفیات الاعیان ج ا ص ۳۵و۳۶۔

اس روایت کی صحت کی صورت میں واقعہ کی شکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ شام بنی امیہ کا مرکزِ حکومت رہ چکا تھا اور وہ حضرت امیر معاویہؓ کا سب سے سنگین قلعہ تھا، یہاں کے تمام قبائل حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کے حامی و مداح تھے، اس لیے بنی امیہ کی حکومت مٹنے کے بعد بھی مدتوں یہ اثر قائم رہا اور حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کے اختلافات کی صدائے بازگشت یہاں صدیوں گونجتی رہی، امام نسائی کے زمانہ میں بھی یہی صورتِ حال رہی ہوگی، جیسا کہ خود اہل شام کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے امام موصوف نے اس کی اصلاح اور حضرت علیؓ سے شامیوں کا سوءظن دور کرنے کے لیے یہ جواب دیا ہوگا مگر اہل شام کے دل و دماغ پر حضرت امیر معاویہؓ کا اتنا اثر تھا کہ وہ آمادۂ پیکار ہوگئے اور امام صاحب کی توہین میں بھی باک نہیں کیا اور ان پر شیعیت کا الزام لگا دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''امام نسائی کی موت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ حضرت علیؓ کے مناقب لکھ کر فارغ ہوئے تو چاہا کہ جامع دمشق میں لوگوں کے سامنے اس کتاب کو بیان کریں تاکہ وہاں کے لوگ جو بنی امیہ کی مدت مدید تک شام میں سلطنت کے باعث نواصب کے مذہب کی طرف مائل ہوگئے ہیں، ہدایت یافتہ ہو جائیں، اس کتاب کا تھوڑا ہی حصہ بیان کیا تھا کہ ایک شخص نے پوچھا کہ امیر المومنین معاویہؓ کے فضائل بھی آپ نے کچھ تحریر کیا ہے، امام نسائی نے کہا معاویہؓ کے لیے تو اتنا بس ہے کہ انھیں سر برسر نجات مل جائے، ان کے فضائل ہی کہاں ہیں بعض کہتے ہیں کہ آپ نے یہ بات بھی فرمائی تھی کہ میرے نزدیک ان کے مناقب میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں سوائے الا لا اشبع اللہ بطنہ کے (یہیں سے) عوام الناس نے ان پر تشیع کا الزام جڑ دیا......اور چند ضربیں ان کے خصیتین میں لگیں جن کی وجہ سے وہ نیم جان ہوگئے۔''(۱)

---

(۱) بستان المحدثین ص ۱۱۱۔

ابن کثیر کا طرز بیان اس سے کسی قدر مختلف ہے، مگر ان کا دارومدار بھی ابن خلکان ہی کی روایت پر ہے، لکھتے ہیں:

وقد قیل عنه: انه کان ینسب الیه من التشیع۔(۱)	ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی جانب کچھ شیعیت بھی منسوب ہے

اس کے بعد انھوں نے وہی ابن خلکان والی روایت نقل کی ہے مگر ''قیل'' کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ انتساب والزام ابن کثیر کے نزدیک مشکوک اور مشتبہ ہے، پھر ''کان ینسب الیه'' میں صیغۂ مجہول کا استعمال بھی یہی بتاتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ راوی کے نزدیک بھی یہ الزام مشتبہ ہے اور ''شیٔ من التشیع'' سے جس تقلیل کا اظہار ہوتا ہے وہ بھی قابل غور ہے۔

ان باتوں سے قطع نظر امام نسائی کے شیعہ نہ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ سے فرط عقیدت کے باوجود دوسرے صحابہؓ کے فضائل وکمالات کے بھی قائل تھے اور مسائل میں ان کے عمل سے استفادہ کرتے تھے، شیعہ سب سے زیادہ شیخین (حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما) کو مطعون کرتے ہیں مگر امام نسائی ان کے آرا واقوال سے حجت واستدلال کرتے ہیں، کتاب البیوع میں ابن ابی اوفی سے یہ روایت نقل کی ہے کہ ''ہم رسولؐ اللہ اور ابوبکرؓ وعمرؓ کے زمانہ میں، گیہوں، جو اور کھجور کی بیع سلم ان لوگوں سے کرتے تھے، جن کے متعلق ہم کو معلوم نہیں کہ یہ چیزیں ان کے پاس ہوتی تھیں یا نہیں، (۲) ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں ''ابوبکر وعمر نے یہ فیصلہ کیا۔'' (۳) ایک اور مقام پر یہ فرماتے ہیں کہ اس چیز کا ابوبکرؓ وعمرؓ اور عثمان رضی اللہ عنہم نے فیصلہ کیا ہے، (۴) خلفائے راشدین میں اسی ترتیب کے وہ بھی قائل تھے جو اہل سنت والجماعت کا مسلک ہے، چنانچہ باب امامۃ اہل العلم والفضل میں یہ روایت نقل کی ہے کہ ''جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا تو

(۱) البدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳ (۲) سنن نسائی ج ۲ ص ۲۲۶ (۳) ایضاً ص ۲۳۲ (۴) ایضاً ۲۳۳۔

انصار نے کہا ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک تم لوگوں (مہاجرین) میں سے، حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ کیا تم لوگوں کو نہیں معلوم کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کو حکم دیا تھا کہ وہ نماز پڑھائیں، ایسی صورت میں کون شخص یہ پسند کرے گا کہ وہ امامت اور خلافت میں ان سے سبقت لے جائے، انھوں نے جواب دیا کہ ہم ابوبکرؓ پر اپنے کو ترجیح دینے سے خدا کی پناہ مانگتے ہیں۔(۱)

یہ مثالیں ان کی شیعیت کی تردید کے لیے کافی ہیں، البتہ دو باتیں قابل بحث ہیں، ایک حضرت علیؓ کی محبت وعقیدت میں غلو، دوسرے حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق سخت الفاظ کا استعمال، پہلے کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی محبت میں کوئی ایسا غلو ناپسندیدہ نہیں ہے جو شریعت کے خلاف نہ ہو، بلکہ اہل بیت کی محبت تو جزو ایمان ہے، امام شافعیؒ اور امام احمد کا بھی یہی مسلک تھا، امام احمد کی حضرت علیؓ سے عقیدت کا ذکر کرتے ہوئے شیخ ابوزہرہ مصری تحریر فرماتے ہیں:

> ''اس معاملہ میں ان کا وہی مسلک تھا جو ان کے استاذ امام شافعی کا تھا، امام شافعیؒ حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب میں روایت کرتے تھے اور ان سے بڑی عقیدت ومحبت رکھتے تھے لیکن حضرت ابوبکرؓ کے مقابلہ میں جب تفضیل کا سوال آتا تھا تو وہ حضرت ابوبکرؓ کو سب پر ترجیح دیتے تھے، ان کا قول ہے کہ ''معاملہ ہمارے جذبات کا تابع نہیں ہے۔''(۲)
>
> امام شافعی ہی کی جانب یہ شعر بھی منسوب ہے:

ان کان رفضا حب آل محمدٍ   فلیشهد الثقلان انی رافض

> (ترجمہ) اگر اہل بیت سے محبت کرنا شیعیت ہے تو جن وانس دونوں گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔

---

(۱) سنن نسائی ج ۱ ص ۹۷ (۲) احمد بن حنبل ترجمہ رئیس احمد جعفری ص ۳۴۳۔

حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں امام نسائی کے الفاظ اور سخت ہیں، وہ بہر حال صحابی ہیں اور ان کے فضائل میں بھی روایتیں ہیں ورا گر نہ بھی ہوتیں تو صحابیت کے عموم میں جو روایتیں ہیں ان کے بھی رو سے ان کی فضیلت مسلم ہے لیکن امام نسائی کے قول کی یہ توجیہ ہوسکتی ہے

۱- حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی فضیلت مسلم ہے، ان کو کسی حیثیت سے بھی حضرت علیؓ کے ہم پایہ قرار نہیں دیا جاسکتا، یہ جمہور امت کا متفقہ فیصلہ ہے، امام نسائی نے شام کے لوگوں کو اس کے برخلاف دیکھا، اس لیے جناب امیرؓ کے فضائل ومناقب بیان کرنے میں غلو سے کام لیا، ایسے حالات میں قدرتی طور پر تشدد اور غلو پیدا ہی ہوجاتا ہے، اس سلسلہ میں حضرت معاویہؓ کی شان میں ان سے بعض نامناسب الفاظ بھی نکل گئے۔

۲- امام نسائی کو حضرت علیؓ سے غیر معمولی محبت وعقیدت تھی مگر جب وہ شام گئے تو وہاں ان کے خلاف سوء ظن کی عام فضا دیکھ کر ان کے فضائل ومناقب بیان کرنا شروع کردیتے جو بنی امیہ کے حامیوں کو ناگوار معلوم ہوئے اور انھوں نے امام نسائی سے امیر معاویہ کے فضائل بیان کرنے کی فرمائش کی، امام صاحب نے یہ سمجھا کہ جناب امیرؓ سے بدگمانی کا اصل سبب حضرت امیر معاویہؓ سے فرط عقیدت اور غیر معمولی شیفتگی ہے اس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ان کی شان میں مذکور بالا باتیں کہہ دیں، جن سے ان کا منشا امیر معاویہؓ کی مذمت نہ تھا بلکہ حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب کا پوری طرح اظہار اور امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں ان کی اہمیت وعظمت کا اثبات میں تھا۔

۳- حافظ ابن حجر وغیرہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائی کے نزدیک حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں اس لیے انھوں نے لوگوں کے مطالبہ پر بھی ایسی کوئی حدیث نہیں بیان کی مگر جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو ان کو غصہ آگیا اور ان کی زبان سے بعض سخت الفاظ نکل گئے لیکن غیظ وغضب کی حالت میں جو باتیں منہ

سے نکل جاتی ہیں، ان کا کوئی اعتبار نہیں۔

غذا اور لباس: امام نسائی بڑے خوش خوراک و خوش لباس تھے، رنگین اور قیمتی کپڑے پہنتے تھے اور کھانا نہایت پر تکلف کھاتے تھے، مرغ خرید کر پالتے تھے، جب خوب فربہ ہو جاتے ذبح کراتے روزانہ مرغ کھانے کے بعد نبیذ حلال پیتے تھے، (۱) ان کا رہن سہن نہایت اعلیٰ اور معاشرتی زندگی بڑی پر شکوہ تھی۔

خاندانی وجاہت: امام صاحب کی معاشرت اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک معزز اور صاحب حیثیت گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ "وہ نہایت نجیب و شریف، رئیس، خوش وضع اور عظیم المرتبت تھے۔ (۲)

وفات: امام نسائی کو شامیوں کی مار پیٹ سے اتنا صدمہ پہنچا کہ اسی کے اثر سے ۳۰۳ھ میں اٹھاسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا، جب ان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے اپنے اصحاب و رفقا سے خواہش ظاہر کی کہ انھیں مکہ لے چلیں، بعض مورخین کا بیان ہے کہ راستہ میں مرو کے مقام میں ان کی وفات ہوگئی اور وہیں دفن کیے گئے لیکن بعض نے لکھا ہے کہ وفات مکہ میں ہوئی اور صفا و مروہ کے درمیان دفن کیے گئے۔ علامہ ابن کثیر نے ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ بیت المقدس میں دفن کیے گئے، مہینہ کی تعیین میں اختلاف ہے، بعض نے شعبان اور بعض نے صفر کا مہینہ لکھا ہے۔ (۳)

ازواج و اولاد: ان کے چار بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں، (۴) حافظ ابن حجر نے ان کے تلامذہ کے تذکرہ میں ایک صاحبزادے عبدالکریم کا نام بھی تحریر کیا ہے۔

حلیہ: بڑے وجیہ و شکیل تھے، چہرہ نہایت شاداب اور شمع کی طرح پر نور تھا، بڑھاپے میں بھی جسم اور چہرے کی تر و تازگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ (۵)

---

(۱) تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۷ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۲۴ (۲) شذرات الذہب ج ۲ ص ۲۳۹ (۳) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۶ و تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۹ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۲۴ (۴) ایضاً (۵) ایضاً۔

تصنیفات: امام نسائی کی جن تصنیفات کا علم ہو سکا وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ خصائص سیدنا علیؓ: اس رسالہ میں حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب بیان کیے گئے ہیں، اس کی تالیف کا مقصد امام صاحب نے خود یہ بیان کیا ہے کہ ''میں جب دمشق آیا تو حضرت علیؓ سے لوگوں کو بیزار پایا، اس لیے یہ رسالہ تالیف کیا تا کہ اس کی بدولت اللہ تعالیٰ لوگوں کو ہدایت سے سرفراز کرے(۱) مگر لوگوں نے بدبختی سے اس کو سخت ناپسند کیا اور امام صاحب کو زدوکوب کر کے مسجد سے نکال دیا۔

۲۔ مسند علی، ۳۔ مسند مالک، ۴۔ کتاب الضعفاء والمتروکین، اس میں ضعیف و متروک الحدیث رواۃ کا حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے۔

یہ رسالہ امام بخاری کی التاریخ الصغیر اور کتاب الضعفاء الصغیر کے ساتھ مطبع انوار احمدی الہ آباد سے ۱۳۲۵ھ میں شائع ہو چکا ہے۔

۵۔ کتاب الجمعہ، ۶۔ کتاب التمییز، ۷۔ کتاب المدلسین، ۸۔ فضائل الصحابہؓ۔

السنن: امام صاحب نے سنن میں دو کتابیں لکھی تھیں، سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ، آخر الذکر کتاب زیادہ مشہور اور صحاح ستہ میں شامل ہے اور یہ امام صاحب کی سب سے زیادہ مشہور تصنیف اور ان کا سب سے بڑا اور اہم علمی و دینی کارنامہ ہے، اس لیے اس کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔

سنن صغریٰ کے دوسرے نام المجتبیٰ اور المجتنیٰ بھی ہیں کیونکہ امام صاحب جب سنن کبریٰ کی تالیف کا کام انجام دے چکے تو امیر رملہ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کی پوری کتاب صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے، آپ نے جواب دیا نہیں، امیر نے درخواست کیا کہ آپ میرے لیے اس میں سے اعلیٰ درجہ کی حدیثیں الگ کر دیجئے، اس درخواست پر امام صاحب نے یہ دوسری کتاب لکھی جس کا نام مجتبیٰ رکھا اور اب یہی سنن نسائی کے نام سے

(۱) بستان المحدثین ص ۱۱۱۔

مشہور ہے۔(۱)

سنن کبریٰ کے راوی ابن الاحمر ابوبکر محمد بن معاویہ متوفی ۳۵۸ھ اور سنن صغریٰ کے راوی ابن السنی ابوبکر احمد بن محمد م ۳۶۴ھ ہیں، علامہ ذہبی نے مجتبیٰ کو امام صاحب کے شاگرد ابن السنی ہی کا اختصار بتایا ہے لیکن خود امام صاحب نے اس کی تردید کی ہے۔

سنن نسائی کی اہمیت: کتب صحاح میں جو مقبولیت صحیحین کو حاصل ہوئی وہ دوسری کتابوں کو نصیب نہیں ہوسکی، اور عام طور پر سنن نسائی کو ابوداؤد اور ترمذی کے بعد جگہ دی گئی ہے، تاہم اس کا نام بھی ان دونوں کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، اس لیے قریب قریب یہ بھی ان کے ہم پایہ ہے اور اس کا صحاح ستہ میں شامل ہونا ہی اس کی اہمیت وعظمت کا ثبوت ہے اور جس طرح صحاح کی ہر کتاب بعض خصوصیات کے لحاظ سے دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے، اسی طرح نسائی کی بھی بعض خصوصیات سے دوسری کتابیں خالی ہیں۔

بعض علمائے فن نے صحیحین کے بعد اسی کا درجہ بتایا ہے، کیوں کہ اس میں سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال زیادہ قوی ہیں، قبول روایت کے معاملہ میں امام نسائی کے شرائط کی سختی اس قدر مشہور ہے کہ بعض علما کا خیال ہے کہ ان کے شرائط امام بخاری وامام مسلم سے بھی زیادہ شدید ہیں،(۲) ابوالحسن معافری کا بیان ہے کہ ''اگر عام محدثین اور امام نسائی کی احادیث کا موازنہ کیا جائے تو امام نسائی کی حدیثیں دوسروں کے مرویات کے مقابلہ میں صحت سے زیادہ قریب نظر آئیں گی'' علامہ سخاوی فرماتے ہیں کہ ''بعض مغاربہ کے نزدیک اس کو صحیح بخاری پر فوقیت حاصل ہے'' ابن احمر کا بیان ہے کہ ''اس فن کی جملہ تصنیفات میں سنن نسائی سب سے زیادہ افضل واشرف ہے اور اسلام میں ایسی بے نظیر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی''(۳) حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ ''فن رجال کے ماہرین کی

(۱) بستان المحدثین ص ۱۱۱ (۲) تذکرہ ج ۲ ص ۲۶۸ وشروط الائمۃ الستۃ (۳) مقدمہ زہر الربی فتح المغیث ص ۱۲۔

ایک جماعت نے ان کو امام مسلم سے برتر قرار دیا ہے اور امام دارقطنی وغیرہ نے ان کو فن حدیث اور فن رجال میں امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ پر ترجیح دی ہے'' ان اقوال کو اگر مبالغہ پر بھی محمول کیا جائے تو ان سے کم از کم اتنا ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی نے ضعیف ومتروک اشخاص سے کوئی روایت نہیں لی ہے بلکہ امام بخاری اور امام مسلم کی طرح صرف صحیح الاسناد حدیثیں درج کی ہیں اور اس اعتبار سے ان کی تصنیف ان دونوں بزرگوں کے طریقوں کی جامع ہے، ابوعبداللہ بن رشید فرماتے ہیں کہ:

وھو جامع بین طریقتی	سنن نسائی بخاری ومسلم دونوں کے
البخاری ومسلم مع حظ کثیر	طریقوں کی جامع ہے اور علل حدیث کا
من بیان العلل۔(۱)	بیان اس پر مستزاد ہے۔

خود امام نسائی سے منقول ہے کہ ''کتاب السنن کا صحیح'' یعنی میری کتاب السنن تمام تر حدیثوں پر مشتمل ہے، امام صاحب نے اس کی تالیف میں جو اہتمام واحتیاط کی ہے، اس کا اندازہ ابوالحسن احمد بن محبوب رملی کے اس بیان سے ظاہر ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ''میں نے خود امام صاحب سے سنا کہ وہ فرماتے ہیں جب میں نے سنن کی جمع وتالیف کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے بعض ایسے رواۃ کے متعلق استخارہ کیا جن کے بارے میں مجھ کو تھوڑا تردد تھا، اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی کہ ان لوگوں سے میں روایت نہ کروں، اس طرح میں نے عالی سندوں کی حدیثیں ذکر کی ہیں''(۲)

خصوصیات: ۱-سنن نسائی کی سب سے اہم خصوصیت اس کے شرائط ہیں، جن کے متعلق کہا گیا کہ ''ان لابی عبدالرحمٰن شرطا اشد من شرط البخاری ومسلم'' یعنی امام نسائی کے شرائط امام بخاری ومسلم سے بھی سخت ہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام نسائی نے نہ صرف بعض اُن رواۃ کو نظر انداز کر دیا ہے جن سے امام

(۱) مقدمہ زہر الربی (۲) شروط الائمۃ الستہ ص ۱۸ ومقدمہ فتح الباری ص ۸۔

ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کی ہے بلکہ امام بخاری و مسلم تک کے راویوں کی ایک جماعت سے حدیث کی تخریج میں اجتناب کیا ہے۔

۲۔ علل حدیث کا بیان امام نسائی کا خاص وصف سمجھا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو جرح و تعدیل اور نقد و نظر کا غیر معمولی ملکہ عطا کیا تھا اور روایت کا سقم فوراً ان کی نگاہ کے سامنے آجاتا تھا، علامہ ذہبی فرماتے ہیں ''امام نسائی حدیث، علل حدیث اور علم الرجال میں امام مسلم، ترمذی اور ابوداؤد سے زیادہ ماہر ہیں اور امام بخاری و ابوزرعہ کے ہمسر ہیں، ابن رشید کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ سنن نسائی، بخاری و مسلم دونوں کے طریقہ کی جامع ہے، علاوہ ازیں اس میں علل حدیث کے بھی ایک خاصے حصہ کا ذکر ہے(۱) رواۃ کے اسماء والقاب وکنیتوں کی تشریح، راوی کے شذوذ و تفرد، حذف و اضافہ عدم متابعت، شک، سہو اور غلطی وغیرہ کا ذکر، دو راویوں کے اختلاف و تضاد، عدم سماع و عدم لقا، راویوں کی توثیق و تضعیف، موقوف و مرسل، مسند و مرفوع، صحیح و ضعیف روایات کی نشاندہی، اسناد کی قوت و ضعف، اختلاف و تعدد طرق کا بیان، غریب الفاظ اور مشکل و مبہم چیزوں کی توضیح جس قدر اس کتاب میں پائی جاتی ہے، اس سے دوسری کتابیں خالی ہیں، امام صاحب نے راویوں اور روایات کا موازنہ کر کے صحیح روایات کی بھی نشاندہی کی ہے۔

۳۔ متعدد فوائد کے پیش نظر ایک ہی روایت کو کئی جگہوں میں ذکر کیا ہے۔

۴۔ وہ بلند پایہ مجتہد و فقیہ بھی تھے اور ان کی سنن فقہ و اجتہاد اور نظر و استدلال کی حیثیت سے بھی نہایت جامع ہے، اس کی ایک مثال پیش کی جاتی ہے، خمس کی تشریح کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ — جان لو کہ جو غنیمت کا مال تم کو ملا ہے،

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸ و مقدمہ زہر الربی۔

فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ	اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسول،
وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى	قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور
وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنِ السَّبِيْلِ الخ	مسافروں کے لیے ہے۔

(توبہ)

اس آیت میں اللہ کا ذکر ابتدائے کلام کے لیے آیا ہے، کیوں کہ ساری چیزیں تو اللہ ہی کی ہیں، یا خدا نے فی اور خمس میں، اپنی ذات کو اس لیے شریک کیا ہے کہ درحقیقت یہ دونوں بہترین قسم کی کمائی ہیں اور صدقہ کو اپنی طرف اس لیے منسوب نہیں کیا کہ وہ اموال کی ناپاکی اور گندگی کا نام ہے، ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ غنیمت کا کچھ حصہ خانۂ کعبہ پر خرچ کیا جائے گا اور اسی حصہ کو اللہ نے اپنا بتایا ہے، نبی کا حصہ امام وقت کی جانب منتقل کیا جائے گا اور وہ اس سے اسلحہ اور جنگی سامان خریدے گا، اس میں سے وہ ان لوگوں کو بھی دے سکتا ہے جن کو مناسب سمجھے مثلاً مسلمانوں کی فائدہ رسانی کے کاموں یا علم دین، فقہ وحدیث اور قرآن وغیرہ کی تحصیل میں صرف کرے گا اور ایک حصہ رسول اللہ کے قرابتداروں یعنی بنو ہاشم اور بنو مطلب میں تقسیم کیا جائے گا، خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر، ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کے قرابت داروں میں صرف فقرا یعنی یتیموں اور مسافروں وغیرہ ہی کو دیا جائے گا اور یہی قول میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے، واللہ اعلم، بڑے چھوٹے اور مرد وعورت کے درمیان برابر تقسیم کیا جائے گا کیوں کہ حدیث میں اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو کسی سے زیادہ دیا ہو اور اس بارے میں مجھ کو علما کے کسی اختلاف کا بھی علم نہیں ہے، کیوں کہ اگر کوئی شخص کسی کی اولاد کے حق میں اپنے تہائی مال کی وصیت کردے تو ان میں سے مرد وعورت سب کو برابر حصہ ملے گا، اسی اصول پر ان تمام چیزوں کو قیاس کرنا چاہیے جو کسی کے قرابتداروں اور خاندان والوں کے لیے متعین کردی گئی ہو، الا یہ کہ شارع نے اس سلسلہ میں کوئی واضح اور صریح حکم دیا ہو یا اس کی تخصیص کردی ہو، اسی طرح

مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو ایک ایک حصہ دیا جائے گا اور مسکین و مسافر کا حصہ کسی دوسرے کو نہیں دیا جا سکتا، باقی خمس کے چار اور حصوں کو امام المسلمین ان بالغ مسلمانوں میں تقسیم کرے گا جو جنگ میں شریک رہے ہوں۔''(۱)

امام نسائی نے بعض ابواب کے عنوانات اس طرح قائم کیے ہیں جن سے ان کا تفقہ واستدلال ظاہر ہوتا ہے اور بعض عنوانات سے وہ اپنے مخالف مسلک کی تردید بھی کرتے ہیں، ان کے فقہ واجتہاد کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی حدیث کو متعدد ابواب میں نقل کر کے اس سے مختلف مسائل کا استنباط کرتے ہیں۔

۵- ترتیب وتالیف میں حسن وموزونیت کے لحاظ سے بھی سنن کا پایہ بلند ہے، ابن رشید کا بیان ہے کہ ''یہ تمام کتب سنن میں تصنیف وترتیب کے لحاظ سے زیادہ بہتر اور عمدہ ہے۔(۲)

شروح وتعلیقات: سنن نسائی کے ساتھ اُس قدر اعتنا نہیں کیا گیا جس کی وہ مستحق تھی، اس لیے دوسری کتابوں کے مقابلہ میں اس کے شروح، حواشی اور تعلیقات کی تعداد کم ہے(۳) ذیل میں ان کے نام درج کیے جاتے ہیں:

شرح ابن ملقن: مشہور مصنف وشارح حدیث علامہ ابن ملقن (م۸۰۴ھ) نے زوائد النسائی علی الاربعہ کے نام سے سنن نسائی کی شرح لکھی اور اس میں ان حدیثوں سے تعرض کیا جو بخاری، مسلم، ترمذی اور ابوداؤد میں نہیں ہیں۔

زہر الربی: یہ علامہ جلال الدین سیوطی (م۹۱۱ھ) کی تعلیق اور شرح ہے جو نہایت مشہور ومعروف ہے، اس میں متن کے مشکل مسائل اور دشوار مقامات کو نہایت خوبی سے حل کیا گیا ہے، ۱۳۱۲ھ میں مصر کے مطبع میمنہ سے سنن اور حاشیہ سندھی کے ساتھ دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے اور غالباً الگ سے بھی چھپی ہے۔

---

(۱) سنن نسائی کتاب قسم الفئ ص ۶۳۸، ۶۳۹ (۲) مقدمہ زہر الربی (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۔

حاشیہ سندھی: محمد بن عبدالہادی سندھی (م ۱۱۳۸ھ) نے جملہ کتب صحاح کی طرح امام نسائی کی سنن کا بھی حاشیہ اور تعلیق تحریر کی جو بہت مقبول ومتداول ہے، یہ حاشیہ سیوطی کی شرح سے زیادہ جامع اور مفصل ہے، اس میں متن کے ضروری اور اہم مقامات کو حل، اعراب کی تحقیق اور غریب الفاظ ومشکل لغات کی تشریح کی گئی ہے، یہ حاشیہ، سنن اور اس کی شرح زہر الربی کے ساتھ ۱۳۱۲ھ میں مطبع میمنہ مصر سے شائع ہوا ہے۔

حافظ ابن کثیر کی تنقید: حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ ''نسائی کے بعض رجال مجہول اور مجروح ہیں، ان کے یہاں ضعیف، معلل اور منکر حدیثیں بھی ہیں،(۱) لیکن امام نسائی کی حزم واحتیاط کے بارے میں جو اقوال نقل کیے گئے ہیں، وہ ابن کثیر کی تردید کے لیے کافی ہیں، حقیقت یہ ہے کہ رجال واحادیث کی تمیز میں امام نسائی کو خاص کمال حاصل تھا، ان کی سختی اور شدت کا یہ حال تھا کہ امام بخاری، امام مسلم، امام مالک اور یحیٰی بن سعید القطان جیسے اکابر محدثین وائمہ فن کے بعض رواۃ سے نقل وروایت میں بھی انھوں نے احتیاط ملحوظ رکھی ہے، ان کا خود بیان ہے کہ ''سنن کی جمع وتالیف کے سلسلہ میں جن مشائخ کے بارے میں میرے دل میں کچھ شک وتردد ہوا میں نے ان کو ترک کردیا، عام محدثین کے نزدیک وہ اپنے عدم تساہل اور فرط احتیاط کے لیے نہایت مشہور مانے جاتے ہیں، اس کے باوجود ان کے یہاں ضعیف ومنکر روایات کا سرے سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا، جب کہ صحاح کی اہم ترین کتابوں کے بارے میں بھی مطلق اور مجرد صحت کے دعویٰ کو بعض علما نے تسلیم نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ابن کثیر کا الزام اور بھی بے حقیقت ہو جاتا ہے، صحاح کو دوسرے مصنفین کے مقابلہ میں امام نسائی نے التزام صحت اور رجال کے متعلق زیادہ شدت اور احتیاط برتی ہے اور مجموعی حیثیت سے صحیحین کے بعد یہی زیادہ معتبر اور مستند کتاب مانی جاتی ہے، علامہ سیوطی اور شارح سندھی دونوں کا بیان ہے کہ ''فی الجملہ نسائی کی کتاب السنن میں صحیحین کے

(۱) اختصار علوم الحدیث والحطہ ص ۱۰۹ بحوالہ شرح الفیہ بقائی۔

بعد سب سے کم ضعیف روایتیں ہیں اور اس کے رجال بھی دوسری کتابوں کے مقابلہ میں زیادہ مجروح نہیں ہیں۔

نواب صدیق حسن خاں صاحب اس اعتراض کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں ان کا مقصود سنن کبریٰ سے ہے کیوں کہ سنن صغریٰ میں تو امام نسائی نے صحیح ترین حدیثیں منتخب اور جمع کی ہیں اور ان روایتوں کو ترک کر دیا ہے جن کی سندوں میں کلام کیا گیا ہے چوں کہ ابن کثیر سے امام نسائی اور ان کی سنن کی توثیق کے متعلق بھی اقوال منقول ہیں، اس لیے اس توجیہ کے بعد ان کی دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں رہ جاتا، حقیقت یہ ہے کہ صحاح ستہ میں صحیحین کے بعد صحت میں سب سے اہم اور مقدم امام نسائی کی سنن ہے۔''(۱)

☆☆☆

(۱) اتحاف النبلاء ص ۹۱۔

امام ابویعلیٰ موصلیؒ

(متوفی ۳۰۷ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابویعلیٰ کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن علی بن مثنیٰ بن یحییٰ بن عیسیٰ بن ہلال۔

ولادت، خاندان ووطن: مشہور روایت کے مطابق وہ ۲۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں پیدا ہوئے، حافظ ذہبی نے شوال ۲۱۰ھ کی روایت کی ہے، ان کا خاندانی تعلق قبیلہ بنی تمیم سے تھا، اس لیے تمیمی کہلاتے ہیں، ان کا وطن موصل، دجلہ وفرات کا درمیانی علاقہ جزیرہ تھا۔(۱)

اساتذہ: امام ابویعلیٰ کے چند مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن حاتم طویل، احمد بن حنبل، شیبان بن فروخ، علی بن جعد، غسان بن لیث، محمد بن منہال ضریر یحییٰ حمانی اور یحییٰ بن معین وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن حبان، ابوبکر اسماعیلی، ابوبکر بن مقری، ابوحاتم، ابوعلی نیشاپوری، ابوعمرو بن حمدان، حمزہ بن محمد کتانی، محمد بن نصر نخاس اور نصر بن احمد مرجی۔

طلب علم کے لیے سفر: پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے طلب حدیث کے لیے سفر کیا اور قیاس ہے کہ اس زمانہ کے دستور کے مطابق مختلف مراکز حدیث کے ارباب کمال سے استفادہ کیا ہوگا۔

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۵۴۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۶ ومعجم البلدان ج ۸ ص ۱۹۸۔

حفظ وثقاہت: حافظ ابو یعلیٰ مشہور حفاظ حدیث اور نامور محدثین اسلام میں شمار کیے جاتے ہیں، اپنے غیر معمولی حافظہ کی بنا پر، الحافظ اور الحافظ المشہور کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، ان کی عدالت وثقاہت میں بھی کوئی کلام نہیں کیا گیا ہے، حافظ ذہبی اور ابن عماد حنبلی لکھتے ہیں ''وہ ثقہ ومتقن تھے'' ابن حبان نے ان کو ائمہ ثقات میں ذکر کیا ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ ثقہ ومامون تھے'' ابو علی ان کے اتقان اور حفظِ احادیث کے بڑے مداح ومعترف تھے اور فرماتے تھے کہ ''ان سے بہت کم حدیثیں مخفی تھیں'' علامہ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں ''وہ اپنے مرویات میں ثقہ وعادل اور احادیث میں حافظ وضابط تھے۔'' (۱)

زہد واتقاء: امام ابو یعلیٰ تدین وتقویٰ میں عالی مرتبہ اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ ''وہ صدق ودیانت، امانت، حلم، تقویٰ اور دوسرے تمام عمدہ اوصاف وکمالات کے جامع تھے'' ابن حبان کا بیان ہے کہ وہ تدین واتقان سے متصف تھے، حافظ ابن کثیر نے ان کو صاحب خیر اور صاحب شذرات نے صاحبِ صلاح بتایا ہے۔ (۲)

اخلاص: وہ زیادہ نمود کو برا سمجھتے تھے، ہر کام خالصۃً لوجہ اللہ کرتے تھے، مورخین کا بیان ہے کہ وہ تصنیف وتالیف، تعلیم حدیث اور تحصیل علوم میں محض حسبۃً للہ اور اخلاص کی بنا پر مشغول ہوئے تھے، ایک مرتبہ ابو عمر حیری نے ان کو حسن بن سفیان پر ترجیح دی، ایک شخص نے کہا یہ غلط ہے، حسن کی مسند ضخیم اور ان کے شیوخ اعلیٰ ہیں، حیری نے جواب دیا کہ ابو یعلیٰ حسبۃً للہ حدیث بیان کرتے تھے اور حسن کا یہ پیشہ تھا۔ (۳)

شہرت ومقبولیت: امام ابو یعلیٰ کو اپنے حسن نیت اور اخلاص کی برکت کی وجہ سے بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، ان کی ذات عوام وخواص کی عقیدت کا مرکز بن گئی، ان کے انتقال کے دن موصل کے بازار بند ہو گئے تھے اور لوگوں کا جم غفیر ان کے جنازہ میں شریک تھا۔

---

(۱) العبر ج ۲ ص ۲۷۵ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۲۵۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۵ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۳۰ (۲) ایضاً (۳) بستان المحدثین ص ۳۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۵۔

وفات: تقریباً سو سال کی عمر میں ۳۰۷ھ میں اپنے وطن موصل میں انتقال کیا۔(۱)

تصنیفات: امام ابویعلیٰ صاحب تصنیف تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ وہ عمدہ اور بہتر تصنیفات کے مالک تھے لیکن ان کی تین ہی کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں:

معجم: شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں ''انھوں نے ترتیب شیوخ پر ایک کتاب لکھی تھی۔(۲)

مسند کبیر و مسند صغیر: حافظ ابویعلیٰ نے دو مسندیں لکھی تھیں، ایک کبیر، دوسری صغیر، مشہور مسند صغیر ہے جو ۳۶ اجزا پر مشتمل ہے، اس کو ترتیب ابواب کے لحاظ سے جامع بھی کہا جا سکتا ہے،(۳) یہ حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں سمجھی جاتی ہے، اس میں ثلاثی حدیثیں بھی ہیں، شاہ ولی اللہ صاحب نے اس کو حدیث کی کتابوں کے تیسرے طبقہ میں شامل کیا ہے، حافظ اسماعیل تمیمی فرماتے ہیں کہ میں نے کئی مسانید، مسند عدنی اور مسند ابن منیع وغیرہ پڑھیں، ان کی حیثیت نہروں کی ہے اور مسند ابی یعلیٰ بحر زخار کی طرح تمام نہروں کا سنگم ہے۔''(۴)

اس کی اہمیت کی وجہ سے علمائے فن نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، حافظ ابن کثیر نے جامع المسانید والسنن میں اور محمد بن سلیمان (م ۱۰۹۴ھ) نے جمع الفوائد من جامع الاصول ومجمع الزوائد میں اس کی حدیثیں درج کی ہیں، نور الدین ہیثمی نے اس کے زوائد مرتب کیے اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرہ میں اور شہاب الدین بوصیری نے اطراف المسانید العشرۃ میں اس کے مرویات نقل کیے ہیں۔(۵)

مسند ابی یعلیٰ کے قلمی نسخے حیدر آباد کے دائرۃ المعارف العثمانیہ اور کتب خانہ آصفیہ کے علاوہ مکتبہ سندیہ اور جرمنی کے کتب خانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔(۶)

(۱) بستان المحدثین ص ۳۵ (۲) ایضاً (۳) ایضاً والرسالۃ المستطرفۃ ص ۶۱ (۴) حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۷۶ (۵) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۴۰ و ۱۴۴ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۴۳ و ۱۴۴
(۶) تذکرۃ النوادر ص ۳۹ وفہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۶۷۰، ۶۷۱۔

امام ابن خزیمہ

(متوفی ۳۱۱ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوبکر کنیت، شیخ الاسلام لقب اور نسب نامہ یہ ہے: محمد اسحاق بن خزیمہ بن مغیرہ بن صالح بن بکر۔

ولادت، خاندان ووطن: ماہ صفر ۲۲۳ھ میں نیشاپور میں پیدا ہوئے، مجشر بن مزاحم سے ولاء کا تعلق تھا۔(۱)

اساتذہ: شیوخ واساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوقدامہ سرخسی، ابوکریب، احمد بن منیع، اسحاق بن موسیٰ خطمی، بشر بن معاذ عقدی، عبدالجبار بن علاء، عتبہ بن عبداللہ محمدی، علی بن حجر، علی بن خشرم، محمد بن ابان مستملی، محمد بن اسلم زاہد، محمد بن حرب، محمد بن مہران، محمود بن غیلان، نصر بن علی جہضمی، یونس بن عبدالاعلیٰ۔

اسحاق بن راہویہ اور محمد بن حمید رازی سے بھی ان کو ملاقات اور سماع کا شرف حاصل ہوا، مگر اس وقت کم سن تھے، اس لیے احتیاط کی بنا پر ان بزرگوں سے حدیثیں نہیں بیان کرتے تھے۔(۲)

تلامذہ: جن لوگوں سے ان کی روایات کا زیادہ حصہ منقول ہے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوبکر احمد بن مہران مقری، ابوحامد احمد بن محمد بن مالویہ، ابوعلی نیشاپوری،

---

(۱) المنتظم ابن جوزی ج ۶ ص ۱۸۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۷ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۰۔

ابوعمرو بن حمدان اسحاق بن سعید نسوی، محمد بن بصیر اور پوتے محمد بن فضل۔
ان کے تلامذہ میں ابراہیم بن ابی طالب اور ابوعمرو احمد بن مبارک مستملی بھی تھے، جو عمر میں ان سے بڑے تھے۔(۱)

رحلت وسفر: علم وفن کی تحصیل اور حدیث وفقہ کی تکمیل کے لیے انھوں نے مختلف مقامات کے سفر کیے، بچپن میں اپنے وطن کے علماو مشائخ سے استفادہ کیا، اس کے بعد رے، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، حجاز، عراق، مصر اور واسط وغیرہ تشریف لے گئے۔(۲)

حفظ وثقاہت: علامہ ابن حبان فرماتے ہیں کہ حدیثوں کے اسناد ومتون کا ان سے بہتر کوئی حافظ میں نے نہیں دیکھا، ابواحمد دارمی نے خود ابن خزیمہ سے ان کے حافظہ کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ "میں جس چیز کو تحریر کرتا ہوں وہ مجھے زبانی یاد ہو جاتی ہے" ابوعلی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ جس طرح قرا کو قرآن کی سورتیں زبانی یاد ہوتی ہیں اسی طرح ابن خزیمہ کو فقہیات حدیث زبانی یاد ہیں، امام دارقطنی وغیرہ نے ان کو ثقہ وثابت بھی قرار دیا ہے، ابن حبان فرماتے ہیں کہ روئے زمین پر احادیث وسنن کے صحیح الفاظ اور زیادات کی یادداشت رکھنے والا ان کے مانند کوئی اور شخص نہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سنن واحادیث کا تمام ذخیرہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔(۳)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: ابن خزیمہ کا شمار اکابر محدثین اور نامور ائمہ فن میں ہوتا ہے، احادیث پر ان کی نظر نہایت وسیع اور گہری تھی، وہ کم سنی ہی میں امام اور حافظ حدیث کی حیثیت سے مشہور ہو گئے تھے، ایک دفعہ امام شافعیؒ کے نامور شاگرد اور فقہ شافعی کے جامع ومدون امام مزنی سے ایک عراقی شخص نے دریافت کیا کہ جب قرآن مجید نے قتل کی صرف دو ہی صورتیں بیان کی ہیں، عمد وخطا، تو آپ لوگ تیسری قسم شبہ عمد کو کس طرح مانتے ہیں،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۷ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۰ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۸۹ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ و ۱۳۴۔

انھوں نے جواب میں ایک حدیث پیش کی، اس نے کہا کہ آپ علی بن زید بن جدحان کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، یہ سن کر مزنی خاموش ہو گئے اور ابن خزیمہ نے جواب کہ شبہ عمد کی روایتیں دوسرے طرق سے بھی مروی ہیں، عراقی نے کہا اور کس کے واسطہ سے مروی ہیں، امام ابن خزیمہ نے فرمایا ایوب سختیانی اور خالد حزا سے، اس نے ایک راوی عقبہ بن اوس کے متعلق شک وتردد کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ ایک بصری شیخ ہیں اور ابن سیرین جیسے جلیل القدر بزرگ نے بھی ان سے روایت کی ہے، معترض نے امام مزنی سے عرض کیا کہ آپ مناظرہ کر رہے ہیں یا یہ؟ انھوں نے فرمایا کہ یہ احادیث کے بارے میں مجھ سے زیادہ واقف کار ہیں، اس لیے جب حدیثوں پر گفتگو ہوتی ہے تو میں خاموش رہتا ہوں اور یہ بحث ومناظرہ میں حصہ لیتے ہیں۔(۱)

امام ابن خزیمہ مسائل وفتاوے کا جواب بھی احادیث کی روشنی میں دیتے تھے، امیر اسماعیل بن احمد نے ایک مرتبہ فئی وغنیمت کا فرق دریافت کیا تو انھوں نے سورۂ انفال کی آیت وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَهٗ الخ پڑھنے کے بعد چند حدیثیں بیان کیں، پھر سورۂ حشر کی آیت مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ الخ پڑھ کر احادیث سے مسئلہ کی وضاحت کی، ابوزکریا یحییٰ بن محمد کا بیان ہے کہ اس موقع پر انھوں نے تقریباً ۱۷۰ حدیثیں بیان کی ہوں گی۔(۲)

احادیث سے استنباط مسائل میں ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا، ابن سریج کا بیان ہے کہ وہ بڑی چھان بین اور محنت سے احادیث کے نکات ومطالب کا استخراج کرتے تھے۔(۳)

حدیث کی نقل وروایت میں ان کے فضل وامتیاز کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ ابن جوزی نے لکھا ہے کہ وکان مبرز فی علم الحدیث یعنی وہ علم حدیث میں بہت

(۱) طبقات الفقہا لابی اسحاق شیرازی ص ۸۷ (۲) طبقات الشافعیہ سبکی ج ۲ ص ۱۳۴ (۳) ایضاً ص ۱۳۲ وطبقات الفقہا شیرازی ص ۸۷۔

ممتاز اور نہایت فاضل تھے۔(۱)

انھوں نے سنن کی اشاعت واحیا کا مقدس فرض بھی انجام دیا، ایک مرتبہ ان کے ایک پڑوسی نے خواب دیکھا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے شبیہ مبارک کو صیقل کر رہے ہیں، معبرین نے بتایا کہ ابن خزیمہ احیاء سنت اور اشاعت حدیث کا کام انجام دیں گے۔(۲)

فقہ واجتہاد: فقہ میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند تھا، بویطی اور مزنی جیسے اساتذہ وقت سے اس کی تحصیل کی تھی لیکن فقہ کے عام مذاہب میں سے وہ کسی خاص مذہب سے وابستہ نہیں تھے بلکہ ان کا شمار مجتہدین مطلق میں ہوتا ہے، علامہ ابن سبکی نے ان کو المجتہد المطلق اور علامہ ابن کثیرؒ نے وھو من المجتھدین فی دین الاسلام لکھا ہے، ان کا خود بیان ہے کہ سولہ سال کی عمر کے بعد میں نے کسی کی تقلید نہیں کی۔

ابوزکریا یحییٰ بن محمد عنبری فرماتے ہیں کہ میں نے ابن خزیمہ سے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحیح فرمان کی موجودگی میں کسی شخص کی بات کا اعتبار نہیں کیا جائے گا،(۳) بعض علما کا خیال ہے کہ وہ خود صاحب مذہب اور مستقل امام فقہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ان کے فتاوے بھی ایک زمانہ میں بعض اسلامی ملکوں میں رائج تھے، ان کے بعض فقہی مسائل کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً۔

وہ رفع یدین کو نماز کا اہم اور ضروری رکن سمجھتے تھے، صف کے پیچھے تنہا نماز پڑھنے والے کے لیے اعادہ لازمی سمجھتے تھے۔

حافظ ابن قیم لکھتے ہیں کہ ''محمد بن اسحاق امام الائمہ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، ان کے متبعین ان کے مذہب کی پیروی کرتے تھے، وہ مقلد کے بجائے خود امام مستقل اور صاحب مذہب تھے، بیہقی نے یحییٰ بن محمد عنبری کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اصحاب

(۱) ج ۶ ص ۱۸۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۴ (۳) ایضاً والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹ وطبقات الفقہا شیرازی ص ۸۷۔

حدیث کے پانچ طبقے ہیں، ۱-مالکیہ، ۲-شافعیہ، ۳-حنبلیہ، ۴-راہویہ اور ۵-خزیمیہ۔(۱)

کلام وعقائد کے بعض مسائل: بدعات کو سخت ناپسند کرتے تھے اور عام محدثین کی طرح کلام وعقائد کے غیر ضروری مسائل میں بحث وتدقیق احتیاط وتقویٰ کے منافی خیال کرتے تھے، اپنے تلامذہ اور منتسبین کو سخت تاکید کردی تھی کہ اس قسم کے مسائل مین پڑنے سے پرہیز کریں، بعض تلامذہ کے متعلق جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ ایسے مباحث ان کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں تو سخت برہمی ظاہر کی اور اعلان کردیا کہ یہ لوگ میرے حوالہ سے جو کچھ بیان کرتے ہیں وہ غلط ہے۔

عقائد وکلام کے متعلق انھوں نے جو کتابیں لکھی تھیں، ان میں اہل سنت والجماعت کے نقطۂ نظر کی ترجمانی کی ہے، بعض مسائل میں عام اہل سنت سے بھی زیادہ متشدد تھے، چند مسائل کے متعلق ان کے آرا وخیالات طبقات وتراجم کی کتابوں سے نقل کیے جاتے ہیں۔

قرآن مجید خدا کا کلام ہے، اس کی وحی وتنزیل اور وہ خود غیر مخلوق ہے، وہ خدا کی صفات میں ایک ذاتی صفت اور مستقل بالذات ہے، اس کو مخلوق، محدث اور فعلی صفت سمجھنے والے جہمی، بدعتی اور گمراہ ہیں، بعض جاہل کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مکرر کلام نہیں کرتا، یہ لوگ کلام الٰہی سے ناآشنا اور اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں، اللہ نے کئی مقامات پر تخلیق آدم کا ذکر کیا ہے جو حضرت موسیٰ کا قصہ مکرر بیان کیا ہے، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ بار بار کہا گیا ہے، یہ کسی مسلمان کا عقیدہ نہیں ہوسکتا اور جو شخص یہ اعتقاد رکھے کہ ازل میں کلام کرنے کے بعد اللہ پھر کلام نہیں کرتا وہ جہمی ہے، اللہ عرش پر بلاکیف مستوی ومتمکن ہے۔

ان مسائل میں وہ اتنے متشدد تھے کہ جہمیہ وغیرہ کو کافر بھی کہہ دیتے تھے، فرماتے ہیں: اللہ ازل سے متکلم ہے، جو شخص یہ گمان کرے کہ اللہ ایک ہی بار کلام کرتا ہے وہ کافر

(۱) اعلام الموقعین ص ۳۶۲۔

ہے، اسی طرح جو اس کا اقرار نہ کرے کہ اللہ عرش پر ساتویں آسمان کے اوپر متمکن ہے وہ کافر ہے، اس کا خون مباح اور مال حلال ہے، قرآن کو کلام الٰہی کے بجائے مخلوق سمجھنے والا کافر ہے، اس سے توبہ کرائی جائے گی اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے گا، اور وہ مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کیا جائے گا، جہمیہ اور کلامیہ ملعون اور اپنے عقائد وخیالات میں جھوٹے ہیں۔(۱)

فضل وکمال کا اعتراف: ان کے معاصرین علما اور ارباب کمال ان کے علم وکمال کے معترف تھے، امام دارقطنی نے ان کو عدیم النظیر اور علامہ ذہبی نے فرید العصر اور حافظ ابن کثیر نے بحر امن بحور العلم لکھا ہے، ابوعلی نیشاپوری فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے زیادہ صاحب کمالات آدمی نہیں دیکھا'' ان کے استاذ ربیع بن سلیمان کا بیان ہے کہ ''ابن خزیمہ نے ہم سے جتنا استفادہ کیا، ہم نے اس سے زیادہ ان سے استفادہ کیا'' علامہ ابن سبکی ان کی جامعیت وفضیلت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''وہ مختلف علوم کے جامع اور مرتبہ کمال پر فائز تھے، نیشاپور میں جو علم وفن کا گہوارہ اور فضلا وارباب کمال کا مرکز تھا، یکتائے روزگار تھے، ان کی علمی شان سب سے بالا وبرتر تھی، ان کے گرد طلبا ومستفیدین کا ہجوم رہتا تھا، ان کے فتاوے تمام روئے زمین میں نقل ہوتے تھے، عقل وفطانت میں بے مثال تھے، بحث مناظرہ میں انھیں زیر نہیں کیا جاسکتا تھا، درحقیقت علم وفضل کا ایسا بحر زخار تھے جس سے تشنگان علوم سیراب ہوتے تھے، ان کی اس علمی ضیاباری سے ایک عالم کو بصیرت حاصل ہوتی تھی، علما واساطینِ فن بھی ان کی جانب رجوع کرتے تھے، ان کے فیض کا یہ حال تھا۔

کالبحر یقذف للقریب جواھرا کرما ویبعث للغریب صحائبا(۲)

''یعنی ابن خزیمہ، سمندر کی طرح اپنے قریب کے لوگوں کو موتی اور

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۲ تا ۲۹۴ (۲) طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۲ ص ۱۳۰۔

جواہرات سے مالا مال کرتے ہیں اور دور والوں کے لیے بارانِ رحمت کی طرح سامان فیض کرتے ہیں۔"

اتباع سنت: اتباع سنت میں بڑا اہتمام تھا، چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی وہ سنت کا لحاظ رکھتے تھے، ایک مرتبہ ان سے حمام میں بال منڈانے کے لیے کہا گیا، تو فرمایا کہ میرے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حمام میں داخل ہو کر بال منڈانا ثابت نہیں ہے، ابوعمرو بن اسماعیل کا بیان ہے کہ میں ابن خزیمہ کے درس میں شریک ہوتا تھا اور وہ اکثر معمولی کاموں میں مدد لیا کرتے تھے، ایک دفعہ میرا داہنا ہاتھ روشنائی سے سیاہ ہو گیا تھا، اس لیے میں نے ان کو بائیں ہاتھ سے قلم دینا چاہا تو انھوں نے نہیں لیا، میرے رفقا نے داہنے ہاتھ سے قلم دینے کے لیے کہا، جب میں نے داہنے ہاتھ سے دیا تو انھوں نے لے لیا۔(۱)

بزرگی وکرامت: وہ صاحب کرامت بھی تھے، لوگ ان کی ذات کو نہایت بابرکت خیال کرتے تھے، ابوعثمان زاہد کا بیان ہے کہ "اللہ تعالیٰ اہل نیشاپور کے مصائب وآلام ابن خزیمہ کی برکت سے دفع کر دے گا۔"

محمد بن ہارون طبری روایت کرتے ہیں کہ وہ اور محمد بن نصر مروزی، محمد بن علویہ وزان اور محمد بن اسحاق بن خزیمہ چاروں آدمی تحصیل علم وسماع حدیث کے لیے ربیع بن سلمان کے پاس گئے، وہاں ہم لوگوں کا ساز وسامان ختم ہو گیا، جب تین دن اور تین رات تک فاقہ کرنا پڑا تو ہم نے آپس میں کہا ایسی حالت میں تو ہمارے لیے سوال کرنا جائز ہے لیکن ہر شخص سوال کرنے میں عار محسوس کرتا تھا، اس لیے قرعہ اندازی کی گئی، اتفاق سے قرعہ ابن خزیمہ کے نام نکلا، انھوں نے کہا، پہلے مجھے دو رکعت استخارہ کی نماز پڑھ لینے دو، ابھی وہ نماز پڑھ ہی رہے تھے کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھولا گیا تو امیر مصر احمد بن طولون کا خادم اجازت لے کر اندر داخل ہوا اور سلام کر کے بیٹھ گیا، پھر ایک پرزہ نکال کر پوچھا کہ

(۱) طبقات الشافعیہ ابن سبکی ج ۲ ص ۱۳۱

محمد بن نصر کون صاحب ہیں؟ ہم لوگوں نے ان کی طرف اشارہ کردیا، اس نے پچاس ہزار کی ایک تھیلی دی اور کہا، امیر نے سلام عرض کیا ہے اور آپ کے اخراجات کے لیے یہ رقم پیش کی ہے، ختم ہونے کے بعد مزید رقم پیش کی جائے گی، اسی طرح ہم چاروں کو تھیلیاں دے کر یہی پیغام پہنچایا، ہم لوگوں نے اس سے کہا، پہلے اس واقعہ کا سبب بتاؤ ورنہ ہم یہ تھیلیاں نہیں قبول کریں گے، اس نے کہا آج دوپہر میں امیر قیلولہ کررہے تھے کہ انھوں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ کل خدا کے یہاں حاضر ہو کر کیا جواب دو گے جب وہ تم سے ان چاروں علما کے متعلق سوال کرے گا جو تین روز سے بھوکے ہیں، اس خواب سے امیر گھبرا کر اٹھ بیٹھے اور آپ لوگوں کا نام لکھوا کر یہ تھیلیاں بھیجیں، میں اسی وقت سے آپ لوگوں کی تلاش میں تھا، اب جا کر آپ لوگ ملے ہیں۔'' (۱)

قناعت: زندگی بڑی سادہ ودرویشانہ اور تکلف وآرائش سے بالکل پاک تھی، ایک معمولی رقم میں گذر بسر کرلیتے تھے، پہننے کے لیے ہمیشہ ایک ہی قمیص ہوتی تھی، جب دوسری قمیص بنواتے تو پرانی کسی ضرورت مند کو دیدیتے تھے، لوگ درخواست کرتے کہ کچھ زیادہ کپڑے بنوالیجئے، فرماتے کہ مجھے اپنے نفس کے آرام وراحت کا کوئی خیال نہیں۔ (۲)

سخاوت: بڑے فیاض اور مہمان نواز تھے، ان کے پوتے محمد بن فضل کا بیان ہے کہ میرے دادا بخل سے نا آشنا اور مال پس انداز نہیں کرتے تھے، ان کا کل مال ودولت اہل علم اور ضرورت مندوں کے لیے وقف تھا، ایک مرتبہ بڑی پرتکلف دعوت کی، مختلف قسم کے لذیذ کھانوں اور حلوے، میوے اور فواکہ سے دسترخوان آراستہ تھا، امرا واعیان کے ساتھ اہل علم اور فقہا ومحدثین بھی مدعو تھے، ہر شخص نے شکم سیر ہو کر کھایا، لوگوں کا بیان ہے کہ ایسی شاندار دعوت اور اس کا اہتمام صرف سلطان ہی کرسکتا تھا۔ (۳)

---

(۱) المنتظم ابن جوزی ج ۶ ص ۱۸۵ و ۱۸۶ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۳) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۵۔

صاف گوئی: ان کے اخلاقی اوصاف میں سب سے نمایاں وصف صاف گوئی ہے، امرا واعیانِ دولت کے سامنے بھی وہ اس میں باک نہ کرتے تھے، ایک دفعہ امیر اسماعیل بن احمد نے اپنے والد کے واسطہ سے ایک حدیث بیان کی جس کی سند میں ان کو وہم ہو گیا تھا، ابن خزیمہ بھی وہاں موجود تھے، انھوں نے فوراً اس کی تصحیح کی جب واپس ہوئے تو قاضی ابوذر نے بتایا کہ ہم لوگ بیس سال سے یہ غلط روایات سنتے تھے مگر تصحیح کی جرأت نہ ہوتی تھی، ابن خزیمہ نے کہا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں خطأ وتحریف جان کر خاموش رہنا گوارا نہیں کر سکتا۔(۱)

امامت وشہرت: اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی مرجعیت اور شہرت عطا فرمائی تھی، امام الائمہ ان کے نام کا جز بن گیا تھا، اسنوی کا بیان ہے کہ وہ اپنے زمانہ میں خراسان کے امام تھے، امام دارقطنی نے ان کو اور ابن ابی حاتم نے امام ومقتدا کہا ہے،(۲) مقبولیت کا یہ حال تھا کہ ان سے استفادہ کرنے کے لیے علما وطلبہ کا ہجوم لگا رہتا تھا، بڑے بڑے ارباب کمال دور دراز سے مشقتیں برداشت کر کے استفادہ کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور مستفیدین کے قافلے ہر وقت خیمہ زن رہتے تھے، امرا وارباب حشمت بھی ان کے اعزاز واکرام کو ملحوظ رکھتے تھے، پہلی مرتبہ جب امیر اسماعیل بن احمد سے آپ کی ملاقات ہوئی تو اس نے ناواقفیت کی وجہ سے شایان شان التفات نہیں کیا، بعد میں جب اس کو معلوم ہوا کہ یہ ابن خزیمہ ہیں تو اس نے بڑی معذرت اور شرمندگی کا اظہار کیا اور نہایت گرمجوشی کے ساتھ ملا۔(۳)

وفات: ۲رذی قعدہ ۳۱۱ھ کو داعی اجل کو لبیک کہا،(۴) اور اپنے گھر کے ایک کمرہ میں دفن کیے گئے، بعد میں پورا گھر مقبرہ میں تبدیل ہو گیا تھا، علامہ ابن جوزی نے ۸رذوقعدہ اور ابو اسحاق شیرازی نے ۳۱۲ھ سنہ وفات بتایا ہے،(۵) ایک شاعر کے مرثیہ کے دو شعر یہ ہیں:

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۱ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۹۵ (۳) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۴

(۴) ایضاً وتذکرۃ ج ۲ ص ۲۹۵ (۵) المنتظم ج ۶ ص ۱۸۶ وطبقات الفقہاء ص ۸۷۔

یـابن اسحاق قد مضیت حمیدا فسقی قبرك السحاب الهتون

مـاتـولیت لابل العلم ولی مـادفنـاك بل هو المدفون (۱)

ترجمہ: اے ابن اسحٰق آپ کی زندگی نہایت قابل ستائش تھی، آپ کی قبر کو ہمیشہ برسنے والے بادل سیراب کرتے رہیں، آپ دنیا سے رخصت نہیں بلکہ علم رخصت ہوگیا، ہم نے آپ کے بجائے علم کو دفن کیا ہے۔

تصنیفات: ابن خزیمہ نامور مصنف بھی تھے، ان کی تصنیفات کی تعداد حاکم نے ۱۴۰ سے زیادہ بتائی ہے، ان کے علاوہ اُن کے مسائل کا مجموعہ بھی سو جزوں کے بقدر تھا، ابن کثیر کا بیان ہے فکتب الکثیر وصنف وجمع یعنی بے شمار کتابیں تصنیف کیں، ابن خزیمہ تصنیف شروع کرنے سے قبل استخارہ کی نماز پڑھتے تھے، اگر استخارہ نکل آتا تھا تب تصنیف کی ابتدا کرتے تھے، (۲) جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

فقہ حدیث بریرہ: یہ تین جزوں پر مشتمل ہے، اس میں ایک حدیث کی فقاہت کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔

کتاب التوحید والصفات: یہ بڑی اہم اور مشہور کتاب ہے اور کئی اجزا پر مشتمل ہے، اس کا موضوع کلام وعقائد ہے، امام رازی اس کو کتاب الاشراک کے نام سے موسوم کرتے تھے، یورپ کے بعض کتب خانوں میں اس کے نسخے پائے جاتے ہیں، ابونعیم نے المستخرج علی التوحید لکھی تھی۔ (۳)

صحیح ابن خزیمہ: یہ علامہ ابن خزیمہ کی سب سے اہم کتاب ہے، اس کا شمار حدیث کی اہم اور معتبر کتابوں میں ہوتا ہے، مستند مصنفین اور ثقہ علما اس کی حدیثوں سے اخذ واستناد کرتے ہیں، کتب صحاح کے علاوہ جن محدثین نے اپنی کتابوں میں صحت کا زیادہ

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۳۳ (۲) ایضاً ص ۱۳۴ و ۱۳۵ وتذکرۃ ج ۲ ص ۲۹۴ والبدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹

(۳) فوائد جامعہ ص ۱۴۴ وکشف الظنون ج ۲ ص ۲۷۰ وتذکرۃ النوادر ص ۶۴ وتدریب الراوی ص ۳۵۔

التزام کیا ہے، ان کے مجموعے صحیح کہلاتے ہیں، شاہ عبدالحق صاحب فرماتے ہیں ''جن دیگر علمانے صحاح کے مجموعے لکھے ان میں ابن خزیمہ کی صحیح بعض حیثیتوں سے زیادہ مشہور ہے،''
اس کی اہمیت کا اندازہ ابن کثیر کے اس بیان سے بھی ہوتا ہے:

من انفع الکتب واجلھا (۱) یعنی صحیح ابن خزیمہ نہایت مفید اور اہم کتابوں میں ہے، علامہ سیوطی نے بخاری ومسلم کے بعد جن کتابوں کو زیادہ معتبر بتایا ہے، ان میں کتب صحاح کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے، وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ صحیح ابن خزیمہ کا پایہ صحیح ابن حبان سے زیادہ ہے، کیوں کہ ابن خزیمہ نے صحت کی جانب زیادہ توجہ کی ہے، وہ ادنیٰ شبہہ پر بھی توقف سے کام لیتے ہیں، چنانچہ اکثر ان صح الخبر وان ثبت وغیرہ قسم کے الفاظ لکھے ہیں، یہ صحت میں صحیح مسلم کے قریب قریب ہے، اس کے نسخے یورپ کے بعض کتب خانوں اور جرمنی میں موجود ہیں، حافظ ابن حجر نے صحیح ابن خزیمہ پر مفید حواشی بھی لکھے تھے۔ (۲)

☆☆☆

(۱) البدایہ ج ۱۱ ص ۱۴۹ و حواشی سعدی ص ۱۵ و تدریب الراوی ص ۳۱ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۳۔

امام ابوعوانہ اسفرائینیؒ

(متوفی ۳۱۶ھ)

نام ونسب: یعقوب نام، ابوعوانہ کنیت، اور سلسلہ نسب یہ ہے: یعقوب بن اسحاق بن ابراہیم بن یزید۔ بعض اہل سیر نے یزید کے بجائے زید لکھا ہے۔ (۱)

وطن: وہ اسفرائن کے باشندہ تھے لیکن آخر عمر میں نیشاپور میں سکونت کر لی تھی، اس لیے اسفرائینی اور نیشاپوری دونوں نسبتوں سے مشہور ہیں، اسفرائین نواحی نیشاپور میں زرخیز اور شاداب شہر تھا، قدیم زمانہ میں اس کا نام مہرجان تھا، اس شہر کی جانب علماواعیان کی ایک کثیر جماعت منسوب ہے، سمعانی کا بیان ہے کہ قدیم اور جدید ہر دور میں جملہ فنون کے ماہرین علما اور فضلا کی ایک جماعت یہاں پیدا ہوئی، ان میں ابوعوانہ بھی ہیں۔ (۲)

اساتذہ: ابوعوانہ کے شیوخ واساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، ان میں سے اکثر بڑے نامور اور کامل الفن ہیں، بعض شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوحاتم، ابوزرعہ، احمد بن ازہر، احمد بن سعید دارمی، اسماعیل بن محمد بن قیراط، حسن زعفرانی، سعد بن عبدالحکم، سعدان بن نصر، علی بن اسکاب، علی بن حرب، عمر بن شیبہ، محمد بن رجاء سندی، محمد بن عبدالحکم، محمد بن یحییٰ ذہلی، مسلم بن حجاج قشیری، یزید بن محمد بن عبدالصمد، یعقوب بن سفیان اور یونس بن عبدالاعلیٰ وغیرہ سے علم حدیث کی اور امام شافعیؒ

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۴۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۲۱ (۲) بستان المحدثین ص ۳۷، کتاب الانساب ص ۳۴۔

کے ارشد تلامذہ ابوابراہیم مزنی اور ربیع بن سلیمان سے فقہ میں تکمیل بہم پہنچائی۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ اور مستفیدین کا حلقہ بھی بڑا وسیع ہے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

ابواحمد علی، ابوبکر اسماعیلی، ابوعلی نیشاپوری، ابوالولید فقیہ، احمد بن علی رازی، حسین بن علی، سلیمان طبرانی، عبداللہ بن عدی، عبدالملک بن حسن اسفرائینی (۱)، محمد بن ابوعوانہ (۲) محمد بن یعقوب بن اسماعیل، یحییٰ بن منصور قاضی وغیرہ۔

طلب حدیث کے لیے سفر: ابوعوانہ نے علم حدیث کی طلب و جستجو میں متعدد مقامات کے سفر کیے، اس حیثیت سے بھی وہ دوسرے محدثین میں ممتاز ہیں، ان سے زیادہ کسی اور کے سفر کی تفصیل نہیں ملتی، علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ''ابوعوانہ نے طلب حدیث کے لیے سفر کیے اور اس کے جمع کرنے اور اس کی تحریر و کتابت میں بڑی مشقت اٹھائی'' حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ کثیر الاسفار تھے اور انھوں احادیث کی تحصیل کے لیے روئے زمین کا گوشہ گوشہ چھان ڈالا'' ابن خلکان کا بیان ہے کہ:

احد الحفاظ الجوالین والمحدثین المکثرین۔ (۳)	وہ ان حفاظ اور محدثین میں تھے جنھوں نے بڑے سفر کیے اور بکثرت حدیثیں جمع کیں۔

مؤرخین اور اصحاب سیر کا بیان ہے کہ انھوں نے خراسان، عراق، یمن، حجاز، شام، جزیرہ، فارس، اصفہان، ثغور، ری، واسط، بصرہ اور کوفہ وغیرہ مختلف ملکوں اور شہروں کا تحصیل علم اور طلب حدیث کے لیے سفر کیا۔

حفظ وثقاہت: ان کا حافظہ بے مثال تھا، علمائے فن نے ان کو الحافظ الکبیر الجلیل،

(۱) یہ ابوعوانہ کے بھتیجے تھے، (۲) یہ ابوعوانہ کے فرزند تھے، (۳) کتاب الانساب ورق ۳۴ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۳۴۵، مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۲۷۰۔

احد الحفاظ، احد حفاظ الدنیا اور من اکابر حفاظ الحدیث لکھا ہے اور ثقہ جلیل اور الثقۃ الکبیر وغیرہ کے الفاظ میں ان کی توثیق کی ہے۔

اعتراف کمال: دوسرے علما و محدثین ان کے کمالات کے معترف تھے، حاکم لکھتے ہیں کہ ''ابوعوانہ بلند پایہ محدثین اور اصحاب کمال میں تھے'' ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ''وہ نامور محدثین اور بلندترین علمائے اسلام میں تھے۔'' (۱)

فقہ و اجتہاد: فقہ میں بھی ان کا پایہ بلند تھا، ذہبی کا بیان ہے کہ ''وہ حافظ و محدث ہونے کے ساتھ ساتھ فقیہ اور امام بھی تھے، ابن خلکان نے ان کے مزار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس مقام میں امام شافعی کے مذہب و مسلک سے تعلق رکھنے والے چالیس ایسے ائمہ مجتہدین اور فقہا مدفون ہیں جو اگر اپنی رائے واجتہاد سے فتویٰ دیتے تو بلاشبہہ وہ اس کے مستحق تھے''

مذہب و مسلک: انھوں نے فقہ کی تعلیم شافعی مذہب کے ائمہ سے حاصل کی تھی، اس لیے ان کو اس مذہب سے بڑا تعلق تھا، مصر سے واپس آنے کے بعد انھوں نے شوافع کی کتابوں سے پہلی مرتبہ اسفرائن کے لوگوں کو روشناس کرایا اور انہی کی بدولت اسفرائن میں امام شافعیؒ کے مذہب کی ترویج واشاعت ہوئی۔ (۲)

زہد و اتقا: زہد و تقویٰ کے زیور سے بھی آراستہ تھے، علامہ سمعانی بیان کرتے ہیں کہ ''وہ زاہد، عبادت گذار، عفیف، پاکدامن اور کم خور تھے اور پانچ مرتبہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔

وفات: اپنے وطن اسفرائن میں ۳۱۶ھ میں انتقال کیا، ایک روایت ۳۱۳ھ کی بھی ہے لیکن وہ ضعیف ہے۔

تصنیفات: امام ابوعوانہ کی تصنیفات میں ایک مسند صحیح ان کی یادگار ہے جو دراصل صحیح مسلم

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۳ ص ۳۴۵ و تذکرہ ج ۳ ص ۲ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۳۲۲ (۲) ایضاً۔

پر مستخرج ہے، محدثین کی اصطلاح میں مستخرج اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں کسی دوسری کتاب کی حدیثوں کو اس کی ترتیب متون اور طرق اسناد کے مطابق نقل کیا جاتا ہے، مسند ابوعوانہ میں امام مسلم کے طرق واسانید کے علاوہ دوسرے طرق اسناد اور بعض متون کا اضافہ بھی کیا گیا ہے، اس لیے اس کو صحیح بھی کہا جاتا ہے اور اس حیثیت سے دراصل یہ خود ایک مستقل تصنیف بن گئی ہے۔(۱)

خصوصیات: ۱- اس کی پہلی خصوصیت تو یہی ہے کہ صحیح مسلم کی مستخرج ہونے کے باوجود اس میں بعض اضافے بھی ہیں، علامہ ذہبی کا بیان ہے:

صاحب الصحیح المسند المخرج علی صحیح مسلم وله فیه زیادات عدة۔(۲)	ابوعوانہ صاحب صحیح مسند ہیں، ان کی کتاب امام مسلم کی صحیح پر تخریج کی گئی ہے لیکن اس میں متعدد اضافے بھی ہیں۔

مثلاً باب الدلیل علیٰ ایجاب الوضو میں تین حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال ابوعوانة من هنا لم یخرجه اصحابنا۔	یعنی یہاں سے جو روایتیں نقل کی جارہی ہیں ان کی ہمارے اصحاب نے تخریج نہیں کی ہے۔

اسی طرح آٹھ حدیثیں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

قال ابوعوانة الیٰ هنا زدت من عندی۔(۳)	یعنی یہاں تک میں نے خود اضافہ کیا ہے۔

۲-مختلف اسانید اور متعدد احادیث تحویل نظائر وشواہد کے ساتھ درج کیے ہیں اور اختلاف متن کی بحث کرتے ہوئے ایسے اقوال اور صحیح مرویات جمع کیے ہیں جو دوسری متداول کتابوں میں نہیں ملتے۔

---

(۱) بستان المحدثین ص ۳۵، ۳٦ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲ (۳) مسند ابوعوانہ ج ۱ ص ۲۳۵، ۲۳۷۔

۳- امام ابوعوانہ نے احادیث کے معنی کی صحیح تعبیر اور بلیغ تشریح بھی کی ہے۔

۴- فقہی ابواب پر مسند کو مرتب کرنے کے باوجود انھوں نے اس میں مختلف فصول قائم کیے ہیں جو ان کی طباعی کا ثبوت ہے۔

اس مسند کو پہلی مرتبہ مولانا محمد ہاشم ندوی نے ایڈٹ کر کے دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے ۱۳۶۲ھ و ۱۳۶۳ھ میں دو جلدوں میں شائع کیا ہے اور مفید تعلیقات اور مختصر حواشی بھی لکھے ہیں، دونوں جلدوں کے آخر میں ابواب وفصول کی مفصل فہرست، اسماء واعلام کی انڈکس اور پہلی جلد میں مصنف اور تصنیف کے متعلق مفید معلومات بھی درج ہیں، مسند کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں (۱) اور علمائے فن نے اس کے ساتھ اعتنا کیا ہے، علامہ ذہبی نے المنتقیٰ کے نام سے اس کی ۲۳۰ حدیثوں کو منتخب کیا ہے اور حافظ ابن حجر نے اتحاف المہرۃ باطراف العشرۃ میں مستخرج ابی عوانہ کی حدیثیں درج کی ہیں۔ (۲)

☆☆☆

---

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۶۴ وتذکرۃ النوادر ص ۴۰ (۲) بستان المحدثین ص ۳۷ وذیل طبقات الحفاظ ص ۳۲۳۔

امام ابوجعفر طحاویؒ

(متوفی ۳۲۱ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوجعفر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمہ بن سلیم بن سلیمان بن حباب۔ (۱)

ولادت: مشہور روایت کے مطابق وہ یکشنبہ کے دن ۱۰ ربیع الاول ۲۳۹ھ میں پیدا ہوئے، ۲۲۷ھ و ۲۳۸ھ بھی سنہ ولادت بیان کیا جاتا ہے۔ (۲)

خاندان ووطن: امام طحاوی کا خاندانی تعلق یمن کے مشہور قبیلہ ازد کی شاخ حجر سے تھا، اسلامی فتوحات کے بعد ان کے خاندان والوں نے مصر میں سکونت اختیار کرلی تھی اور یہیں ایک گاؤں طحا میں امام صاحب کی ولادت ہوئی۔ (۳) اس لیے وہ ازدی، حجری اور مصری وطحاوی کہلاتے ہیں، یاقوت کا بیان ہے کہ طحا کے قریب ہی طحطوط نام کے ایک گاؤں کو ان کے وطن ہونے کا فخر حاصل ہے لیکن انھوں نے اس کے بجائے طحا کی جانب ہی اپنی نسبت کو پسند کیا، علامہ سیوطی نے بھی اسی روایت پر اعتماد کیا ہے۔ (۴)

اساتذہ: ان کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے، عبدالعزیز بن طاہر تمیمی نے ایک مستقل رسالہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، (۵) طحاوی کے اکثر شیوخ کو مشہور محدث ابن وہب

---

(۱) الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۱۰۲ (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۳ (۳) ایضاً و کتاب الانساب ورق ۱۵۷ و ۱۵۸ و الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۱۰۲ (۴) معجم البلدان ج ۶ ص ۳۰ و الرسالۃ المستطرفۃ ص ۳۸ (۵) الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۶۔

اور سفیان بن عیینہ سے شرف تلمذ حاصل ہے،(۱) بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

بحیر بن نصر، سلیمان بن شعیب کیسانی، عبدالغنی بن رفاعہ، عیسیٰ بن مثرود، محمد بن عبدالحکم، ہارون بن سعید ایلی، یونس بن عبدالاعلیٰ صدفی وغیرہ۔

فقہ واجتہاد کی تحصیل کے لیے پہلے امام شافعیؒ کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہِ شافعی کے جامع ومرتب امام مزنی کی جانب جو ان کے ماموں تھے متوجہ ہوئے لیکن بعد میں قاضی ابو حازم اور احمد بن عمران وغیرہ سے اس کی تکمیل کی۔(۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے، بعض علما نے ان پر مستقل رسالہ لکھا ہے، چند مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

احمد بن عبدالوارث زجاج، احمد بن قاسم خشاب، ابو محمد حسن بن قاسم مصری، ابو القاسم سلیمان بن احمد طبرانی، ابو القاسم عبداللہ بن علی داؤدی، ابو سعید عبدالرحمٰن بن احمد، ابو بکر محمد بن ابراہیم مصری، ابو الحسن محمد بن احمد اخمیمی، محمد بن بکر، محمد بن مظفر، یوسف بن قاسم میانجی۔(۳)

طلب علم کے لیے سفر: مورخین نے صرف ۲۶۸ھ میں امام صاحب کے شام تشریف لے جانے کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے اساتذہ میں مصر، یمن، کوفہ، بصرہ، حجاز، شام، خراسان اور مغرب وغیرہ مختلف اسلامی ملکوں کے ارباب کمال شامل ہیں، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ انھوں نے ان میں سے اکثر مقامات کا سفر بھی کیا ہوگا، ان کے شوق وجستجو کا یہ حال تھا کہ جب کوئی محدث یا صاحب کمال مصر آتا تو اس کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ کی کوشش کرتے۔(۴)

---

(۱) العبر ج ۲ ص ۵۵ (۲) الجواہر ج ۱ ص ۱۰۳، ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷ (۳) الجواہر المضیہ ج ۱ ص ۱۰۴ والحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۷ (۴) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۴ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰ والحاوی ص ۱۸ و ۱۹۔

حفظ وثقاہت: ابن یونس صاحب تاریخ مصر کا بیان ہے کہ ''امام طحاوی ثقہ وثابت اور صاحبِ عقل وفراست تھے'' مسلمہ بن قاسم قرطبی فرماتے ہیں، ''وہ ثقہ اور نہایت جلیل القدر تھے''، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''ثقہ وثابت اور ماہر حفاظ حدیث میں ایک امام طحاویؒ بھی ہیں۔'' بدرالدین عینی فرماتے ہیں کہ ''ان کی ثقاہت، دیانت، امانت اور فضیلت پر سب کا اتفاق ہے۔'' صاحبِ مرأۃ الزماں تحریر فرماتے ہیں کہ ''لوگ ان کے علم وفضل کی طرح ان کے صدق وثقاہت کے بھی معترف ہیں۔'' (۱)

اعتراف کمال: تمام اکابر علما ومحدثین ان کے علمی کمالات کے معترف تھے، مورخین کا بیان ہے کہ ''ان کے بعد ان کا کوئی ہمسر اور جانشین نہیں پیدا ہوسکا۔'' ابن ندیم فرماتے ہیں کہ ''وہ علم وفضل میں بے مثال اور یکتائے روزگار تھے'' علامہ عینی کہتے ہیں کہ ''جن محدثین اور مورخین نے ان کا تذکرہ کیا ہے، وہ سب ان کی مدح وتوصیف میں متفق ہیں، متقدمین میں طبرانی، خطیب، حمیدی اور متاخرین میں حافظ مزی، ابن کثیر اور ذہبی وغیرہ نے ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی واقف کار اور مصنف مزاج شخص ان کے علم وفضل اور اوصاف وکمالات کا منکر نہیں ہوسکتا۔'' حضرت شاہ عبدالعزیزؒ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''ان کی تصنیفات ان کی وسعت نظر اور علمی تبحر پر شاہد ہیں۔'' (۲)

جامعیت: امام طحاوی کو جملہ اسلامی علوم اور ان کے متعلقات میں مہارت حاصل تھی، مورخین اور علمائے سیر نے تفسیر، کلام، عربیت، ادب، لغت، نحو اور انساب وغیرہ میں ان کی ژرف نگاہی کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض علوم میں انھوں نے مستقل کتابیں لکھیں اور ان کی فقہی وحدیثی کتابوں میں بھی ان علوم پر بحثیں ہیں، حدیث وفقہ اور اصول وشروط کے خاص طور پر بڑے ماہر تھے، حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''انھوں نے شروط میں کتاب لکھی اور

(۱) الجواہر المضیۃ ج۱ ص۱۰۲ وکتاب الانساب ورق ۱۵۸، ۳۶۹ والبدایۃ والنہایۃ ج۱۱ ص۱۷۴ وتاریخ ابن عساکر ج۲ ص۵۵ (۲) الفہرست ص۲۹۲ والحاوی ص۱۲ و۱۳ وبستان المحدثین ص۸۸۔

وہ اس فن میں ممتاز و ماہر تھے" علامہ زاہد الکوثری فرماتے ہیں "امام طحاوی فضائل و کمالات کے جامع تھے، حدیث اور اس کے متعلقہ علوم اور فقہ اور اس کے اصول و ضوابط میں علمائے امت میں بہت کم لوگ ان دونوں فنون میں ایسے جامع پیدا ہوئے، اس کا ان تمام لوگوں کو اعتراف ہے، جو اس سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہیں۔" (۱)

زہد و اتقاء: زہد و اتقاء میں بھی اُن کا درجہ نہایت بلند تھا، ابن ندیم فرماتے ہیں کہ وہ زہد وورع میں یکتائے زمانہ تھے، صاحب مرآۃ الزمان کا بیان ہے کہ "ان کے زہد و تقویٰ پر لوگوں کا اتفاق ہے" علامہ عینی نے ان کی دیانت، ثقاہت، امانت اور راست بازی وغیرہ کی جانب اشارہ کیا ہے۔ (۲)

فقہی مسلک: شروع میں وہ شافعی مذہب سے وابستہ تھے، پھر حنفی مذہب اختیار کر لیا اور اس سے ایسا مستحکم تعلق ہوا کہ اس کے اکابر فقہا اور ائمہ مجتہدین میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کے تمام سوانح نگاروں نے ابن یونس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ مصر میں حنفی مذہب کی ریاست وسیادت ان پر تمام ہوگئی" حافظ ذہبی وغیرہ نے ان کو شیخ الحنفیہ لکھا ہے، (۳) گو اس مذہب میں بڑے بڑے جلیل القدر علما اور بکثرت ارباب کمال پیدا ہوئے لیکن ان سب میں امام طحاوی کو امتیازی درجہ حاصل ہے، انھوں نے اپنی تصنیفات سے اس مذہب کی بڑی اہم خدمات انجام دیں اور اس کی ترویج و اشاعت اور تائید و حمایت میں اپنی عمر صرف کر دی، جس کا اعتراف خود علمائے احناف کو بھی ہے، ابن قطلوبغا کا بیان ہے، وکان اماما فقیها من الحنفیین (۴) حنفی مذہب سے شدید تعلق کے باوجود انھوں نے بعض مسائل میں اس سے اختلاف بھی کیا ہے اس لیے ان کو مجتہد منتسب وغیرہ کہا گیا ہے۔

---

(۱) العبر ج ۲ ص ۱۸۶ و ابن خلکان ج ۱ ص ۲۰ و البدایہ ج ۱۱ ص ۱۷۴ و الحاوی ص ۳ (۲) الفہرست ص ۲۹۲ والحاوی ص ۱۲ (۳) تاریخ ابن عساکر ج ۴ ص ۵۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰ و العبر ج ۲ ص ۱۸۶ (۴) الجواہر المضیئہ ج ۱ ص ۱۰۳ و حسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷۔

شافعی مذہب ترک کرنے کا سبب: امام طحاویؒ کے شافعی مسلک چھوڑنے کے متعلق مورخین نے یہ واقعہ لکھا ہے کہ ''ابتدا میں وہ اپنے ماموں اسماعیل بن یحییٰ مزنی ۲۶۴ھ کے درس میں جو امام شافعیؒ کے ممتاز ترین شاگرد اور فقہ شافعی کے بانیوں میں تھے، شریک ہوتے تھے، ایک دن انھوں نے کوئی مسئلہ بیان کیا، جس کو طحاوی بار بار سمجھانے کے باوجود بھی نہیں سمجھ سکے، اس پر انھوں نے بلادت وغباوت کا طعنہ دیا اور کہا کہ ''بخدا تم کو کچھ نہیں آ سکتا'' امام طحاوی اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوئے کہ مزنی کے درس میں جانا ہی ترک کر دیا اور ابو جعفر احمد بن ابی عمران کے حلقۂ درس میں جو مصر میں حنفی مذہب کے قاضی تھے، شریک ہونے لگے اور پوری محنت سے فقہ میں مشق ومہارت بہم پہنچائی اور مختصر تصنیف کر کے اپنے تمام معاصرین پر گوئے سبقت لے گئے، ایک روز وہ امام مزنی کی قبر سے گذرے تو فرمایا کہ خدا تعالیٰ ان پر رحم کرے اگر یہ زندہ ہوتے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کرتے۔''(۱) علامہ ابن خلکان نے ایک دوسری وجہ یہ بھی تحریر کی ہے کہ محمد بن احمد شروطی نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنے ماموں کا مسلک کیوں ترک کیا تو فرمایا کہ میں نے خود ان کو دیکھا کہ وہ اکثر امام ابوحنیفہ کے مسلک کی کتابوں کا مطالعہ اور ان کی جانب مراجعت کرتے ہیں، اس لیے میں نے حنفیہ کا مذہب اختیار کر لیا اور اپنے ماموں اور استاذ کا مسلک ترک کر دیا۔(۲)

وفات: پنجشنبہ کے دن غرۂ ذوقعدہ ۳۲۱ھ کو مصر میں انتقال کیا اور قرافہ میں امام شافعیؒ کے مزار کے متصل ہی دفن کیے گئے۔(۳)

اولاد: ایک صاحبزادہ ابوالحسن علی اور پوتے ابو علی حسن بن علی کا نام ضمناً ملتا ہے۔

تصنیفات: امام طحاوی جلیل القدر عالم اور بلند پایہ مصنف تھے، ان کو ان کی تصنیفات اور اہم علمی خدمات کی بنا پر بڑی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی، علامہ ابن کثیر فرماتے ہیں

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۲ ص ۵۵ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۱ ولسان المیزان ج ۱ ص ۲۷۵ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۲ (۳) ایضاً ص ۳۳۔

"وہ نہایت مفید اور بیش بہا تصنیفات کے مالک تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ "ان کی تصنیفات بڑی انوکھی ہیں" علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں "انھوں نے متعدد مفید کتابیں لکھیں" (۱) جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ حسب ذیل ہیں:

۱-کتاب الاشربه، ۲-کتاب التاریخ الکبیر، ۳-کتاب التسویه بین حدثنا واخبرنا، ۴-رسالة حکم اراضی مکه، ۵-رساله فی الرزیه، ۶-کتاب الشروط الاوسط، ۷-کتاب العزل، ۸-کتاب الفرائض، ۹-قسم الفئ والغنائم، ۱۰-کتاب المحاضره والسجلات، ۱۱-کتاب الوصایا، ۱۲-مناقب ابی حنیفه یا اخبار ابی حنیفة واصحابه، ۱۳-اختلاف الروایات علی مذهب الکوفیین (دو جزوں میں) ۱۴-الرد علی عیسیٰ بن ابان (دو جزوں میں)، ۱۵- النوادر الفقهیه (دس جزوں میں)، ۱۶- النوادر و الحکایات (بیس جزوں میں)، ۱۷-کتاب فی النحل واحکامها (چالیس جزوں میں)

۱۸-کتاب نقض کتاب المدلسین: ابوعلی حسین بن علی کرابیسی کی کتاب المدلسین کے ردو جواب میں ہے۔

۱۹-کتاب الرد علی ابی عبید: ایک جزء پر مشتمل ہے، اس میں ابوعبید کی ان غلطیوں کی تردید کی گئی ہے جو انساب کے متعلق انھوں نے کی ہیں۔

۲۰-سنن شافعی: یہ ان حدیثوں پر مشتمل ہے جو امام مزنی کے واسطہ سے امام شافعیؒ سے مروی ہیں۔

۲۱-شرح الجامع الصغیر: امام محمد بن حسنؒ کی مشہور و معرکۃ الآراء کتاب الجامع الصغیر فی الفروع کی جو ۱۵۲۲، مسائل پر مشتمل ہے، شرح ہے۔

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج۱۱ص۱۷۴ و تذکرۃ الحفاظ ج۳ص۲۹ و تاریخ ابن خلکان ج۱ص۳۲۔

۲۲-شرح الجامع الکبیر: یہ بھی امام محمدؒ صاحب کی مشہور کتاب الجامع الکبیر فی الفروع کی شرح ہے۔

۲۳-کتاب الشروط الصغیر: اس کا نام مختصر الشروط بھی ہے، یہ پانچ جزوں میں ہے اور مکتبہ شیخ الاسلام فیض اللہ میں موجود ہے۔

۲۴-کتاب الشروط الکبیر: چالیس اجزا پر مشتمل ہے، یورپ سے اس کا ایک جز چھپ چکا ہے اور بعض اجزا مکتبہ علی پاشا شہید اور استنبول کے مکتبہ ملا مراد میں ہیں۔(۱)

۲۵-احکام القرآن: ۲۰ جزوں پر مشتمل ہے، قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن کے موضوع پر امام طحاویؒ نے ایک ہزار اوراق لکھے تھے، علامہ زاہد الکوثری کے خیال میں احکام القرآن ان ہی اوراق کا مجموعہ ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک یہ دوسری اور مستقل کتاب ہے۔(۱)

۲۶-بیان السنۃ والجماعۃ: اس کے مختلف نام ہیں اور اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، یہ رسالہ کئی بار چھپ چکا ہے، ۱۳۱۱ھ مطابق ۱۸۹۳ء میں قازان سے عمر بن اسحاق ہندی کی شرح کے ساتھ ۷۴ صفحات میں شائع ہوا تھا،(۲) مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اسی نسخہ کی مدد سے اس کا ایک ایڈیشن دیوبند سے عقیدۃ الطحاوی کے نام سے شائع کیا ہے، اس میں اہل سنت والجماعت کے عقائد، امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے مذاہب، اصول اور معتقدات کی روشنی میں تحریر کئے گئے ہیں۔

۲۷-اختلاف العلماء: ۳۰ سے زیادہ اجزا پر مشتمل ہے، ابن ندیم نے اس کا نام کتاب الفقہاء لکھا ہے اور یہ تصریح کی ہے کہ یہ نہایت ضخیم کتاب ہے، امام طحاویؒ اس کو مکمل

(۱) دیکھئے الفہرست ابن ندیم ص ۲۹۲ والجواہر المضیئہ ج ۱ ص ۱۰۴ وکشف الظنون باختلاف صفحات وفوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ص ۷۹ والحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۵ تا ۳۷ (۲) الجواہر المضیئہ ج ۱ ص ۱۰۴ والحاوی ص ۳۵ (۳) اکتفاء القنوع ص ۱۲۵ ومعجم المطبوعات کالم ۱۲۳۳۔

نہیں کر سکے تھے، ابوبکر جصاص رازی متوفی ۳۷۰ھ نے اس کا مختصر لکھا تھا جو استنبول کے مکتبہ جاراللہ ولی الدین میں موجود ہے، علامہ کوثری کی نظر سے یہ مختصر گذرا ہے وہ لکھتے ہیں کہ "اس میں ائمہ اربعہ کی طرح دوسرے قدیم مجتہدین اور فقہاء امصار مثلاً ابراہیم نخعی، عثمان بتی، امام اوزاعی، سفیان ثوری، لیث بن سعد، ابن شبرمہ، ابن ابی لیلیٰ اور حسن بن حیی وغیرہ کے اقوال و مذاہب بھی نقل کئے گئے ہیں، (۱) اگر آج امام طحاوی کی اصل کتاب موجود ہوتی تو اکابر علمائے متقدمین اور فقہائے امصار کے مسالک معلوم کرنے میں بڑی آسانی بھی ہوتی اور یہ کتاب ان کے اقوال کا اچھا اور عمدہ ماخذ بھی ہوتی۔

۲۸- کتاب المختصر فی الفقہ یا مختصر الطحاوی: اس کو امام مزنی کی مختصر کے انداز پر مرتب کیا گیا ہے، یہ حنفی فقہ کے فروع و جزئیات پر ایک مختصر اور جامع متن ہے اور اس میں اس مذہب کے اکابر یعنی امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ، امام زفرؒ اور حسنؒ بن زیاد کے اقوال و آرا نقل کئے گئے ہیں۔ (۲) امام طحاوی نے اقوال مختلفہ کے درمیان ترجیح بھی دی ہے، ائمہ کے اختلاف کی صورت میں غیر جانبدارانہ طور پر کبھی امام ابوحنیفہؒ اور کبھی صاحبین اور کبھی ان دونوں میں سے کسی ایک کے مسلک کو راجح قرار دیا ہے، بعض مواقع پر ان تینوں بزرگوں کے بجائے امام زفر یا حسن بن زیاد کے قول کی تائید کی ہے، اور چند مقامات پر ان سب بزرگوں کے قول کو مرجوح سمجھ کر اپنی رائے و اجتہاد کا ذکر بھی کیا ہے، جس مسئلہ میں ائمہ کے اقوال معلوم و منقول نہیں ہوتے تو اشارات نصوص اور دوسری دلالتوں سے ان کے اقوال مستنبط کرتے ہیں، اسی خصوصیت کی وجہ سے ان کو علمائے مجتہدین میں شمار کیا جاتا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

"اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حنفی مذہب کے مقلد ہی نہ تھے بلکہ مجتہد منتسب بھی تھے، چنانچہ انھوں نے حنفی مذہب کے خلاف بھی کچھ باتیں لکھی ہیں" صاحب

---

۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۴ و الفہرست ص ۲۹۲، والطحاوی ص ۳۵ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۰۰۔

دراسات اللبیب کا بیان ہے ''امام طحاوی حنفی مذہب سے شغف رکھنے اور اس کے ماخذ مرفوع وموقوف کی تخریج کر سکے باوجود جب اس کو حدیث کے خلاف پاتے تو رد کرنے میں کوئی تامل نہیں کرتے تھے۔(۱)

یہ مختصر متن حنفیہ کی صحیح وقوی روایات اور مفتی بہ ومرجح اقوال کا بڑا مستند ماخذ اور اتنے گونا گوں مسائل کا مجموعہ ہے جو دوسرے متون اور مطول کتابوں میں نہیں ملتے، علاوہ ازیں اس میں ترجیح کے وجوہ اور کتاب وسنت اور قیاس وغیرہ سے دلائل بھی فراہم کئے گئے ہیں، اس لیے اس کو ہمیشہ مقبول اور معتبر سمجھا گیا ہے، اس کتاب کی اہمیت اس لیے اور زیادہ ہے کہ علمائے احناف میں سب سے پہلے امام طحاویؒ کو مختصر لکھنے کا شرف حاصل ہوا، اس کی اہمیت کی وجہ سے اس کی متعدد شرحیں لکھی گئیں، جن کی تعداد گیارہ سے متجاوز ہے، یہ کتاب دائرۃ المعارف حیدرآباد سے چھپ چکی ہے۔

مشکل الآثار: یہ امام طحاوی کی بڑی مشہور اور اہم کتاب ہے، اس کا مقصدِ تصنیف بیان کرتے ہوئے وہ خود لکھتے ہیں:

''ثقہ وثابت رواۃ سے مروی مسند ومقبول حدیثوں کی معرفت وغیرہ کے متعلق لوگوں کی ناواقفیت دیکھ کر میں نے ان پر غور کیا، اس کے نتیجہ میں جو مشکلات اور حدیثوں سے جو مسائل واحکام اور اہم نکات وحقائق مستنبط ہوئے، ان کو بیان کر کے ان پر عائد ہونے والے اعتراضات واشکالات کو اس میں دفع کرنے کی کوشش کی ہے''(۲) اس کی ترتیب وتصنیف میں یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ پہلے ایک حدیث ذکر کر کے اس کے متابعات اور مؤید روایتیں نقل کی گئی ہیں، پھر اس کا صحیح مدلول ومنشاء متعین کر کے اس پر عائد ہونے والے شکوک کا جواب یا دوسری حدیثوں سے اس کے اختلاف کی نوعیت وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ثبوت واستدلال اور بحث وتحقیق میں قرآنی آیات، احادیث نبوی، آثار

(۱) بستان المحدثین ص ۸۸ واتحاف النبلاء المتقین ص ۱۹۲ (۲) مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۔

صحابہ وتابعین، ائمہ مجتہدین کے اقوال وآرا بیان کیے گئے ہیں اور نحوی ولغوی مسائل کی تحقیق بھی کی گئی ہے، اور کلام عرب سے بھی کہیں کہیں شواہد پیش کیے گئے ہیں، اسناد ومتون اور رجال وغیرہ کے متعلق بھی مفید اور ضروری معلومات نقل کیے گئے ہیں، مشکل الآثار کے بعض اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

۱- اس کی سب سے اہم اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اصلاً مشکلات حدیث کا تعین کر کے ان کا محققانہ جواب دیا گیا ہے، جس سے مشکلات اور دقت طلب امور بھی حل ہوگئے ہیں اور شکوک وشبہات بھی دفع ہوگئے ہیں۔

۲- اس کتاب میں یہ بھی ثابت کیا گیا ہے کہ احادیث کے اندر تضاد وتناقض نہیں ہوتا۔

۳- استدلال وتحقیق کی حیثیت سے بھی اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے، امام طحاوی تحقیق وتنقیح اور بحث واستدلال کا پورا حق ادا کردیتے ہیں، اس کتاب میں جو اہم اور گوناگوں مسائل ومباحث بیان کیے گئے ہیں ان کے متعلق ماہرین فن اور ائمہ کے خیالات اور اہم کتابوں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں۔

۴- فقہی واجتہادی حیثیت سے بھی مشکل الآثار کا پایہ بہت بلند ہے، امام طحاویؒ نے فقہائے صحابہؓ وتابعینؒ، ائمہ کبار اور مجتہدین اسلام کے اختلافات بھی بیان کیے ہیں اور ان کے درمیان توجیہ وتطبیق اور ترجیح بھی دی ہے، نیز وجوہِ ترجیح بھی بیان کیے ہیں، ان کے تفقہ واجتہاد کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے بعض مسائل میں ائمہ احناف کے اقوال سے اختلاف کیا ہے۔

۵- تفسیری مباحث اور قرآنی علوم مثلاً آیتوں کی تشریح، ان کے مفہوم ومنشا کی توضیح، قرآن کے مشکل الفاظ وکلمات کی تحقیق اور بعض استعمالات کی توضیح، سبب نزول وشان نزول کی وضاحت اور تجوید وقرأت کے مسائل پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

۶- حدیث کی فنی بحثوں، اصول حدیث کے مباحث اور رجال واسناد وغیرہ پر

بھی عالمانہ گفتگو کی گئی ہے، امام صاحب جب کوئی حدیث نقل کرتے ہیں تو پہلے یہ واضح کرتے ہیں کہ حدیث صحیح ہے یا غلط، اگر صحیح ہے تو اس کے اسباب اور غلط ہے تو اس کے وجوہ وعلل بیان کرتے ہیں، اسی طرح حدیث منقطع ہے یا متصل، موقوف ہے یا مرفوع، مرسل ہے یا مسند، غریب ومنکر ہے یا مقبول ومشہور، ضعیف اور فاسد الاسناد ہے یا قوی، حسن اور صحیح الاسناد، راوی ثقہ وضابط ہے یا غیر ثقہ اور مجہول الحال، مدلس ہے یا غیر مدلس، شذوذ وتفرد سے اس نے کام لیا ہے یا دوسرے راویوں نے اس کی متابعت وموافقت کی ہے، اس کو وہم وشک ہوا ہے یا نہیں؟ نفسِ روایت کے اندر اس سے کیا سہو وخطا ہوئی ہے، راوی نے کوئی اضافہ یا کمی کی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے، راوی کے ابہام، دوسرے راوی سے سماع وعدم سماع اور اسماء واعلام کے متعلق وضاحتیں کرتے ہیں، ایک قسم کی متعدد حدیثیں اس لیے بیان کرتے ہیں کہ ان کا باہمی فرق واختلاف اور کمی بیشی نمایاں ہو جائے۔

۷- حدیث کے مشکل وغریب الفاظ اور بعض اصطلاحی الفاظ پر ایک ماہر فن کی حیثیت سے داد تحقیق دی گئی ہے، نحو، بلاغت، معانی اور زبان کے استعمالات واسالیب پر بھی بعض اچھی بحثیں کی گئی ہیں۔

مشکل الآثار کی سات جلدیں استنبول کے مکتبہ فیض اللہ میں موجود ہیں، دائرۃ المعارف حیدر آباد نے صرف ۴ جلدیں شائع کی ہیں جو تقریباً ۱۶۳۳ صفحات پر مشتمل ہیں، ہر جلد کے آخر میں فہرست مضامین ہے جس کے صفحات کی مجموعی تعداد ۵۰ ہے، مرتبین نے مختصر حواشی بھی لکھے ہیں جو الفاظ ولغات کی تشریح اور اسماء ورواۃ کے متعلق معلومات پر مشتمل ہیں، اصل متن میں جو مختصر حدیثیں ہیں، ان کو حاشیہ میں مکمل درج کیا گیا ہے۔

محدث ابو الولید بن رشد مالکی نے اس کا مختصر تحریر کیا ہے، جو دائرۃ المعارف سے شائع ہوا ہے، اس میں امام طحاوی پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، اس کا قاضی القضاۃ جمال الدین یوسف بن موسیٰ الملطی نے المعتصر من المختصر کے نام سے مختصر کیا ہے، یہ کتاب

بھی دائرۃ المعارف سے ۱۳۱۷ھ میں لمبی تقطیع کے ۴۶۷ صفحات میں شائع ہوئی ہے، چوں کہ مشکل الآثار میں ترتیب وتبویب نہیں تھی، اس لیے ابن رشد نے اس کو ابواب پر مرتب کیا تھا، قاضی لمطی کے مختصر میں پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں اور اوصاف وخصوصیات کی حدیثیں ہیں، پھر معجزات اور سنہ وفات کی روایتیں ہیں، اس کے بعد احکام وشرائع کے ابواب جدا جدا عنوانات کے تحت ہیں، پھر تفسیر قرآن اور اسباب نزول کے ابواب ہیں، باجی کے اعتراضات کا اس میں جواب بھی دیا گیا ہے، پورے مجموعہ میں ۹۴۳ حدیثیں ہیں، صاحب معتصر نے طویل سندیں حذف کر دی ہیں، متعدد طرق واسناد کی وہی حدیثیں نقل کی ہیں، جن میں نمایاں فرق واختلاف تھا، دو مختلف روایتوں کے صرف اسی حصہ کو نقل کیا ہے، جس سے ان کے اصل مدلول اور روایت کا خاص فرق وتضاد ظاہر ہوتا ہے۔

معانی الآثار: اس کا نام شرح معانی الآثار بھی ہے، یہ امام صاحب کی سب سے اہم اور بلند پایہ کتاب سمجھی جاتی ہے، اس میں فقہ وحدیث دونوں قسم کے مباحث ہیں، اس کی اہمیت کا اندازہ علمائے فن کے ان اقوال سے ہوتا ہے۔

علامہ ابن حزم ظاہری نے اس کو سنن ابی داؤد اور سنن نسائی کے ہم پایہ قرار دیا ہے،(۱) شارح ہدایہ امیر اتقانی کا بیان ہے کہ اگر کسی شخص کو طحاوی کی عظمت وشان اور بلند پائیگی میں کلام ہو تو اسے معانی الآثار کا مطالعہ کرنا چاہیے، حنفی مذہب کا کیا ذکر جملہ مذاہب میں بھی ایسی بے مثال اور بے نظیر کتاب نہیں مل سکتی،(۲) علامہ عینی فرماتے ہیں ''امام طحاوی کی جملہ تصنیفات نہایت عمدہ اور پر از منفعت ہیں، خصوصاً معانی الآثار کو اگر کوئی منصف مزاج شخص بغور دیکھے تو وہ اس کو حدیث کی اکثر مشہور ومقبول کتابوں سے برتر وراجح پائے گا، سنن ابی داؤد، جامع ترمذی اور سنن ابن ماجہ اور اس قسم کی دوسری کتابوں پر اس کی

(۱) ماتمس الیہ الحاجہ ص ۲۹ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۵۹، ۴۶۰۔

فوقیت اور برتری بالکل عیاں ہے، کیوں کہ اس کے اندر وجوہِ استنباط اور معارضات کی شکلیں بیان کی گئی ہیں اور ناسخ ومنسوخ میں امتیاز کیا گیا ہے اور اس قسم کے بہت سے مباحث ہیں اور یہی چیزیں معرفت حدیث کی اصل بنیاد ہیں، بعض لوگ طحاوی کی مرجوحیت کا یہ سبب بتاتے ہیں کہ اس کے کچھ رجال ضعیف اور مرتبۂ ثقاہت سے فروتر ہیں، حالانکہ سنن مذکورہ کا بھی یہی حال ہے بلکہ ان کی بعض روایات کو باطل اور موضوع بھی کہا جاتا ہے اور ضعیف حدیثوں کی تو کثرت ہے، سنن دارقطنی، بیہقی اور دارمی وغیرہ کا اس سے کوئی مقابلہ ہی نہیں، اس کتاب کی اہمیت وعظمت کے مخفی رہ جانے کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ عام لوگوں میں مروج نہ تھی، اس لیے اس کے عجائب کا نہ تو استخراج کیا جا سکا اور نہ غرائب سے واقفیت حاصل کی گئی، یہ کتاب ایک طویل عرصہ تک گوشۂ گمنامی میں پڑی رہی اور عام لوگ اس سے بے خبر تھے۔''(۱) مولانا انور شاہ کشمیری کا بیان ہے کہ ''ہمارے نزدیک طحاوی کی مشہور کتاب معانی الآثار کا پایہ ابوداؤد کے قریب قریب ہے، کیوں کہ اس کے تمام رواۃ معروف ومشہور ہیں، گو بعض کے متعلق کلام بھی کیا گیا ہے، اس کے بعد ترمذی اور ابن ماجہ کا درجہ ہے۔''(۲)

اس کا مقصد تالیف خود امام طحاویؒ نے یہ بیان کیا ہے:

''مجھ سے میرے بعض احباب نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احکامی روایات وآثار کا ایک مجموعہ مرتب کرنے کی فرمائش کی تاکہ ناسخ ومنسوخ اور واجب العمل روایات سے قلت واقفیت کی بنا پر ملحدین اور ضعیف الاسلام لوگوں کا یہ وہم دور ہو جائے کہ ان میں تضاد واختلاف ہے، اس لیے اس کتاب میں ناسخ ومنسوخ، مطلق ومقید اور واجب العمل روایات نیز علما کی تاویل وتوجیہ اُن کے دلائل وشواہد اور مرجح ومختار مسلک کی تفصیل بیان کی گئی ہے، ترجیح کے دلائل ووجوہ بھی نقل کیے گئے ہیں اور ثبوت وتائید میں کتاب

(۱) ماتمس الیہ الحاجہ ص۳۰ (۲) فیض الباری ج۱ ص۵۷، ۵۸۔

وسنت، صحابہؓ وتابعین کے آثار اور اجماع وغیرہ کو پیش کیا گیا ہے۔(۱)

امام طحاوی نے اس کتاب میں مختلف حیثیتوں سے احادیث کا تضاد واختلاف دور کیا ہے اور ان کے محمل کی ایسی تعیین کی ہے، جو روایات وقیاس کے عین مطابق معلوم ہوتی ہے، طریقہ تصنیف یہ ہے کہ پہلے اختلافی امور ومسائل میں مرجوح مسلک کی موید روایات نقل کی ہیں، اس کے بعد اس سے مختلف اور راجح مسلک کی حدیثیں اور ان کے مویدات ذکر کر کے دونوں میں محاکمہ اور ہر مذہب کے دلائل وشواہد اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ روایات کا ظاہری اختلاف بھی رفع ہو گیا ہے اور ان میں مکمل تطبیق بھی ہو گئی ہے، انھوں نے توجیہ وتوفیق کے مندرجہ ذیل اصول اختیار کیے ہیں۔

۱- دو قسم کی متضاد سمجھی جانے والی حدیثوں میں ایک قسم کو اولویت پر اور دوسری قسم کو غیر اولویت پر محمول کر کے فرق وتضاد کی نفی کی گئی ہے۔

۲- احادیث مختلفہ کو مطلق ومقید، مجمل ومفصل اور خاص وعام وغیرہ پر محمول کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ ان میں کوئی تضاد نہیں۔

۳- ناسخ ومنسوخ روایات کی تعیین اور ان میں امتیاز کر کے تعارض کو دفع کیا گیا ہے۔

۴- اگر صحیح الاسناد اور قوی روایات ضعیف اور کمزور حدیثوں کے معارض ہوں تو پہلی قسم کی حدیثوں کو قابل اختیار سمجھا جائے گا اور دوسری قسم کی حدیثوں کی یا تو توجیہ کی جائے گی یا مناسب توجیہ نہ ہونے کے وقت ان کو رد کر دیا جائے گا۔

۵- اگر کوئی روایت کسی متواتر حدیث کے خلاف ہو تو متواتر کے مقابلہ میں غیر متواتر روایت کو ساقط قرار دیا جائے گا۔

۶- اصول وکلیات شرع کے معیار پر حدیثوں کا جائزہ لے کر ان کی ایسی توجیہ کی

(۱) معانی الآثار ج ا ص ۶۔

گئی ہے کہ ظاہری اختلاف ختم ہو گیا ہے۔

معانی الآثار میں اکابر ائمہ احناف یعنی امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کے آرا و مسالک کو نقل کرنے کا زیادہ التزام کیا گیا ہے اور ان بزرگوں کے اقوال کی حدیثوں سے مطابقت بھی دکھائی گئی ہے، تاہم دوسرے اکابر فقہا امام مالک، امام اوزاعی، سفیان ثوری، ابن ابی لیلیٰ اور فقہائے احناف میں امام زفر کے مذاہب کی بھی کہیں کہیں تصریح کی گئی ہے' اور فقہائے صحابہ و تابعین کے مذاہب بھی نقل کیے گئے ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت کا سب سے اہم اور نمایاں پہلو اس کی تحقیقی و استدلالی شان اور فقیہانہ و مجتہدانہ رنگ ہے، امام صاحب حنفی ہونے کے باوجود خود بھی مجتہد اور صاحب فقہ تھے، اس لیے انھوں نے مختلف فیہ امور و مسائل میں محاکمہ کر کے مرجح و مختار مسلک کی نشاندہی کی ہے اور عموماً نہایت تنقیح اور پوری تحقیق کے بعد ہی کسی مسلک کو مرجح قرار دیا ہے، یہاں تک کہ اپنے ائمہ سے بھی بعض مواقع پر اختلاف کیا ہے۔

روایات کی چھان بین اور تحقیق و تفتیش میں بھی بڑی دیدہ ریزی اور دقتِ نظر سے کام لیا گیا ہے، ان کے متون و طرق کی معرفت، اسناد کا جائزہ، رجال اور رواۃ کی تحقیق، رطب و یابس حدیثوں میں امتیاز، ارسال، انقطاع وقف اور رفع و اتصال کی نشاندہی اور روایت کے علاوہ درایت کے لحاظ سے بھی حدیثوں کو پرکھا گیا ہے۔

معانی الآثار میں حدیث و فقہ کے علاوہ تفسیر و قرأت کی بعض لطیف بحثیں بھی ہیں، مشہور مفسرین صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر و قرأت کے اقوال، مختار و مرجح قرأت و تفسیر کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور سنت و حدیث کی طرح قرآنی آیات سے استنباط مسائل کیا گیا ہے، سیر، انساب اور ایام و مشاہد کا بھی ایک حد تک حسب موقع ذکر ملتا ہے، ابواب کی ترتیب و مطالب کی افادیت اور انداز بیان کے لحاظ سے بھی یہ ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔

خصوصیات: ۱- اس کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں احادیث و آثار کا تضاد

ثابت کیا گیا ہے اور جو حدیثیں بظاہر باہم مختلف و متناقض معلوم ہوتی ہیں، ان کی نہایت مناسب اور دلنشیں توجیہ و تطبیق بیان کی گئی ہے۔

۲- گو اساطین احناف کے مسالک کے نقل کا زیادہ التزام کیا گیا ہے لیکن دوسرے فقہا و مجتہدین کے اقوال اور خصوصاً صحابہ و تابعین کے آثار و فتاوے کی بھی صراحۃً نشاندہی کی گئی ہے۔

۳- اقوال مختلفہ میں تطبیق اور ان کے دلائل کی تشریح کر کے مرجح مسلک کی تعیین کی گئی ہے۔

۴- مختلف طرق، تعدد اسناد، روایت اور راوی کی قوت و ضعف کے اسباب، ناسخ و منسوخ، مطلق و مقید اور خاص و عام کی وضاحت نیز علمائے جرح و تعدیل کے اقوال کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

۵- معانی الآثار کی بعض حدیثوں سے دوسری کتب احادیث خالی ہیں۔

۶- وضع و ترتیب کی خوبی، انداز بیان اور طرز ادا کا حسن و دلآویزی۔

معانی الآثار پر اعتراض اور اس کا جواب: معانی الآثار کی ان خصوصیات اور اہمیتوں کے باوجود اس پر بعض اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ان میں سب سے زیادہ مشہور اعتراض امام بیہقیؒ کا ہے کہ امام طحاوی نے ان حدیثوں کی جو عام محدثین کے نزدیک صحیح ہیں مگر احناف کے مسلک کے خلاف ہیں تضعیف اور ان روایتوں کی جو محدثین کے نزدیک ضعیف ہیں مگر احناف کے مسلک کی موید ہیں، تصویب کی ہے لیکن یہ اعتراض صحیح نہیں ہے، اس کا جواب پہلے گذر چکا ہے کہ امام طحاوی حنفی ہونے کے باوجود مجتہد بھی تھے اور اپنی انصاف پسندی کی وجہ سے بعض مسائل میں احناف کے مسلک کو مخالفِ حدیث ہونے کی وجہ سے مرجوح سمجھتے ہیں اور اگر کہیں ایسا واقعی ہوا ہے تو اس کی مثالیں دوسرے مذاہب کے ائمہ کے یہاں بھی ملتی ہیں، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے "امام بیہقی کی

اس امام عظیم کی شان میں جس پر اکابر علما و مشائخ نے اعتماد کیا ہے، یہ کھلی ہوئی زیادتی ہے'' حافظ عبدالقادر قرشی فرماتے ہیں ''امام طحاوی کی شان سے یہ بعید اوران کی عظمت کے منافی ہے، بخدا مجھ کو اس کتاب میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی جو امام بیہقی نے اس کے بارے میں کہی ہے'' علامہ عینی فرماتے ہیں کہ ''کسی عاقل و منصف مزاج شخص کو اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ امام طحاوی نے قرآن واحادیث نبویہ سے استنباط احکام کیا ہے۔''(۱)

امام بیہقی کی تردید میں علاؤالدین ترکمانی نے الجواہر النقی والرد علی البیہقی کے نام سے ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔ (۲)

معانی الآثار پر اعتراض کرنے والوں میں ایک ممتاز نام شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کا بھی ہے، ان کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ صحاح کے مقابلہ میں اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالحیؒ لکھنوی کی یہ رائے نقل کردینا کافی ہے کہ ''میں ابن تیمیہ کے متعلق وہی بات عرض کروں گا جو شیخ صالح نے حافظ ابن حجرؒ کے بارے میں کہی ہے کہ ''ان کا موطا اور صحیح بخاری میں تفریق اور موطا کی صحت سے انکار صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے موطا میں اُس امعان نظر سے کام نہیں لیا ہے، جس امعان نظر سے بخاری میں کام لیا ہے، ورنہ ان کو موطا کی اہمیت سے انکار نہ ہوتا، اسی طرح اگر امام ابن تیمیہؒ نے بھی صحاح ستہ کی طرح معانی الآثار پر گہری نظر ڈالی ہوتی تو وہ طحاوی اور ائمہ صحاح کے درمیان اس طرح تفریق روانہ رکھتے، بلکہ ابن حزم کی طرح جو اگرچہ اپنے تفت کے لیے مشہور ہیں اس کی عظمت کا اعتراف کرتے۔ (۳)

معانی الآثار کی صحت اور اس کے رجال وغیرہ کے بارے میں بعض لوگوں کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے شارح ہدایہ امیر اتقانی لکھتے ہیں:

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۷۶۰ و ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۰ و ۳۱ (۲) تقریظ معانی الآثار ج ۲ ص ۵۔
(۳) ماتمس الیہ الحاجہ ص ۳۱۔

''میرے نزدیک امام طحاوی پر ان لوگوں کے اعتراض وانکار کے کوئی معنی نہیں ہیں، اس لیے کہ وہ معتمد وثقہ ہیں اور متہم نہیں ہیں، اس کے علاوہ ان کا علمی پایہ بلند اور مرتبۂ اجتہاد مسلم ہے، ورع وتقویٰ کے لحاظ سے بھی وہ فائق تھے اور مذاہب فقہ سے واقفیت میں بھی شرف وتقدم رکھتے تھے..... اگر تم کو ابو جعفر کے فضل وکمال میں شک ہو تو ان کی کتاب شرح معانی الآثار کا مطالعہ کرو، اس کی حنفی مذہب تو کجا کسی مذہب میں بھی کوئی نظیر اور مثال تم کو نظر نہ آئے گی۔''(۱)

شروح وتلخیصات: معانی الآثار کی اہمیت کی بنا پر ہر زمانہ کے علما نے اس کے ساتھ بڑا اعتنا کیا ہے، وہ نصاب درس میں شامل کی گئی، اس کے شروح وحواشی لکھے گئے اور تلخیص بھی کی گئی، ذیل میں اس کی شرحوں اور تلخیصات کی فہرست درج کی جاتی ہے۔

۱- علامہ بدرالدین عینی (۸۵۵ھ) کو اس کتاب سے بڑا شغف تھا، انھوں نے ایک عرصہ تک اس کا درس بھی دیا اور اس کی دو شرحیں مبانی الاخبار اور نخب الافکار کے نام سے لکھیں، دونوں کے نسخے دارالکتب المصریہ میں موجود ہیں، پہلی کتاب آٹھ جلدوں میں اور دوسری چھ جلدوں میں ہے، ان کے علاوہ انھوں نے طحاوی کے رجال پر بھی ایک مستقل کتاب معانی الاخبار فی رجال معانی الآثار دو جلدوں میں لکھی، اس کا ناقص نسخہ بھی دارالکتب المصریہ میں پایا جاتا ہے،(۲) زاہدی کا بیان ہے کہ عینی نے طحاوی پر بخاری سے کم کام نہیں کیا ہے۔(۳)

۲- شیخ قاسم بن قطلو بغا حنفی (م ۸۷۹ھ) نے الایثار برجال معانی الآثار لکھی جو طحاوی کے رجال پر نہایت مفید کتاب ہے۔(۴)

۳- ابوالحسین محمد بن محمد باہلی مالکی (م ۳۲۱ھ) کی شرح تصحیح معانی الاثار جس

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۲ (۲) الحاوی فی سیرۃ الامام الطحاوی ص ۳۲ و ۳۳ وفہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۴۴۳ (۳) الحاوی ص ۳۳، ۳۴ (۴) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۰ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۲۔

کے متعلق بروکلمان نے لکھا ہے کہ بنکاک میں محفوظ ہے۔(۱)

۴- حافظ ابو محمد علی بن زکریا بنجی مولف لباب (م ۶۹۸ ھ) بھی اس کے مشہور شارحین میں ہیں، ان کی شرح کا ایک جز آستانہ کے مکتبہ ایاصوفیا میں موجود ہے۔(۲)

۵- حافظ عبدالقادر قرشی (م ۷۷۵ ھ) نے الحاوی فی تخریج الاحادیث معانی الآثار لکھی جو بڑی عمدہ اور مفید شرح ہے، اس میں مصنف نے طحاوی کی حدیثوں اور سندوں کا صحاح، مشہور مسانید اور مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ سے تعلق اور نسبت ظاہر کی ہے، اس کا ایک جز دارالکتب المصریہ میں موجود ہے۔(۳)

۶- حافظ ابوعمر بن عبدالبر (م ۴۶۳ ھ) نے جو طحاوی کے بڑے عظمت شناس اور اکثر اپنی کتابوں میں ان کا حوالہ دیتے ہیں تلخیص کی ہے۔(۴)

۷- حافظ ابومحمد عبداللہ بن یوسف زیلعی صاحب نصب الرایہ (م ۷۶۲ ھ) کی تلخیص مکتبہ رواق اتراک اور مکتبہ کوبریلی میں محفوظ ہے۔(۵)

۸- شیخ الاسلام حافظ ابن حجر (م ۸۵۲ ھ) نے اتحاف المہرہ میں اس کے اطراف کو جمع کیا ہے۔(۶)

۹- شیخ التبلیغ مولانا محمد یوسفؒ صاحب دہلوی نے عربی میں شرح امانی الاخبار فی شرح معانی الآثار لکھی ہے، اس کی دو جلدیں اب تک چھپ چکی ہیں۔

معانی الآثار کئی مرتبہ شائع ہو چکی ہے، ۱۳۰۲ ھ میں مطبع مصطفائی لکھنؤ نے اس کو لمبی تقطیع کی دو جلدوں میں شائع کیا ہے، دونوں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد ۹۰۰ ہے، مولانا وصی احمد دہلوی نے اس پر مختصر حواشی تحریر کیے ہیں، ان میں الفاظ ولغات کی تحقیق، اسماء واعلام کی مختصر تشریح اور دوسرے نسخوں کے اختلاف کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۰ و مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۹۲ (۲) الحاوی ص ۳۳ (۳) الحاوی ص ۳۶، ۳۲ وفہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۳۴ (۴) الحاوی ص ۳۳ (۵) ایضاً (۶) ماتمس الیہ الحاجۃ ص ۳۰۔ ☆

نَضَّرَ اللّٰهُ اَمْرًا سَمِعَ مِنَّا حَدِيْثًا فَبَلَّغَهُ (حدیث)

تذکرۃ المحدثین

حصہ دوم

اس میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات زندگی وسوانح اور ان کی علمی وحدیثی خدمات کی روح پرور ودلآویز تفصیل بیان کی گئی ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ الْکَرِیْم
محمدن الامین وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین

صاحبِ تصانیف محدثین کرام کے حالات میں ایک کتاب کی تالیف عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھی، حضرت الاستاذ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں دوسرے ضروری کاموں کی وجہ سے اس کا موقع نہ ملا، ان کے لائق جانشین مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم نے یہ خدمت مولوی ضیاء الدین اصلاحی کے ذمہ کی، اس کی پہلی جلد ان کی رہنمائی میں شائع ہوئی، اس میں ان کا فاضلانہ مقدمہ بھی شامل ہے، دوسری جلد کا بھی زیادہ حصہ ان کی زندگی میں مرتب کیا جا چکا تھا اور انھوں نے اس کے بعض حصے معارف میں شائع بھی کیے تھے، اب جب کہ یہ جلد چھپ رہی ہے تو ان کی یاد برابر آ رہی ہے، یقیناً اس کی اشاعت سے وہ بہت خوش ہوتے۔

پہلے خیال تھا کہ دو جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہو جائے گا لیکن دوسری جلد کے بعد بھی کئی ممتاز محدثین کے تذکرے رہ گئے اور اب اندازہ ہے کہ تین جلدوں میں یہ سلسلہ مکمل ہوگا اور مزید ایک اور جلد ہندوستان کے محدثین کے لئے مخصوص کرنی ہوگی، قدردانوں کا اصرار ہے کہ پہلے یہی جلد مرتب کی جائے، ان کی خواہش کے مطابق آئندہ پہلے ہندوستانی

محدثین سے متعلق جلد کی تالیف عمل میں آئے گی، اس کے بعد انشاء اللہ بیرونی ممالک کے محدثین کے متعلق تیسری جلد شائع ہوگی۔

اس جلد میں چوتھی صدی سے آٹھویں صدی کی ابتدا تک کے صاحبِ تصانیف محدثین کے حالات تحریر کیے گئے ہیں، حدیث کی جمع وتدوین کی تاریخ میں تیسری صدی ہجری کو زریں عہد سمجھا جاتا ہے، صحاحِ ستہ کے مصنفین اسی دور میں گذرے ہیں لیکن اس کے بعد کی صدیاں بھی صاحبِ کمال محدثین سے خالی نہیں ہیں، حدیث کے بڑے بڑے شارحین ان ہی صدیوں میں پیدا ہوئے، ان کے اہم کارنامے فنِ حدیث کی تاریخ میں ہمیشہ یادرکھے جائیں گے، اس جلد میں ان میں سے اکثر کے تذکرے اوران کی خدمات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس میں جن محدثین کا ذکر ہے ان کے زمانے میں عقائد واحکام کی بنیاد پر مسلمانوں میں متعدد فرقے پیدا ہوگئے تھے، محدثین عموماً اہلسنت والجماعت کے ہمنوا تھے، وہ کوئی ایسی بات انگیز کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے جو بظاہر کتاب وسنت کے خلاف ہوتی، اس سلسلہ میں بعض کے یہاں شدت پسندی بھی آگئی تھی، جو نیک نیتی اورحق پسندی ہی کا نتیجہ تھی لیکن اس کی وجہ سے ان کو مخالفتوں اورآزمائشوں سے دوچار ہونا پڑا اوراعتراضات کا نشانہ بھی بنناپڑا، ان اعتراضات سے کہیں کہیں سرسری گزر جانا ممکن نہ تھا لیکن ان کے بارہ میں جو کچھ تحقیق سے درست معلوم ہوا ہے وہی لائق مرتب نے پیش کیا ہے اور جانبداری سے پرہیز کیا ہے۔

کاپی اور پروف کی تصحیح پر پوری توجہ صرف کی گئی ہے مگر اس کے بعد بھی کہیں کہیں غلطیاں رہ گئی ہیں جن کی ناظرین اپنے ذوق سے خود تصحیح کرسکتے ہیں، اس کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ ہر محدث کے حالات نئے صفحے سے شروع کیے جائیں، مگر ایک جگہ آگے کے

صفحات چھپ جانے کی وجہ سے اس کا التزام نہیں ہو سکا اور مجبوراً یہ خامی انگیز کرنی پڑی (۱) لائق مرتب نے جس محنت و کاوش اور سلیقہ سے یہ کتاب مرتب کی ہے، اسے پڑھ کر ناظرین ضرور محظوظ ہوں گے، اس کی اشاعت سے دار المصنفین کے سلسلۂ مطبوعات میں ایک اچھی اور قابلِ قدر تصنیف کا اضافہ ہوا ہے، ناظرین دعا کریں کہ مرتب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور آپ کے اسوۂ حسنہ پر عمل کی بیش از بیش توفیق نصیب ہو۔ آمین

سید صباح الدین عبدالرحمٰن
دار المصنّفین، اعظم گڑھ
۷/ربیع الاول ۱۳۹۷ھ، ۲۶/فروری ۱۹۷۷ء

(۱) الحمدللہ نئے اڈیشن میں یہ خامی دور ہوگئی ہے اور کہیں کہیں جو تحقیقی فروگزاشتیں ہوگئی تھیں ان کو بھی درست کردیا گیا ہے۔ والعصمة لله وحده. (ض)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

امام عبدالباقی بن قانع

متوفی ۳۵۱ھ

نام ونسب: عبدالباقی نام، ابوالحسین کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، عبدالباقی بن قانع بن مرزوق بن واثق۔(۱)

ولادت، خاندان اور وطن: خطیب بغدادی نے لکھا ہے کہ وہ ۲۵/ ذوقعدہ ۲۶۵ھ کو پیدا ہوئے، دوسرے مورخین نے بھی یہی سنہ تحریر کیا ہے مگر ایک روایت ۲۶۶ھ کی بھی ہے۔(۲)

امام ابن قانع بنوامیہ کے موالی میں تھے اور بغداد ان کا وطن تھا، اس لیے اموی اور بغدادی کہلاتے تھے۔(۳)

اساتذہ: ان کو جن اصحاب کمال اور ائمہ حدیث سے شرف تلمذ حاصل تھا ان کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن احمد وکیعی، ابراہیم بن اسحاق حربی، ابراہیم بن ہیثم بلدی، احمد بن اسحاق وزان، احمد بن علی خراز، احمد بن یحیٰ حلوانی، اسحاق بن حسن حربی، اسماعیل بن فضل بلخی، حارث بن ابی اسامہ، حسن بن عباس رازی، محمد بن مسلم واسطی، عبید بن شریک بزار،

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۱ص ۸۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۹۹ (۲) لسان المیزان ج ۳ص ۳۸۴ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۹۹ وتاریخ بغداد ج ۱۱ص ۸۸۔

علی بن محمد بن ابی الشوارب وغیرہ۔

تلامذہ: ان کے چند ممتاز تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن بن رزقویہ، ابوالحسن دارقطنی، ابوالحسین بن فضل قطان، احمد بن علی بادی، ابوعلی بن شاذان، ابوالقاسم بن بشران، عبدالعزیز بن محمد بن شبان اور مرزبانی وغیرہ۔ (۱)

رحلت وسفر: طلب علم کے لیے ان کے سفر کی تفصیلات تو معلوم نہیں ہوسکیں لیکن علامہ ذہبی لکھتے ہیں، وکان واسع الرحلة (کثیر الاسفار تھے) اور شاہ عبدالعزیزؒ صاحب کا بیان ہے ''ورحلت بسیار کردہ۔'' (۲)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے متعدد مقامات کے علمی سفر کیے تھے۔

حفظ وثقاہت: امام ابن قانع بغداد کے مشہور حفاظِ حدیث میں تھے، کثیر الحفظ ہونے کی وجہ سے الحافظ ان کا لقب پڑ گیا تھا، عام علمائے فن سے ان کی توثیق بھی منقول ہے، ابن ناصرالدین فرماتے ہیں کہ علما کی ایک جماعت سے ان کی توثیق منقول ہے، **حافظ ابن کثیر** کا بیان ہے کہ وہ حافظ، ثقہ اور امین تھے، علامہ خطیب کا بیان ہے کہ ہمارے عام اساتذہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، ابن جوزی، علامہ ذہبی اور دوسرے علما نے بھی ان کی **ثقاہت** کا تذکرہ کیا ہے۔ (۳)

حدیث میں درجہ: وہ بڑے نامور علما اور مشہور حفاظِ حدیث میں شمار کیے جاتے تھے، اس فن میں ان کی عظمت اور بلند پایگی کا اندازہ علامہ ذہبی کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ ابن قانع کثیر الحدیث تھے۔

روایت کی طرح درایت میں بھی امتیاز رکھتے تھے، خطیب لکھتے ہیں کہ وہ اہل علم اور اصحابِ فہم ودرایت میں تھے۔ (۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ وتاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۸ (۲) تذکرۃ ج ۳ ص ۹۹ وبستان المحدثین ص ۸۶ (۳) حوالہ مذکورہ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ وتاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۸۔

رجال: حدیث کی طرح رجال پر بھی ان کی اچھی نظر تھی، اسماء الرجال کی کتابوں میں ان کے اقوال درج ہیں۔

فقہ وقضا: فقہ میں ان کا درجہ بلند تھا، اسی لیے قضا کے منصب پر فائز کیے گئے، احکام ومسائل پر ان کی وسعتِ نظر کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابوبکر جصاص رازی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں ان سے بے شمار روایتیں نقل کی ہیں۔(۱)

مذہب ومسلک: مسلکاً حنفی تھے اور ان کا شمار فقہائے حنفیہ میں ہوتا ہے، حافظ ابن حجر نے بھی ان کے حنفی اور اصحابِ رائے میں ہونے کا ذکر کیا ہے اور عبدالقادر قرشی اور صاحب تاج التراجم نے ان کا طبقات الحنفیہ میں ذکر کیا ہے۔(۲)

وفات: ۸۶ سال کی عمر میں اپنے وطن بغداد میں ۷رشوال ۳۵۱ھ کو انتقال کیا، ابن ماکولا نے ۳۵۴ھ کی روایت کی ہے مگر حافظ ابن حجر نے اس کی تضعیف کی ہے۔(۳) ان کے ازواج واولاد اور دیگر اہل خاندان کے حالات معلوم نہیں ہو سکے، عبدالقادر قرشی نے الجواہر میں ان کے ایک بھائی احمد کا ذکر کیا ہے جو نامور قاضی، ممتاز فقیہ اور علم الفرائض کے ماہر تھے۔

تصنیفات: حافظ ابن قانع بڑے صاحب علم تھے، اس کا ثبوت ان کی متعدد تصنیفات ہیں، مورخین نے ان کو کئی کتابوں کا مصنف بتایا ہے لیکن ان میں سے صرف ایک کا نام معلوم ہو سکا اور یہ معجم الصحابہ ہے جو حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہے، حافظ ابن حجر نے مجمع المؤسس میں (۴) اور دوسرے علمائے سیر وتراجم نے بھی اپنی کتابوں میں اس کا ذکر کیا ہے، حافظ ذہبی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کی ایک روایت نقل کی ہے جو یہ ہے:

عن كعب بن عياض قال	کعب بن عیاض سے روایت ہے کہ
قال رسول الله صلى الله	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

(۱) الجواہر المضیہ ج۱ص۲۹۳ (۲) ایضاً وتاج التراجم فی طبقات الحنفیہ ص۳۴ ولسان المیزان ج۳ ص۳۸۴ (۳) لسان المیزان ج۳ص۳۸۴ (۴) کشف الظنون ج۲ص۴۶۵۔

علیہ وسلم لکل امة فتنة وفتنة امتي المال۔(۱)	ہرامت کے لیے ایک نہ ایک چیز موجب فتنہ ہوتی ہے اور میری امت کے لیے مال باعثِ فتنہ ہے۔

مشہور فقیہ ابویعلیٰ صدفی نے اس معجم کی ان حدیثوں کی جو وہم وتصحیف پر مشتمل ہیں وضاحت کے لیے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام الاعلام والتعریف مما لا بن قانع في معجمه من الاوهام والتصحيف تھا۔(۲)

غالباً انھوں نے رجال پر بھی کوئی کتاب لکھی تھی کیوں کہ رجال کی تمام معتبر کتابوں میں ان کے اقوال ملتے ہیں۔

ابن قانع پر بعض اعتراضات: عام علمائے فن نے ان کی توثیق کی ہے لیکن بعض علما نے ان پر اعتراضات بھی کیے ہیں، جن کی تفصیل یہ ہے:

۱- ان کے مشہور شاگرد امام دارقطنی کا بیان ہے کہ ان کا حافظہ اگرچہ نہایت عمدہ تھا لیکن وہ خطا بھی کرتے تھے اور بعض روایتوں میں ان سے یہ بھی منقول ہے کہ وہ خطا پر اصرار کرتے تھے، مشہور محدث برقانی کا بیان ہے کہ اہل بغداد ان کو ثقہ بتاتے ہیں لیکن میرے نزدیک وہ ضعیف ہیں۔

۲- علامہ ابن حزم نے ان کو منکر الحدیث کہا ہے اور لکھا ہے کہ عام محدثین نے ان سے روایت کرنے میں بالکل احتراز کیا ہے اور ابن فتحون سے منقول ہے کہ حفاظ حدیث میں ان سے زیادہ کثیر الاوہام اور منکر المتون شخص میں نے نہیں دیکھا، مگر اس کے باوجود جلیل القدر اشخاص نے ان سے روایت کی ہے اور ان کے حافظہ کی تعریف کی ہے مثلاً امام دارقطنی وغیرہ، مگر یہ دونوں اعتراضات مطلقاً صحیح نہیں ہیں، اصل حقیقت یہ ہے جیسا کہ خطیب نے ابوالحسن بن فرات سے نقل کیا ہے کہ وفات سے دو سال پہلے وہ سوءِ حفظ اور اختلال عقل

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۹ وبستان المحدثین ص ۸۸ و ۸۹ (۲) لسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۴۔

کے عوارض میں مبتلا ہوگئے تھے، اس لیے ہم لوگوں نے ان سے سماع وروایت کا سلسلہ موقوف کردیا تھا لیکن بعض لوگوں نے اس وقت اس حالت میں بھی ان سے سماع جاری رکھا، خطیب برقانی کے اعتراض پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ برقانی کی تضعیف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ابن قانع اصحاب علم وفہم ودرایت میں تھے اور ہمارے عام شیوخ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، البتہ آخر عمر میں وہ اختلال اور نسیان کے عوارض میں مبتلا ہوگئے تھے۔

علامہ ابن حزم کا اعتراض ناواقفیت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور اگر اس کو صحیح مانا جائے تو اس کا بھی وہی جواب ہے جو پہلے گذر چکا، حافظ بن حجر نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ آخر عمر میں اختلال میں مبتلا ہوگئے تھے، اس لیے لوگوں نے ان سے روایت کرنا ترک کردیا تھا۔(۱)

ان تفصیلات سے واضح ہوگیا کہ ابن قانع کی ثقاہت مسلم ہے، البتہ آخر عمر میں بعض عوارض میں مبتلا ہوجانے کی وجہ سے علمائے فن نے ان سے اس وقت روایت کرنے میں احتیاط برتا ہے، ابن جوزی کا بیان ہے:

وان كان من اهل العلم والفهم والثقة غيرانه تغير في آخر عمره.(٢)	وہ اگرچہ صاحب علم وفہم اور ثقہ تھے لیکن آخر عمر میں مختل ہوگئے تھے۔

☆☆☆

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۱ ص ۸۹ ومیزان الاعتدال ج ۲ ص ۹۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۹۹ ولسان المیزان ج ۳ ص ۳۸۳، ۳۸۴ (۲) المنتظم ج ۷ ص ۱۴۔

امام سعید بن السکن

متوفی ۳۵۳ھ

نام ونسب: سعید نام، ابو علی کنیت اور نسب نامہ حسب ذیل ہے:

سعید بن عثمان بن سعید بن السکن۔ (۱)

اپنے جد اعلیٰ کی نسبت سے ابن السکن کہلاتے ہیں اور اسی نام سے مشہور ہیں۔

ولادت ووطن: ۲۹۴ھ ان کا سنہ ولادت ہے، اصلی وطن بغداد تھا لیکن مصر میں سکونت اختیار کر لی تھی، (۲) اسی لیے بغدادی اور مصری دونوں نسبتوں سے مشہور ہوئے، خاندانی حالات معلوم نہیں ہو سکے۔

اساتذہ وشیوخ: ان کے جن شیوخ کا نام معلوم ہو سکا وہ یہ ہیں:

ابن جوصا، ابو عروبہ حرانی، ابو القاسم البغوی، سعید بن عبد العزیز حلبی، محمد بن محمد بن بدر باہلی اور محمد یوسف فربری۔

تلامذہ: بعض شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابو جعفر بن عون، ابو عبد اللہ بن مندہ، عبد اللہ بن محمد بن اسد قرطبی، عبد الغنی بن سعید، علی بن محمد دقاق، ابو عبد اللہ محمد بن یحییٰ بن مفرج۔ (۳)

طلب علم کے لیے سفر: علم کی تحصیل اور احادیث کی طلب کے لیے اس زمانہ کے مشہور مراکز حدیث کا سفر کیا علامہ ذہبی نے العبر میں عراق، شام، جزیرہ، خراسان اور ماوراء النہر

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹ (۲) ایضاً وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۷ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹۔

کے علما سے اور تذکرہ میں جیحون سے فرات تک کے اربابِ کمال سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔(۱)

حفظ وثقاہت: امام ابن السکن کا مشہور حفاظ اور معتبر محدثین میں شمار ہوتا ہے، مورخین نے ان کو الحافظ اور الحافظ الکبیر لکھا ہے اور ان کی عدالت وثقاہت پر بھی اتفاق ہے، ابن عماد نے ثقہ وحجت اور سیوطی نے الحافظ الحجہ لکھا ہے۔(۲)

حدیث میں درجہ: علامہ سیوطی نے مصر کے اعلیٰ طبقہ کے محدثین اور نقادان فن میں ان کا تذکرہ کیا ہے، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ ابن السکن نے فن حدیث کی جانب خاص توجہ کی اس میں کتابیں لکھیں اور حدیثیں جمع کیں، ان کی حدیث میں بصیرت اور ژرف نگاہی کا یہ حال تھا کہ اکثر علما اس باب میں ان کی جانب رجوع کرتے اور ان کی رایوں پر پورا اعتماد کرتے، ایک دفعہ کچھ محدثین ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، انھوں نے کہا کہ ہمارے سامنے حدیث کی بہت سی کتابیں آگئی ہیں، آپ ان میں سے چند ایسی کتابوں کی نشاندہی کر دیں جن پر ہم اکتفا کر سکیں، وہ یہ سن کر گھر میں داخل ہوئے اور کتابوں کے چار بستے لا کر تلے اوپر رکھ دیے پھر فرمایا:

هذه قواعد الاسلام كتاب مسلم وكتاب البخاری و كتاب ابی داؤد وكتاب النسائی.(۳)	یہ اسلام کی بنیادیں ہیں یعنی صحیح مسلم، صحیح بخاری، سنن ابی داود، اور سنن نسائی۔

امامت وشہرت: اپنے کمالات اور عظمت کی وجہ سے ان کا شمار ائمہ میں ہوتا ہے، علامہ ذہبی نے العبر میں احد الائمہ لکھا ہے اور تذکرۃ الحفاظ میں لکھتے ہیں کہ ان کی شہرت کا دور دور چرچا

(۱) تذکرۃ والعبر ج ۳ ص ۲۹۷۔ (۲) شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۲ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۴۔ (۳) شروط الائمۃ الستۃ ص ۸۔

تھا، ان کی کتاب الصحیح المنتقی اندلس میں پہنچ چکی تھی۔(۱)

وفات: ۵۹ سال کی عمر میں محرم ۳۵۳ھ میں انتقال کیا۔(۲)

تصنیفات: اہل سیر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں جو معدوم ہیں صرف دو کتابوں کے نام معلوم ہو سکے۔

۱- مصنف: اس کا صاحب کشف الظنون اور صاحب تحفۃ الاحوذی نے ذکر کیا ہے، (۳) مگر اور کسی قسم کے معلومات نہیں لکھے ہیں۔

۲- الصحیح المنتقی: یہ احکامی احادیث وسنن کا مجموعہ ہے، گو ان کی سندیں مصنف نے حذف کر دی ہیں تاہم اس میں صحت کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے، اسی لیے اس کا نام منتقی رکھا ہے، اور اپنے خیال میں انھوں نے صرف صحیح روایتیں ہی اس میں شامل کی تھیں اور ضروری مسائل واحکام کے ابواب قائم کر کے ان کے تحت حدیثیں درج کی ہیں، اس کتاب کی حدیثوں کی تین نوعیتیں ہیں، میں نے اس کتاب میں جن حدیثوں کا مجملاً بیان کیا ہے یعنی ان کے صحت وسقم کی کوئی تشریح نہیں کی ہے وہ بالاتفاق صحیح ہیں، دوسرے نمبر پر ایسی حدیثیں ہیں جو کسی نہ کسی امام کی مختار ومعمول بہا ہیں لیکن بعض ایسی حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن کے ناقلین ان کی روایت میں منفرد ہیں مگر میں نے اس کی علت اور راوی کے انفراد کا ذکر کر دیا ہے، (۴) ابن حزم کا بیان ہے کہ صحیحین کے بعد اسی کتاب کا درجہ ہے۔(تدریب ص۴۲)

---

(۱) العبر ج ۲ ص ۲۹۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹، (۲) العبر ج ۲ ص ۲۹۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۹
(۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۵۱ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۶۔ (۴) الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۴ بحوالہ شفاء السقام سبکی۔

امام ابوبکر شافعیؒ

متوفی ۳۵۴ھ

نام ونسب: محمد نام، ابوبکر کنیت اور بزار لقب تھا، نسب نامہ حسب ذیل ہے،

محمد بن عبداللہ بن ابراہیم بن عبدویہ۔(۱)

ولادت ووطن: امام ابوبکر شافعی کی ولادت ۲۶۰ھ میں واسط کے قریب ایک مقام جبل (جہل) میں ہوئی لیکن انھوں نے بغداد میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، اسی لیے بغدادی کی نسبت سے مشہور ہوئے، علمائے سیر اسی بنا پر ان کو محدثینِ عراق میں لکھتے ہیں۔(۲)

اساتذہ: ان کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن ابی الدنیا، ابوقلابہ رقاشی، قاضی اسماعیل، عبداللہ بن روح مداینی، محمد بن جہم سمری، محمد بن شداد مسمعی، محمد بن فرج ازرق اور موسیٰ بن سہل وشاد۔

موسیٰ بن سہل وشاد نے اسماعیل بن علیہ جیسے عظیم محدث سے اور محمد بن شداد مسمعی نے یحییٰ بن قطان سے اکتسابِ فیض کیا تھا۔(۳)

تلامذہ: ابوبکر کے حلقۂ فیض سے وابستہ لوگوں میں بعض کے اسماء حسب ذیل ہیں:

ابوعلی بن شاذان، احمد بن عبداللہ بن محاملی، امام دارقطنی، عبدالملک بن بشران،

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۹۶ وبستان المحدثین ص ۵ (۲) ایضاً وکتاب الانساب ورق ۳۲۶ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۹۶۔

عمر بن شاہین، ابوالحسن محمد بن احمد، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حافظ اور ابوطالب محمد بن محمد بن ابراہیم بن غیلان۔(۱)

حصول علم کے لیے سفر: انھوں نے ۲۱ سال کی عمر میں ۲۷۶ھ میں حدیث کی تحصیل شروع کی، اس کے بعد اس فن سے اس قدر اشتغال ہوا کہ متعدد مقامات کا سفر کیا، مصر وجزیرہ جانے کی تصریح ملتی ہے۔(۲)

ضبط وثقاہت: محدثین اور علمائے فن نے ان کی توثیق کی ہے، حافظ ذہبی نے الامام الحجہ المفید اور خطیب نے ثقہ وثبت لکھا ہے، امام دارقطنی کا بیان ہے کہ وہ ثقہ و مامون تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ ایسے ثقہ و مامون تھے، جن کی نظر احادیث کے معاملہ میں کبھی نہیں چوکتی تھی، ان کے زمانہ میں ان سے زیادہ معتبر اور ثقہ آدمی کوئی نہیں تھا۔(۳)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: حدیث میں ان کا درجہ ومرتبہ اتنا بلند تھا کہ امام دارقطنی نے ان کو جبلِ حدیث اور ذہبی نے امام ومحدثِ عراق کہا ہے، علامہ ابن اثیر لکھتے ہیں کہ وہ حدیثوں کے عالم اور ان کی سندیں نہایت عالی ہوتی تھیں، علامہ سمعانی لکھتے ہیں۔

مارأیت لہ الا اصولا صحیحۃ متقنۃ۔ (۴)	میں نے ان کے اصولِ حدیث نہایت صحیح اور قوی پائے۔

مذہب ومسلک: ان کے فقہی مذہب کی باقاعدہ تصریح نہیں ملتی لیکن شافعیت کی نسبت سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شافعی رہے ہوں گے۔

کارنامہ: امام ابوبکر بڑے صاحب عزیمت اور نہایت راسخ العقیدہ بزرگ تھے، ان کے زمانے میں شیعیت کا بڑا غلبہ تھا لیکن اس کے باوجود وہ علی الاعلان صحابہ کے فضائل کی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶ (۲) بستان المحدثین ص ۵ (۳) تذکرہ ج ۳ ص ۹۶ والعبر ج ۲ ص ۳۰۱ وکتاب الانساب ورق ۳۲۶ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۱۶ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶، ۹۷ وکامل ابن اثیر ج ۷ ص ۸۶ او کتاب الانساب ورق ۳۲۶۔

حدیثیں بیان کرتے تھے، علامہ ابن اثیر نے ۳۵۱ھ کے واقعات میں لکھا ہے کہ اہل دیلم نے لوگوں کو فضائل صحابہ بیان کرنے سے روک دیا اور جامعِ اعظم اور دوسری مسجدوں کے صدر دروازوں پر تبرا لکھوایا تو یہ اس وقت بھی علی الاعلان صحابہ کے فضائل بیان کرتے تھے اور جامع اعظم اور باب الشام میں حسبۃً للہ اس قسم کی روایات کا املا کراتے تھے۔(۱)

وفات: انھوں نے ۹۵ سال کی طویل عمر میں ذی الحجہ ۳۵۴ھ میں انتقال کیا۔

پیشہ: ان کا ذریعہ معاش کپڑوں کی تجارت تھا، اسی لیے بزاز لقب پڑ گیا تھا۔(۲)

تصنیفات: مورخین نے ان کو صاحب تصانیف لکھا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ان کی تصنیفات نہایت عمدہ تھیں لیکن ان کے ایک ہی مجموعہ حدیث کا پتہ چلتا ہے جو فوائد ابوبکر یا غیلانیات اور اجزاء الغیلانیات کے نام سے مشہور ہے، اس مجموعہ کو غیلانیات اس لیے کہا جاتا ہے کہ امام ابوبکر کے مشہور شاگرد شیخ ابوطالب محمد بن محمد بن ابراہیم بن غیلان م ۴۴۰ھ نے اس کی ان سے روایت کی ہے، ان کے نام کی نسبت کی وجہ سے اس کو غیلانیات وغیرہ کہتے ہیں، یہ گیارہ اجزا پر مشتمل ہے اس کی ترتیب ابواب و شیوخ پر ہے اور حدیث کی اعلیٰ و احسن کتابوں میں شمار کی جاتی ہے، امام دارقطنی نے اس کی رباعی حدیثوں کی ایک مستقل رسالہ میں تخریج کی ہے، علامہ ذہبی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے اس کی ایک ایک حدیث نقل کی ہے۔(۳)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۹۶، ۹۷ و کامل ابن اثیر ج ۷ ص ۱۸۶، المنتظم ج ۷ ص ۳۲، البدایہ ج ۱۱ ص ۲۶۰ (۲) تذکرہ ج ۳ ص ۹۷ والعبر ج ۲ ص ۳۰۱ (۳) بستان ص ۴۷ و تذکرہ ج ۳ ص ۹۷ و کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۶۔

امام ابن حبان

متوفی ۳۵۴ھ

نام ونسب: محمد نام، ابوحاتم کنیت اور ابن حبان لقب تھا، سلسلۂ نسب یہ ہے:

محمد بن حبان بن احمد بن حبان بن معاذ بن معبد بن شہید بن ہدیہ بن مرۃ بن سعد بن یزید بن مرۃ بن زید بن عبداللہ بن دارم بن حنظلہ بن مالک بن زید بن مناۃ بن تمیم۔(۱)

نسب نامہ میں قدرے اختلاف منقول ہے۔

خاندان: ابن حبان عربی النسل تھے، جیسا کہ نسب نامہ سے ظاہر ہے، عرب کے مشہور قبیلہ تمیم کی شاخ دارم سے ان کا نسبی تعلق تھا، اسی لیے دارمی اور تمیمی کہلاتے ہیں۔

وطن: بست کو ان کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، یہ سیستان میں غزنیں اور ہرات کے درمیان دریائے ہلمند کے کنارے واقع تھا، محب الدین خطیب کا بیان ہے کہ غالب گمان یہ ہے کہ ان کے آباواجداد میں سے کوئی بزرگ مجاہدین اسلام کے اس دستہ میں شامل رہے ہوں گے جو پہلی صدی ہجری میں محمد بن قاسم ثقفی کی سرکردگی میں ہندوستان آیا تھا اور ملتان کی فتح کے بعد ان ہی علاقوں میں آباد ہوگئے ہوں گے، انہی کی نسل سے محمد بن حبان بست میں پیدا ہوئے، یہ اس زمانہ میں صوبہ سجستان (سیستان) کا ایک اہم پررونق اور سرسبز وشاداب مقام سمجھا جاتا تھا اور خرما اور انگور کی پیداوار کے لیے مشہور تھا، غالباً باغوں کی کثرت کی بنا پر اس کا نام بست پڑ گیا تھا، جو بوستاں یا بستان کی بگڑی ہوئی شکل معلوم ہوتا ہے، یہ شہر اسلامی فتوحات سے پہلے اور اس کے بعد بھی کئی صدیوں تک آباد رہا، یاقوت

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۳۔

کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ ابن حبان کے بعد تقریباً تین صدیوں تک یہ آباد رہا مگر چھٹی صدی کے آخر یا ساتویں صدی کے شروع میں ویران ہوگیا، اس کی خاک سے متعدد نامور محدثین اور اکابر علما پیدا ہوئے، عربی کا مشہور ادیب وشاعر ابوالفتح بستی (متوفی ۴۰۱ھ) کا وطن یہی علاقہ ہے اور سنن ابی داؤد کے مشہور شارح اور عظیم محدث امام ابوسلیمان خطابی (م ۳۸۸ھ) کا تعلق بھی اسی مردم خیز سرزمین سے ہے۔(۱) امام ابن حبان بست کے گل سرسبد تھے اور امام خطابی سے زیادہ کوئی باکمال شخصیت یہاں نہیں پیدا ہوئی۔

ولادت: مورخین نے ان کے سنہ ولادت کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن ذہبی کا بیان ہے کہ وفات (۳۵۴ھ) کے وقت ان کی عمر تقریباً اسی سال تھی،(۲) اسی لحاظ سے لگ بھگ ۲۷۵ھ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

شیوخ واساتذہ: ابن حبان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، حافظ ذہبی اور علامہ ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں:

وانما لا یحصون من مصر الی خراسان.

مصر سے خراسان تک کے بے شمار لوگوں سے ابن حبان نے کسب فیض کیا۔

ان کا خود کا بیان ہے کہ:

لعلنا قد کتبنا عن الفي شیخ ما بین الشاس والاسکندریه. (۳)

شاید ہم نے شاس واسکندریہ کے درمیان کے دوہزار بزرگوں سے حدیثیں لکھیں۔

اگر ان کی مختلف علوم میں جامعیت اور رحلت وسفر کی کثرت کو مدنظر رکھا جائے تو اس بیان میں کوئی مبالغہ نہ معلوم ہوگا۔

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۸۱ معجم البلدان ج ۳ ص ۱۷۰،۱۷۱ وجغرافیہ خلافت مشرقی ص ۳۸۱ - ۵۱۹

(۲) العبر جلد ۲ ص ۳۰۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱۔

بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن خزیمہ، ابوخلیفہ جمحی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، ابویعلیٰ موصلی، احمد بن حسن صوفی، قاضی ابواحمد اسحاق بن ابراہیم بستی جعفری، احمد دمشقی، حسن بن سفیان شیبانی، حسین بن ادریس ہروی، ابویعلیٰ زکریا ساجی، عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن بن شیرویہ ازدی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بغوی، عمر بن محمد، عمران بن موسیٰ بن مجاشع، محمد بن ابراہیم خلدی ہروی، محمد بن اسحاق بن ابراہیم سراج ثقفی، ابوالحسن محمد بن عبداللہ بن جنید بستی، محمد بن عثمان بن سعد دارمی، محمد بن یحییٰ مدینی، محمد بن یزید دورقی، ابوعوانہ یعقوب بن اسحاق وغیرہ۔

امام الائمہ ابوبکر بن خزیمہ سے غیر معمولی تعلق تھا، سفر ہو یا حضر ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے اور وہ جو کچھ فرماتے تھے اسے قلمبند کر لیتے تھے، فقہ، حدیث، اصول اور فرائض وغیرہ کی ان ہی سے تعلیم حاصل کی تھی۔(۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی، چند مشہور شاگردوں کے نام ملاحظہ ہوں:

ابوعبداللہ حاکم، ابوعبداللہ بن مندہ اصبہانی، جعفر بن شعیب بن محمد سمرقندی، حسن بن منصور، ابوعبداللہ محمد بن احمد غنجار بخاری، ابومعاذ عبدالرحمٰن محمد بن رزق اللہ بجستانی، محمد بن احمد بن منصور بوقانی، ابوالحسن محمد بن احمد بن ہارون عبدون زوزنی، ابوسلمہ محمد بن محمد بن داؤد شافعی، ابوعلی منصور بن عبداللہ خالد ذہلی وغیرہ۔(۲)

طلب علم کے لیے سفر: امام ابن حبان نے علم وفن کی تحصیل کے لیے متعدد اسلامی ملکوں کا سفر کیا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ انھوں نے شاس واسیجاب (مشرقی ترکستان) سے اسکندریہ (مصر) اور مصر سے خراسان کا چپہ چپہ چھان ڈالا تھا، علمائے سیر نے ان کے مرو، نیشاپور، اہواز، ابلہ، بصرہ، واسط، بغداد، کوفہ، مکہ، موصل، حلب، انطاکیہ، حمص، بخارا، لسا، ماوراء النہر، جرجان، عراق، حجاز، شام، مصر اور جزیرہ جانے کی تصریح کی ہے اور لکھا ہے کہ ان

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۴ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱ (۲) ایضاً۔

میں سے بعض جگہ تو وہ متعدد بار تشریف لے گئے تھے۔(۱)

حفظ وثقاہت: ان کو غیر معمولی ذکاوت اور بے نظیر حافظہ ملا تھا، ابوسعد ادریسی صاحب تاریخ سمرقند فرماتے ہیں کہ ''وہ آثار واحادیث کے نامور حفاظ میں تھے'' حافظ ابن حجر نے ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوتِ حافظہ کا اعتراف کیا ہے، دوسرے اصحابِ سیر وتراجم نے بھی ان کو الحافظ الجلیل اور احد الحفاظ الکبار وغیرہ لکھا ہے۔

ان کی ثقاہت پر بھی ائمہ فن کا اتفاق ہے، تمام مورخین نے خطیب کے حوالہ سے ان کو ثقہ ومتقن لکھا ہے، علامہ ابن عماد حنبلی فرماتے ہیں کہ وہ حافظ ثابت اور امام وحجت تھے۔(۲)

حدیث میں بلند پائیگی: حدیث میں ان کو زیادہ امتیاز اور برتری حاصل تھی اور وہ اس فن کے باکمال ائمہ میں شمار کئے جاتے ہیں، مورخین اور ارباب سیر نے ان کو حدیث میں مکثر اور معرفت حدیث میں امام قرار دیا ہے، متون واسانید حدیث پر ان کی نظر وسیع اور گہری تھی، ماہرینِ فن کا بیان ہے کہ: وہ متون واسانید کے عالم اور واقف کار تھے، حدیث میں ان کے کارنامے غیر معمولی ہیں، انھوں نے علوم حدیث کی حیرت انگیز خدمات انجام دی ہیں، حاکم فرماتے ہیں کہ ''حدیث میں ان سے بے نظیر کتابیں یادگار ہیں۔''(۳) حدیث میں ان کی مہارت اور ژرف نگاہی کا ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ جرح وتعدیل کے امام تھے اور اس فن میں ان کی تصنیفات بڑی اہم خیال کی جاتی ہیں۔

فقہ: اپنے جامع کمالات استاذ امام ابن خزیمہ کی طرح وہ بھی فقہ وحدیث دونوں میں ممتاز تھے اور انھیں سے اس فن کی تکمیل وتحصیل کی تھی، علمائے سیر لکھتے ہیں کہ ''ابن حبان فقہ کے

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۱ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۵ وبستان المحدثین ص ۴۰ (۲) ایضاً والبدایہ والنہایہ جلد ۱۱ ص ۲۵۹ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۱۶ (۳) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ واعلام ج ۳ ص ۸۸۰۔

عالم و عارف اور فقہائے دین میں ہیں'' سمرقند والوں میں فقہی ذوق پیدا کرنا ان ہی کا کارنامہ ہے، حاکم کا بیان ہے کہ ''وہ علم فقہ کا خزانہ تھے۔''(۱)

دیگر علوم: دینی علوم کی طرح وہ اس زمانہ کے مروجہ علوم اور جدید فنون سے بھی اچھی طرح واقف تھے، حاکم کا بیان ہے کہ لغت، عربیت نحو و ادب کے علاوہ فلسفہ و کلام، طب و نجوم اور جغرافیہ میں بھی دستگاہ رکھتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

سوائے علم حدیث علوم دیگر ہم داشت فقہ ولغت وطب ونجوم فلک وہندسہ رانیک می دانست۔(۲)	وہ علم حدیث کے علاوہ دوسرے علوم میں درک رکھتے تھے، فقہ ولغت وطب ونجوم، فلکیات وہندسہ سے خوب واقف تھے۔

جامعیت: ان گوناگوں علوم سے واقفیت و معرفت ابن حبان کی جامعیت کا ثبوت ہے، ادریسی کا بیان ہے کہ ''وہ متعدد علوم میں جامع تھے'' حاکم فرماتے ہیں کہ ''وہ علوم وفنون کا خزانہ تھے۔'' حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ انھوں نے ہر ہر فن میں کتابیں لکھی تھیں، علمائے اسلام میں ایسے جامع کمالات لوگ کم گذرے ہیں جن کو اتنے گوناگوں اور متنوع علوم میں اس قدر رسوخ اور ایسی مکمل مہارت حاصل رہی ہو، ان ہی کمالات اور جامعیت کی وجہ سے مورخین نے انھیں امام عصر، فاضل متقن، العالم البحر اور العلامۃ المتبحر وغیرہ لکھا ہے۔(۳)

فہم وفراست: اللہ تعالیٰ نے علم وفضل کی طرح ان کو فہم وفراست اور عقل و دانش سے بھی نوازا تھا، حاکم نے ان کو عقلائے رجال میں بتایا ہے اور خطیب نے بھی ان کی فہم وفراست کا اعتراف کیا ہے۔(۴)

علم کا شوق وذوق: ابن حبان کو علم وفن سے غیر معمولی شغف تھا، سفر کی زیادتی اسی دلچسپی کا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۷ (۲) ایضاً وبستان المحدثین ص ۴۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴۔

نتیجہ تھی، وہ ابن خزیمہ کی خدمت میں رہ کر اپنی تشنگی علم بجھاتے تھے، علم سے تعلق اور دلچسپی کا یہ حال تھا کہ اپنے وطن بست میں ایک مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تھا اور اپنی زندگی ہی میں اپنا مکان ان دونوں پر وقف کر دیا تھا، یہ مدرسہ اہل علم، محدثین اور فقہا سے معمور رہتا تھا اور کتب خانہ کا نہایت معقول انتظام کیا گیا تھا، اس کی نگرانی با قاعدہ ایک شخص کے متعلق کر دی گئی تھی، اس کی کشش لوگوں کو دور دراز سے یہاں کھینچ لاتی تھی، ان کو قیام اور کتبخانہ سے استفادہ اور کتابوں کے نقل کی پوری سہولت بہم پہنچائی جاتی تھی، کتابوں کی حفاظت کا بھی معقول انتظام تھا، چنانچہ کتب خانہ سے باہر کتابیں لے جانے کی کسی کو اجازت نہیں دی جاتی تھی، اس مدرسہ اور کتب خانہ کا فیض ابن حبان کے بعد بھی جاری رہا۔(۱)

منصب قضا: دینی علوم میں بصیرت اور پختگی کی وجہ سے انھیں قضا کا منصب تفویض کیا گیا تھا اور وہ ایک عرصہ تک سمرقند، نسا، نیشاپور اور خراسان کے بعض شہروں کے قاضی رہے۔(۲)

مقبولیت وشہرت: ابن حبان کے علم وفضل اور جامعیت وکمال کی بنا پر چار دانگ عالم میں ان کی شہرت ہو گئی تھی، حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ "شہروں اور ملکوں میں ان کی غیر معمولی شہرت تھی اور وہ بالاتفاق ائمہ امت میں شمار کیے جاتے تھے" علامہ سمعانی نے ان کو امام العصر اور حافظ ذہبی نے ان کو ائمہ زمانہ میں محسوب کیا ہے، ان کی مقبولیت کا یہ حال تھا کہ جب سیر وسیاحت کے بعد اپنے وطن بست تشریف لائے تو ان کے گھر پر شائقین علم اور طالبین فیض کا ازدحام رہتا تھا اور ان کی تصنیفات بڑے شوق وذوق سے پڑھی اور سنی جاتی تھیں۔(۳)

فقہی مسلک: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ شافعی المذہب تھے لیکن عام اصحاب طبقات

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۲) ایضاً وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۴ وکتاب الانساب ورق ۸۱ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۴ وکتاب الانساب ورق ۸۱۔

وتراجم نے اس باب میں سکوت اختیار کیا ہے، اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی خاص مسلکِ فقہ سے وابستہ نہ تھے، بلکہ اپنے استاذ امام ابن خزیمہ کی طرح تقلید کے بجائے تفقہ واجتہاد سے کام لیتے رہے ہوں گے حافظ ابن کثیر نے بھی ان کو مجتہدین میں شمار کیا ہے۔(۱)

جرح وتعدیل: اوپر گذر چکا ہے کہ وہ حدیث کی طرح اس کے متعلقہ علوم کے بھی ماہر تھے، جرح وتعدیل ان کا خاص موضوع تھا، اس میں انھوں نے کئی کتابیں لکھی تھیں۔

فکر وخیال میں جدت: امام صاحب کے بعض افکار وخیالات میں بڑی جدت اور ندرت پائی جاتی ہے اس قسم کی ایک عجیب اور دلچسپ رائے ذیل میں تحریر کی جاتی ہے:

حضرت انسؓ سے صومِ وصال کی جو روایت منقول ہے، اس میں آپؐ کے اس ارشاد مبارک:

انی لست کاحدکم انی اطعم واسقی۔	میں تم لوگوں کی طرح نہیں ہوں، مجھے (خداوند کی طرف سے) کھلایا پلایا جاتا ہے۔

کے متعلق اپنی صحیح میں لکھتے ہیں:

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حدیثیں صحیح نہیں ہیں جن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بھوک کی شدت سے پیٹ پر پتھر باندھ لینے کا ذکر ہے، دراصل ان حدیثوں میں حجر (پتھر) کے بجائے حجز کا لفظ ہوگا، جس کے معنی طرف الازار یعنی نیفہ ہے کیوں کہ جب اللہ تعالیٰ مسلسل روزہ رکھنے کی صورت میں بھی اپنے رسولؐ کو کھلاتا پلاتا تھا تو اس وقت بھلا وہ کیسے آپ کو بھوکا چھوڑ دیتا، جب آپ روزے سے نہیں ہوتے تھے یہاں تک کہ آپؐ کو اپنے پیٹ پر پتھر رکھنا پڑتا تھا، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ بھوک میں پیٹ پر پتھر باندھنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔''

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۲۵۹۔

علامہ ابن سبکی نے اس رائے پر جو ایراد کیا ہے وہ بھی ملاحظہ فرمایئے:

''علامہ کا یہ قول محل نظر ہے کیوں کہ خود انھوں نے اپنی اسی کتاب میں چند ورق پہلے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے واسطہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ آپ نے ایک دفعہ فرمایا:

والذی نفسی بیدہ ما اخرجنی الا الجوع۔(۱)	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں بھی بھوک ہی کی وجہ سے نکلا ہوں۔

اسی طرح متعدد روایتوں میں آپؐ کی بھوک کا ذکر ہے، درحقیقت بھوک کو نقص اور عیب خیال کرنا ہی غلط ہے بلکہ اسی سے نبی کے درجات کی بلندی کا پتہ چلتا ہے، ان حدیثوں اور وصال کی روایت میں تطبیق کی صورت بالکل واضح ہے، اللہ کی مشیت اور مرضی سے نبی کے مختلف احوال ہوتے ہیں، کبھی وہ بھوکا ہوتا ہے، کبھی روزے سے ہوتا ہے، اور کبھی یہ حال ہوتا ہے کہ روزے میں بھی اس کو بھوک اور پیاس کی تکلیف کا مطلقاً احساس نہیں ہوتا اور یہ سب صورتیں اور مختلف حالتیں اپنے اپنے محل اور وقت کے اعتبار سے بالکل موزوں اور مناسب ہوتی ہیں۔''(۲)

اخلاق وعادات: افسوس ہے کہ تذکرہ وتراجم کی کتابیں ابن حبان کے اخلاق کے ذکر

(۱) امام مالک نے اس روایت کی اس طرح تخریج کی ہے کہ آپ مسجد میں تشریف لے گئے وہاں حضرت ابوبکرؓ وعمرؓ پہلے سے موجود تھے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لوگ بھوک سے بیقرار ہو کر اپنے گھروں سے نکلے ہیں، آپ نے فرمایا (وانا اخرجنی الجوع) یعنی میں بھی اسی وجہ سے بے چین ہو کر نکلا ہوں، چنانچہ حضرت ابوالہیثم انصاری ان سب کو اپنے گھر لائے اور کھلایا پلایا۔ (موطا امام مالک ص۷۱۔۷۲۱، مطبوعہ احمدی پریس دہلی) (۲) طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۴۲۔

سے خالی ہیں لیکن ان کی فیاضی اور سخاوت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آخر عمر میں جب انھوں نے اپنے وطن میں مدرسہ اور کتب خانہ قائم کیا تو شائقین علم کے لئے ان کا گھر لنگر خانہ بنا ہوا تھا، دور دراز کے لوگوں کے طعام کے مصارف وہی برداشت کرتے تھے۔(۱)

الحاد اور بدعقیدگی کا الزام اور اس کا جواب: ابن حبان پر بدعقیدگی، الحاد اور زندقہ کا الزام عائد کیا گیا ہے اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کر دیئے گئے تھے، ذیل میں اس الزام کو نقل کر کے اس کی حقیقت واضح کی جاتی ہے۔

اس الزام کا دار و مدار اُن دو روایتوں پر ہے جو مشہور صوفی ابو اسمٰعیل عبداللہ بن محمد انصاری ہروی (متوفی ۴۸۱ھ) سے مروی ہیں، ان میں پہلی روایت یہ ہے:

قال سألت يحيىٰ بن عمار	ابو اسمٰعیل ہروی کا بیان ہے کہ میں نے
عن ابی حاتم بن حبان	یحییٰ بن عمار سے ابو حاتم بن حبان کے
فقال رأيتهٗ ونحن اخرجناه	بارہ میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ
من سجستان كان له علم	میں نے انھیں دیکھا ہے اور ہم ہی
كثير ولم يكن له دين كبير	لوگوں نے ان کو سیستان سے جلاوطن
قدم علينا فانكر الحد لله	کیا تھا، وہ کثیر العلم ضرور تھے مگر ان کا
فاخرجناه. (۲)	دینی پایہ زیادہ بلند نہ تھا، وہ ہمارے
	پاس آئے اور اللہ کے بارے میں حد کا
	انکار کیا تو ہم نے ان کو شہر بدر کر دیا۔

دوسری روایت ہے:

قال ابواسماعيل الانصاری	ابو اسمٰعیل انصاری کہتے ہیں کہ میں

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۴ و ۱۳۵ و میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۲ وطبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۱۴۱ و لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳۔

سمعت عبدالصمد بن محمد يقول سمعت ابي يقول انكروا على ابن حبان قوله (النبوة العلم والعمل) وحكموا عليه بالزندقة وهجروه وكتب فيه الى الخليفة فامربقتله وسمعت غيره يقول لذلك اخرج الى سمرقند۔(۲)	نے عبدالصمد سے اور انھوں نے اپنے والد محمد سے سنا کہ لوگوں نے ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل یعنی نبوت علم وعمل ہے)(۱) کی وجہ سے ان پر نکیر کی ہے، الحاد و زندقہ کا الزام لگایا اور ان سے قطع تعلق کر کے خلیفہ سے ان کی شکایت کی، خلیفہ نے ان کے قتل کا حکم دیا (ابواسماعیل کہتے ہیں مگر) میں نے عبدالصمد کے علاوہ دوسرے شخص سے یہ سنا ہے کہ اس کی وجہ سے وہ جلاوطن کر کے سمرقند بھیج دیئے گئے تھے۔

مذکورہ بالا دونوں روایتوں میں عائد کردہ الزامات کی نوعیت مختلف ہے، پہلی روایت میں ابن حبان کی فضیلت وبرتری میں کلام کیا گیا ہے اور دوسری روایت میں ان کے الحاد و زندقہ کا ذکر ہے، اسی طرح دونوں روایتوں میں الزام کے اسباب اور وجہیں مختلف بتائی گئی ہیں، پہلی روایت میں صرف جلاوطنی کا تذکرہ ہے اور دوسری میں اس کے بجائے خلیفہ کی طرف سے قتل کے فرمان کا ذکر ہے، مگر اس سے پتہ نہیں چلتا کہ واقعۃً وہ قتل کیے گئے تھے یا نہیں؟ (۳) پھر فرمانِ قتل کے بارہ میں خود راوی نے شک وتذبذب ظاہر کر کے

(۱) اس سے التباس ہوتا ہے کہ ابن حبان کے نزدیک نبوت علم وعمل کا نام ہے یعنی جس میں یہ اوصاف پائے جائیں وہ نبی ہوسکتا ہے گویا نبوت وہبی نہیں کسبی ہے (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵ ومیزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ (۳) شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قتل نہیں کیے گئے تھے بلکہ بعض ثقہ محدثین نے درمیان میں پڑ کر اس کو رفع دفع کرادیا تھا۔

روایت کو مشکوک بنا دیا ہے، علاوہ ازیں اس سے اس کا سوئے حفظ اور نسیان بھی ثابت ہوتا ہے۔

ابو اسماعیل انصاری کا زہد و تقدس اور تصوف میں ان کا کمال مسلم ہے مگر روایت و درایت میں ضبط و تیقظ ثابت نہیں ہے، عموماً صوفیہ روایات کی صحت اور سندوں کی قوت کا زیادہ لحاظ نہیں کرتے علاوہ ازیں وہی تنہا ان دونوں روایتوں کے راوی ہیں ان احتمالات کی موجودگی میں ابن حبان جیسے جلیل القدر محدث کے بارہ میں اتنے اہم اور سنگین الزام کو کیسے صحیح مانا جاسکتا ہے؟ ہروی کی پیدائش اور ابن حبان کی وفات کے درمیان چالیس بیالیس سال کا فرق ہے۔(۱) اگر یہ الزام کچھ بھی وزنی ہوتا تو اس عرصہ میں پوری طرح مشہور ہو چکا ہوتا اور اس کو بیان کرنے والے متعدد افراد اور ابن حبان کے معاصرین بھی ہوتے کیوں کہ ان کا شمار ائمہ حدیث اور جرح و تعدیل کے ماہرین میں ہوتا ہے، اس لیے دوسرے اربابِ فن محدثین اور رجال و اسناد کے ماہرین ان کے بارہ میں چھان بین ضرور کرتے لیکن اتنے اہم الزام کے بعد بھی ان کی شہرت و اہمیت وثوق و اعتبار اور عظمت و بلند پائیگی میں فرق نہ آنا اور ان کی ذات کا محدثین اور ائمہ فن کا مرکز توجہ بنا رہنا اور رجال کی کتابوں کا ان کے اقوال سے معمور ہونا اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ان پر یہ الزام ثابت و متحقق نہیں۔(۲)

ان روایتوں کے ناقابلِ یقین ہونے ہی کی بنا پر ان کو بعض ارباب سیر و تذکرہ نے نقل کرنے سے پرہیز کیا ہے اور جن مورخین نے ان کو نقل کیا ہے انھوں نے بھی ان پر نقد و تعقب کیا ہے۔

درحقیقت ایسے سنگین الزام محض مشکوک روایتوں کی بنیاد پر تسلیم نہیں کیے جاسکتے

---

(۱) طبقات ابن رجب ص ۳۹ (۲) اس سے پتہ چلتا ہے کہ مذکورہ بالا روایت میں ابن حبان سے تعلقات اور روایات وغیرہ ترک کرنے کا جو ذکر ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے ممکن ہے ان کے بعض مخالفین نے ان سے روایت کرنا چھوڑ دیا ہو لیکن عام طور سے ثقہ اور معتبر سمجھے جاتے رہے۔

جب تک کہ متعدد افراد کے بیانات، معاصرین کی شہادتوں اور دوسرے قرائن سے ان کی پوری تصدیق نہ ہو جائے۔

دونوں روایتوں کے اختلاف واضطراب اور ان میں خطا وتحریف کے احتمالات کو نظر انداز کر کے اگر انھیں صحیح بھی مان لیا جائے تو ابن حبان پر الحاد اور بدعقیدگی کا الزام ثابت نہیں ہوتا اس کی تفصیل یہ ہے:

اوپر گذر چکا ہے کہ پہلی روایت میں الحاد اور بے دینی کا سرے سے کوئی ذکر نہیں ہے بلکہ اس میں محض ابن حبان کی دینی عظمت وجلالت کے بارہ میں کلام کیا گیا ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے حد وحیز کی نفی کرتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ کوئی الحاد اور بے دینی کی بات نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کو بلا حد ومکان ماننا ہی اسلامی عقائد کے مطابق اور صحیح نقطہ نظر ہے، علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں:

انظر ماجهل هذا الجارح وليت شعري من المجروح مثبت الحد لله اونافيه۔	ذرا غور کرو کہ یہ جارحانہ الزام لگانے والا بھی کس قدر ناواقف ہے کاش میں بھی جانتا کہ دونوں میں قابلِ الزام کون ہے؟ آیا وہ جو اللہ کے لیے حد کو ماننا اور ثابت کرتا ہے یا وہ جو اس کی نفی کرتا ہے۔

حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلدی کا بیان ہے:

باللہ العجب من احق بالاخراج والتبديع وقلة الدين۔(۱)	بخدا سخت تعجب ہے آخر جلاوطنی کی سزا بدعت اور دین میں ضعف کے الزام کا کون زیادہ مستحق ہے؟

(۱) طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۲ ص ۱۴۱، ۱۴۲۔

حافظ ابن حجر نے بڑے صریح الفاظ میں علامہ ابن حبان کے موقف کو صحیح قرار دیا ہے، ان کے بیان کا خلاصہ ہے:

> ''معترض کا یہ کہنا کہ ابن حبان سے کوئی ایسی لغزش سرزد ہوگئی تھی جس کی وجہ سے لوگوں نے ان پر طعن کیا ہے اگر اس سے اس کی مراد پہلی روایت والا قصہ ہے جس میں ابن حبان کی جانب حد کی نفی کی نسبت کی گئی ہے تو دراصل اس میں کوئی لغزش نہیں ہے بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اس معاملہ میں ابن حبان ہی کا موقف برحق ہے۔''(۱)

ان اقوال سے ظاہر ہوگیا کہ حد کے مسئلہ میں علامہ ابن حبان کی رائے میں کوئی غلطی اور قابل اعتراض بات نہ تھی بلکہ ان ہی کا نقطہ نظر صحیح تھا، البتہ اس پر اس پہلو سے اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے خواہ مخواہ ایک غیر ضروری مسئلہ کو چھیڑا، کیوں کہ محتاط علما اس قسم کے کلامی مسائل میں غور وخوض کو پسند نہیں کرتے، ان کے نزدیک خدائے تعالیٰ کی صفات وغیرہ میں بحث وتدقیق فضول اور لایعنی بات ہے اور ان مباحث میں سکوت افضل اور سوال وتفتیش اور بحث وجستجو بدعت ہے، علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

> ''ابن حبان کا اللہ کے لیے حد ہونے کا انکار کرنا اور تم لوگوں کا اس کے لیے حد کا ثابت کرنا دونوں ہی فضول باتیں ہیں، ان کے متعلق خاموشی افضل واولیٰ ہے، اس لیے کہ نفی واثبات کے بارہ میں کوئی نص وارد نہیں ہے اور اللہ کی شان یہ ہے کہ ''اس کے مانند کوئی چیز بھی نہیں'' پس جو شخص حد کا قائل ہے اس کا مخالف اس سے کہے گا کہ تم نے تو رائے وقیاس سے اللہ کے لیے حد بنائی ہے، اس کے لیے تمہارے پاس کوئی ثبوت اور نص نہیں ہے (نتیجہ کے اعتبار سے اس قول سے اللہ کا محدود ہونا ثابت ہوتا ہے، حالاں کہ) محدود مخلوق ہے اور اللہ

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴۔

کی شان اس سے بہت اعلیٰ وارفع ہے مگر حد کو ماننے والا نہ ماننے والے سے یہ کہے گا کہ تم نے تو خداوند کو معدوم چیزوں کے برابر کردیا ہے(۱) کیوں کہ معدوم چیزوں کے لیے کوئی حد نہیں ہوتی، پس ایسی حالت میں جو لوگ اللہ کو منزہ سمجھتے اور ان امور کے بارہ میں خاموشی اختیار کرتے ہیں وہی سلف صالحین کے متبع ہیں اور انھیں کا طریقہ احتیاط اور سلامتی پر مبنی ہے۔‘‘(۲)

اس تقریر کا ماحصل یہ ہے کہ حد کے مثبت ومنکر دونوں نے ایک غیر ضروری اور بے سود مسئلہ کو موضوع بنا کر غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور ان دونوں کا طریقہ احتیاط وتورع کے منافی ہے، علامہ ذہبی دوسری جگہ لکھتے ہیں:

’’اثبات وانکار دونوں کے قائلین غلطی کرتے ہیں کیوں کہ حد کی نفی وثبوت کے متعلق کوئی نص وارد نہیں ہے، اور آدمی کے حسن اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ وہ لایعنی باتیں چھوڑ دے۔‘‘(۳)

اوپر جو لکھا گیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) حد کے بارہ میں ابن حبان کا موقف صحیح اور اسلامی عقائد کے مطابق تھا۔

(۲) ان کی غلطی اتنی ہے کہ انھوں نے ایک ایسے غیر ضروری اور لاطائل مسئلہ کو موضوع بحث بنایا جس میں سکوت افضل اور بہتر تھا لیکن اس کو عقیدہ کے بگاڑ اور دین میں فتور سے کوئی تعلق نہیں۔

مگر مزید غور وفکر سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن حبان نے بلاضرورت اس مسئلہ میں کلام نہیں کیا تھا، ذیل میں اس کی توضیح کی جاتی ہے:

---

(۱) حافظ ابن حجر نے اس کی تردید میں لکھا ہے کہ یہ بات قابل تسلیم نہیں ہے کیوں کہ اللہ کے وجود کے تحقق کے بعد اس کے لیے حد کی نفی اس کو معدوم اشیا کے برابر کردینا نہیں ہوسکتا (۲) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵۔

بلاشبہ یہ صحیح ہے کہ مسئلہ صفات میں غور وخوض نامناسب اور خلافِ احتیاط ہے لیکن یہ اس صورت میں جب خواہ مخواہ اور بلاضرورت غور وخوض اور بحث وکلام کیا جائے مگر ضرورۃً اور ناگزیر حالات میں خاموشی کے بجائے اظہار خیال ہی مناسب ہے، علامہ ابن حبان نے ضروری اور ناگزیر حالت ہی میں اس کے متعلق اظہار خیال فرمایا تھا، ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ بحث ونظر کا موضوع بنا ہوا تھا اور کچھ لوگ شد ومد کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے حد وحیز ثابت کررہے تھے، اس لیے انھوں نے اس مسئلہ میں اظہار خیال ضروری سمجھا اور وہ بات کہی جو عقائد صحیحہ کے مطابق تھی اس لیے انھوں نے کوئی خلافِ احتیاط کام نہیں کیا، خلق قرآن کے مسئلہ میں امام احمدؒ کے طرز عمل میں بھی اس کی مثال ملتی ہے، اس کے بارے میں علمائے حق کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ اس میں بحث وتفتیش فضول، سوال وتجسس بدعت اور خاموشی افضل واولیٰ ہے، چنانچہ امام بخاری سے جب اس کے متعلق استفسار کیا گیا تو انھوں نے یہیؔ جواب دیا اور خود امام احمد سے بھی جب لوگوں نے عام حالات میں اس کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے اس کو فضول اور لایعنی مشغلہ قرار دیا اور اس میں بحث اور کرید کرنے سے منع کیا۔(۱) مگر جب معتزلہ کے استیلا وتسلط اور خلفائے عباسیہ کے جبر وتشدد نے اس کو فتنہ کی شکل دیدی تو اس وقت خاموشی کے بجائے انھوں نے اظہار خیال کو ضروری سمجھا اور ابتلا وآزمائش کی پرواہ کئے بغیر بڑی جرأت وبے باکی سے یہ اعلان کیا کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے، وہ کسی طرح بھی مخلوق نہیں ہوسکتا، اس کے نتیجہ میں انھوں نے قید وبند کی صعوبتیں اور سخت قسم کی جسمانی سزائیں برداشت کیں، ابن حبان نے اس اسوہ پر عمل کیا۔

رہی دوسری روایت تو اس میں الحاد وزندقہ کا ضرور ذکر ہے مگر اس کی جو وجہ بیان کی گئی ہے اس سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں ہوتا، کفر وایمان کا معاملہ نہایت نازک ہے، محققین اور علمائے حق کا معمول رہا ہے کہ وہ اس میں ہمیشہ توقف وتامل سے کام لیتے ہیں

---

(۱) احمد بن حنبل والمحنہ ص ۴۳۔

اور پوری تحقیق کے بغیر الزام عائد نہیں کرتے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا توجیہ وتاویل سے کام لیتے تھے، محدثین اور نقادانِ فن نے ابن حبان کے بارہ میں بھی اس اصول کو مدنظر رکھا ہے، ان کی توجیہ وتاویل سے یہ الزام پوری طرح رفع ہو جاتا ہے، ذیل میں ان کے اقوال درج کیے جاتے ہیں۔

علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

''دوسرا اعتراض بھی درست نہیں ہے کیوں کہ اس کی عمدہ توجیہ ممکن ہے درحقیقت ابن حبان کی مراد مبتدا کو خبر میں محصور ومحدود کرنا نہیں ہے جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد (الحج عرفۃ، یعنی حج عرفہ ہے) کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حج کی ادائیگی کے لیے صرف عرفہ میں قیام کر لینا کافی ہے اور نہ تنہا عرفہ میں قیام سے حج کے تمام ارکان ومناسک ادا ہو جائیں گے، بلکہ آپ کا مقصد حج کے سب سے اہم، ضروری اور مقدم رکن کو بیان کرنا ہے، اسی طرح ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل یعنی نبوتِ علم وعمل ہے) کا منشا یہ ہے کہ نبوت کی اہم اور ضروری حقیقت علم وعمل میں نبی کا کمال وامتیاز ہے اور کوئی شخص ان میں درجۂ کمال کو پہنچے بغیر نبی نہیں ہوسکتا یہ صحیح ہے کہ نبوت وہ مخصوص موہبتِ الٰہی اور عطیہ ربانی ہے جس کے لیے اللہ اپنے علم وعمل والے بندے کا انتخاب کرتا ہے اس میں آدمی کے کسب اور حیلہ وتدبیر کا کوئی دخل نہیں ہوتا اور نہ وہ ریاضت اور محنت شاقہ سے حاصل کی جاسکتی ہے، اسی سے علم نافع اور عمل صالح کا سرچشمہ پھوٹتا ہے اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ابن حبان کے مذکورہ بالا قول میں کوئی خرابی اور قباحت نظر نہیں آئیگی، البتہ مطلق شکل میں ان سے جو کچھ منقول ہے وہ صحیح نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک فلسفیانہ رائے وخیال کی ہے۔''(۱)

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۵۔

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر دونوں نے یہ توجیہ بھی تحریر کی ہے:

''ابن حبان کے اس قول (النبوۃ العلم والعمل) کی ایک مناسب توجیہ یہ ہے کہ اگر ان کی مراد یہ ہو کہ نبوت کا دارومدار علم وعمل پر ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ نبوت ووحی سے اسی شخص کو سرفراز کرتا ہے جو ان دونوں اوصاف سے متصف ہو اور نبی وحی کی وجہ سے علم والا ہوتا ہے اور علم الٰہی عمل صالح کو مستلزم ہے تو اس اعتبار سے ان کا قول صحیح ہے کیوں کہ نبوت علم لدنی اور اعمال کا نام ہے جو قربت الٰہی کا ذریعہ ہیں، پس نبوت ان دونوں چیزوں کے بتمام وکمال پائے جانے کا نام ہے اور وحی الٰہی کے بغیر ان دونوں کا بدرجۂ کمال حصول نہیں ہوسکتا کیوں کہ وحی الٰہی ایسا یقینی علم ہے جس میں ظن وتخمین کو دخل نہیں ہوتا مگر غیر انبیا کا علم یقینی کم اور ظنی زیادہ ہوتا ہے، پھر نبوت عصمت کو مستلزم ہے اور انبیا کے علاوہ کسی شخص کے لیے عصمت نہیں خواہ وہ علم وعمل کے کتنے ہی اعلیٰ مدارج اور بلند مراتب کیوں نہ طے کرے، دوسری بات یہ ہے کہ جب کسی چیز کے بارے میں خبر دی جاتی ہے تو وہ اس کے ضروری مقاصد اور اہم اجزا کے لحاظ سے دی جاتی ہے جس طرح کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (الحج عرفۃ یعنی حج تو عرفہ ہے)

تاہم کسی کے لیے اس طرح کی بات مطلقاً اور بلا قرینہ کہنا درست نہیں ہے اور اگر ابن حبان کا مقصد حصر ہو یعنی نبوت صرف علم وعمل ہی کا نام ہے تو بلاشبہہ یہ زندقہ اور فلسفیانہ موشگافی ہوگی۔''(۱)

اس کے متعلق شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلویؒ کی تقریر بھی قابل ملاحظہ ہے وہ فرماتے ہیں:

''مگر انصاف کی بات یہ ہے کہ ابن حبان کا یہ قول (النبوۃ العلم والعمل)

(۱) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۳۹ ولسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۳ و ۱۱۴۔

عقائد صحیحہ کے چنداں خلاف نہیں، کیوں کہ ان کا مطلب یہ نہیں تھا کہ نبوت کوئی کسبی چیز ہے جو علم و عمل کی ریاضت سے حاصل ہو سکتی ہے جیسا کہ فلاسفہ کا مذہب ہے بلکہ ان کی غرض یہ ہے کہ نبوت کے لیے انسان میں اس نفس ناطقہ کا پایا جانا لازمی ہے جو علم و عمل میں نمایاں زیادتی رکھتا ہو، اس کے بعد ہی اس کو وہبی طور پر نبوت عطا کی جاتی ہے، قرآن مجید کی اس آیت میں اسی کی جانب اشارہ کیا گیا ہے:

اللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ۔ (انعام ۱۲۴) — اللہ خوب جانتا ہے کہ اپنی رسالت ونبوت سے کس کو سرفراز کرے۔

رہا یہ عقیدہ کہ انبیا علیہم السلام کو علمی و عملی استعداد میں دوسرے افراد پر برتری حاصل نہیں ہوتی بلکہ خدا تعالیٰ محض اپنے حکم و فیصلہ سے برابر برابر صلاحیت رکھنے والے لوگوں میں سے کسی ایک شخص کو زبردستی نبوت سے سرفراز کر دیتا ہے تو یہ بات ہرگز دین و شریعت سے ثابت نہیں ہے۔

یا ابن حبان کا منشا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انبیا علیہم السلام کو نبوت عطا کیے جانے کے بعد علم و عمل دونوں اعتبار سے فوقیت اور برتری حاصل ہو جاتی اس لیے وہ معصوم اور گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں تو یہ ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔"(۱)

ان توجیہات سے ثابت ہوتا ہے کہ ابن حبان کے قول (النبوۃ العلم والعمل) میں بھی الزام و اعتراض اور الحاد و بدعقیدگی کی کوئی بات نہیں، زیادہ سے زیادہ اس کو سوئے تعبیر کہا جا سکتا ہے، البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے بڑے محدث اور ایسی جلیل القدر شخصیت پر محض سوئے تعبیر کی وجہ سے اتنا بڑا اور ناروا الزام کیوں عائد کیا گیا ہے؟ اس کے مختلف اسباب معلوم ہوتے ہیں۔

---

(۱) بستان المحدثین ص ۴۰۔

۱- ایک سبب یہ ہے کہ ابن حبان علم وفن میں نہایت ممتاز اور بڑے ذہین وطباع شخص تھے، ان کے غیر معمولی کمالات نے بعض لوگوں میں ان کو محسود بنا دیا تھا اور وہ ان کو مطعون ومتہم کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کے اس قول نے ان کے لیے اس کا موقع فراہم کر دیا اور انھوں نے ان کی تعبیری غلطی سے فائدہ اٹھا کر اور اس کو سیاق وسباق سے جدا کر کے اسے ان کا الحاد وزندقہ قرار دیا حاکم فرماتے ہیں:

''ابو حاتم نہایت عالی مرتبہ تھے، اس بنا پر ان سے حسد کیا جاتا تھا۔''(۱)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

''بجز عناد وتعصب کے ان پر اس الزام کے عائد کرنے کی اور کوئی وجہ نہیں ہو سکتی وہ یگانہ روزگار اور غیر معمولی ذہین وطباع تھے ان کا حافظہ بے مثال تھا۔''(۲)

۲- دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ فلسفہ وکلام کے ماہر اور فلسفیانہ ومتکلمانہ مذاق رکھتے تھے اور فلسفہ وکلام میں انہماک بعض لوگوں کے عقائد وخیالات میں فساد پیدا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر متقشف علما کو ابن حبان سے بدگمانی ہوگئی اور وہ ان پر طعن وتشنیع کرنے لگے، علامہ سیوطی کا بیان ہے کہ ''وہ فلسفہ وکلام وغیرہ کے بڑے واقف کار تھے، اس لیے ان پر الحاد وزندقہ کا الزام لگایا جاتا ہے'' حالانکہ فلسفہ وکلام سے فسادِ عقیدہ ضروری نہیں ہے، ایسے بہت سے علما ہیں جو ان فنون سے غیر معمولی اشتغال رکھنے کے باوجود دینی حیثیت سے نہایت ممتاز اور بلند تھے، فلسفہ وکلام میں انہماک نے ان کے عقائد میں کوئی خرابی نہیں پیدا کی، اس لیے ابن حبان کے فلسفہ وکلام کی دلچسپی کو بھی ایمان وعقیدہ کے فساد اور بگاڑ کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا تا آنکہ اس کا پورا ثبوت موجود نہ ہو۔

۳- ابن حبان پر اتہام والزام کی روایت کرنے والے ابو اسماعیل انصاری

---

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۵ (۲) ایضاً ص ۱۱۴۔

ہروی جلیل القدر صوفی اور عارف باللہ تھے، صوفیہ کا ان مسائل میں تشدد مشہور ہے اس لیے وہ ابن حبان سے ان کے فلسفہ وکلام میں اشتغال کی بنا پر خوش نہ رہے ہوں گے، اس فروگذاشت نے ان کا رویہ اور سخت بنا دیا ہوگا اور انھوں نے ان پر الحاد وزندقہ کا الزام لگا دیا اس لیے یہ الزام درحقیقت ان کے غایتِ تورع اور تصوف میں غلو کا نتیجہ ہے جو حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔

وفات: ابن حبان نے جمعہ کا دن گذار کر ۲۴ رشوال ۳۵۴ھ کی شب میں اپنے وطن بست میں انتقال کیا، انھوں نے اپنے مکان کے قریب ایک چبوترہ بنایا تھا، اسی میں دفن کیے گئے۔(۱)

تصنیفات: امام ابن حبان ان علمائے اسلام میں تھے جن سے بیشمار کتابیں یادگار ہیں، ان کی تصنیفات کیفیت وکمیت دونوں اعتبار سے اہم اور علمائے فن اور محدثین کا عمدہ ماخذ ومرجع ہیں، سمعانی اور حاکم کا بیان ہے کہ ''ابن حبان نے فن حدیث وغیرہ میں بیش قیمت اور عدیم الامثال کتابیں لکھی تھیں''(۲) مگر افسوس کہ چند کے علاوہ اکثر تصنیفات اب ناپید ہیں، خطیب نے ان کی بربادی کا ماتم کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''یہ عظیم الشان کتابیں اس لائق تھیں کہ ان کی زیادہ سے زیادہ نقل واشاعت ہوتی، اہل علم ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، ان کی نقل وکتابت کرتے اور جلدوں میں باندھ کر محفوظ کر دیتے لیکن افسوس کہ امام صاحب کے اہل وطن ان کے مرتبۂ فضل وکمال سے ناآشنا تھے اور وہ اپنی بے بصیرتی کی وجہ سے ان کی اہم اور بلند پایہ تصنیفات کی اشاعت سے غافل رہے۔''(۳)

جن کتابوں کا علم ہوسکا ہے ان کی فہرست اور بعض کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

---

(۱) لسان المیزان ج ۵ ص ۱۱۴ وطبقات الشافعیہ الکبری ج ۲ ص ۱۴۱ (۲) کتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱ و ۱۷۴ (۳) مقدمہ موارد الظمآن۔

۱- کتاب الصحابہ (۵ جز) ۲- کتاب التابعین (۱۲ جز) ۳- کتاب اتباع التابعین (۱۵ جز) ۴- کتاب تبع الاتباع (۷ جز) ۵- کتاب تباع التبع (۲۰ جز) ۶- کتاب الفصل بین النقلیۃ (۱۰ جز) ۷- کتاب علل اوہام الزہری (۲۰ جز) ۸- کتاب علل حدیث مالک (۱۰ جز) ۹- کتاب علل اوہام اصحاب التواریخ (۱۰ جز) ۱۰- کتاب علل مناقب ابی حنیفہ ومثالبہ (۱۰ جز) ۱۱- کتاب علل مااستند الیہ ابوحنیفہ (۱۰ جز) ۱۲- کتاب ماخالف الثوری شعبۃ (۳ جز) ۱۳- کتاب ماانفرد بہ اہل المدینہ من السنن (۱۰ جز) ۱۴- کتاب ماانفرد بہ اہل مکۃ من السنن (۱۰ جز) ۱۵- کتاب ماعند شعبۃ عن قتادہ ولیس عند سعید عن قتادہ (۲۰ جز) ۱۶- کتاب غرائب الاخبار (۲۰ جز) ۱۷- کتاب مااغرب الکوفیون عن البصریین (۱۰ جز) ۱۸- کتاب مااغرب البصریون عن الکوفیین (۱۰) ۱۹- کتاب اسامی من یعرف بالکنی (۳ جز) ۲۰- کتاب کنی من یعرف بالاسامی (۳ جز) ۲۱- کتاب الفصل والوصل (۱۰ جز) ۲۲- کتاب التمیز بین حدیث النصر الحدانی والنصر الخزار (۲ جز) ۲۳- کتاب الفصل بین حدیث اشعث بن مالک واشعث بن سوار (۲ جز) ۲۴- کتاب الفصل بین حدیث منصور بن معتمر ومنصور بن زاذان (۳ جز) ۲۵- کتاب الفصل بین مکحول الشامی والازدی (ایک جز) ۲۶- کتاب موقوف مارفع (۱۰ جز) ۲۷- کتاب آداب الرحلۃ (۲ جز) ۲۸- کتاب مااسند جنادہ عن عبادۃ (ایک جز) ۲۹- کتاب الفصل بین حدیث ثور بن یزید وثور بن زید (ایک جز) ۳۰- کتاب ماجعل عبداللہ بن عمر عبیداللہ بن عمر (۲ جز) ۳۱- کتاب ماجعل شیبان سفیان وسفیان شیبان (۳ جز) ۳۲- کتاب مناقب مالک بن انس (۲ جز) ۳۳- کتاب مناقب الشافعی (۲ جز) ۳۴- کتاب المعجم علی المدن (۱۰ جز) ۳۵- کتاب المقلین من الحجازیین (۱۰ جز) ۳۶- کتاب المقلین من العراقیین (۲۰ جز) ۳۷- کتاب الابواب المفرقہ (۳۰ جز) ۳۸- کتاب الجمع بین الاخبار المتضادۃ (۲ جز) ۳۹- کتاب وصف العدل والمعدل (۲ جز) ۴۰- کتاب الفصل بین حدثنا واخبرنا

(ایک جز) ۴۱- کتاب وصف العلوم وانواعہا (۳۰ جز) ۴۲- کتاب الحجۃ المبتدئین ۴۳- کتاب حفظ اللسان ۴۴- کتاب مراعات العشرۃ ۴۵- کتاب الثقۃ باللہ ۴۶- کتاب التوکل ۴۷- کتاب مراعاۃ الاخوان ۴۸- الفصل بین الغنی والفقر ۴۹- کتاب السخا والبذل ۵۰- کتاب صفۃ الصلوٰۃ (۱) ۵۱- کتاب شعب الایمان۔ اس موضوع پر امام بیہقی (۴۵۸ھ) کی کتاب زیادہ مشہور ومتداول ہے لیکن ابن حبان کو اولیت اور تقدم کا شرف حاصل ہے۔(۲) ۵۲- روضۃ العقلاء ونزہۃ الفضلاء، اسلام اور عربوں کے اخلاق وآداب پر یہ عمدہ کتاب ہے اس کا ایک حصہ قاہرہ سے ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوا تھا، اس میں مصنف نے اپنی متعدد کتابوں کا ذکر اور حوالہ دیا ہے۔(۳) ۵۳- کتاب التاریخ یہ ضخیم کتاب کئی حصوں میں ہے، اس کا پہلا حصہ مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی کے کتب خانہ میں موجود تھا اس حصہ میں ام ورقہ تک کے واقعات درج ہیں یہ حصہ ۱۲۹۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔(۴)

۵۴- کتاب الہدایۃ الی علم السنن، یہ حدیث وفقہ دونوں کی جامع اور عمدہ تصنیف ہے، اس میں ترجمۃ الباب کے بعد حدیث نقل کرکے اس کے اسناد کے تمام ناموں (صحابہ سے لے کر اپنے شیخ تک) کے عام حالات، فضل وکمال، نسبتوں، کنیتوں، قبائل، اوطان اور سنینِ ولادت ووفات وغیرہ تحریر کیے گئے ہیں، پھر حدیث کی حکیمانہ اور فقہی تشریح کی گئی ہے متضاد ومتعارض حدیثوں میں جمع وتطبیق کی صورتیں اور روایات میں کمی بیشی اور فرق واختلاف کی صراحت بھی کی گئی ہے۔(۵)

۵۵- کتاب الجرح والتعدیل: اس کا نسخہ کتب خانہ ایاصوفیا میں ہے، بعض لوگوں نے اس کو اور کتاب الضعفاء کو جس کا ذکر آگے آرہا ہے، ایک ہی کتاب قرار دیا ہے، اس میں رواۃ کے درجہ ومرتبہ کو واضح کرنے کے لیے وہ تمام اقوال درج کیے گئے ہیں جو ان

(۱) مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۵ تا ۱۸ واعلام ج ۳ ص ۸۸۰ (۲) ایضاً ص ۱۵ (۳) ایضاً ص ۱۷ (۴) ایضاً ومعارف اکتوبر ۱۹۲۹ء (۵) معجم البلدان ج ۲ ص ۱۷۵۔

کے ضعف وجرح یا ضبط وعدل کے بارہ میں اصحابِ فن سے منقول ہیں، اس کو کتاب الثقات کا تکملہ بھی بتایا جاتا ہے، عبدالعزیز خولی کا بیان ہے کہ یہ دس جلدوں میں ہے، حافظ ابن حجر کی نظر سے یہ کتاب گذری تھی، لسان المیزان کے مقدمہ میں انھوں نے اس پر نقد بھی کیا ہے۔(۱)

۵۶- کتاب الثقات: یہ رجال کی مبسوط، اہم اور شہرۂ آفاق کتاب ہے، اس کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ اس کے بعد رجال میں جو کتابیں لکھی گئیں ان سب میں اس کے حوالے ملتے ہیں، اس کی ابتدا میں سنت واتباع سنت کی اہمیت بیان کی گئی ہے اور مقدمہ میں حدیث کے راویوں کی بتیس ۳۲ قسمیں گنائی گئی ہیں،(۲) اس میں پہلے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کا تذکرہ ہے اس کے بعد عام صحابہ، تابعین وتبع تابعین سے لے کر اپنے عہد تک کے علمائے حدیث وروایت کا حروف کی ترتیب کے مطابق ذکر کیا گیا ہے، مصنف نے اس میں صرف ثقات کا ذکر کیا ہے، مگر ان کے نزدیک اس میں قدرے وسعت ہے یعنی جو راوی منکر الحدیث، مجروح اور مدلس نہیں ہے، وہ ثقہ ہے وہ خود فرماتے ہیں:

> ''اس میں صرف انہی ثقات کا ذکر ہے جن کی روایتوں سے احتجاج جائز ہے، جن راویوں کی بعض لوگوں نے تضعیف کی ہے وہ بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں بشرطے کہ وہ میرے معیار کے مطابق ثقہ ہوئے، میں نے اپنے اصول اور معیار کو کتاب الفصل بین النقلیہ میں تحریر کیا ہے جو لوگ اس معیار واصول کے مطابق ضعیف ہیں یا جن کی روایت سے استدلال روا نہیں ہے، میں نے ان کو اس میں شامل نہیں کیا ہے، ان لوگوں کا کتاب الضعفا میں ذکر ہوگا۔''(۳)

کتاب الثقات کے قلمی نسخے حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ اور سعیدیہ اور مکتبہ

---

(۱) مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۵ ومفتاح السنہ ص ۱۵۲ ومقدمہ لسان المیزان ص ۶ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۳۷۷ وبستان المحدثین ص ۴۰ (۳) فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ص ۸۱ وتذکرۃ النوادر ص ۹۱۔

ایا صوفیہ اور مکتبہ سندیہ میں موجود ہیں۔(۱)

۵۷- کتاب الضعفاء: یہ بھی رجال کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے اور اس کو حروف معجم پر مرتب کیا گیا ہے، صاحب شرح الفیہ لکھتے ہیں کہ اس کے مبسوط مقدمہ میں حدیث کے راویوں کی بیس قسمیں بیان کی گئی ہیں، بعض لوگوں نے اس کو اور کتاب الثقات کو مصنف کی تاریخ کبیر کا خلاصہ بتایا ہے جو طلبہ اور معلمین کی سہولت کے لیے انھوں نے خود علاحدہ تیار کیا تھا۔

کتاب الضعفاء کا مختصر، کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں مختصر اسماء المجروحین کے نام سے موجود ہے۔(۲)

۵۸- صحیح ابن حبان: اس کا نام التقاسیم والانواع بھی ہے، یہ پانچ جلدوں میں ہے، اس کو حدیث کی مشہور اور اہم کتاب خیال کیا جاتا ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ نے حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں اس کا بھی نام لیا ہے۔(۳) اس کی بعض اہم خصوصیات حسب ذیل ہیں:

(۱) صحیح ابن حبان کی سب سے اہم خصوصیت اس کی صحت ہے، صحیح میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابن خزیمہ کی کتاب کے بعد اسی کا درجہ ہے، بعض محدثین نے اس کو سنن ابن ماجہ سے زیادہ صحیح رواتیوں کا مجموعہ بتایا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ صحیحین کے بعد بہتر اور عمدہ مجموعے ابن خزیمہ اور ابن حبان کے ہیں۔

(۲) اس کو نہایت دلچسپ انداز اور نرالے ڈھنگ پر مرتب کیا گیا ہے یعنی فقہی ابواب اور مسانید پر احادیث مرتب کرنے کے مشہور اور مروج طریقوں کے بجائے اس کو اقسام وانواع پر مرتب کیا گیا ہے۔

---

(۱) تذکرۃ النوادر ص ۹۱ (۲) ایضاً و کشف الظنون ج ۲ ص ۸۴ و فہرست کتب خانہ آصفیہ ج ۱ ص ۷۸۸ و ۷۸۹ (۳) حجۃ اللہ البالغۃ ج ۱۔

(۳) ہر حدیث کے آخر میں رجال واسناد کی تحقیق، حدیث کے مفہوم کی تعیین ووضاحت اور اسناد ومتون کی فنی بحثیں اور دوسرے مفید ولطیف معلومات بیان کیے گئے ہیں۔

(۴) کتاب کے عنوانات سے ابن حبان کی فقہی بصیرت، عالمانہ ژرف نگاہی اور سنت واثر سے مکمل واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔(۱)

مختصرات وزوائد: صحیح ابن حبان کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کی جانب اعتنا کیا گیا اور اس کے زوائد، اطراف، حواشی اور مختصرات ترتیب دیے گئے۔

۱- انواع واقسام پر مرتب کیے جانے کی وجہ سے اس سے استفادہ مشکل اور دشوار تھا اس لیے امیر علاء الدین ابوالحسن علی فارسی (م ۷۳۷ھ) نے اس کو فقہی ابواب پر ''الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان'' کے نام سے مرتب کیا، اس میں اصل کی تمام خصوصیات کو برقرار رکھا گیا ہے اس کی پہلی جلد احمد محمد شاکر مرحوم کی تصحیح، تعلیقات اور مقدمہ کے ساتھ دارالمعارف قاہرہ سے بڑے اہتمام کے ساتھ دیدہ زیب ٹائپ اور عمدہ کاغذ پر ۳۱۵ صفحے میں شائع ہوئی ہے۔(۲)

۲- حافظ ابن حجر نے اس پر مفید حواشی لکھے تھے۔(۳)

۳- ابوالفضل عراقی نے اس کے اطراف لکھے۔

۴- سراج الدین عمر بن علی معروف بابن ملقن (۸۰۴ھ) نے اس کو مختصر ابواب پر مرتب کیا۔

۵- ابوالحسن نورالدین ہیثمی نے موارد الظمآن الی زوائد ابن حبان کے نام سے

---

(۱) اعلام ج ۳ ص ۸۸۰، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۶، الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۹ ومقدمہ موارد الظمآن ص ۱۳ و ۱۴ (۲) مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۴ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی، از مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری ص ۱۶۳۔

اس کے زوائد لکھے، اس میں ان حدیثوں کو جمع کیا گیا ہے جو صحیحین میں نہیں ہیں اس کا نسخہ مدینہ کے کتب خانہ میں تھا، اس کی مدد سے دارالحدیث مکہ کے مدیر شیخ محمد عبدالرزاق حمزہ نے اس کو ایڈٹ کر کے مطبعہ سلفیہ سے شائع کیا ہے، اس کی ترتیب فقہی ابواب پر ہے، ہیثمی نے صحیحین کی بعض روایتوں سے اس کی عدم مطابقت وفرق اور حواشی میں حدیث کی بعض اور کتابوں سے اس کی روایتوں کی مطابقت دکھائی ہے اور کہیں کہیں راویوں کے ناموں کی تصحیح کی ہے۔

صحیح ابن حبان کے نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں اس کی ایک جلد مدینہ منورہ کے کتب خانہ محمودیہ میں بھی ہے، اس پر حافظ ابن حجر کے حواشی بھی ہیں۔(۱)

ایک شبہ کا جواب: اوپر جرح میں ابن حبان کے تشدد اور تعدیل میں نرمی کا ذکر کیا جا چکا ہے اسی بنا پر ان پر تساہل کا الزام عائد کیا گیا ہے، مگر یہ مطلق صورت میں قابل تسلیم نہیں ہے، اس لیے اس کا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس شبہ اور الزام کی بنیاد ممتاز محدث علامہ نووی کے اس قول پر ہے:

یقارب صحیح الحاکم فی حکمه صحیح ابی حاتم بن حبان.(۲)	قریب قریب صحیح حاکم ہی کے حکم میں ابو حاتم ابن حبان کی صحیح بھی ہے۔

عام محدثین کے نزدیک حاکم کا تساہل مشہور ہے اس لیے نووی کے اس بیان سے خیال ہوتا ہے کہ ابن حبان کے یہاں بھی اسی قسم کا تساہل پایا جاتا ہے جس کے لیے حاکم کو شہرت ہے لیکن ارباب فن نے اس قول کی وضاحت میں جو کچھ لکھا ہے اس سے اس شبہہ کی تردید ہو جاتی ہے علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

''اس بیان سے بظاہر حاکم کی کتاب کی ترجیح معلوم ہوتی ہے مگر ایسا

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص۱۲۳ (۲) تدریب الراوی ص۳۱و۳۲۔

واقعۃً نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد حاکم کے تساہل میں ابن حبان کی قربت ومماثلت کا اظہار ہے ابن حبان کی جانب اس کی نسبت اس لیے صحیح نہیں ہے کہ وہ صرف حسن کو صحیح سے موسوم کر دیتے ہیں باقی جن شرطوں کو انھوں نے بیان کیا ہے ان کا پوری طرح لحاظ رکھا ہے اور حاکم کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔"(۱)

حافظ ابن حجر رقمطراز ہیں:

''حاکم کے مقابلہ میں ان کا تساہل کم درجے کا ہے۔''

حازمی کا بیان ہے کہ:

''حاکم سے زیادہ ان کو حدیثوں میں درخور حاصل ہے، اگر ان کی جانب تساہل کی نسبت اس وجہ سے کی گئی ہے کہ ان کی کتاب میں حسن روایتیں موجود ہیں تو یہ بجا ہے کیوں کہ انھوں نے اس کو صحیح کے نام سے موسوم کیا ہے لیکن اگر اس سے شرطوں میں تخفیف وتساہل کی جانب اشارہ مقصود ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنی صحیح میں انھیں ثقات اور غیر مدلس اشخاص کی حدیثیں بیان کرتے ہیں جنھوں نے اپنے شیوخ سے ان کو اور ان سے روایت کرنے والوں نے ان سے ان کا سماع کیا ہو اور ان میں کسی قسم کا ارسال وانقطاع نہ ہو حقیقت یہ ہے کہ رواۃ کی ثقاہت کے متعلق ان کا ایک خاص نظریہ ہے، اسی کے مطابق کتاب الثقات مرتب کی گئی ہے لیکن اس اصول سے ناواقفیت کی بنا پر ان پر اعتراض کیا جاتا ہے۔''(۲)

---

(۱) تدریب الراوی ص ۱۳۱، ۱۳۲ (۲) مقدمہ موارد الظمآن ص ۱۴۔

امام ابوبکر آجری

(متوفی ۳۶۰ھ مطابق ۹۷۰ء)

نام ونسب: محمد نام، ابوبکر کنیت اور سلسلۂ نسب یہ ہے: محمد بن حسین بن عبداللہ۔(۱)

ولادت ووطن: وہ بغداد میں پیدا ہوئے، سنہ پیدائش کا مورخین نے ذکر نہیں کیا ہے، آجری کی نسبت سے زیادہ مشہور ہیں، انساب کے ماہر علامہ سمعانی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیشہ کی جانب نسبت ہے، یعنی وہ اینٹیں بناتے اوران کو فروخت کرتے تھے۔(۲) لیکن علامہ ابن خلکان نے اس نسبت کے سبب سے لاعلمی ظاہر کی ہے اور کتاب الصلہ کے حاشیہ کے حوالہ سے یہ تحریر فرمایا ہے کہ آجر بغداد کے ایک گاؤں کا نام تھا اور یہ اسی کی جانب نسبت ہے۔(۳)

آخر عمر میں مکہ معظمہ میں آباد ہو گئے تھے اور ۳۰ سال تک جوار بیت اللہ میں رہ کر حج بیت اللہ کو آنے والوں اور بلاد مغرب کے لوگوں کی تشنگی علم بجھاتے رہے، ابن خلکان اور ابن جوزی وغیرہ نے لکھا ہے کہ آجری جب مکہ معظمہ تشریف لائے تو یہ شہر انھیں بہت پسند آیا اور انھوں نے اللہ تعالیٰ سے اس میں ایک سال تک قیام کرنے کی دعا کی، ہاتف غیب نے صدا دی کہ ابوبکر ایک ہی سال کی تمنا کیوں کرتے ہو تم کو تیس سال تک یہاں قیام کرنے کا

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۸ (۲) کتاب الانساب ورق ۱۴ (۳) وفیات الاعیان ج ۳ ص ۲۹۱۔

موقع ملے گا، چنانچہ ان کی حیات مستعار کے بقیہ دن یہیں گزرے اور ۳۰ سال کے بعد جب داعی اجل کا پیام آیا تو وہ اسی کی خاک میں پیوند کیے گئے۔(۱)

اساتذہ وشیوخ: ابوبکر آجری کے بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہے:

ابوشعیب حرانی، ابومسلم ابراہیم بن عبداللہ کجی، احمد بن حسن بن عبدالجبار صوفی، احمد بن عمر بن زنجویہ قطان، احمد بن یحییٰ حلوانی، جعفر بن محمد فریادی، خلف بن عمرو عکبری، قاسم بن زکریا مطرز، مفضل بن محمد جندی، ہارون بن یوسف بن زیاد۔(۲)

تلامذہ: بعض مشہور شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں:

حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ اصبہانی، عبدالرحمٰن بن عمر بن نحاس، ابوالحسن علی بن محمد عبداللہ بشران سکری، ابوالحسن علی بن احمد بن عمر حمامی مقری، (ان کے بھائی) ابوالقاسم عبدالملک محمد بن حسین بن فضل قطان، محمود بن عمرو عکبری۔(۳)

حفظ وضبط اور حدیث میں درجہ: مورخین اور علمائے فن نے بالاتفاق ان کی توثیق کی ہے اور حدیث میں ان کے کمال کا اعتراف کیا ہے، حافظ ذہبی ان کو ''الامام المحدث القدوہ'' لکھتے ہیں، علامہ ابن اثیر کا بیان ہے کہ ''طبرانی اور آجری کبارِ محدثین وحفاظ میں تھے'' خطیب، ابن جوزی اور ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ''وہ ثقہ تھے'' علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ''آجری ثقہ وصدوق تھے'' حافظ ذہبی اور ابن عماد کہتے ہیں کہ وہ ثقہ وضابط محدث اور صاحب سنت تھے۔''(۴)

فقہ: فقہ واجتہاد میں بھی آجری کا درجہ بلند تھا اور وہ الفقیہ کے لقب سے موسوم کیے جاتے تھے، اس فن میں کئی کتابیں بھی ان سے یادگار ہیں۔

تدین وتقویٰ: علم وفضل کی طرح زہد وتقویٰ بھی ان کا شعار تھا، ابن ندیم کا بیان ہے کہ ''وہ

(۱) وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۹۱ وصفۃ الصفوہ ج ۲ ص ۲۶۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۴۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۴۸ (۳) ایضاً وکامل ابن الاثیر ص ۲۰۴ (۴) العبر ج ۲ ص ۲۱۸۔

صلحائے عباد میں تھے۔'' حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ'' وہ عالم باعمل، صاحب سنت اور متبع شریعت تھے۔'' مورخ خطیب اور علامہ سمعانی وغیرہ نے بھی ان کے صلاح وتدین کا اعتراف کیا ہے۔(۱)

فقہی مسلک: گوان کے شافعی المذہب ہونے پر اتفاق ہے چنانچہ ابن ندیم لکھتے ہیں وکان علی مذهب الشافعي (وہ امام شافعی کے مسلک فقہ سے وابستہ تھے) لیکن ابن عماد حنبلی کا بیان ہے کہ:

کان حنبليا وقيل شافعيا	آجری حنبلی تھے مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ
وبه جزم الاسنوی وابن	وہ شافعی تھے اور اسنوی وابن اہدل نے
الاهدل۔ (۲)	اسی کو قطعی بتایا ہے۔

وفات: یکم محرم الحرام ۳۶۰ھ کو مکہ معظمہ میں وفات ہوئی اور یہیں سپرد خاک کئے گئے۔(۳)

تصنیفات: امام ابوبکر آجری کثیر التصانیف تھے، فقہ، حدیث اور زہد ورقاق وغیرہ میں انھوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں مگر اب وہ سب نایاب اور معدوم ہیں جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے وہ یہ ہیں:

۱-کتاب احکام النساء، ۲-کتاب مختصر الفقہ، ۳-کتاب النصیحۃ: یہ تینوں کتابیں فقہ میں ہیں، ابن ندیم نے ان کا ذکر کیا ہے، ۴-کتاب الشریعۃ: یہ سنت وحدیث میں تھی، حاجی خلیفہ نے اس کا نام لکھا ہے۔

۵-کتاب الاربعین: یہ امام صاحب کی سب سے مشہور تصنیف ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب کتب حدیث کے طبقات واقسام بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

(۱) الفہرست ص ۳۰۱ و ۳۰۲، تذکرۃ ج ۳ ص ۱۴۸ انساب ورق ۱۴۔ (۲) الفہرست ص ۳۰۲ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۳۵ (۳) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۹۱ وتاریخ بغداد ج ۲ ص ۲۴۳۔

''اربعینیات میں چالیس حدیثیں ایک باب یا مختلف ابواب میں ایک سند یا متعدد سندوں سے جمع کی جاتی ہیں، اربعینیات بیشمار ہیں۔''(۴)

حاجی خلیفہ لکھتے ہیں کہ ''اربعینیات کی جمع وتالیف کے اغراض ومقاصد مختلف ہیں چنانچہ بعض میں توحید واثباتِ صفات، بعض میں احکام وعبادات، بعض میں مواعظ ورقاق اور بعض میں فضائل ومناقب کے متعلق روایتیں درج ہوتی ہیں، اربعینیات کے بعض مجموعے صحیح الاسناد اور طعن وقدح سے خالی اور بعض نہایت عالی سندوں اور طویل متن والی حدیثوں پر مشتمل ہیں۔''(۱)

ابن سبکی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ آجری کی اربعین کی سندیں عالی اور بلند تھیں، حاجی خلیفہ اور دوسرے اصحابِ فہارس نے اس موضوع کی اکثر کتابوں کے نام لکھے ہیں، اس فہرست سے ظاہر ہوتا ہے کہ اربعینیات میں سب سے قدیم مجموعہ یہی ہے (۲) گو اس کو نووی وغیرہ کی اربعین جیسی شہرت نہیں ملی تاہم قدامت اور اسناد کی قوت کے اعتبار سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔

(۴) بستان المحدثین۔ (۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۶۷ واتحاف النبلاء المتقین ص ۷ (۲) ایضاً وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۵۰۔

امام ابوالقاسم طبرانی

(متوفی ۳۶۰ھ)

نام ونسب: سلیمان نام، ابوالقاسم کنیت اور سلسلہ نسب یہ ہے: سلیمان بن احمد بن ایوب بن مطیر۔

ولادت: امام ابوالقاسم ماہ صفر ۲۶۰ھ میں پیدا ہوئے۔(۱)

خاندان: ان کا قبیلہ لخم سے نسبی تعلق تھا، اس لیے لخمی کہلاتے تھے، لخم دراصل یمن کا ایک قبیلہ ہے، اس کی ایک شاخ شام میں آباد ہوگئی تھی، اس قبیلہ سے متعدد نامور لوگ منسوب ہیں، امام صاحب کے والدِ بزرگوار کو علم وفن سے بڑی دلچسپی تھی، اس لیے وہ اپنے فرزند کو بھی علم کی تحصیل وتکمیل کی تلقین کرتے رہتے تھے۔

وطن: ان کا اصلی وطن طبریہ ہے مگر آخر عمر میں انھوں نے اصبہان میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، طبریہ اردن کے قریب واقع ہے ۱۳ھ میں شرحبیل بن حسنہ نے اس کو اسلامی سلطنت کے زیرنگیں کیا تھا، اس کی نسبت سے وہ طبرانی کہلاتے ہیں، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ وہ عکا میں پیدا ہوئے یہاں سے طبریہ کی مسافت دوروز میں طے ہوتی تھی۔(۲)

اساتذہ: امام طبرانی نے ایک ہزار سے زیادہ باکمال محدثین سے استفادہ کیا تھا، بعض مشہور اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن ابی سفیان قیسرانی، ابراہیم بن محمد بن عرق حمصی، ابراہیم بن موید

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۹۵ و ۳۶۶، ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۳، کتاب المنتظم ج ۷ ص ۵۴ و معجم البلدان ج ۶ ص ۲۳ تا ۲۵۔

شیبانی، ابوزرعہ دمشقی، ابوعبدالرحمٰن نسائی، ابومسلم کجی، احمد بن انس، احمد بن عبدالرحیم حوطی، احمد بن عبدالقاہر، احمد بن معلیٰ، احمد بن یحییٰ، ادریس بن جعفر عطاء، اسحاق بن ابراہیم دبری، ابوعلی اسماعیل بن محمد بن قیراط، بشر بن موسیٰ، حسن بن سہل، حسن بن عبدالاعلیٰ بوسی، حفص بن عمر، عبداللہ بن محمد بن سعید بن ابی مریم، علی بن عبدالعزیز بغوی، ابوخلیفہ فضل بن حباب جمحی ابوسعید بن ہاشم بن مرثد طبرانی اور یحییٰ بن ایوب علاف وغیرہ۔(۱)

تلامذہ: ان کے تلامذہ و منتسبین کی تعداد بھی بے شمار ہے اور ان سے استفادہ کرنے والوں میں ان کے بعض شیوخ بھی شامل ہیں، بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابن عقدہ، ابوبکر بن زبدہ، ابوبکر بن مردویہ، ابواحمد بن عبداللہ بن عدی جرجانی، ابوالحسن بن قادیہ، ابوعمر محمد بن حسین بسطامی، حافظ ابونعیم احمد بن عبداللہ، احمد بن محمد صحاف، حسین بن احمد بن مرزبان، عبدالرحمٰن بن احمد صفا، ابوبکر عبدالرحمٰن بن علی ذکوانی، ابوالفضل محمد بن احمد جارودی، ابوعمر محمد بن حسین بسطامی، محمد بن عبیداللہ بن شہریار۔

امام طبرانی کے حلقہ فیض سے دو صاحب کمال وزرا بھی وابستہ تھے، ان میں ابن عمید لغت و عربیت اور شعر و ادب میں سرآمد روزگار تھا، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ دیلمی حکومت میں اس لیاقت و قابلیت کا کوئی اور وزیر نہیں گذرا اور دوسرا وزیر صاحب بن عباد بھی ممتاز ادیب و انشاپرداز اور امام طبرانی کا شاگرد اور تربیت یافتہ تھا۔(۲)

تحصیل علم کے لیے سفر: امام طبرانی ۲۷۳ھ میں علم و فن کی تحصیل میں مشغول ہوئے تھے، اس وقت ان کی عمر تیرہ سال تھی، پہلے انھوں نے اپنے وطن طبریہ کے اصحابِ کمال سے استفادہ کیا، ۲۷۴ھ میں قدس اور ۲۷۵ھ میں قیساریہ تشریف لے گئے، اس کے بعد انھوں نے دوسرے اسلامی ملکوں اہم مقامات اور مشہور مراکز حدیث کا رخ کیا اور حمص، جبلہ،

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ وغیرہ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۷ و بستان المحدثین ص ۵۵ و کتاب الانساب ورق ۳۶۶۔

مدائن، شام، مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، یمن، مصر بغداد، کوفہ، بصرہ، جزیرہ، فارس اور اصبہان وغیرہ تشریف لے گئے، اصبہان کی مرکزیت کی وجہ سے یہیں بود و باش بھی اختیار کرلی تھی، علم کی تلاش و جستجو اور احادیث کی تحصیل میں ان کو سخت مشکلات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن ان کے ذوق و شوق اور سرگرمی وانہماک میں کبھی کمی نہیں آئی شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں:

> ''۳۰ سال تک ان کو بستر پر سونا نصیب نہ ہوا مگر وہ آرام و آسائش کا خیال کئے بغیر حدیث کی تحصیل میں مشغول اور بوریا پر سوتے رہے۔''(۱)

حفظ وثقاہت: حفظ وضبط اور ثقاہت واتقان میں ان کا مرتبہ بلند تھا، ان کے معاصرین فضلا اور ارباب کمال محدثین نے ان کے حافظہ اور ثقاہت کا اعتراف کیا ہے، علمائے سیر وتراجم نے ان کو الحافظ الکبیر، احد الحفاظ، الحافظ العلم، واسع الحفظ، الحجة اور من الثقات الاثبات المعدلین وغیرہ لکھا ہے، ابراہیم بن محمد بن حمزہ کا بیان ہے کہ ''میں نے ان سے بڑا کوئی حافظ نہیں دیکھا۔'' ابن خلکان لکھتے کہ ''وہ اپنے عہد کے ممتاز حافظ تھے'' علامہ ابن جوزی رقمطراز ہیں کہ ''امام سلیمان کا حافظہ نہایت قوی تھا، صاحب بن عباد ان کے حافظہ کی قوت اور یادداشت کی زیادتی کے معترف تھے۔'' ان کے صدق وثقاہت کے بارے میں بھی علمائے فن کا اتفاق ہے، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ ضبط وثقاہت اور صدق وامانت کے ساتھ بڑے عظیم رتبہ اور شان کے محدث تھے، احمد بن منصور اور ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ ''وہ ثقہ تھے'' علامہ ابن حجر نے ان کو ثابت وضابط لکھا ہے، یافعی اور ابن عماد تحریر فرماتے ہیں کہ طبرانی ثقہ وصدوق اور حدیثوں کے علل، رجال وابواب کے اچھے واقف کار تھے۔(۲)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۷ وبستان المحدثین ص ۵۵ وکتاب الانساب ورق ۳۶۶ والعبر ج ۲ ص ۳۱۶ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ و ۱۳۰، لسان المیزان ج ۳ ص ۷۳، مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۳۷۲ وشذرات الذہب ج ۲ ص ۳۰۔

حدیث میں درجہ: امام طبرانی علم و فضل کے جامع اور فن حدیث میں نہایت ممتاز تھے، علامہ ذہبی نے انھیں ''الامام العلامہ اور مسند الدنیا'' اور یافعی و ابن عماد نے ''مسند العصر'' لکھا ہے، ابن ناصر الدین کہتے ہیں کہ وہ مسند الآفاق تھے، ایک دفعہ ابن عقدہ سے ایک اصبہانی شخص نے کوئی مسئلہ دریافت کیا، انھوں نے پوچھا کہ تم نے سلیمان بن احمد لخمی سے سماع کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں ان سے واقف نہیں، ابن عقدہ نے حیرت سے سبحان اللہ کہا اور فرمایا کہ ان کے ہوتے ہوئے تم لوگ ان سے حدیثیں نہیں سنتے اور ہم لوگوں کو خواہ مخواہ دق کرتے ہو میں نے طبرانی کا کوئی مثیل اور نظیر نہیں دیکھا، ابو بکر بن علی کا بیان ہے کہ وہ بڑے وسیع العلم تھے، حدیث میں ان کی وسعت نظر اور کمال کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد بن منصور شیرازی نے ان سے تین لاکھ حدیثیں لکھی تھیں، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ حدیث کی کثرت اور علوے اسناد میں ان کی ذات نہایت ممتاز تھی اور حدیث میں ان کی بالغ نظری کا پوری دنیائے اسلام میں چرچا تھا، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث میں وسعت اور کثرتِ روایت میں وہ یکتا اور منفرد تھے۔ (۱)

فقہی مذہب: قیاس ہے کہ امام طبرانی کا فقہی مسلک وہی رہا ہوگا جو محدثین اور ائمہ سنت کا ہے، مولانا عبدالحلیم چشتی نے انھیں شافعی بتایا ہے۔ (۲)

ابو بکر جعابی سے ایک دلچسپ مناظرہ: امام طبرانی کے علم و فضل اور حدیث میں عظمت و کمال کا اندازہ اس مناظرہ سے بھی ہوتا ہے جو ان کے اور ابو بکر جعابی کے درمیان ہوا تھا، صاحب بن عباد بیان کرتے ہیں۔

مجھے دنیا میں وزارت سے زیادہ کوئی چیز مرغوب اور عزیز نہ تھی اور میں اس سے زیادہ کسی منصب کو اعلیٰ اور برتر نہیں خیال کرتا تھا، کیوں کہ اسی کی بدولت مجھے ہر طرح کا اعزاز اور ہر ہر طبقے میں مقبولیت حاصل تھی لیکن ایک روز میرے سامنے مشہور محدث ابو بکر

---

(۱) ایضاً و بستان المحدثین ص ۵۴ (۲) فوائد جامعہ بر عجالۂ نافعہ ص ۱۸۰۔

چغابی اور ابوالقاسم طبرانی میں حدیث کے بارے میں ایک مباحثہ ہوا، حفظ وضبط میں طبرانی اور ذہانت وفطانت میں چغابی فائق معلوم ہوتے تھے، یہ مباحثہ دیر تک ہوتا رہا، دونوں طرف سے بڑے جوش وخروش کا اظہار اور پرزور آوازیں بلند ہورہی تھیں، اسی اثنا میں چغابی نے کہا میرے پاس ایک حدیث ایسی ہے جو اور کسی کو معلوم نہیں، طبرانی نے اسے بیان کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے فرمایا:

حدثنا ابو خليفة قال حدثنا	ہم سے ابوخلیفہ نے حدیث بیان کی
سليمان بن ايوب ابوالقاسم	انھوں نے کہا ہم سے سلیمان بن
....	ایوب ابوالقاسم نے روایت کی......

طبرانی نے کہا حضرت! سلیمان بن ایوب تو میں ہی ہوں اور ابوخلیفہ میرے شاگرد ہیں اگر آپ اس حدیث کو میرے واسطہ سے بیان کریں تو آپ کی سند زیادہ عالی ہوگی، اس سے بے چارے ابوبکر چغابی بہت نادم ہوئے، ان کی ندامت اور طبرانی کی فتح ومسرت دیکھ کر مجھے خیال ہوا کہ کاش میں طبرانی ہوتا تو آج وہی سرور وانبساط اور غلبہ وکامرانی جوانھیں حاصل ہوئی ہے، مجھے حاصل ہوتی، یہ منظر دیکھ کر میرے دل سے وزارت کی اہمیت جاتی رہی کیوں کہ علم وفضل کی بدولت اس سے کہیں بڑھ کر اعزاز واکرام اور جاہ ومرتبہ حاصل ہوتا ہے۔(۱)

بعض مورخین نے صاحب بن عباد کے بجائے ابن عمید کی نسبت سے یہ واقعہ تحریر کیا ہے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز نے اس پر کتنا دلچسپ اور بہتر تبصرہ فرمایا ہے وہ لکھتے ہیں:

ایں تمنا وآرزوے ہم از بقائے	صاحب بن عباد کا اس قسم کی آرزو وتمنا
وزارت وریاست او بود والا علمائے	کرنا درحقیقت وزارت وریاست ہی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۹۔

ربانیین را بسبب ایں غلبہ ہائے تغیرے نمی شود ونفس ایشاں بحرکت نمی آید ولکن المرء یقیس علی نفسہ۔	کے اثر کا نتیجہ تھا، ورنہ علمائے ربانی کے اندر اس طرح کی فتح وکامرانی کے بعد بھی کوئی عجیب تبدیلی نہیں آتی اور نہ ان کی طبیعتیں اس قسم کے واقعات سے متاثر ہوتی ہیں مگر آدمی دوسروں کو بھی اپنے ہی اوپر قیاس کرتا ہے۔
.........................(۱)	

دینی غیرت وحمیت: امام طبرانی میں بڑی دینی غیرت وحمیت تھی، ابن جوزی کا بیان ہے کہ وہ دین کے معاملہ میں نہایت سخت تھے،(۲) ان کو صحابہ کرام سے غیر معمولی محبت وعقیدت تھی، اس لیے ان کی کوئی مذمت اور تنقیص گوارا نہیں کرتے تھے، بعض مصنفین کا بیان ہے کہ وہ پہلی دفعہ اصبہان تشریف لے گئے تو ابو علی زینم نے جوزکوۃ وخراج کا عامل تھا، ان کی بڑی آؤ بھگت کی امام صاحب اس کے یہاں برابر تشریف لے جاتے تھے، اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے نے امام صاحب کے لیے پانچ سو درہم ماہوار وظیفہ مقرر کر دیا تھا لیکن جب اس نے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کے بارہ میں مخالفانہ رویہ اختیار کیا تو امام طبرانی اس سے سخت آزردہ ہو گئے یہاں تک کہ اس کے یہاں آمد ورفت بھی بند کر دی۔(۳)

اس زمانہ میں قرامطہ اور فرقۂ اسماعیلیہ کا بڑا زور واثر تھا، یہ لوگ محدثین سے بڑی کدورت اور سخت عناد رکھتے تھے، ان لوگوں نے امام صاحب کی دینی معاملات میں شدت پسندی کی وجہ سے ان پر سحر کر دیا تھا، اس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی بصارت ختم ہو گئی تھی۔(۴)

---

(۱) بستان المحدثین ص ۵۵ (۲) المنتظم ج ۷ ص ۵۴ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۸، ۱۲۹ (۴) بستان المحدثین ص ۵۴۔

وفات: امام طبرانی نے بروز شنبہ ۲۸/ذوقعدہ ۳۶۰ھ کو سو سال کی عمر میں انتقال کیا اور ایک صحابی حضرت حمدوسی کے مزار کے پہلو میں دفن کئے گئے، حافظ ابونعیم اصبہانی نے جنازہ کی نماز پڑھائی۔(۱)

تصنیفات: امام طبرانی کثیر التصانیف تھے لیکن قدیم مصنفین کی طرح ان کی بھی اکثر کتابیں محفوظ نہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے متعلق مختصر معلومات درج ہیں۔

۱- کتاب الاوائل، ۲- کتاب التفسیر، ۳- کتاب المناسک، ۴- کتاب عشرۃ النساء، ۵- کتاب السنۃ، ۶- کتاب الطوالات، ۷- کتاب النوادر، ۸- کتاب دلائل النبوۃ، ۹- کتاب مسند شعبہ، ۱۰- کتاب مسند سفیان، ۱۱- کتاب حدیث الشامیین، ۱۲- کتاب الرمی، ۱۳- مسند العشرۃ، ۱۴- معرفۃ الصحابہ، ۱۵- فوائد معرفۃ الصحابہ، ۱۶- مسند ابی ہریرہؓ، ۱۷- مسند عائشہؓ، ۱۸- حدیث الاعمش، ۱۹- حدیث الاوزاعی، ۲۰- حدیث شیبان، ۲۱- حدیث ایوب، ۲۲- مسند ابی ذرؓ، ۲۳- کتاب الرؤیۃ، ۲۴- کتاب الجود، ۲۵- العلم الالویہ، ۲۶- فضل رمضان، ۲۷- کتاب الفرائض، ۲۸- کتاب الرد علی المعتزلہ، ۲۹- کتاب الرد علی الجہمیۃ، ۳۰- مکارم اخلاق العزاء، ۳۱- الصلوٰۃ علی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم، ۳۲- کتاب المامون، ۳۳- کتاب الغسل، ۳۴- کتاب فضل العلم، ۳۵- کتاب ذم الرای، ۳۶- کتاب تفسیر الحسن، ۳۷- کتاب الزہری عن انس، ۳۸- کتاب ابن المنکدر عن جابر، ۳۹- مسند ابی اسحاق السبیعی، ۴۰- حدیث یحییٰ بن کثیر، ۴۱- حدیث مالک بن دینار، ۴۲- کتاب ماروی الحسن عن انس، ۴۳- حدیث ربیعہ، ۴۴- حدیث حمزۃ الزیات، ۴۵- حدیث مسعر، ۴۶- حدیث ابی سعد البقال، ۴۷- طرق حدیث من کذب علی، ۴۸- کتاب النوح، ۴۹- مسند ابی مجادہ، ۵۰- کتاب من اسمہ عطاء، ۵۱- کتاب من اسمہ شعبہ، ۵۲- کتاب اخبار عمر بن عبدالعزیزؒ، ۵۳- کتاب اخبار عبدالعزیز بن رفیع، ۵۴- مسند

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۰ و ابن خلکان ج ۱ ص ۳۸۳ و المنتظم ج ۷ ص ۵۴۔

روح ابن القاسم، ۵۵-کتاب فضل عکرمہ، ۵۶-کتاب امہات النبی، ۵۷-مسند عمارۃ بن غزیہ، ۵۸-مسند طلحہ بن مسرف وجماعۃ، ۵۹-مسند العبادلہ، ۶۰-احادیث ابی عمرو بن العلاء، ۶۱-کتاب غرائب مالک، ۶۲-جزو ابان بن تغلب، ۶۳-جزء حدیث ابن ابی مطر، ۶۴-وصیۃ ابی ہریرۃؓ، ۶۵-مسند الحارث العکلی، ۶۶-فضائل الاربعۃ الراشدین، ۶۷-مسند ابن عجلان، ۶۸-کتاب الاشربۃ، ۶۹-کتاب الطہارۃ، ۷۰-کتاب الامارۃ، ۷۱-مسند ابی ایوب الافریقی، ۷۲-مسند زیاد الجصاص، ۷۳-مسند زافر، ۷۴-حدیث شعبہ، ۷۵-کتاب من اسمہ عباد۔(۱)

۷۶-کتاب الدعا: یہ طبرانی کی مشہور اور ضخیم کتاب ہے، اس کی اہمیت واستناد اور ترتیب کی خوبی کا اندازہ ان کے اس بیان سے پوری طرح ہو جاتا ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ”میری یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں کا مجموعہ ہے، چوں کہ میں نے دیکھا کہ اکثر لوگوں نے ان دعاؤں کو اختیار کرلیا ہے جو مسجع عبارتوں میں اور روزمرہ کے لیے وضع کی گئی ہیں، اوران کو وراقوں (واعظین) نے جمع کیا ہے، یہ خود آنحضور صلعم یا کسی صحابی اور تابعی سے مروی نہیں ہیں بلکہ آپ سے دعا میں سجع قافیہ بندی اور تعدی کی کراہت وارد ہے، اس لیے میں نے یہ کتاب تالیف کی جوان دعاؤں پر مشتمل ہے جن کی سندیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، اس میں پہلے دعا کے فضائل وآداب بیان کیے گئے ہیں، پھر آپ جس حال میں جو دعائیں کرتے تھے ان کو علاحدہ علاحدہ ابواب میں درج کیا گیا ہے، اس کے آخری باب میں آیت کریمہ (ادعونی استجب لکم) کی تفسیر کی گئی ہے۔“(۲)

---

(۱) ان رسائل کا ذکر متفرق کتابوں میں ملتا ہے، مولانا عبدالحلیم چشتی نے عجالۂ نافعہ کے فوائد میں ان کو جمع کردیا ہے۔(ص۸۰و۸۱) (۲) بستان المحدثین ص۵۴۔

معاجم ثلاثہ: امام طبرانی نے معجم میں تین کتابیں لکھیں، یہ ان کی مشہور اور اہم اور حدیث کی بلند پایہ کتابیں سمجھی جاتی ہیں، شاہ ولی اللہ دہلوی نے ان کو حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شامل کیا ہے، ان کی بدولت امام طبرانی کو لازوال شہرت ملی۔

معجم کی تعریف: محدثین کی اصطلاح میں ان کتابوں کو معجم کہا جاتا ہے جن میں شیوخ کی ترتیب پر حدیثیں درج کی گئی ہیں، اس طرح کی بعض کتابوں میں شیوخ کی وفات اور بعض میں ان کے علم وتقویٰ کے تقدم کا لحاظ کیا گیا ہے لیکن عموماً حروف تہجی کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، شیوخ کے بجائے صحابہ یا بلاد وامصار کی ترتیب پر بھی معاجم مرتب کیے گئے ہیں۔

۷۷- معجم کبیر: یہ دراصل مسند ہے کیوں کہ اس میں صحابہ کی ترتیب پر ان کے مرویات شامل کئے گئے ہیں لیکن اس کی شہرت معجم کے نام سے ہوئی، مشہور اور کثیر الروایت صحابی حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثیں اس میں شامل نہیں ہیں، طبرانی ان کے مرویات کو علاحدہ ایک کتاب میں جمع کرنا چاہتے تھے لیکن یا تو وہ اسے مرتب نہیں کر سکے یا مرتب کیا تو اس کی شہرت نہیں ہوسکی، ابن عابدین کا بیان ہے کہ یہ بارہ جلدوں میں ہے اور اس میں ساٹھ ہزار حدیثیں شامل ہیں، ابن دحیہ کا بیان ہے کہ کتب معاجم میں سب سے بڑی یہی ہے اور جب محدثین مطلق معجم کہتے ہیں تو ان کی مراد اسی کتاب سے ہوتی ہے لیکن محدثین میں اس کے زیادہ متداول نہ ہونے کی وجہ سے امیر علاء الدین علی بلبن (م ۷۳۱ھ) نے اس کی از سرنو تہذیب وترتیب کی تھی، حافظ ابوالحسن ہیثمی نے اس کے ان مرویات کو جو صحاح میں نہیں ہیں، تین جلدوں میں جمع کیا تھا، مکتبہ شرقیہ دارالعلوم پشاور میں اس کا نسخہ موجود ہے۔(۱)

۷۸- معجم اوسط: اس کو شیوخ کے ناموں پر مرتب کیا گیا ہے، اس میں طبرانی نے اپنے تقریباً ایک ہزار شیوخ کے افراد وغرائب جمع کیے ہیں، محدثین کے نزدیک افراد وغرائب

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۶۵ و بستان المحدثین ص ۵۳ و الرسالۃ المستطرفہ ص ۱۱۲ و فہرست مکتبہ شرقیہ دارالعلوم پشاور ص ۴۷۔

ان حدیثوں کو کہا جاتا ہے جو ایک ہی شیخ کے پاس ہوں اور دوسرے شیوخ ان سے واقف نہ ہوں، یہی وجہ ہے کہ اس مجموعہ میں نفیس، عزیز اور منکر ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں لیکن اس کی ترتیب و تالیف میں امام طبرانی نے بڑی کاوش سے کام لیا تھا، ان کو خود بھی یہ کتاب بہت زیادہ عزیز تھی، اس سے حدیث میں ان کی فضیلت و کمال اور کثرت واقفیت کا پتہ چلتا ہے، اس کے باب میں تفرد ثقہ کا ذکر ہے۔

یہ چھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، ابوالحسن ہیثمی نے اس کے زوائد بھی علاحدہ مرتب کئے تھے۔(۱)

۷۹۔معجم صغیر: یہ سب معاجم میں مختصر ہونے کی وجہ سے زیادہ مقبول اور متداول ہے، اس کی ترتیب بھی شیوخ کے ناموں پر ہے اور اس میں انھوں نے حروف تہجی کے مطابق ایک ہزار سے زیادہ شیوخ کی ایک ایک حدیث درج کی ہے، آخر میں بعض خواتین کی بھی حدیثیں ہیں ان کی حدیثوں کی تعداد دو ہزار بتائی گئی ہے لیکن بعض نے ڈیڑھ ہزار بھی کہا ہے، اس کے زوائد بھی ابوالحسن ہیثمی نے علاحدہ مرتب کئے تھے، معجم صغیر کے نسخے کئی کتب خانوں میں موجود ہیں، ۱۳۱۱ھ میں یہ مطبع انصاری دہلی سے شائع ہوئی ہے، اس کی بعض خصوصیات ملاحظہ ہوں، اس میں روایت اور راوی کے متعلق مختلف قسم کی تصریحات کی گئی ہیں، مثلاً حدیث کے ضعف وقوت، رفع واتصال تفرد، شہرت اور غرابت، راویوں کے ضبط وثقاہت یا وہم وضعف، کنیت، نسبت، نام، لقب، قبیلہ، وطن اور بعض کے نسب نامے اور روایتوں میں فرق واختلاف اور کمی بیشی کی تصریح کی گئی ہے، جس سنہ اور مقام پر جو روایت سنی یا لکھی گئی ہے کہیں کہیں اس کی اور بعض راویوں کی صحابیت وتابعیت کا ذکر کیا گیا ہے، بعض روایتوں کے کسی خاص لفظ یا فقرہ کے متعلق یہ وضاحت کردی گئی ہے کہ وہ صرف اسی حدیث میں مذکور ہے، بعض شیوخ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے فلاں شیخ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۲۶ بستان المحدثین ص ۵۰ والرسالۃ المستطرفۃ ص ۱۱۱۔

سے کتنی حدیثیں بیان کیں یا اس نے اور کن مشہور شیوخ سے سنیں یا اس سے کن مشہور اشخاص اور اہم راویوں نے حدیثیں روایت کی ہیں اسی طرح اکثر راویوں کے وہ نمایاں اوصاف بیان کئے گئے ہیں جن سے ان کی زیادہ شہرت ہے۔

۲- حدیث کے بارے میں اہل علم کے بیان کردہ مفہوم ومنشاء کو ذکر کرنے کے علاوہ خود بھی کہیں کہیں اس کی مراد واضح کی ہے اور راوی نے حدیث کے بعض الفاظ کی جو وضاحت کی ہے، اس کو اور کہیں کہیں خود بھی مشکل اور غریب الفاظ کے معنیٰ لکھے ہیں۔

۳- امام طبرانی نے ائمہ فقہ اور محدثین کے فقہی اقوال اور رائیں بھی نقل کی ہیں اور خود بعض روایتوں کی اس طرح تشریح کی ہے جن سے کسی خاص فقہی مسلک کی تائید اور وضاحت ہوتی ہے، مثلاً ایک حدیث ہے کہ:

عن ابن عباس ان النبي	حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ
صلى الله عليه وسلم قال يا	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
بني عبد مناف يا بني	اے بنی عبد مناف، اے بنی
عبدالمطلب ان وليتم هذا	عبدالمطلب اگر تم اس معاملہ کے ذمہ
الامر فلا تمنعوا احداً طاف	دار ہوتا تو خانہ کعبہ کا طواف کرنے
بهذا البيت ان يصلي اية	والے کسی شخص کو رات اور دن کے کسی
ساعة شاء من ليل ونهار۔	حصہ میں نماز پڑھنے سے منع نہ کرنا۔

امام طبرانی اس کی تشریح میں لکھتے ہیں:

يعني الركعتين بعدا لطواف	آپ کی مراد سات پھیرے طواف کے
السبع ان يصلي بعد صلاة	بعد کی دو رکعتوں سے ہے کہ وہ فجر کی
الصبح قبل طلوع الشمس	نماز کے بعد طلوع آفتاب سے پہلے
وبعد صلاة العصر قبل	اور عصر کی نماز کے بعد غروب سے پہلے

غروب الشمس وفی کل النهار۔ (معجم صغیر ص ۱۲)

اور اسی طرح دن کے ہر حصہ میں پڑھی جاسکتی ہیں یعنی ممنوع ومنہی عنہا اوقات میں بھی ان کو پڑھ لینے میں حرج نہیں ہے۔

۴- انھوں نے بعض حدیثوں کے متعلق شبہات کے جواب دیے ہیں، مثلاً ایک حدیث ہے کہ:

عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے چار کام کیے اس کو چار چیزیں عطا کی جاتی ہیں، اس کا ذکر کتاب اللہ میں بھی ہے۔

۱- جس نے اللہ کو یاد کیا اللہ بھی اسے یاد کرتا ہے۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ۔ (بقرہ:۱۵۲) سو مجھے یاد کرو تو میں تمہیں یاد کروں گا۔

۲- جس نے دعا کی اس کی دعا قبول کی جاتی ہے، اللہ کا ارشاد ہے:

أُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (مومن:۶۰) مجھ سے مانگو تو میں تمہیں دوں گا

۳- شکر کرنے والے پر اللہ مزید فضل وانعام کرتا ہے:

لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ۔ (ابراہیم:۷) اگر تم میرا شکر کروگے تو میں تمہیں اور زیادہ نوازوں گا۔

۴- جو اللہ سے استغفار کرتا ہے، اللہ اس کی مغفرت کرتا ہے، اس کا فرمان ہے:

إِسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ إِنَّهُ كَانَ غَفَّارًا۔ (نوح:۱۰) اپنے خداوند سے مغفرت چاہو بلاشبہ وہ بہت بخشنے والا ہے۔

اس حدیث کے سلسلہ میں پہلے انھوں نے بعض لوگوں کے اس شبہہ کا ذکر کیا ہے کہ ''ہم لوگ دعائیں کرتے ہیں مگر وہ قبول نہیں ہوتیں'' پھر اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

''گویا یہ اعتراض خدا پر ہے کیوں کہ اس نے کہا ہے اور یقیناً اس کی

بات برحق ہے کہ:

اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (مومن:٦٠)	مجھے پکارو! میں تمہاری پکار کا جواب دوں گا۔

نیز:

وَاِذَاسَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (بقرہ:١٨٦)	اور جب میرے بندے تم سے میرے متعلق پوچھیں تو (انھیں بتاؤ کہ) میں (ان کے) نزدیک ہوں اور پکارنے والے کی پکار کا جواب دیتا ہوں۔

مگر اس حقیقت اور مفہوم سے اہل علم اور ارباب بصیرت ہی واقف ہو سکتے ہیں، ایک اور حدیث میں بھی اس کی وضاحت کی گئی ہے، حضرت ابوسعید خدریؓ اور بعض دوسرے صحابہ سے مروی ہے کہ:

مامن مسلم یدعواللّٰہ بدعوة الا استجاب له فهو من دعوته علی احدی ثلاث اما ان یعجل له فی الدنیا واما ان تدخر فی الآخرة واما ان یدفع عنه من البلاء مثلها.(١)	جو مسلمان بھی اللہ سے دعا کرتا ہے اس کی دعا قبول ہوتی ہے، اس کی تین صورتیں ہیں، یا تو دنیا ہی میں قبولیت عطا کی جاتی ہے، یا اس کی دعا آخرت کے لیے موخر کی جاتی ہے اور ذخیرہ بنتی ہے یا دعا مانگنے والے کی اس طرح کی کوئی مصیبت دفع کردی جاتی ہے۔

معجم صغیر کے مطبوعہ ایڈیشن میں مختصر تشریحی حواشی بھی شامل ہیں جن میں نسخوں کے فرق واختلاف متن کی تصحیح، راویوں کے ناموں کی تحقیق، اعراب کی تعیین، لغات کی

(١) معجم صغیر ص ٢١٢۔

تشریح، حدیث کے مشکل جملوں کی وضاحت، اختلاف قراءت، ثلاثی حدیثوں کی نشاندہی اور دوسری کتب حدیث سے اس کی حدیثوں کی مطابقت اور غیر مطابقت اور دوسری بحثیں درج ہیں، شارح نے محدثین کے مسلک کی تائید کی ہے، مثلاً حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ:

قال رسول الله ﷺ لاصلوٰة بعد الصبح حتی تطلع الشمس ولابعد العصر حتی تغرب الشمس (۱)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فجر اور عصر کے بعد طلوع وغروبِ آفتاب سے پہلے کوئی نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔

اس کے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

"یہ حکم بلا سبب پڑھی جانے والی نفل نمازوں کے بارے میں ہے لیکن فوت شدہ فرائض ونوافل یا کسی وجہ سے پڑھی جانے والی نفل نمازوں کو ان وقتوں میں بھی پڑھنا جائز ہے جیسا کہ متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے، اس کی تفصیل کے لیے مشہور محدث علامہ شمس الحق عظیم آبادی کے رسالہ اعلام اہل العصر باحکام رکعتی الفجر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔" (۲)

اس مطبوعہ نسخہ کے آخر میں مندرجہ ذیل چار رسالے شامل ہیں۔

۱- غنیۃ الالمعی: صاحب عون المعبود مولانا ابوالطیب محمد شمس الحق عظیم آبادی نے اس میں اصول حدیث اور بعض فقہی مسائل کے بارے میں سوالات کا جواب قلمبند کیا ہے۔

۲- التحفۃ المرضیہ فی حل بعض مشکلات الحدیثیہ: یہ شیخ حسین بن محسن انصاری (م ۱۳۲۷ھ) کا رسالہ اور امام ترمذی کی بعض اصطلاحوں کی تحقیق پر مشتمل ہے۔

۳- رفع الیدین فی الدعاء: یہ علامہ محمد بن عبدالرحمٰن بن سلیمان بن یحیٰ زبیدی یمانی کی تالیف ہے، اس میں فرض نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے کو مدلل طور

(۱) معجم صغیر حواشی ص ۲۲ (۲) ایضاً حواشی ص ۲۲۔

پر مسنون بتایا گیا ہے۔

۴- الکشف من مجاوزۃ ہذہ الامۃ الالف: یہ امام جلال الدین سیوطی کا رسالہ ہے، اس میں اس حدیث (ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم لایمکث فی قبرہ الف سنۃ) کے متعلق گفتگو کر کے اس کو باطل قرار دیا گیا ہے۔

امام طبرانی پر بعض اعتراضات اور ان کا جواب: امام طبرانی کی عظمت وجلالت کے باوجود ان پر بعض اعتراضات کیے گئے ہیں، ذیل میں دو اعتراضات نقل کیے جاتے ہیں:

۱- پہلا اعتراض ان کے تفرد کے بارے میں ہے، اسماعیل بن محمد بن فضل تیمی نے ان کے افراد وغرائب پر مشتمل حدیثوں کو جمع کرنے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان حدیثوں میں نکارت پائی جاتی ہے اور یہ موضوع اور طعن وقدح سے خالی نہیں ہیں۔

۲- ان پر وہم وخطا اور نسیان کا بھی الزام عائد کیا گیا ہے، اس کی مثال یہ دی گئی ہے کہ انھوں نے مغازی وسیر کے باب میں مصر کے احمد بن عبداللہ بن عبدالرحیم برقی سے روایت کی ہے، اس نام میں ان کو وہم ہوا ہے، اصل میں راوی احمد کے بجائے ان کے بھائی عبدالرحیم ہیں کیوں کہ احمد طبرانی کے مصر جانے سے دس سال پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔

ابن مندہ نے بھی اس کی وجہ سے ان پر طعن کیا ہے اور ابو بکر بن مردویہ نے اسی بنا پر انھیں لین قرار دیا ہے، ان کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ طبرانی کی جانب سے صاف نہ تھے، ابن مردویہ کی جانب سے خفگی کی ایک وجہ یہ بھی منقول ہے کہ انھوں نے بغداد جا کر جب ان حدیثوں کی تحقیق وتفتیش کی جن کو ان سے طبرانی نے ادریس سے اور ادریس نے یزید بن ہارون سے اور انھوں نے روح بن عبادہ کے واسطہ سے بیان کیا تھا تو انھیں، بہت کم حدیثوں کا پتہ چلا، علاوہ ازیں یہ معلوم ہوا کہ اہل بغداد کے نزدیک ادریس کا زیادہ پایہ بلند نہ تھا، اس لیے وہ ان سے زیادہ حدیثیں روایت نہیں کرتے تھے مگر امام طبرانی کے نزدیک ادریس مغتنم لوگوں میں تھے۔

اسی نوعیت کا ایک اور اعتراض حاکم نے علوم الحدیث میں تحریر کیا ہے کہ ابوعلی نیشاپوری امام طبرانی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، اس کا سبب یہ تھا کہ طبرانی نے شعبہ کی ایک حدیث بیان کی اور کہا کہ یہ ان کو غندر اور شبابہ کے واسطہ سے ملی ہے، ابوعلی نے سوال کیا کہ آپ سے اس کی کس نے روایت کی ہے؟ انھوں نے کہا عبداللہ بن احمد نے اپنے والد سے انھوں غندر اور شبابہ سے، حالاں کہ یہ غندر کی حدیث نہ تھی۔ (۱)

ان اعتراضات کا نمبروار جواب یہ ہے کہ:

۱- امام طبرانی کو طویل عمر ملی اور ان سے بیشمار حدیثیں منقول ہیں، اس لیے ان کے یہاں تفرد کی بھی کثرت ہے لیکن ارباب فن نے ان کے تفرد کو منکر نہیں قرار دیا ہے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ کثرتِ روایت کی وجہ سے امام طبرانی کے تفرد کو منکر نہیں قرار دیا جاتا، حافظ ابن حجر نے تیمی کے مذکورہ بالا اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:

> ''افراد وغرائب جمع کرنے کا معاملہ صرف طبرانی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اکثر قدیم محدثین کا یہی حال تھا کہ وہ تفرد کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے اور اپنی ذمہ داری سے برأت کے لیے احادیث کو ان کی اصل سندوں کے ساتھ بیان کرنے پر اکتفا کرتے تھے۔''

شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں:

> ''معجم اوسط افراد وغرائب کا مجموعہ ہے، محدثین کے نزدیک اس میں بہت سی منکر روایتیں ہیں لیکن اس کی حقیقت اور منشا یہ ہے کہ غرابت اسی کی مقتضی ہے ورنہ تفرد ثقہ کا جس کو غریب صحیح کہا جاتا ہے، ایک علاحدہ باب ہے۔'' (۲)

۲- دوسرے اعتراض میں بعض ناموں کے بارے میں امام طبرانی کے سہو

---

(۱) لسان المیزان جلد ۳ ص ۷۳ (۲) میزان الاعتدال ج ا ص ۴۰ ولسان المیزان ج ۳ ص ۷۳ وبستان المحدثین ص ۵۳۔

ونسیان کا ذکر ہے، اس کتاب میں یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ وہم ونسیان علمائے فن کے نزدیک مانع ثقاہت اور قابل اعتراض نہیں چنانچہ حافظ ذہبی اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> ''یہ زیادہ اہم بات نہیں احمد بن منصور شیرازی فرماتے ہیں کہ ''میں نے ان سے تین لاکھ حدیثیں لکھیں، وہ ثقہ تھے، البتہ مصر کے ایک شیخ سے انھوں نے حدیث لکھی اور غلطی سے اس کو ان کے بجائے ان کے بھائی کی جانب منسوب کر دیا۔''(۱)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن مردویہ نے جو روایت کی اس کی بنیاد پر بھی طبرانی کو مجروح اور قابل طعن قرار دینا زیادتی ہے، رہی یہ بات کہ وہ طبرانی کی جانب سے صاف نہ تھے تو یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیوں کہ وہ خود ان کے حلقۂ فیض سے وابستہ تھے اور ان سے حزم واحتیاط کے ساتھ حدیثیں بھی نقل کرتے تھے، چنانچہ حافظ ابونعیم نے ان سے پوچھا کہ آپ نے طبرانی سے حدیثیں روایت کی ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ ہاں میں ان سے احتیاط کے ساتھ روایتیں کرتا ہوں حافظ ضیاء کا بیان ہے کہ ابن مردویہ نے خود اپنی تاریخ میں طبرانی کا ذکر کیا ہے لیکن ان کی تضعیف نہیں کی ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طبرانی ثقہ وثابت تھے اور ابن مردویہ کے نزدیک بھی ان کی ثقاہت مسلم تھی۔ (۲)

لیکن اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ ابن مردویہ کو واقعی ان سے بدگمانی تھی تو تنہا ان کی ذاتی رائے کی وجہ سے طبرانی کو ضعیف اور غیر معتبر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ابوعلی نیشاپوری کے بیان میں بھی وہم ونسیان کا ذکر ہے، اس کا جواب بھی مندرجہ بالا توضیح سے ہو گیا لیکن حافظ ابن حجر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۳۰ (۲) ایضاً۔

طبرانی کو کوئی وہم نہیں ہوا تھا، چنانچہ وہ تحریر فرماتے ہیں:

ابونعیم نے ابوعلی کا تعاقب کرتے ہوئے غندر کی حدیث کو ابوعلی بن صواف سے اورانھوں نے عبداللہ بن احمد سے اسی طرح بیان کیا ہے جس طرح طبرانی نے بیان کیا ہے، اس سے طبرانی کا بری الذمہ ہونا ظاہر ہوتا ہے، حافظ ضیاء نے طبرانی کے دفاع میں ایک رسالہ لکھا تھا، جس میں وہ اس اعتراض کی تفصیل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

لو کان کل من وهم في حديث او حديثين اتهم لكان هذا لا يسلم منه احد.(۱)	اگر اسی طرح ہر شخص کو محض ایک یا دو حدیثوں میں وہم کی وجہ سے متہم قرار دیا جائے تو کوئی شخص بھی الزام واعتراض سے بچ نہیں سکتا۔

اس تفصیل سے ان اعتراضات کی حقیقت واضح ہوگئی اور یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اگر یہ صحیح بھی ہوں تو ان سے ان کی عظمت واہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔

☆☆☆

(۱)لسان المیزان ج ۳ص ۷۴۔

امام ابو عمرو بن نجید

(المتوفی ۳۶۵ھ یا ۳۶۶ھ)

نام ونسب: اسماعیل نام، ابو عمرو کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: اسماعیل بن نجید بن احمد بن یوسف ابن خالد۔ (۱)

پیدائش، خاندان ووطن: ۲۷۲ یا ۲۷۳ھ میں پیدا ہوئے، عرب کے مشہور قبیلہ سلیم سے خاندانی تعلق تھا، اسی لیے سلمی کہلاتے تھے۔

اساتذہ وشیوخ: امام ابو عمرو بن نجید نے ابراہیم بن ابو طالب، ابو مسلم ابراہیم بن عبداللہ، عبداللہ ابن احمد بن علی بن حسین بن جنید، ابو عبداللہ محمد بن ابراہیم بوشنجی، محمد بن ایوب رازی وغیرہ سے حدیث روایت کی اور جنید بغدادی اور ابو عثمان جیسے اجل صوفیہ سے تصوف کی تعلیم حاصل کی۔

تلامذہ: جن لوگوں نے ان سے علم ظاہر وباطن کی تحصیل کی تھی ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:

ابو حفص بن مسرور، ابو نصر احمد بن عبدالرحمٰن صفار، ابو عبداللہ حاکم، صاعد بن محمد قاضی عبدالقاہر بن طاہر فقیہ، ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین وغیرہ۔ (۲)

حدیث میں درجہ: ابو عمر بن نجید کا روایت وحدیث میں درجہ بلند تھا، علمائے سیر وطبقات نے ان کی کثرتِ روایت، احادیث میں انہماک واشتغال اور ثقاہت کا اعتراف کیا ہے،

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۰۲ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۱۸۹ (۲) ایضاً۔

ابن جوزی، ابن کثیر، شعرانی اور مولانا جامی وغیرہ نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے، حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے (اسند من بقی بخراسان فی الروایۃ) یعنی خراسان کے محدثین میں ابن نجید سب سے زیادہ بلند پایہ اور مستند ہیں، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں، در علو اسناد در خراسان مشہور و مشار الیہ آفاق۔

زہد و تصوف: وہ عمل، اخلاص اور زہد و تقویٰ میں نہایت کامل تھے، حدیث سے زیادہ ان کو تصوف میں اشتغال تھا اور اسی حیثیت سے زیادہ مشہور بھی ہیں، اس زمانہ کے مشائخ و کبار صوفیہ اور اوتاد و ابدال میں شمار کیے جاتے تھے، مورخین نے ان کو الزاہد العابد، شیخ الصوفیہ اور صاحب احوال و مناقب لکھا ہے، ابن نجید ابو عثمان حیری کے اجل خلفا میں تھے، انھیں خود اپنے مسترشد پر بڑا ناز تھا اور فرماتے تھے کہ ابو عمرو میرے جانشین ہیں، لوگ ان سے محبت کرنے پر میری ملامت کرتے ہیں، حالاں کہ ان سے زیادہ کسی کو میرے طریقہ اور مشرب کا علم نہیں، گو وہ جنید و ابو عثمان کے صحبت نشین اور فیض یافتہ تھے لیکن تصوف میں ان کا اپنا خاص طریقہ بھی تھا، مولانا جامی لکھتے ہیں:

''ویرا طریقۂ خاص بود از تلبیس حال و نگاہ داشت وقت۔''(۱)

انفاق فی سبیل اللہ: اللہ تعالیٰ نے ان کو علم ظاہر و علم باطن کی طرح دنیوی جاہ و حشمت سے بھی نوازا تھا لیکن ان میں بڑی بے نیازی اور استغنا تھا اور مال و دولت کی حرص و طمع سے ان کا دل پاک تھا، ان کو اپنے والد سے کافی مال و دولت وراثت میں ملا تھا لیکن خود کفاف پر بسر کرتے تھے اور باقی سب خدا کی راہ میں اور علما و مشائخ پر خرچ کر دیتے تھے۔

اخلاص: دنیا کے ارباب جاہ و حشمت کی طرح ان کو نام و نمود اور شہرت سے کوئی دلچسپی نہ تھی، وہ ریا کاری کو سخت ناپسند کرتے تھے، ہر کام خالصتاً لوجہ اللہ کرتے، ان کا اخلاص بیمثال تھا، ایک روز ابو عثمان حیری کو سرحدوں پر مجاہدین کے اخراجات کے لیے کچھ رقم کی

نفحات الانس جامی ص ۲۱۶۔

ضرورت ہوئی لیکن حاضرین کی تہی دستی کی وجہ سے ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، اس سے ان کا دل بھر آیا، وہ ضبط نہ کر سکے اور رو پڑے، رات میں عشاء کی نماز کے بعد ابو عمرو بن نجید نے دو ہزار درہم کی ایک تھیلی پیش کی، ابو عثمان بہت خوش ہوئے اور ان کے لیے دعائے خیر فرمائی، پھر انھوں نے مجلس میں یہ اعلان کیا کہ اللہ تعالیٰ ابو عمرو کو جزائے خیر دے، انھوں نے دو ہزار درہم دے کر میری خواہش پوری کر دی، ابو عمرو نے اسی وقت فوراً مجمع میں کھڑے ہو کر کہا حضرات! میں جو رقم لایا تھا وہ میری ماں کی تھی وہ اسے دینے کے لیے راضی نہ تھیں، اس لیے تھیلی واپس کر دی جائے تاکہ میں اسے لے جا کر اپنی ماں کو دیدوں، چنانچہ ابو عثمان نے تھیلی منگا کر واپس کر دیا جب رات کا سناٹا ہوا اور سارا مجمع منتشر ہو گیا تو ابو عمرو نے دوبارہ وہی رقم شیخ کی خدمت میں نذر کی اور کہا آپ اسے اس طور پر خرچ کریں کہ ہمارے علاوہ کسی اور شخص کو اس کی اطلاع نہ ہو، ابو عثمان آبدیدہ ہو گئے اور ان کی بڑی ستائش و تحسین کی۔(۱)

حکیمانہ وصوفیانہ اقوال: ابو عمرو بن نجید سے بڑے حکیمانہ وصوفیانہ اقوال منقول ہیں، چند ملاحظہ ہوں۔

۱- بعض سکوت (خاموشی) گفتگو سے زیادہ بلیغ و موثر ہوتا ہے۔

۲- جو شخص اپنے نفس کو معزز و مکرم سمجھتا ہے اس کا دین اسے حقیر و ہین معلوم ہوتا ہے۔

۳- غیر اللہ سے انسیت رکھنا اصلی وحشت ہے۔

۴- پوچھا گیا کس چیز سے بندہ کو چارہ نہیں، فرمایا سنت کے مطابق بندگی کا التزام اور ہمیشہ دل کی نگرانی و پاسبانی۔

۵- حال اگر علم کا نتیجہ نہ ہو تو صاحب حال کے لیے اس کا ضرر نفع سے زیادہ ہے۔

(۱) نفحات الانس جامی ص ۱۱۶ کتاب الانساب ورق ۳۰۳ کتاب المنتظم ج ۷ ص ۸۴، ۸۵۔

۶- تصوف امر و نہی کے تحت صبر کرنے کا نام ہے۔

۷- بندہ کے لیے سب سے بڑی آفت اس کا اپنے نفس سے مطمئن ہو جانا ہے۔

۸- جس شخص کو دیکھنے کے بعد تمہاری اصلاح نہ ہو وہ شخص مصلح نہیں ہے۔

۹- آدمی عبادت میں اسی وقت مخلص ہو سکتا ہے جب اس کو اپنے تمام افعال ریا اور تمام احوال و اقوال ادعا معلوم ہوں۔

۱۰- پوچھا گیا، ادعاء کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ فرمایا دھوکہ سے، اس کی ابتدا ہی بگاڑ سے ہوتی ہے، جس شخص کی ابتدا صحیح ہو اس کی انتہا بھی صحیح ہوتی ہے اور جس کی ابتدا فاسد ہو وہ کسی وقت ہلاک و برباد ہو سکتا ہے۔

۱۱- ملامتی (۱) میں کبھی ادعا نہیں ہوتا کیوں کہ اسے اپنے اندر کوئی چیز ادعا کی نظر نہیں آتی۔

۱۲- جب اللہ اپنے بندہ کی بھلائی چاہتا ہے تو اسے صلحا و اخیار کی خدمت وصحبت اور ان کے ارشادات قبول کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے اور اس کے لیے نیکیوں کی راہیں آسان کر دیتا ہے۔

۱۳- عام مسلمانوں کا احترام کرو اور غیر ممکن کام کے درپے نہ بنو، سب سے اپنے کو حقیر سمجھو جس قدر تمہارا تعلق لوگوں سے زیادہ ہوگا اسی قدر خدا کے احکام میں تمہارا حصہ کم ہوگا۔

۱۴- جو شخص نفع وضرر نہ پہچاننے والے کے سامنے اپنے محاسن ظاہر کرتا ہے وہ دراصل جہل کا اظہار کرتا ہے۔

---

(۱) یہ صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے، اس کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں، مولانا جامی لکھتے ہیں، الملامتی ہو الذی لایظہر خیرا ولا یضمر شرا (نفحات الانس) یعنی ملامتی وہ شخص ہے جو اپنی نیکی کا اظہار اور برائی کو پوشیدہ نہیں رکھتا۔

۱۵- جو شخص واقعۃً درست ہو گیا، اسے کوئی بگاڑ نہیں سکتا اور جو کج ہو گیا اسے کوئی سیدھا نہیں کر سکتا۔(۱)

وفات: سنہ وفات میں اختلاف ہے، ربیع الاول ۳۶۵ھ اور ۳۶۶ھ کی روایتیں ملتی ہیں، صاحب الرسالۃ القشیریہ نے تصریح کی ہے کہ مکہ معظمہ میں اور بعض مورخین کے بیان کے مطابق ۹۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا۔(۲)

اولاد واحفاد: اولاد واحفاد میں ایک نواسہ ابوعبدالرحمٰن محمد بن حسین بن محمد بن موسیٰ سلمی کا ذکر ملتا ہے جو بڑے صاحبِ کمال بزرگ اور بلند پایہ صوفی تھے، تصوف میں ان سے کئی کتابیں یادگار ہیں، ان کی سب سے مشہور کتاب طبقات الصوفیہ ہے، یہ صوفیہ کے حالات پر مشتمل اور قاہرہ سے چھپ چکی ہے، مولانا جامی کی نفحات الانس کا اصل ماخذ یہی کتاب ہے، تفسیر میں بھی ایک کتاب لکھی تھی جس میں صوفیانہ نقطۂ نگاہ سے قرآن کی تفسیر کی گئی ہے، حدیث سے بھی اشتغال تھا، مرو، نیشاپور، عراق وحجاز کے علما سے حدیثوں کی تحصیل کی تھی لیکن محدثین نے ان کو ضعیف قرار دیا ہے، امام دارقطنی فرماتے ہیں کہ یہ صوفیہ کی مفید مطلب حدیثیں وضع کرتے تھے،(۳) ۳رشعبان ۴۱۲ھ کو انتقال ہوا اور نیشاپور میں اپنی خانقاہ کے اندر دفن کیے گئے۔

تصنیفات: ان کی تصنیفات میں صرف جزء ابن نجید کا ذکر ملتا ہے لیکن اس کے متعلق اور کچھ معلوم نہیں ہو سکا، جزء کتب حدیث کی ایک قسم ہے، محمود محمد خطاب سبکی لکھتے ہیں:

الجزء يطلق على ماهو اعم من الجامع والمسند وقد يطلق على ماالف في نوعٍ خاص.	جزء کا اطلاق اس کتاب پر ہوتا ہے جو جامع اور مسند دونوں سے عام ہوتی ہے اور کبھی اس پر بھی ہوتا ہے جو کسی خاص موضوع پر تالیف کی جاتی ہے۔

(۱) الرسالۃ القشیریہ ص ۳۴، طبقات شعرانی ص ۱۰۳، نفحات الانس ص ۲۱۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۰۳ المنتظم ج ۷ ص ۸۴، طبقات شعرانی ص ۱۰۳، الرسالۃ القشیریہ ص ۳۴ (۳) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۶۔

شاہ عبدالعزیز صاحب تحریر فرماتے ہیں:

''جزء حدیث کی اس کتاب کو کہا جاتا ہے جس میں صرف ایک خاص شخص کی بیان کردہ حدیثوں کو جمع کیا جاتا ہے، چاہے وہ شخص صحابہ کے طبقہ سے ہو یا ان کے بعد کے طبقہ سے مثلاً جزء حدیث ابوبکر و جزء حدیث مالک''

اس قسم کا بھی محدثین میں بڑا رواج ہے، کبھی ایسا کرتے ہیں کہ جامع میں مذکور آٹھ موضوعوں (۱) میں کسی خاص موضوع کو اختیار کر لیتے ہیں اور اس پر ایک نہایت مبسوط کتاب مرتب کرتے ہیں چنانچہ باب الدیۃ پر ابوبکر بن ابی الدنیا نے ایک مبسوط کتاب لکھی تھی، علی ہذا القیاس مذکورہ بالا آٹھ مطالب میں سے ہر ہر موضوع پر مستقل اور جداگانہ رسالے لکھے گئے ہیں جن کا احاطہ و شمار دشوار ہے، حافظ ابن حجر اور علامہ سیوطی کی تصانیف میں رسالوں کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ (۲)

---

(۱) جوامع میں حسب ذیل موضوع سے متعلق احادیث ہوتی ہیں عقائد، احکام، رقاق، آداب، تفسیر، تاریخ و سیر، فتن و ملاحم، فضائل و مناقب (۲) عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۱۶ و ۱۰۳۔

امام ابوبکر اسماعیلی

(متوفی ۳۷۱ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت، اسماعیلی نسبت اور سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن ابراہیم بن اسماعیل بن عباس بن مرداس۔ (۱)

پیدائش، خاندان اور وطن: وہ امام بخاری کی وفات کے اکیس سال بعد ۲۷۷ھ میں پیدا ہوئے، ان کا خاندان علمی حیثیت سے ممتاز تھا، ان کے بعد اس میں متعدد فضلا اور ارباب کمال گذرے، (۲) ان کا وطن جرجان تھا۔

شوق علم اور طلب حدیث کے لیے سفر: علم وفن سے ان کو فطری مناسبت تھی، بچپن میں لوگ عموماً پڑھنے لکھنے سے بیزار ہوتے ہیں لیکن اسماعیلی کو اسی زمانہ میں اس سے دلچسپی ہوگئی تھی، چھ سال کی عمر میں یعنی ۲۸۳ھ میں انھوں نے حدیثوں کی تحریر وکتابت شروع کر دی تھی، اور ۲۸۹ھ میں باقاعدہ اس فن کی تحصیل میں مشغول ہوگئے تھے، اسی زمانہ میں وہ اس مقدس اور مبارک علم کی تحصیل کے لیے اپنے وطن سے نکل جانا چاہتے تھے، مگر ان کی کمسنی کی وجہ سے ان کے اعزہ نے سفر کی اجازت نہیں دی اور جب ان کا شوق اور اصرار حد سے بڑھ جاتا تو وہ لوگ مختلف حیلوں اور بہانوں سے انھیں باز رکھنے کی کوشش کرتے، ایک دن ان کو اس زمانہ کے مشہور محدث محمد بن ایوب رازی کی موت کی اطلاع ملی تو ان کا عجیب حال ہوگیا، وہ گھر سے باہر آکر رونے دھونے، چیخنے چلانے لگے کپڑے چاک کرنے اور سر پر

---

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۶، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۷۹ (۲) ایضاً وبستان المحدثین ص ۳۷۔

خاک ڈالنے لگے، یہ کیفیت دیکھ کر ان کے تمام اعزہ جمع ہو گئے اور اس کا سبب دریافت کیا، اسماعیلی نے کہا آج دنیا ایسے عظیم المرتبت اور صاحب کمال شخص سے خالی ہو گئی، آپ لوگوں کی بندشوں اور رکاوٹوں نے مجھے اس کے فیوض و برکات سے متمتع نہیں ہونے دیا، اعزہ نے تسلی دیتے ہوئے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے، اب بھی خدا کے فضل سے بہت سارے نامور علما و مشائخ اور اساطین فن موجود ہیں، یہ حالت دیکھ کر اب ان کو سفر سے مزید روکنا مشکل تھا، اس لیے ان کے ماموں کو ان کے ہمراہ کر دیا گیا، اس طرح وہ پہلی مرتبہ ۲۹۴ھ میں ابوالحسن بن سفیان کی خدمت میں نسا تشریف لے گئے، ان کا خود بیان ہے کہ یہ سفر میں نے اس وقت کیا تھا جب نہ تو میری مسیں بھیگی تھیں اور نہ داڑھی کے بال نکلے تھے، ۲۹۶ھ میں بغداد گئے، اس سفر میں بھی ان کا کوئی عزیز ان کے ساتھ تھا، پھر حجاز، عراق، فارس، کوفہ، بصرہ، انبار، موصل، جزیرہ، نیشاپور وغیرہ تشریف لے گئے، نیشاپور کئی بار تشریف لے گئے۔(۱)

اساتذہ وشیوخ: جس شخص کے شوق و جستجوئے علم کا یہ حال رہا ہو اس کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد و شمار نہیں کی جا سکتی، بعض نامور محدثین اور ارباب کمال کے نام یہ ہیں:

ابراہیم بن زہیر حلوانی، ابراہیم بن عبداللہ مخرمی، ابو یعلیٰ احمد بن علی بن مثنیٰ موصلی، احمد بن محمد بن مسروق، بہلول بن اسحاق تنوخی انباری، جعفر بن محمد فریابی، حسن بن سفیان شیبانی، حمزہ بن محمد بن عیسیٰ کاتب، عبداللہ بن ناجیہ، عبدان بن احمد عسکری، عمران بن موسیٰ سختیانی، ابوخلیفہ فضل بن حباب جمحی، ابوبکر محمد بن اسحاق بن خزیمہ، محمد بن حسن بن سماعہ، ابوجعفر محمد بن عبداللہ بن سلیمان حضرمی، محمد بن عثمان بن ابی شیبہ، شیخ زاہد محمد بن عثمان مقابری، محمد بن یحییٰ بن سلیمان مروزی، یحییٰ بن محمد حنائی، قاضی یوسف بن یعقوب۔(۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں اس دور کے ائمہ اور نامور فضلا شامل تھے، بعض کے نام یہ ہیں:

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۰ (۲) ایضاً۔

ابوالقاسم عبدری، ابوبکر بن محمد بن غالب برقانی، حسین بن محمد باسانی، حمزہ بن یوسف سہمی صاحب تاریخ جرجان، ابوعمر وعبدالرحمٰن بن (۱) محمد فارسی، عبدالواحد بن منیر معدل، ابوجعفر محمد بن احمد حجاجی، ابوبکر محمد بن ادریس جرجانی، ابوعبداللہ محمد بن عبداللہ حاکم، ابوعلی محمد بن علی بن سہل، ابوالحسن محمد بن علی طبری۔

حفظ وضبط: حفظ وضبط میں ممتاز اور مشہور حفاظ میں شمار کئے جاتے تھے، بہت ساری کتابیں ان کو زبانی یاد تھیں، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ میں ان کے کمال حفظ سے مبہوت ہو گیا اور میرا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ متقدمین کے علم وحافظہ کا متاخرین مقابلہ نہیں کر سکتے، ضبط واحتیاط کا یہ حال تھا کہ فن حدیث میں غیر معمولی امتیاز اور امام فن ہونے کے باوجود انھوں نے مستقل کتاب لکھنے کے بجائے مستخرج بخاری لکھنے پر اکتفا کیا، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ وہ رفع اسناد اور علوے تفرد میں ممتاز تھے،(۲) حاکم کا بیان ہے کہ ان کے ضبط وثقاہت میں کوئی اختلاف نہیں کیا گیا ہے۔

حدیث میں درجہ: اسماعیلی منقولات کے متبحر عالم اور کامل الفن محدث تھے، وہ حدیث میں امام، مرجوع اور مقتدیٰ کی حیثیت رکھتے تھے، حاکم نے ان کو شیخ المحدثین اور امامِ اہل جرجان کہا ہے، ان کی عظمت وبلند پائیگی کا یہ عالم تھا کہ امام دارقطنی جیسے صاحب کمال اور جلیل القدر محدث نے کئی بار ان کی بارگاہ فضل وکمال میں حاضر ہونے کا قصد کیا لیکن مقدور نہ ہو سکا اور زندگی بھر اپنی اس محرومی پر حسرت وافسوس ظاہر کرتے رہے، حافظ حسن بن علی فرماتے ہیں کہ اسماعیلی اس پایہ کے محدث تھے کہ حدیث وسنن میں مستقل کتابیں لکھتے مگر انھوں نے مستخرج مرتب کرنے پر اکتفا کیا، ان کو اکثر کتابیں ازبر تھیں اور اللہ تعالیٰ نے علمِ وافر اور ذہن رسا سے نوازا تھا۔(۳)

---

(۱) یہ اسماعیلی کے نواسے تھے، تذکرہ ج ۳ ص ۱۵۹ (۲) تذکرۃ ج ۳ ص ۱۶۰ و ۱۶۱ (۳) تاریخ جرجان ص ۷۰ وکتاب الانساب ورق ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰۔

مسندِ درس: اسماعیلی کے حدیث میں کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علم کی تکمیل کے بعد جب وہ مسند درس پر رونق افروز ہوئے تو ان کو بڑا عروج نصیب ہوا اور ان کے درس میں طلبہ و مستفیدین کا جم غفیر شریک ہوتا تھا، حمزہ سہمی اور علامہ سمعانی نے روزانہ کے شرکا کی تعداد چالیس اور پچاس کے لگ بھگ بتائی ہے، یہ لوگ اسماعیلی کی زبان سے جو بات نکلتی تھی اس کو قلمبند کر لیتے تھے۔ (۱)

فقہ واجتہاد: وہ فقہ واجتہاد میں بھی صاحب کمال اور امام ومقتدیٰ سمجھے جاتے تھے، علامہ سمعانی لکھتے ہیں کہ اسماعیلی اہل جرجان کے امام اور فقہ وحدیث میں مرجع تھے، حاکم نے انھیں شیخ المحدثین والفقہا کہا ہے، ان کے صاحبزادے ابوسعید اور بعض علمائے جرجان نے فقہ کی ان سے تحصیل کی تھی۔

قرأت: فن قرأت میں اسماعیلی کو مہارت اور اچھی دستگاہ تھی، ابوالحسن محمد بن مظفر نے قرأت میں ان کی جودت کا اعتراف کیا ہے، حمزہ سہمی فرماتے ہیں کہ وہ ہر مجلس میں پیش پیش رہتے تھے، ان کے سامنے کسی کو قرأت کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی، ابوالقاسم بغوی کا بیان ہے کہ میں نے ان سے بہتر قاری نہیں دیکھا۔ (۲)

تدین واخلاق: اسماعیلی متدین اور ستودہ صفات تھے، حاکم نے ان کی مروت وسخاوت کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور حمزہ سہمی کا بیان ہے کہ وہ اپنے والدین کے نہایت مطیع اور فرمانبردار تھے، ان کے طرز عمل سے ان کے والدین اس قدر خوش تھے کہ ہمیشہ ان کے لیے خیر وبرکت کی دعا کرتے رہتے تھے۔ (۳)

دولت وثروت: اللہ تعالیٰ نے ان کو علمی ودینی کمالات کی طرح مال ودولت کی فراوانی اور دنیوی جاہ ومنزلت سے بھی نوازا تھا، مورخین کا بیان ہے کہ وہ دینی ودنیاوی وجاہت اور

(۱) تاریخ جرجان ص ۷۰ وکتاب الانساب ورق ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

ہر قسم کی خوبیوں کے جامع تھے۔(۱)

شہرت ومقبولیت: ان کو بڑی شہرت اور غیر معمولی مقبولیت حاصل تھی، وہ امام اور مرجع خلائق تھے، درس میں حاضرین کی بڑی تعداد ہوتی تھی، جو نہایت عقیدت کے ساتھ ان کا ایک ایک لفظ نقل کرتے تھے، ابن فرات کا بیان ہے کہ:

لقد رزق من العلم والجاه والصيت الحسن۔	ان کو علم وجاہ اور اچھی شہرت نصیب ہوئی۔

بغداد میں جب ان کی موت کی خبر ہوئی تو اکابر محدثین اور فقہا نے کئی دنوں تک جمع ہو کر ان کو خراج عقیدت پیش کیا۔(۲)

فقہی مسلک: اسماعیلی شافعی المذہب تھے اور شوافع کے ائمہ میں خیال کیے جاتے تھے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ اپنے خطہ کے اکابر شافعیہ میں تے۔(۳)

کلامی عقائد: وہ اہل سنت والجماعت اور محدثین کے ہمنوا تھے، اس لیے ان کے اعتقادات بھی وہی تھے، ان کے بعض کلامی عقائد یہ ہیں:

اہل حدیث کا مسلک یہ ہے کہ اللہ اس کے ملائکہ، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کا اقرار کیا جائے، کتاب اللہ اور صحیح حدیثوں کے منطوق کو قبول کیا جائے اور ان سے انحراف نہ کیا جائے، محدثین کا عقیدہ ہے کہ اللہ کو اس کے اچھے ناموں سے پکارنا اور ان صفتوں سے متصف ماننا چاہیے جن سے اس نے اور اس کے رسول نے اس کو متصف کیا ہے، مثلاً اللہ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا، اس کے دونوں ہاتھ کشادہ ہیں، وہ عرش پر متمکن ہے وغیرہ، ان ساری باتوں کو محض تسلیم کرنا ضروری ہے، ان کی حقیقت اور کیفیت معلوم کرنے کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔(۴)

---

(۱) تاریخ جرجان ص ۷۰ وکتاب الانساب ورق ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ و ۱۶۰ (۲) تاریخ جرجان ص ۷۰ و ۷۱ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۹ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰، ۱۶۱

وفات: عام مورخین کے بیان کے مطابق ۹۴ رسال کی عمر میں سنیچر کے دن غرہ رجب ۳۷۱ھ میں انتقال ہوا اور اتوار کو تدفین ہوئی، ان کے صاحبزادے ابونصر نے جنازہ کی نماز پڑھائی، ابن سبکی اور شاہ عبدالعزیز صاحب نے لکھا ہے کہ صفر ۳۷۱ھ میں وفات پائی۔ (۱)

اولاد: انتقال کے وقت پانچ اولادیں تھیں، تین لڑکیاں اور دو لڑکے، ایک لڑکے کا نام ابونصر محمد اور دوسرے کا ابوسعد اسماعیل تھا، دونوں علم وفضل میں اپنے والد کے جانشین تھے، ابونصر اپنے باپ کی موجودگی ہی میں مسندِ درس پر فروکش ہو چکے تھے اور دوسرے صاحب زادے ابوسعد اپنے زمانے کے ممتاز فقیہ اور صاحبِ علم خیال کئے جاتے تھے۔ (۲)

تصنیفات: امام اسماعیلی کی جن کتابوں کے نام معلوم ہو سکے ہیں وہ یہ ہیں:

۱- مسند عمر: یہ دو جلدوں میں تھی اور حافظ ذہبی کی نظر سے گذری تھی، انھوں نے اس کی تعلیق بھی لکھی تھی۔ (۳)

۲- مسند کبیر: یہ نہایت ضخیم کتاب اور تقریباً سو جلدوں پر مشتمل تھی، مگر اس کو زیادہ شہرت نہیں ملی۔

۳- مستخرج: اس کا نام صحیح اسماعیلی بھی ہے، یہ صحیح بخاری پر مستخرج ہے (۴) حافظ ابن کثیر کے اس بیان سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ انھوں نے صحیح بخاری پر مستخرج لکھا، یہ بیشمار فائدوں اور معلومات پر مشتمل ہے۔

حافظ ابن حجر نے اس کا انتخاب کیا تھا، جو منتقی ابن حجر کے نام سے مشہور ہے، اسماعیلی نے بخاری کی تعلیقات کو یکجا کر دیا تھا لیکن حافظ نے ان کا جدا جدا ذکر کیا ہے (۵)

۴- معجم: اسماعیلی کی یہ اہم تصنیف ہے، اس کے متعلق حافظ ابن حجر نے

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۶۰، ۱۶۱ و تاریخ جرجان ص ۶۹ کتاب الانساب ورق ۱۳۶ المنتظم ص ۱۰۸ طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۸۰ (۲) تاریخ جرجان ص ۷۴ (۳) بستان المحدثین ص ۳۸ (۴) مستخرج کی تعریف کے لیے ملاحظہ ہو تذکرۃ المحدثین ج ۱ ص ۴۰۸ (۵) بستان المحدثین ص ۳۷۔

مصنف کے حوالہ سے مجمع المؤسس میں یہ تصریح نقل کی ہے۔

میں نے جن شیوخ سے حدیثیں سنی اور لکھی ہیں یا جن کے سامنے قرأت کی ہے ان کے ناموں کے حصر اور حروف معجمہ پر تخریج کے متعلق اللہ تعالیٰ سے استخارہ کیا تا کہ طلبہ کو اس سے سہولت ہو اور ناموں میں التباس واشکال کے وقت وہ اس کی جانب رجوع کر سکیں، ہر شیخ کی صرف ایک ہی حدیث نقل کرنے پر اکتفا کیا گیا ہے، اس کا مقصد فی الواقع مفید حدیثوں کو جمع کرنا ہے، جن راویوں کی طرف میرے خیال میں کذب واتہام یا عام محدثین سے تفرد کی بنا پر ناپسندیدہ ہیں، ان کی حقیقت اس میں اچھی طرح واضح کر دی گئی ہے لیکن جن لوگوں کا قدح وطعن بالکل واضح اور ظاہر ہے، ان کی حدیث کی تخریج کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، میں نے تیمناً وتبرکاً اس کو احمد کے نام سے شروع کیا ہے اور جمادی الاولیٰ ۸۳۶ھ میں اس کی جمع وتالیف کی ابتدا کی ہے۔(۱)

☆☆☆

(۱) بستان المحدثین ص ۳۷ واتحاف اتلاء المتقین ص ۱۵۷۔

امام ابوالحسن دارقطنی

متوفی ۳۸۵ھ

نام ونسب: ابوالحسن کنیت، علی نام اور نسب نامہ یہ ہے: علی بن عمر بن احمد بن مہدی بن مسعود بن نعمان بن دینار بن عبداللہ۔ (۱)

ولادت ووطن: صحیح روایت کے مطابق امام دارقطنی ۵/ ذوقعدہ ۳۰۶ھ کو بغداد کے ایک محلہ دارقطن میں پیدا ہوئے، یہ محلہ کرخ اور نہر عیسیٰ بن علی کے درمیان واقع اور متعدد اکابر کا مولد تھا لیکن بعد میں ویران ہوگیا، علامہ سمعانی کے بغداد تشریف لانے کے زمانہ میں یہ اجڑ چکا تھا۔ (۲)

اساتذہ: امام صاحب کے بعض مشہور شیوخ واساتذہ کے نام یہ ہیں:

قاضی ابراہیم بن حماد، ابن درید، ابن زیاد نیشاپوری، ابن نیروز، ابوبکر بن ابی داؤد سجستانی، ابوحامد بن ہارون حضرمی، ابوسعید عدوی، ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز، ابوجعفر احمد بن اسحاق بن بہلول، احمد بن عیسیٰ بن مسکین بلدی، احمد بن قاسم فرائضی، ابوطالب احمد بن نصر، عبداللہ بن ابی حیہ، علی بن عبداللہ بن بشر، فضل بن احمد زبیدی، ابوعلی محمد بن سلیمان مالکی، محمد بن قاسم محاربی، محمد بن نوح جندیسابوری، ابوعمر محمد بن یوسف قاضی ازدی، یحییٰ بن محمد بن صاعد، یوسف بن یعقوب نیشاپوری۔ (۳)

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ کتاب الانساب ورق ۲۱۷، المنتظم ج ۷ ص ۸۳ (۲) ایضاً وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹ (۳) ایضاً۔

تلامذہ: ان کے بعض مشہور تلامذہ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابوبکر احمد بن محمد برقانی، ابوبکر بن بشران، ابوحامد اسفرائینی، ابوالحسن بن الآبنوسی، ابوالحسین ابن مہتدی باللہ، ابوذر عبدابن احمد ہروی، ابوطالب بن عباری، ابوطاہر بن عبدالرحیم، قاضی ابوالطیب طبری ابوالقاسم بن بشران، ابوالقاسم بن محسن، ابومحمد جوہری، ابومحمد خلال، ابونعیم اصفہانی صاحب حلیۃ الاولیا، ابوالقاسم ازہری، تمام رازی صاحب فوائد مشہورہ، ابوعبداللہ حاکم صاحب المستدرک، ابوالقاسم حمزۃ بن محمد طاہر، ابوالقاسم حمزہ بن یوسف سہمی، ابوالقاسم عبدالصمد بن مامون ہاشمی، عبدالعزیز ازجی، حافظ عبدالغنی ازدی منذری صاحب ترغیب وترہیب، ابوعبدالرحمن محمد بن حسین سلمی۔(۱)

طلب حدیث کے لیے سفر: امام دارقطنی کو علم وفن خصوصاً احادیث نبویؐ سے غیر معمولی شغف تھا، وہ نہایت کمسنی میں اس فن کی تحصیل میں مشغول ہو گئے تھے، ابویوسف قواس کا بیان ہے کہ ”جب ہم بغوی کے پاس جاتے تھے تو دارقطنی بہت چھوٹے تھے، ان کے ہاتھ میں روٹی اور سالن ہوتا تھا“ امام صاحب کے زمانہ میں بغداد علمی حیثیت سے نہایت ممتاز اور نامور علما ومحدثین کا مرکز تھا، مگر وہ اپنی تشنگی علم کو بجھانے کے لیے بغداد کے علاوہ کوفہ، بصرہ، واسط، شام اور مصر وغیرہ متعدد مقامات میں تشریف لے گئے۔(۲)

حفظ وذکاوت: امام دارقطنی کا حافظہ غیر معمولی اور بے نظیر تھا، نہ صرف احادیث بلکہ دوسرے علوم کا بھی ان کا سینہ مخزن تھا، بعض شعرا کے دواوین ان کو ازبر تھے، قدیم عربوں کی طرح وہ تحریر وکتابت کے بجائے اکثر اپنے حافظہ ہی سے کام لیتے تھے، اپنے تلامذہ کو کتابیں زبانی املا کراتے تھے، تذکرہ نگاروں نے ان کو الحافظ الکبیر، الحافظ المشہور، کان عالماً حافظاً وغیرہ لکھا ہے، ذہبی نے ان کو حافظ الزمان کہا ہے، حاکم فرماتے ہیں کہ ”وہ حافظہ میں

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ وکتاب الانساب ورق ۲۱۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲۔

یکتائے روزگار تھے؛ "سمعانی کا بیان ہے کہ "دارقطنی کا حافظہ ضرب المثل تھا" علامہ ابن جوزی رقمطراز ہیں کہ "وہ حافظہ میں منفرد اور یگانہ عصر تھے،" حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "بچپن ہی سے دارقطنی اپنے نمایاں اور غیر معمولی حافظہ کے لیے مشہور تھے" ابوالطیب طاہری کا بیان ہے کہ "بغداد میں جو بھی حافظ حدیث آتا وہ امام دارقطنی کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا اور اس کے بعد اس کے لیے ان کی علمی بلند پائیگی اور حافظہ میں برتری اور تقدم کا اعتراف کرنا لازمی ہو جاتا تھا" ان کے حافظہ اور ذہانت کا یہ حال تھا کہ ایک ہی نشست میں ایک ہی روایت کی بیس بیس سندیں برجستہ بیان کر دیتے تھے، حافظ ذہبی نے اس طرح کے ایک واقعہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ اس کو دیکھ کر دارقطنی کی بے پناہ ذہانت، قوت حفظ اور غیر معمولی فہم و معرفت کے سامنے سرنگوں ہو جانا پڑتا ہے، شباب کے زمانہ میں ایک روز وہ اسماعیل صفار کے درس میں شریک ہوئے، وہ کچھ حدیثیں املا کرا رہے تھے، امام دارقطنی کے پاس کوئی مجموعہ حدیث تھا، یہ بیک وقت اس کو نقل بھی کرتے جاتے تھے اور صفار سے حدیثیں بھی سن رہے تھے، اس پر کسی شریک مجلس نے ان کو ٹوکا اور کہا تمہارا اسماع صحیح اور معتبر نہیں ہوسکتا، کیوں کہ تم لکھنے میں مشغول ہو اور شیخ کی مرویات کو ٹھیک سے سمجھنے اور سننے کی کوشش نہیں کرتے، امام دارقطنی نے جواب دیا کہ املا کو سمجھنے میں میرا طریقہ آپ سے مختلف ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت شیخ نے اب تک کتنی حدیثیں املا کرائی ہیں؟ اس شخص نے نفی میں جواب دیا تو آپ نے فرمایا کہ اب تک اٹھارہ حدیثیں املا کرائی ہیں، شمار کرنے پر وہ واقعی اٹھارہ ہی نکلیں، پھر آپ نے ایک ایک حدیث کو بے تکلف بیان کر دیا اور اسناد و متون میں وہی ترتیب بھی قائم رکھی جو شیخ نے بیان کی تھی، پورا مجمع اس حیرت انگیز ذہانت اور غیر معمولی حافظہ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

بعض مورخین کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ شریکِ مجلس کے بجائے خود شیخ اسماعیل صفار نے ان کو تنبیہ فرمائی تھی۔

ابوبکر برقانی کا بیان ہے کہ میں اکثر ابومسلم بن مہران کے سامنے دارقطنی کی تعریف کیا کرتا تھا، ایک دن انھوں نے کہا تم دارقطنی کی تعریف میں افراط اور غلو سے کام لیتے ہو، ذرا ان سے رضراض کی وہ حدیث دریافت کرو جو ابن مسعودؓ سے مروی ہے میرے دریافت کرنے پر امام صاحب نے نہ صرف وہ حدیث بلکہ اس کے اختلافِ وجوہ اور امام بخاری کی اس روایت کے بارے میں خطا بھی واضح کر دی اور میں نے اس کو بھی علل میں شامل کر لیا۔(۱)

ثقاہت: حافظہ کی طرح ان کی ثقاہت بھی مسلم ہے، خطیب نے ان کے مناقب میں راست بازی، امانت اور عدالت کا ذکر کیا ہے، صاحب مشکوٰۃ نے اپنے دیباچہ میں امام دارقطنی کو اکابر محدثین اور ائمہ متقنین میں شمار کیا ہے۔

علل و اسماء الرجال: وہ روایت کی طرح درایت کے بھی ماہر اور جرح و تعدیل کے فن میں امام تھے، ان کا شمار مشہور نقادان حدیث میں کیا جاتا ہے، ممتاز محدثین اور ائمہ فن نے ان کے اس کمال کا اعتراف کیا ہے، رجال کی تمام معتبر و متداول کتابوں میں ان کے نقد و جرح کے اقوال موجود ہیں، حافظ ذہبی فرماتے ہیں کہ ''امام کی عظمت و براعتِ شان دیکھنی ہو تو ان کی علل کا مطالعہ کرو، تم مبہوت ہو جاؤ گے'' سعد بن علی زمانی سے چار ہم عصر محدثین، بغداد کے دارقطنی، مصر کے عبدالغنی بن سعید، اصبہان کے ابوعبداللہ بن مندہ اور نیشاپور کے ابوعبداللہ حاکم کے متعلق سوال کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ ''دارقطنی علل سے واقفیت میں ان سب سے فائق ہیں۔'' خطیب کا بیان ہے کہ ''احادیث و آثار، عللِ حدیث، اسماء الرجال اور احوال و رواۃ کا علم ان پر ختم ہو گیا، حافظ ابن جوزی کا ارشاد ہے کہ ''امام دارقطنی کی علم حدیث، اسماء الرجال اور عللِ حدیث میں معرفت مسلم ہے'' حافظ ابن کثیر نے نہایت شاندار الفاظ میں ان کی ناقدانہ بصیرت و ژرف نگاہی کا اعتراف کیا ہے، فرماتے ہیں

(۱) تاریخ بغداد صفحات ۳۶ تا ۳۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۹۹ تا ۲۰۱ و بستان المحدثین ص ۴۶۔

"احادیث پر نظر اور علل وانتقاد کے اعتبار سے وہ نہایت عمدہ تھے، اپنے دور میں فن اسماء الرجال، علل اور جرح وتعدیل کے امام اور فن درایت میں مکمل دستگاہ رکھتے تھے۔" ان کے معاصر وشاگرد حاکم کا بیان ہے کہ "میں قیامِ بغداد کے زمانہ میں اکثر ان کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا، یہ واقعہ ہے کہ میں نے ان کی جس قدر تعریفیں سنی تھیں ان سے بڑھ کر ان کو پایا، میں ان سے شیوخ، رواۃ اور عللِ حدیث کے متعلق سوالات کرتا تھا اور وہ ان کا جواب دیتے تھے، میری شہادت ہے کہ روئے زمین پر ان کی کوئی نظیر موجود نہیں۔"(۱) شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ "فقہی احکام ومسائل اور حلال وحرام کی معرفت میں جو حیثیت مالک، سفیان ثوری، اوزاعی اور شافعی وغیرہ ائمہ فقہ کی رایوں اور اقوال کی ہے وہی حیثیت رجال اور صحیح وضعیف احادیث کے بارے میں یحییٰ بن معین، بخاری، مسلم، ابوحاتم، ابوزرعہ، نسائی، ابن عدی اور امام دارقطنی وغیرہ جہابذہ محدثین ونقادان فن کے کلام کی ہے۔"(۲) ان کی عظمت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علل میں ان کی تصنیف سب سے بہتر اور جامع خیال کی جاتی ہے اور اس فن میں ان کے بعض اولیات بھی ہیں، مثلاً مدبج (روایت اقران) کی ایجاد کا فخر ان ہی کو حاصل ہے، عراقی کا بیان ہے کہ "میرے علم کے بموجب دارقطنی نے سب سے پہلے اس اصطلاح کو وضع کیا ہے۔"(۳)

ازہری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ کسی حدیث کی علت یا کسی راوی کے متعلق محمد بن ابی الفوارس کو جواب دیتے ہوئے فرمایا: "اے ابوالفتح! مشرق ومغرب کے درمیان اس فن کا جاننے والا میرے سوا کوئی نہیں۔" حمزہ بن محمد بن طاہر دقاق نے مندرجہ ذیل شعروں میں ان کے کمال فن کا اعتراف کیا ہے:

---

(۱) تدریب الراوی ص ۲۷۷ تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۷ وتذکرہ ج ۳ ص ۲۰۰ کتاب الانساب ورق ۲۱۷، المنتظم ج ۷ ص ۱۸۳ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ (۲) الرد علی البکری ص ۱۳ (۳) تدریب الراوی ص ۲۱۷۔

جعلناك فيما بيننا ورسولنا ☆ وسيطا فلم تظلم ولم تتحرب

فانت الذی لولاك لم يعرف الوری ☆ ولو جهد واما صادق من مكذب

ترجمہ: اے امام حدیث! آپ ہمارے اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان بہترین اور عمدہ واسطہ ہیں اگر آپ کی پر کمالات ذات نہ ہوتی تو لوگ انتہائی کوششوں کے باوجود بھی سچے اور جھوٹے راویوں اور صحیح وغلط حدیثوں میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔"

حدیث واسماء الرجال سے ان کی گہری واقفیت کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے جملوں میں معمولی غلطی بھی کرتا تو وہ فوراً اس کو تاڑ جاتے اور بروقت اس کی اصلاح کر دیتے تھے، ایک مرتبہ خلال نے یہ حدیث پڑھی: اللهم انك عفو تحب العفو فاعف عني، اس میں انھوں نے عفو کو مخفف پڑھا تو امام صاحب نے فوراً ٹوکا کہ عفو مشدد ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں "عللِ حدیث ورجال کی معرفت میں یگانہ روزگار اور عدیم المثال تھے،" حاکم اور اس فن کے دوسرے ممتاز ائمہ نے اس کا اعتراف کیا ہے۔(۱)

حدیث میں درجہ: امام دارقطنی کو اصل شہرت حدیث میں امتیاز کی بنا پر حاصل ہے، ان کے حفظ وضبط، ثقاہت واتقان، روایت ودرایت میں مہارت اور علل کی معرفت وغیرہ کے متعلق جو کچھ لکھا گیا، اس سے بھی ان کے حدیث میں کمال، بلند پائیگی اور تبحر کا پوری طرح اندازہ ہو جاتا ہے، ائمہ فن اور نامور محدثین نے ان کے عظیم المرتبت اور صاحب کمال محدث ہونے کا اعتراف کیا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ "احادیث وآثار کا علم ان پر ختم ہو گیا، وہ حدیث میں یکتائے روزگار، عجوبۂ دہر اور امام فن تھے،" امام بخاری کی طرح امام دارقطنی کو بھی ان کے زمانہ میں امیر المومنین فی الحدیث (اقلیم حدیث کے تاجدار) کا خطاب ملا تھا، عبدالغنی بن سعید کا بیان ہے کہ "حدیث پر بحث وگفتگو میں تین اشخاص اپنے اپنے زمانہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۸، ۳۹ و تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۱ و بستان المحدثین ص ۴۶۔

میں نہایت ممتاز تھے، علی بن مدینی، موسیٰ بن ہارون اور علی بن عمر دارقطنی،'' علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں،'' وہ علم حدیث میں منفرد اور امام تھے، ان کے معاصرین میں کوئی اس رتبہ اور پایہ کا شخص نہیں گذرا، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں، روایت کی وسعت و کثرت کے اعتبار سے وہ امامِ دہر تھے، ابن عماد حنبلی کہتے ہیں'' حدیث اور اس کے متعلق فنون میں وہ منتہی تھے اور اس میں امیر المومنین کہلاتے تھے،'' ابوبکر بن ہبۃ اللہ صاحب طبقات الشافعیہ..... لکھتے ہیں کہ '' وہ اپنے دور میں حدیث کے امام تھے،'' ابوالطیب طبری کا بیان ہے کہ امام صاحب کی مجلس میں ایک روز مسِ ذکر کی حدیث پڑھی جا رہی تھی، امام صاحب نے اس کے بے شمار طرق جمع کر کے اس کے فوائد پر عمدہ تقریر کی اور اس کے بعد فرمایا کہ اگر امام احمد بھی اس وقت موجود ہوتے تو وہ اس معاملہ میں مجھ سے استفادہ کرتے۔'' (۱)

امام صاحب کے اس فن میں مقام و مرتبہ کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ صحاح ستہ کے مصنفین کے بعد جن مصنفین کو معتبر اور جن کی تصنیفات کو مستند اور زیادہ پر منفعت خیال کیا گیا ہے، ان میں ان کا نام نامی بھی ہے، ابن صلاح، نووی، صاحبِ مشکوٰۃ اور علامہ سیوطی نے اس حیثیت سے ان کا ذکر و اعتراف کیا ہے۔ (۲)

فقہ وخلافیات: امام صاحب فقہ میں ممتاز فقہا کے مذاہب و مسالک کے نہایت واقف کار اور خلافیات کے بڑے ماہر تھے، ان کی سنن بھی اس پر شاہد ہے، خطیب لکھتے ہیں کہ '' حدیث کے علاوہ مذاہب فقہا کی معرفت میں بھی ان کا درجہ نہایت بلند ہے'' کتاب السنن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو فقہ سے بڑا اعتنا و اشتغال تھا، کیوں کہ کتاب کے محتویات و مشمولات کو وہی شخص جمع اور مرتب کر سکتا ہے جس کو احکام و مسائل اور فقہا کے

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴، ۳۶، ۳۸ و ابن خلکان ج ۲ ص ۵ و البدایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷، طبقات الشافعیہ لابی بکر ص ۳۳، شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۱۶ و کتاب الانساب ورق ۲۱۷ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ تدریب الراوی ص ۶۰ ۲ مقدمہ کمال ص ۱۷۔

اختلافات سے اچھی اور پوری طرح واقفیت ہو، اس فن کو انھوں نے ابوسعید اصطخری اور ایک روایت کے مطابق ان کے کسی خاص شاگرد سے حاصل کیا تھا، مورخین اور سوانح نگاروں کا متفقہ بیان ہے کہ: وکان عارفا باختلاف الفقهاء (۱)

فقہی مذہب: اگرچہ امام دارقطنی شافعی المذہب تھے لیکن ان کا شمار اس مذہب کے صاحبِ وجوہ فقہا میں ہوتا ہے، صاحبِ وجوہ وہ فقہا کہلاتے ہیں جنھوں نے اپنے ائمہ کے مذاہب کی تکمیل اور ان سے منسوب مختلف روایتوں کے درمیان تطبیق وترجیح اور ان کے وجوہ وعلل واضح کئے ہیں اور جن مسائل کے متعلق ان کے ائمہ کی تصریحات موجود نہیں تھیں، ان کو ان کے اصول وعلل پر قیاس کر کے فتوی دیا ہے۔'' ابن خلکان نے دارقطنی کو فقیہا علی مذہب الشافعی اور یافعی نے صاحب الوجوہ فی المذہب لکھا ہے۔ (۲)

نحو، تفسیر، قرأت وتجوید: امام صاحب کو علم نحو، فن قرأت وتجوید میں ید طولیٰ حاصل تھا اور تفسیری وقرآنی علوم سے بڑا شغف تھا، ابوالفدا کا بیان ہے کہ ''وہ قرآنیات کے امام تھے؛'' حاکم کہتے ہیں کہ وہ نحاۃ وقراء کے امام اور تجوید وقرأت میں بلند پایہ تھے، انھوں نے حروف ومخارج کی تصحیح وادائیگی کا علم بچپن میں ابوبکر بن مجاہد سے سیکھا اور محمد بن حسین نقاش طبری، احمد بن محمد دیباجی ابوسعید قزاز وغیرہ ماہرین فن سے اس کی باقاعدہ تکمیل کی اور آخر عمر میں خود اس فن میں مرتبہ امامت واجتہاد پر فائز ہو گئے اور اس میں ایک رسالہ بھی لکھا، اس میں قدیم قراء سے مختلف ایک نیا طرز انھوں نے ایجاد کیا تھا، یہ طرز بعد میں مقبول ہوا اور لوگوں نے اسے اختیار کیا۔ (۳)

شعر وادب: امام دارقطنی شعر وادب کا بھی عمدہ ذوق رکھتے تھے، بعض شعرا کے دواوین ان کو زبانی یاد تھے، عربی زبان وادب پر ان کو اس قدر قدرت اور کامل عبور تھا کہ ایک دفعہ مصر

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۵ التاج المکلل ص ۹۵ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۵ ومرأۃ الجنان ج ۲ ص ۴۲۵ (۳) تاریخ ابوالفدا ج ۲ ص ۱۳۰ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰ و ۲۰۳ وتاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴ و ۳۵۔

تشریف لے گئے تو وہاں علوی خاندان کے ایک شخص مسلم بن عبداللہ موجود تھے، یہ ادب، فصاحت و بلاغت اور زبان دانی کے بڑے ماہر تھے، ان کے پاس زبیر بن بکار کی کتاب الانساب تھی جس کو حضر بن داؤد نے ان سے روایت کیا تھا اور جو انساب کے علاوہ اشعار اور ادبی فکاہات و لطائف کا بھی بہترین مجموعہ تھی، لوگوں نے امام دارقطنی سے اس کی قرأت کی فرمائش کی، امام صاحب نے سب کے شدید اصرار کی وجہ سے اس کو منظور کر لیا، چنانچہ اس تقریب کے لیے ایک مجلس کا اہتمام کیا گیا، اس میں مصر کے نامور علما و فضلا اور اساطینِ شعر و ادب بھی شریک ہوئے تا کہ امام دارقطنی کی غلطیوں کی گرفت کر سکیں لیکن ان لوگوں کو ناکامی ہوئی، امام کے حیرت انگیز کمال کو دیکھ کر سب دنگ رہ گئے، خود مسلم کو بھی ان کے ادبی مذاق کی پختگی و بلندی اور عربی زبان پر غیر معمولی قدرت اور دسترس کا اعتراف کرنا پڑا۔(۱)

جامعیت: ان گونا گوں کمالات سے ان کی جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے، گو ان کو اصل شہرت حدیث میں امتیاز کی وجہ سے ہے تاہم وہ کسی فن میں بھی عاجز و قاصر نہ تھے، خطیب کا بیان ہے کہ "حدیث کے علاوہ بھی متعدد علوم و فنون میں ان کو درک و مہارت تھی۔" ازہری کا بیان ہے کہ امام دارقطنی بڑے ذہین و طباع تھے، ان کے سامنے کسی علم کا بھی تذکرہ کیا جاتا تو اس کے متعلق معلومات کا بیشار ذخیرہ ان کے پاس ہوتا، محمد بن طلحہ بغالی ایک روز ان کے ساتھ کسی دعوت میں شریک تھے، جب کھانے پر گفتگو چھڑی تو دارقطنی نے اس کے اتنے واقعات و حکایات اور نوادر و عجائب بیان کئے کہ رات کا اکثر حصہ ختم ہو گیا، حاکم سے دریافت کیا گیا کہ کیا آپ نے دارقطنی کی طرح کوئی جامعِ کمالات شخص دیکھا ہے، تو انھوں نے نفی میں جواب دیا، ابوالفدا کا بیان ہے کہ وہ متعدد علوم میں جامع تھے۔(۲)

فہم و دانش: اللہ تعالیٰ نے ان کو فہم و دانش سے بھی سرفراز کیا تھا، حاکم کا بیان ہے کہ امام

(۱) تذکرۃ الحفاظ و تاریخ بغداد حوالۂ مذکورہ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۶ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰ و تاریخ ابوالفدا ء ج ۲ ص ۱۳۰۔

دارقطنی اس حیثیت سے بھی یکتائے روزگار تھے، خطیب نے ان کے فقہ وفہم کی تعریف کی ہے۔(۱)

ورع وتقویٰ: حاکم کا بیان ہے کہ وہ ورع وتقویٰ میں بے مثال تھے، خلال کا بیان ہے ایک روز میں اپنے ایک استاد کے یہاں گیا وہاں ابوالحسین بن مظفر، قاضی ابوالحسن جراحی اور امام دارقطنی وغیرہ ائمہ فن واصحاب کمال موجود تھے، جب نماز کا وقت ہوا تو دارقطنی نے امامت کی، حالانکہ اس مجلس میں ان سے زیادہ معمر مشائخ موجود تھے، امام صاحب دین کے معاملہ میں کسی مصلحت، نرمی اور مداہنت کو پسند نہیں کرتے تھے، ان کے زمانہ میں شیعیت کا زور تھا لیکن انھوں نے شیعوں کے علی الرغم حضرت عثمانؓ کو حضرت علیؓ سے افضل قرار دیا۔(۲)

شہرت ومقبولیت: امام صاحب اپنے بے شمار کمالات کی وجہ سے نہایت مقبول ومحترم سمجھے جاتے تھے، امام اور شیخ الاسلام ان کے نام کا جز ہو گیا تھا، جب مسندِ درس پر رونق افروز ہوتے تو تشنگانِ علوم کا ہجوم اردگرد رہتا تھا، آپ کی مجلسِ درس نہایت باوقار اور پر ہیبت ہوتی تھی، نامور محدثین کو بھی احترام کی وجہ سے لب کشائی کی جرأت نہیں ہوتی تھی، ابن شاہین ایک مرتبہ ان کے درس میں شریک ہوئے تو ان پر اس قدر ہیبت طاری ہوئی کہ ایک کلمہ بھی زبان پر نہ لا سکے کہ مبادا کوئی غلطی ہو جائے، آپ کے تلامذہ ہمیشہ آپ کا نام عزت واحترام کے ساتھ لیتے تھے، عبدالغنی جو خود بھی نامور اور صاحب کمال محدث تھے اور بقول برقانی دارقطنی کے بعد میں نے ان سے بڑا کوئی حافظِ حدیث نہیں دیکھا لیکن جب بھی وہ دارقطنی کے حوالہ سے کوئی بات بیان کرتے تو قال استاذی سمعت استاذی وغیرہ ضرور کہتے، اس کا سبب دریافت کیا گیا تو نہایت فراخ دلی کے ساتھ اعتراف کیا کہ ہم نے یہ جو دو چار حروف سیکھے ہیں وہ ان ہی امام دارقطنی کا فیض ہے۔(۳)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ص ۳۴ وتذکرہ حوالہ مذکورہ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۲ص ۳۸ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۶ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۱۹۶۔

لطائف وظرائف: امام صاحب بڑے پر مذاق اور شگفتہ مزاج تھے، اس لیے لطف وتفریح مزاح وتفنن اور دلچسپی کی باتیں بھی کرتے تھے، ایک روز ابوالحسن بیضاوی آپ کی خدمت میں ایک شخص کو لے کر آئے اور آپ سے کچھ حدیثیں املا کرانے کی فرمائش کی، امام صاحب نے پہلے معذرت کی اور کہا مجھے فرصت نہیں ہے لیکن بیضاوی نے اصرار کیا اور کہا کہ یہ مسافر ہیں اور دور دراز سے محض حدیث کی تلاش وتحصیل کے لیے آئے ہیں، امام صاحب نے اسی وقت اپنی یادداشت سے ایک حدیث بیس طرق اور سندوں سے بیان کی، سب کا متن یہ تھا نعم الشی الهدية امام الحاجة۔ یعنی حاجت اور غرض پیش کرنے سے پہلے ہدیہ کرنا بہت عمدہ بات ہے، جب دوسرے دن یہ صاحب پھر تشریف لائے تو اپنے ساتھ کچھ مناسب ہدیہ بھی لائے، امام دارقطنی نے ان کو اپنے قریب بیٹھایا اور ایک حدیث سترہ طرق سے زبانی املا کرائی جس کا متن یہ تھا:

اذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ — جب کسی قوم کا سردار یا شریف آدمی تمہارے پاس آئے تو اس کی تعظیم کرو۔

ان کی شگفتگی مزاج کا ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ ایک دن نفل پڑھ رہے تھے، اتفاقاً ان کے پاس ہی ایک شخص کسی مجموعۂ حدیث کے مطالعہ میں مشغول تھا، اس نے ایک راوی نسیر (بنون وسین مصغر) کو بشیر (بباۓ موحدہ وشین معجمہ) پڑھا، امام دارقطنی نے نماز ہی میں ان کو متنبہ کرنے کے لیے سبحان اللہ کہا وہ سمجھ گئے لیکن دوبارہ بھی غلط ہی پڑھا اور نسیر کہنے کے بجائے یسیر (بضم یا وسین مصغر) کہا، امام صاحب نے دیکھا کہ اب بھی وہ صحیح نہیں پڑھ رہا ہے تو یہ آیت تلاوت کی: (ن والقلم ومایسطرون) تب قاری نے سمجھا کہ یہ نسیر ہے۔(۱)

---

(۱) امام دارقطنی شافعی المذہب تھے، شوافع کے یہاں نماز میں اس طور پر تلقین کرنا جائز ہے مگر امام ابوحنیفہؒ کے یہاں جائز نہیں ہے۔

اسی قسم کا ایک لطیفہ اور بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن وہ نفل ادا کر رہے تھے کہ ابوعبداللہ کاتب نے عمرو بن شعیب کا نام غلطی سے عمرو بن سعید پڑھا، امام دارقطنی نے سبحان اللہ کہا قاری سمجھ گیا کہ میں نے غلط پڑھا ہے، اس لیے سند دہرا کر خاموش ہوگیا، امام صاحب نے اس کی تصحیح کے لیے یہ آیت پڑھی (يَاشُعَيْبُ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ)(۱)

یہ واقعات محض لطائف ہی نہیں ہیں بلکہ ان سے امام صاحب کی ذہانت، قوتِ حفظ، استحضارِ علم اور حدیث میں بالغ نظری اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔

اخلاق وعادات: امام صاحب کے اخلاق وعادات کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا لیکن بعض واقعات اور مورخین کے ضمنی بیانات سے ان کی طبعی شرافت اور حسن اخلاق کا پتہ چلتا ہے، مثلاً وہ فضول باتوں کو سخت ناپسند کرتے تھے اور خاموشی کو پسند کرتے تھے، طبیعت میں نرمی اور انکساری تھی، لوگوں کی دلآزاری سے پرہیز کرتے تھے، طلبہ کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے تھے، ان کی علمی امداد واعانت بھی کرتے، امام صاحب کی شگفتہ مزاجی اور بذلہ سنجی سے بھی ان کے حسنِ اخلاق کا پتہ چلتا ہے۔

عقائد: وہ بڑے صحیح العقیدہ تھے، مذہبی واعتقادی مسائل میں ان کا مسلک وہی تھا جو اہلسنت والجماعت کا ہے، مورخ خطیب لکھتے ہیں کہ وہ فہم وفراست، حفظ وذکاوت، صدق وامانت اور ثقاہت وعدالت وغیرہ اوصاف کی طرح صحتِ اعتقاد اور سلامتی مذہب سے بھی متصف تھے، (۲) دوسرے مورخین نے بھی ان کے عقیدہ کی صحت ودرستگی کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے باوجود ان پر شیعیت کا الزام عائد کیا جاتا ہے، اس پر آگے بحث کی جائے گی۔

وفات: مشہور روایت کے مطابق ان کا انتقال ۸/ ذوقعدہ ۳۸۵ھ کو ہوا، مشہور فقیہ ابوحامد اسفرائنی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور مشہور بزرگ معروف کرخی کے مزار کے متصل بابِ

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۹، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۰۱، بستان المحدثین ص ۴۶ واتحاف النبلاء المتقین ص ۳۱۷ (۲) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴۔

حرب میں سپرد خاک کیے گئے، ابونصر بن ماکولا کا بیان ہے کہ میں نے رمضان کی ایک رات میں خواب دیکھا کہ کسی سے امام دارقطنی کے اخروی انجام کے بارے میں سوال کر رہا ہوں اور وہ یہ جواب دے رہے ہیں کہ جنت میں دارقطنی امام کہلاتے ہیں۔(۱)

امام دارقطنی پر بعض اعتراضات: امام دارقطنی کی عظمتِ شان اور زہد و اتقا میں امتیاز کے باوجود ان پر چند اعتراضات کیے گئے ہیں اس لیے ذیل میں ان کو نقل کر کے ان کا جواب تحریر کیا جاتا ہے۔

شیعیت کا الزام: ان پر سب سے بڑا الزام شیعیت کا لگایا گیا ہے لیکن اس کی حقیقت صرف اس قدر بیان کی جاتی ہے کہ ان کو مشہور شیعی شاعر سید حمیری (۲) کا دیوان زبانی یاد تھا، چنانچہ خطیب لکھتے ہیں کہ ''میں نے حمزہ بن محمد بن طاہر دقاق کو یہ کہتے سنا کہ ابوالحسن دارقطنی کو منجملہ اور دواوین کے سید حمیری کا دیوان بھی زبانی یاد تھا، اسی وجہ سے ان کی طرف شیعیت کی نسبت کی جاتی ہے، ابن خلکان کا بیان ہے کہ ان کو جن عرب شعرا کے دواوین یاد تھے ان میں سید حمیری کا دیوان بھی تھا، اسی لیے ان پر شیعیت کا الزام لگایا گیا ہے،(۳) دوسرے مورخین نے بھی اسی چیز کو نقل کیا ہے اس کے علاوہ امام صاحب کی شیعیت کا اور کوئی

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ص ۴۰ وابن خلکان ج ۲ص ۵و۶ (۲) اس کا نام اسماعیل، کنیت ابوالہاشم اور نسب نامہ یہ ہے: اسماعیل بن محمد بن یزید بن ربیعہ بن مضر حمیری، اس کی ماں قبیلہ ازد کی تھی، یہ بڑا مشہور اور باکمال پرگو شاعر تھا لیکن نہایت دریدہ دہن، بدزبان اور غالی شیعہ تھا، ہجوگوئی کے لیے مشہور تھا، زیاد کی ہجو کہی تو اس کے لڑکے عبیداللہ نے اس کو قید کر لیا اور سخت سزائیں دیں لیکن حضرت معاویہؓ نے اسے آزاد کر دیا، صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہراتؓ کی شان میں طعن و تشنیع، سب و شتم اور گستاخی و دریدہ دہنی اس کا شعار بن گیا تھا، اللہ کی شان دیکھیے کہ اس کے کمالات کے باوجود اس کی یاوہ گوئی اور دریدہ دہنی کی وجہ سے اس کا نام ونشان اور کلام سب مٹ گیا (کتاب الاغانی ج ۷ص ۲)(۳) تاریخ بغداد ج ۱۲ص ۳۵ و تاریخ ابن خلکان ج ۲ص ۶۔

ثبوت نہیں بیان کیا گیا ہے۔

ظاہر ہے محض اتنی سی بات پر امام صاحب کو شیعیت سے متہم کرنا غلط اور سراسر خلافِ انصاف ہے، یہ پہلے گذر چکا ہے کہ ان کو زبان وادب اور شعر وسخن کا عمدہ ذوق تھا، اپنے اس ذوق کی تسکین کے لیے وہ ادب ومحاضرات کی کتابوں اور شعرا کے دواوین کا دلچسپی سے مطالعہ کرتے تھے، ان کا حافظہ نہایت قوی تھا، اس لیے اکثر چیزیں ان کے لوحِ قلب پر نقش ہو جاتی تھیں، سید حمیری یاوہ گو اور شیعہ ہونے کے باوجود ایک باکمال شاعر تھا، اس کا کلام ادبی لطائف ورعنائی سے معمور ہوتا تھا، اس کی خوبیوں اور لطفِ زبان کی وجہ سے امام صاحب کو اس اس سے دلچسپی رہی ہوگی اور یہ ان کو زبانی یاد ہو گیا ہوگا لیکن اس کا شیعیت سے کیا تعلق؟ یہ تو درحقیقت فن اور اہل علم کی قدردانی ہے لیکن تاریخِ اسلام میں جس طرح بے شمار مقدس اور برگزیدہ علمائے اسلام کو بے بنیاد اعتراضات اور بے سروپا الزامات کا نشانہ بنایا گیا ہے، اسی طرح امام صاحب پر بھی یہ الزام عائد کر دیا گیا اور اکابر پر ممکن ہے اس قسم کے الزامات کے کچھ وجوہ رہے ہوں لیکن امام دارقطنی کو شیعیت سے متہم کرنے کی معمولی وجہ بھی موجود نہیں ہے، چنانچہ حافظ ذہبی نے اس الزام کا ذکر کرنے کے فوراً بعد ہی اس کی پرزور تردید بھی کی ہے ما ابعد من التشیع یعنی ان کا شیعیت سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ (تذکرہ ج ۳ ص ۲۰۰)

امام صاحب کے حالات وواقعاتِ زندگی سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے، کیوں کہ بعض ایسے صریح قرائن اور واضح شواہد موجود ہیں جن سے امام صاحب کی شیعیت سے بیزاری کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً:

ابن طاہر کا بیان ہے کہ بغداد میں ایک بار تفضیلِ علیؓ کے متعلق اختلاف ہوا لوگ امام دارقطنی کی خدمت میں استفسار کے لیے آئے، انھوں نے پہلے تو خاموشی اختیار کی مگر پھر فوراً ان کو خیال ہوا کہ یہ ایک مذہبی واعتقادی مسئلہ ہے اس میں مصالح کو دخل دینا

اور کتمانِ حق سے کام لینا نامناسب ہوگا، اس لیے بلا جھجک یہ فرمایا کہ حضرت عثمانؓ افضل ہیں کیوں کہ صحابہ کا اس پر فی الجملہ اتفاق ہے اور یہی اہلسنت والجماعت کا مسلک ہے،(۱) ایسے زمانہ میں جب شیعیت کا اس قدر غلبہ رہا ہو اس قسم کی بات کہنا حق گوئی، جرأت اور بیباکی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

امام دارقطنی کے اساتذہ میں ایک شخص کا نام ابوالعباس احمد بن محمد بن سعید کوفی الملقب بابن عقدہ ہے، یہ اگرچہ جلیل القدر محدث ہیں لیکن ان کا شیعیت کی جانب رجحان تھا، اس لیے امام صاحب ان کو ناپسند کرتے تھے، چنانچہ ایک موقع پر ان کے متعلق فرمایا:

حافظ محدث ولم يكن في	وہ حافظ ومحدث تھے لیکن دین میں
الدين بقوى لاازيد فيه على	زیادہ قوی نہیں تھے، اس سے زیادہ میں
هذا۔	ان کے بارے میں اور کچھ نہیں کہوں گا

لیکن حمزہ بن محمد بن طاہر فرماتے ہیں کہ امام دارقطنی نے ان کے بارے میں کسی قدر سخت الفاظ بھی کہے ہیں حافظ ذہبی لکھتے ہیں کانه يشير الى الرفض (۲)(گویا اس سے ان کی شیعیت کی طرف اشارہ تھا)

ان واضح اور صریح واقعات کی موجودگی میں یہ باور کرنا مشکل ہے کہ ان کا شیعیت سے ادنیٰ تعلق بھی رہا ہوگا، ان کے فضل وکمال تدین وتقویٰ اور عقیدہ میں صحت وپختگی کا پہلے جو ذکر ہو چکا ہے اس کے بعد ان کے متعلق اس قسم کے الزام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

تدلیس: دوسرا اعتراض تدلیس کا ہے، ذہبی نے اس کی مثال دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے بغوی سے جو روایتیں نہیں سنی ہیں ان کو اس طرح بیان کرتے تھے "قرء البغوى ابى القاسم حدثكم فلان." اس اعتراض کی بنیاد اس امر پر ہے کہ بغوی کی وفات

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۲ و ۵۹ و میزان الاعتدال ج ۱ ص ۶۵۔

کے وقت امام صاحب کمسن تھے، ابو یوسف قواس کا بیان ہے کہ ''ہم لوگ بغوی کے پاس جاتے تھے تو دارقطنی بھی ہمارے پیچھے پیچھے جاتے تھے، یہ اس وقت اتنے چھوٹے تھے کہ ان کے ہاتھ میں روٹی اور سالن ہوتا تھا لیکن اس بیان سے خود دارقطنی کی بغوی سے ملاقات اور سماع کا ثبوت ملتا ہے کیوں کہ مشہور روایت کے مطابق امام دارقطنی ۳۰۶ھ میں پیدا ہوئے اور ابوالقاسم عبداللہ بن محمد بن عبدالعزیز بغوی نے ۳۱۷ھ میں انتقال کیا، دوسرے ان دونوں بزرگوں کا وطن بغداد تھا، اس اعتبار سے گیارہ سال کی عمر میں اپنے وطن کے شیخ سے سماع واستفادہ میں دشواری کی کوئی بات معلوم نہیں ہوتی رہا تدلیس کا معاملہ تو اس کا ذہبی کے علاوہ کسی اور نے ذکر نہیں کیا ہے اگر تنہا ذہبی کی حکایت صحیح مان لی جائے تو بھی محض نفس تدلیس ثقاہت کے لیے مانع نہیں ہے۔

خودستائی: امام دارقطنی نے بعض مواقع پر خود اپنی ہی زبان سے اپنی تعریف کی ہے، اس کو پہلے لکھا جا چکا ہے مگر اس کا جائزہ لینے کے لیے اس کو دوبارہ نقل کرنا ضروری ہے۔

ایک موقع پر آپ نے اپنے کو سب سے جامع اور افضل قرار دیا، ایک موقع پر کچھ حدیثوں کا املا کرانے اور ان کے فوائد پر تقریر کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر امام احمد بھی موجود ہوتے تو استفادہ کرتے، اسی طرح ایک دفعہ ایک حدیث کی علت کے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے ابن ابی الفوارس سے یہ کہا کہ ''شرق وغرب میں اس فن کا مجھ سے بہتر کوئی جاننے والا نہیں۔''

بلاشبہ اپنی تعریف خود ہی کرنا معیوب ضرور ہے لیکن اگر یہ خلاف واقعہ نہ ہو تو بعض حالات جیسے تحدیث نعمت، طلبہ کی ترغیب وتشویق اور لوگوں کی خواہش واصرار یا اور کسی ضرورت ومجبوری کی بنا پر اس میں قباحت نہیں رہ جاتی ہے، دوسرے یہ کوئی ایسی معصیت نہیں ہے جس کی کسی حال میں بھی گنجائش نہ ہو، امام صاحب کے جو اوصاف وکمالات پہلے بیان کیے گئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی جانب کوئی خلاف واقعہ بات

منسوب نہیں کی ہے اور آپ کی عظمت و بلند پائیگی اور شان زہد وورع سے یہ بعید بھی ہے کہ بلاکسی خاص ضرورت اور وجہ کے خودستائی سے آپ کی زبان آلودہ ہوئی ہو چنانچہ اپنی جامعیت کا تذکرہ کرنے سے پہلے آپ نے سوال کو ٹالنے کی پوری کوشش کی، یہاں تک کہ قرآن مجید کی یہ آیت پڑھی:

فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ. (۱) (نجم-۲)	سوتم (بہت) اپنی پاکیزگی (جتایا) نہ کرو پرہیزگاروں کو وہی خوب جانتا ہے۔

لیکن اس پر بھی سائل خاموش نہ ہوا اور مصلحت داعی ہوئی تو آپ نے مناسب اور جائز وصف کا تذکرہ کیا، اسی پر دوسرے مواقع کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔

یافعی کا اعتراض: امام دارقطنی طلبہ کی حوصلہ افزائی اور اہل علم کے علمی و تصنیفی کاموں میں ان کی امداد کرتے تھے، ان کے شاگرد عبدالغنی کی کتاب المؤتلف والمختلف درحقیقت ان ہی سے استفادہ کا نتیجہ تھی، اسی طرح کافور اخشیدی کے وزیر ابوالفضل جعفر المعروف بابن خنزابہ کے بارے میں آپ کو معلوم ہوا کہ وہ مسند تالیف کرنا چاہتے ہیں تو بغداد سے مصر تشریف لے گئے اور مسند کی تالیف تک وہاں قیام پذیر رہ کر اس کی امداد فرماتے رہے، ابوالفضل نے آپ کی خوب پذیرائی اور بڑا اعزاز واکرام کیا اور واپسی کے وقت اس قدر مال و دولت آپ کے ہمراہ کیا کہ آپ کو ایک حد تک فراغت میسر آگئی۔ (۲)

بظاہر اس واقعہ میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت امام صاحب کی علم دوستی کا ثبوت ہے لیکن یافعی صاحب مرآۃ الجنان نے اس کو ان کی شان کے منافی اور خلاف اولیٰ قرار دیا ہے، وہ لکھتے ہیں: ''امام صاحب نے اگرچہ ابن خنزابہ کو مسند کی

(۱) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۵ وتذکرہ ج ۳ ص ۲۰۱ وابن خلکان ج ۲ ص ۵۔ (۲) یہ واقعہ تمام کتابوں میں مذکور ہے۔

تخریج میں مدد پہنچانے کے لیے یہ سفر کیا تھا لیکن علمائے متدینین کے لئے میں اس کو مناسب نہیں سمجھتا، اگر اس قسم کا معاملہ وزرا وامرا کے بجائے اصحابِ علم ودین کے ساتھ کیا گیا ہوتا اور اس میں حصولِ دنیا کی کوئی آرزو شامل نہ ہوتی تو البتہ یہ ایک اچھی بات ہوتی اور اس کو اشاعتِ علم اور اعانت فی الخیر پر محمول کیا جاتا۔(۱)

اس اعتراض کا تجزیہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صاحب نے مسند کی تالیف میں مدد پہنچا کر وزیر سے اپنے علم وفن کا معاوضہ قبول کیا، حالاں کہ اولاً تو معاوضہ قبول کرنے کی اکثر علما کے یہاں گنجائش ہے، دوسرے یہ معاملہ سرے سے معاوضہ میں داخل ہی نہیں ہے کیوں کہ امام صاحب نے پہلے سے اس قسم کا کوئی مطالبہ یا معاملہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے خود اور بلا طلب آپ کی امداد کی تھی، امام صاحب کی معاشی حالت اچھی نہیں تھی، اس لیے آپ نے اس کے انعام واکرام سے مستفید ہونا قبول کرلیا، کہیں اس قسم کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے کہ آپ نے حرص ولالچ کی وجہ سے یہ سفر کیا تھا۔

تعصب: امام دارقطنی پر یہ اعتراض بھی کیا گیا ہے کہ وہ متعصب تھے، شافعی مذہب میں ان کو غیر معمولی غلو تھا اور اس کے برعکس وہ حنفی مذہب سے سخت عناد رکھتے تھے، پہلی بات کے ثبوت میں یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے مصر کے لوگوں کی فرمائش پر ایک رسالہ تحریر کیا، اس میں انھوں نے جہری نمازوں میں زور سے بسم اللہ پڑھنے کے متعلق حدیثیں جمع کی تھیں لیکن جب ان سے ان حدیثوں کی صحت کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے اعتراف کیا کہ ''جہر بالبسملہ کے متعلق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے، البتہ صحابۂ کرام سے اس کے متعلق صحیح اور ضعیف دونوں قسم کی روایتیں ملتی ہیں۔(۲)

اس واقعہ سے امام دارقطنی پر دو شبہات عائد ہوتے ہیں:

۱- انھوں نے جان بوجھ کر ضعیف اور غیر ثابت حدیثیں جمع کیں۔

(۱) مرآۃ الجنان ج ۲ ص ۴۲ (۲) فتاوی ابن تیمیہ ج ۱ ص ۷۷ و نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۸ و ۳۵۹، کبیری ص ۳۶

(۲) اس علم وواقفیت کے باوجود بھی کہ صحیح حدیثوں سے جہر بالبسملہ کی تائید نہیں ہوتی، انھوں نے اس سے رجوع نہیں کیا۔

پہلے شبہ کا جواب یہ ہے کہ امام صاحب کا مقصد اس باب کی تمام احادیث کا استقصا اور ایک جامع رسالہ تالیف کرنا تھا، اس لیے انھوں نے اس میں ضعیف حدیثیں بھی درج کردی ہیں چنانچہ سنن میں تحریر فرماتے ہیں:

> ''ان لوگوں کے علاوہ جن کا یہاں ہم نے نام لیا ہے، صحابۂ کرام اور ازواج مطہرات کی ایک جماعت نے جہر بالبسملہ کی حدیثیں بیان کی ہیں، ان کی اس نوعیت کی حدیثوں کو ہم مستقلاً کتاب الجہر میں لکھ چکے ہیں، یہاں اختصار کی وجہ سے ان ہی چند لوگوں کی روایتوں پر اکتفا کیا گیا ہے، اس رسالہ میں ان صحابہ وتابعین کے مرویات بھی جمع کئے گئے ہیں جو بسم اللہ زور سے پڑھنے کے قائل ہیں اور ان کے بھی جو ان کے مخالف یعنی آہستہ سے پڑھنے کے قائل ہیں۔'' (۱)

اس کا جماعتی عصبیت سے کوئی تعلق نہیں، اگر امام دارقطنی کے پیش نظر جماعتی عصبیت ہوتی تو وہ اس میں اور سنن میں صرف جہر کی موید حدیثیں ہی شامل کرتے لیکن انھوں نے موید کے ساتھ مخالف حدیثیں بھی درج کر کے درحقیقت انصاف اور حقیقت پسندی کا ثبوت دیا ہے، اس معاملہ میں انھوں نے مصر کے جو شوافع کا مرکز تھا لوگوں کی خواہش اور مرضی کی بھی کوئی پروانہ کی، جو چاہتے تھے کہ امام صاحب صرف جہر کی موید حدیثیں جمع کریں، مگر امام صاحب نے استقصاء وجامعیت کے پیش نظر ہر قسم کی حدیثیں جمع کیں اور لوگوں کے سوال پر صاف صاف اقرار بھی کرلیا کہ جہر کے متعلق کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں، اسی طرح سنن میں بھی اس نوعیت کی بعض حدیثوں کے ضعف ووہن کی وضاحت کی ہے۔

رہا رجوع کا معاملہ تو وہ خالی از امکان نہیں، کیوں کہ امام صاحب نے جس وقت

(۱) سنن دارقطنی ج ۱ ص ۱۱۷۔

یہ رسالہ تالیف کیا تھا، ممکن ہے اس وقت زیر بحث مسئلہ ان کی نگاہ میں منقح نہ رہا ہو لیکن بعد میں جب رسالہ کے بارے میں سوالات کیے گئے اور امام صاحب کو اس معاملہ میں زیادہ توجہ سے غور کرنے کا موقع ملا تو اس وقت یہ مسئلہ ان کی نگاہ میں منقح ہو گیا، جیسا کہ ان کے جواب سے معلوم ہوتا ہے، اس تنقیح کے بعد ممکن ہے، انھوں نے رجوع بھی کر لیا ہو لیکن اس کی کوئی تصریح موجود نہیں ہے، اس لیے محض امکان وقیاس کی بنیاد پر اس کو تسلیم کرنا محال ہے لیکن رجوع نہ کرنے سے یہ خیال کرنا کہ ان کی رائے ضد اور عصبیت پر مبنی ہے صحیح نہیں کیوں کہ امام صاحب اور ان لوگوں کے جو جہری نمازوں میں زور سے بسم اللہ پڑھنے کے قائل ہیں، متعدد دلائل موجود ہیں، ان سے تعرض کرنے کا یہ محل نہیں ہے، فقہی کتابوں میں اس کی تفصیل موجود ہے، ان دلائل سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف لیکن ان کی گنجائش سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ امام صاحب کے غلو اور بے جا عصبیت کا اس واقعہ سے کوئی پتہ نہیں چلتا، ان کا شافعی مذہب کی طرف میلان ضرور تھا لیکن وہ مجتہد فی المذہب تھے، مولانا شبیر احمد عثمانی مرحوم لکھتے ہیں کہ:

> ''امام دارقطنی شافعی مذہب کی طرف مائل تھے، مگر وہ مجتہدین اور ائمہ حدیث وسنت میں تھے، ان کا حال اپنے مابعد کے اکابر محدثین کی طرح نہیں جو سوائے چند گنے چنے مسائل کے عموماً تقلید کو لازمی سمجھتے تھے، امام دارقطنی فقہ واجتہاد اور علم میں لوگوں سے فائق وبرتر تھے۔''(1)

اعتراض کے دوسرے جز یعنی حنفی مذہب سے تعصب وعناد کے سلسلہ میں یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے امام ابوحنیفہؒ پر طعن کیا ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے سنن میں امام صاحب پر حدیث میں ضعف، تفرد اور ثقہ راویوں کی مخالفت وعدم متابعت کا الزام لگایا ہے۔

(1) مقدمہ فتح الملہم شرح صحیح مسلم ج1 ص 101 بحوالہ توجیہ النظر۔

بلاشبہ امام دارقطنی کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ کا پایہ فقہ واجتہاد کی طرح روایتِ حدیث میں زیادہ بلند نہیں تھا اور انھوں نے سنن میں ان کو ضعیف بھی کہا ہے اور مشہور حدیث (مَنْ کان له امام فقرأة الامام قرأة له) کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ تمام معتبر و ثقہ راویوں نے حضرت جابرؓ کا نام لیے بغیر اس کو مرسل روایت کیا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ نے اس کو مسند بیان کیا ہے اور اس کے سلسلہ اسناد میں حضرت جابرؓ کا بھی ذکر کیا ہے۔(۱)

اسی طرح دوسری جگہ وہ کہتے ہیں کہ وضو میں حضرت خالد بن علقمہ کے واسطہ سے تین دفعہ سر کا مسح کرنے کو صرف امام ابوحنیفہؒ نے بیان کیا ہے، جب کہ دوسرے ثقہ راویوں نے خالد بن علقمہ ہی کے واسطہ سے اس میں صرف ایک دفعہ مسح کرنے کو بیان کیا ہے۔

اس موقع پر امام دارقطنی نے امام صاحب پر ایک اعتراض اور کیا ہے اور وہ یہ کہ تین دفعہ مسح کرنے کی روایت بیان کرنے کے باوجود وہ ایک ہی دفعہ مسح کرنے کو مسنون سمجھتے ہیں۔(۲)

لیکن ان سب اعتراضات میں امام دارقطنی منفرد نہیں ہیں، بعض اور محدثین کا بھی یہی خیال ہے اور وہ بھی امام صاحب کو ضعیف الحدیث سمجھتے تھے اور مذکورہ بالا حدیثوں کے سلسلہ میں انھوں نے بھی امام صاحب پر ثقہ راویوں کی مخالفت کا الزام لگایا ہے لیکن امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف الحدیث سمجھنا غلط فہمیوں کا نتیجہ ہے مگر ان غلط فہمیوں کے بعض وجوہ واسباب بھی تھے جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے، اس لیے محدثین کو ان اسباب کی بنا پر معذور سمجھنا چاہیے، وہ کسی غلط جذبہ، بدنیتی، مخالفت اور تعصب کی وجہ سے امام صاحب سے سوئے ظن نہیں رکھتے تھے، بلکہ ایک اعتبار سے درحقیقت اس سے ان لوگوں کی صاف گوئی اور حق پسندی کا پتہ چلتا ہے کہ بڑے بڑے ائمہ کا علم وفضل اور زہد واتقا بھی ان کی حق پسندی میں مانع نہ ہوا اور انھوں نے اس رائے کو جسے وہ صحیح سمجھتے تھے، دیانت داری کے ساتھ ظاہر کر دیا۔

(۱) سنن دارقطنی ج۱ص ۱۲۳ (۲) سنن دارقطنی ج۱ص ۱۳۳۔

لیکن امام ابوحنیفہؒ کو ضعیف الحدیث قرار دینے والے محدثین بہت تھوڑے ہیں، اکثر ائمہ فن سے ان کی تعریف وتوثیق منقول ہے، علامہ ابن عبدالبر کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ ؒ کو ثقہ قرار دینے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔(۱)

رہیں وہ حدیثیں جن کے سلسلہ میں امام صاحب پر عدم متابعت اور ثقہ راویوں کی مخالفت کا الزام لگایا گیا ہے تو چوں کہ ان کی ثقاہت محدثین کی ایک بڑی جماعت کے نزدیک مسلم ہے، اس لیے ان کا اضافہ مقبول ومعتبر ہوگا۔

پہلی حدیث (من كان له امام الخ) کے سلسلہ میں امام صاحب کی جانب سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ اس کو محمد بن منیع نے اپنی مسند اور امام محمد نے مؤطا اور کتاب الآثار میں مسند بیان کیا ہے اور ابن ہمام کا بیان ہے کہ ان کی سندیں صحیحین کے شرائط کے مطابق صحیح ہیں اور محمد بن منیع کی روایت میں سفیان وشریک نے جو صحیحین کے رجال میں ہیں حضرت جابرؓ کا نام لینے اور حدیث کو مسند بیان کرنے میں امام ابوحنیفہؒ کی متابعت کی ہے۔(۲)

دوسرا جواب یہ ہے کہ اس حدیث کو حضرت جابرؓ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم نے بھی روایت کیا ہے اور گو بعض کے طرق میں ضعف بھی ہے تاہم صحیح اور تعدد وکثرتِ طرق نے اس کو قوی کر دیا ہے۔(۳)

تثلیث مسح کے متعلق بھی امام ابوحنیفہؒ کی زیادتی کو ثقہ کی زیادتی سمجھ کر قبول کیا جائے گا، دوسرے اس حدیث کے بھی شواہد ومتابعات موجود ہیں اور ان میں سے بعض کو خود امام دارقطنی نے بھی بیان کیا ہے، اس لیے اس کے بارے میں بھی امام دارقطنی کا اعتراض

---

(۱) حواشی سنن دارقطنی ج ۱ ص ۲۳ (۲) حاشیہ نصب الرایہ ج ۲ ص ۷، ۸ وحاشیہ معانی الآثار طحاوی ج ۱ ص ۱۲۸ وفیض الباری ج ۲ ص ۲۷۷، ۲۷۸ (۳) نصب الرایہ۔

بے معنیٰ معلوم ہوتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ امام ابوحنیفہؒ نے جب خود ہی تین دفعہ سر کا مسح کرنے کی روایت کی ہے تو ان کے نزدیک ایک دفعہ مسح کرنا کیوں مسنون ہے، گو امام دارقطنی کا یہ اعتراض صحیح ہے لیکن کسی چیز کی روایت کر دینے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ خود راوی کا اس کے مطابق عمل اور فتویٰ بھی ہو، امام دارقطنی اور دوسرے محدثین نے کتنی ایسی حدیثیں روایت کی ہیں جن کے مطابق ان کا عمل نہیں ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ امام دارقطنی کو امام ابوحنیفہؒ سے کوئی عناد اور تعصب نہ تھا، انھوں نے نہایت فراخدلی سے حنفی مذہب کے ایک اہم رکن امام محمد کو ثقہ محدثین میں شمار کیا ہے، (۱) البتہ بعض اور اکابر محدثین کی طرح وہ امام صاحب کا پایہ حدیث میں زیادہ بلند نہیں سمجھتے تھے اور اپنی حق پسندی کی وجہ سے انھوں نے امام صاحب کی عظمت وجلالت کے باوجود اپنی اس رائے کو جسے وہ صحیح سمجھتے تھے، بیان بھی کر دیا، یہ الگ بات ہے کہ ان کی رائے غلط فہمی پر مبنی ہے لیکن اس میں وہ معذور تھے اور ان کی عظمتِ شان سے اس قسم کا تعصب بعید ہے جو بیان کیا جاتا ہے۔

تصنیفات: امام دارقطنی نے بے شمار کتابیں یادگار چھوڑیں جو سب مفید، بلند پایہ اور حسن تالیف کا نمونہ ہیں (۲) ان میں سے اکثر حدیث، اصول حدیث اور رجال کے موضوع پر لکھی گئی تھیں، مگر اب زیادہ تر نایاب ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کے نام اور بعض کے بارے میں مختصر معلومات تحریر کیے جاتے ہیں۔

۱- **کتاب الرؤیۃ** (پانچ جزوں میں)، ۲- **کتاب المستجاد**، ۳- **کتاب معرفۃ مذاہب الفقہاء** (۳) ۴- **غریب اللغۃ**: محمد بن طاہر مقدسی المعروف بابن القیسرانی (م ۵۰۷ھ)

(۱) امام ابن ماجہ اور علم حدیث از عبدالرشید نعمانی بحوالہ غرائب مالک دارقطنی (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۰۰ والبدایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ (۳) کشف الظنون ج ۲۔

نے اس کے اطراف لکھے تھے۔(۱)

۵-**اختلاف الموطآت:** اس میں موطا امام مالکؒ کی روایتوں اور اس کے مختلف نسخوں پر بحث کی گئی ہے۔(۲)

۶-**غرایب مالک:** اس میں امام مالک کی ان غریب حدیثوں کا ذکر ہے جو موطا میں شامل نہیں ہیں ممکن ہے یہ وہی کتاب ہو جو امام دارقطنی کی جانب کتاب الغرائب کے نام سے منسوب ہے، ابن عبدالہادی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ضخیم کتاب تھی۔(۳)

۷- **الاربعین:** نام سے ظاہر ہے کہ اس میں چہل حدیثیں درج ہوں گی، یہ اس فن کی قدیم کتابوں میں ہے۔(۴)

۸-**کتاب الضعفاء:** یہ دراصل امام دارقطنی کے ان حواشی پر مشتمل ہے جو علامہ ابن حبان کی کتاب الضعفاء پر انھوں نے لکھے تھے،(۵) اس میں ضعیف راویوں کا حال اور ان کی معرفت کا ذکر ہے، رجال کی اکثر کتابوں میں امام دارقطنی کے جو اقوال درج ہیں وہ غالباً اسی سے ماخوذ ہوں گے، اس لحاظ سے یہ اہم کتاب ہے۔

۹- **اسماء المدلسین:** اس موضوع پر امام حسین بن علی کرابیسی (م۲۴۵ھ) اور امام نسائی (م۳۰۳ھ) نے پہلے کتابیں لکھی تھیں، یہ غالباً اس فن کی تیسری مشہور کتاب ہے۔(۶)

۱۰- **اسئلۃ الحاکم:** اس میں ان سوالات کا جواب دیا گیا ہے جو غالباً حاکم صاحب مستدرک نے دارقطنی سے حدیث و رجال وغیرہ کے بارے میں کئے ہوں گے، زین الدین قاسم بن قطلو بغا حنفی (م۸۷۹ھ) نے اس کو جمع کیا تھا۔(۷)

---

(۱) کشف الظنون ج۲ص ۱۵۸ (۲) حیات امام مالک مولانا سید سلیمان ندوی ص۱۰۴ (۳) الرسالۃ المستطرفۃ ص۹۴،۹۵ (۴) کشف الظنون ج۱ص۷۸ (۵) تدریب الراوی ص۲۶۱ والرسالۃ المستطرفۃ ص۱۱۸،۱۱۹۔ (۶) کشف الظنون ج۱ص۹۸ (۷) کشف الظنون ج۱ص۱۰۰

۱۱- **باب القضا بالیمین مع الشاہد:** حدیث کی بعض کتابوں میں صرف ایک ہی باب کی روایتیں شامل ہوتی ہیں، یہ کتاب اسی قسم کی ہے اور اس میں صرف ایک ہی باب کی حدیثیں درج ہیں۔(۱)

۱۲- **کتاب الجہر:** یہ بھی اسی نوعیت کی کتاب ہے، اس میں نماز میں بسم اللہ کو زور اور آہستہ سے پڑھنے کے بارے میں حدیثیں اور آثار درج ہیں۔(۲)

۱۳- **رسالہ قرأت:** فن قرأت پر ایک مختصر اور جامع رسالہ ہے، اس کے شروع میں اس فن کے اصول وقاعدے اور پھر فنی بحثیں تحریر کی گئی ہیں، اس کی ترتیب وتبویب اور طریقہ تالیف کو اتنا پسند کیا گیا کہ بعد کے مولفین نے اسی ڈھنگ پر اپنی کتابیں مرتب کیں، ابن الجزری طبقات القراء میں لکھتے ہیں کہ اس کی قدر وقیمت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوسکتا ہے۔(۳)

۱۴- **الرباعیات:** اس میں مشہور محدث ابوبکر محمد بن عبداللہ بن ابراہیم المعروف بزار (م ۳۵۴ھ) کی تصنیف رباعیات کی جو غیلانیات کے نام سے مشہور ہے تخریج کی گئی ہے اور امام بخاری کی رباعیات کو علاحدہ ایک رسالہ میں مرتب کیا گیا ہے، یہ ایک زمانہ میں بہت متداول تھی۔(۴)

۱۵- **کتاب المجتبیٰ من السنن الماثورہ:** یہ غالباً امام دارقطنی کی شہرۂ آفاق سنن کا انتخاب ہے، کتب خانہ خدیویہ مصر میں اس کی دوسری جلد کا قلمی نسخہ موجود ہے جو کتاب الزکوٰۃ سے آخر تک کے ابواب پر مشتمل ہے، کاتب کا نام عبداللہ بن محمد بن حسن موصلی المعروف بابن ترکیہ اور سنہ کتابت ۶۳۸ھ ہے۔(۵)

---

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۵۳، الرسالۃ المستطرفہ ص ۴۲ (۲) سنن دارقطنی ص ۱۱۷ (۳) تاریخ بغداد ج ۱۲ ص ۳۴، ۳۵ وحاشیہ العمر ج ۳ ص ۲۹ (۴) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۴۳ (۵) الاعلام ج ۲ ص ۶۲۳ وفہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۹۸۔

۱۶- **کتاب الاخوۃ** (۱): اس فن میں امام دار قطنی سے پہلے اور ان کے بعد متعدد کتابیں لکھی گئیں، اس کو اہم اور مفید کتابوں میں خیال کیا جاتا ہے۔

۱۷- **کتاب الافراد** (۲): یہ کتاب بڑی جامع اور سو اجزا پر مشتمل ہے، ابوالفضل بن طاہر نے اس کے اطراف لکھے تھے۔ (۳)

۱۸- **کتاب التصحیف** (۴): اس فن میں یہ ایک مفید اور جامع کتاب ہے، علامہ سیوطی کا بیان ہے:

اورد الدار قطنی فی کتاب التصحیف کل تصحیف وقع للعلماء حتی فی القرآن۔(۵)

امام دار قطنی نے کتاب التصحیف میں ان سب تصحیفات کا ذکر کیا ہے جو علما کو پیش آئی ہیں، یہاں تک کہ حدیث کے علاوہ قرآن کی تصحیف بھی بیان کی ہے۔

---

(۱) اس فن میں علی بن مدینی، امام نسائی اور ابوالعباس سراج وغیرہ متقدمین کی کتابیں اہم ہیں، اس کو ضبط کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دو شخصوں کی ولدیت میں اشتراک کی وجہ سے ان کو عینی بھائی نہ خیال کیا جائے (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۵۵ و تدریب الراوی ص ۲۱۸) (۲) یہ بڑا اہم اور مشکل موضوع ہے، اس لیے اس میں ماہر محدثین ہی نے کتابیں لکھی ہیں، ارباب فن کے نزدیک فرد کی دو قسمیں ہیں، مطلق اور نسبی، اول الذکر میں ایک شخص تمام رواۃ سے تفرد کرتا ہے، مؤخر الذکر میں کسی خاص پہلو اور حیثیت سے تفرد ہوتا ہے جیسے کسی روایت میں کسی خاص مقام کے راویوں کا تفرد (مقدمہ ابن صلاح ص ۴۱ و ۴۲) (۳) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ والرسالۃ المستطرفہ ص ۹۵ (۴) تصحیف وخطا سے محفوظ رہنا بہت مشکل ہے امام احمد فرماتے ہیں کہ اس سے کون بچ سکتا ہے، یہ اسناد ومتون دونوں میں ہوتی ہے، اسناد کی مثال یہ ہے کہ یحییٰ بن معین نے عوام بن مراجم (بالراوالجیم) کو مزاحم کر دیا اور متن کی مثال یہ ہے کہ ابن لہیعہ نے ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم احتجر فی المسجد میں احتجر کو احتجم کر دیا (تدریب الراوی ص ۱۹۶) (۵) تدریب الراوی ص ۱۹۶۔

۱۹- **کتاب المؤتلف والمختلف** (۱): اس فن میں ابن ماکولا کی کتاب الاکمال زیادہ اہم اور مشہور ہے تاہم دارقطنی کی کتاب بھی جامع اور پراز معلومات ہے، سیوطی کا خیال ہے کہ اس موضوع پر پہلی کتاب دارقطنی کے شاگرد عبدالغنی بن سعید نے لکھی اور امام دارقطنی کی کتاب اس کے بعد لکھی گئی لیکن نواب صدیق حسن خان صاحب لکھتے ہیں کہ ''ابوعبداللہ محمد بن علی کا بیان ہے کہ عبدالغنی نے المؤتلف والمختلف لکھنے کے بعد جب اس کو امام دارقطنی کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے عبدالغنی سے پڑھنے کے لیے کہا، عبدالغنی نے کہا ''میں اسے کیا پڑھوں، میں نے تو اس کو آپ ہی سے استفادہ کر کے لکھا ہے۔'' اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالغنی کی تصنیف درحقیقت امام دارقطنی کے افادات پر مشتمل ہے، اس لحاظ سے گویا اس فن میں تقدم واولیت کا شرف انہی کو ہے، امام دارقطنی کی کتاب کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس کے بعد اس موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے اکثر کی اساس وبنیاد اسی پر ہے، علاوہ ازیں اس کے مختلف ذیول واستدراک بھی لکھے گئے ہیں (۲)

۲۰- **کتاب العلل** (۳): یہ کتاب اس موضوع پر متقدمین کی کتابوں کا نچوڑ اور بڑی جامع ہے، ابوعبداللہ حمید اندلسی کا بیان ہے کہ فن حدیث کی تین اہم چیزوں میں ایک العلل بھی ہے اور اس میں سب سے عمدہ کتاب امام دارقطنی کی ہے، (۴) ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ''اس میں صحیح وغلط، متصل، مرسل اور منقطع ومعضل وغیرہ کی وضاحت کی گئی ہے۔'' اس کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علل کے طرق کی کثرت وتعدد کو جمع کیا

(۱) اگر راویوں کے نام تحریر وکتابت میں یکساں اور ہم شکل ہوں لیکن تلفظ وتکلم میں مختلف ہوں تو اسے اصطلاح میں مؤتلف ومختلف کہا جاتا ہے (مقدمہ ابن صلاح ص ۱۷۲) (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۷۲ وتدریب الراوی ص ۴۳۵ واتحاف النبلاء المتقین ص ۱۳۷ (۳) معلل ان مسند حدیثوں کو کہا جاتا ہے جن کے متن یا اسناد میں کوئی ایسی پوشیدہ علت اور مخفی عیب ہوتا ہے جس کی صحت بآسانی نہ ہو سکے تا وقتیکہ تمام سندوں اور صحیح متن کا ٹھیک طور پہ پتہ نہ ہو (تدریب الراوی ص ۸۹) (۴) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۰۔

گیا ہے، یہ مسانید کی ترتیب پر ہے، امام دارقطنی نے اس کا املا کرادیا تھا اور ان کے شاگرد ابوبکر برقانی نے اس کو جمع وترتیب دیا تھا۔(۱)

حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا، اس کا ایک قلمی نسخہ جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے(۲) اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی اس کا مخطوطہ ہے، جو تین جلدوں پر مشتمل ہے،(۳) ہر جلد کے متعلق علاحدہ علاحدہ مندرجہ ذیل تعارفی نوٹ درج ہیں:

المجلد الثانی: اس میں مسند احادیث کی خامیوں اور نقائص کو بتایا گیا ہے، یہ حدیثیں اکابر صحابہ یعنی حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی مرتضیٰ، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف، عبداللہ بن مسعود، معاذ بن جبل اور حضرت ابوذر (رضوان اللہ علیہم اجمعین) وغیرہ سے منسوب ہیں اور تھوڑی حدیثیں جو حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کردہ ہیں ان میں بھی کچھ نقائص وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ قلمی نسخہ بہت نایاب ہے اور کسی کتب خانہ کی فہرست میں نہیں دیکھا گیا، خط نسخ میں خوش خط لکھا ہوا ہے، اس پر کوئی تاریخ وغیرہ نہیں ہے مگر آٹھویں صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

المجلد الثالث: یہ علل الحدیث کی تیسری جلد ہے، باقی ماندہ اسناد حدیث جو حضرت ابوہریرہؓ سے منقول ہیں، ان کی خامیوں اور نقائص پر بحث کی گئی ہے، ۱۳۰۹ھ کا لکھا ہوا نسخہ ہے۔

المجلد الخامس: کتاب علل الحدیث کا یہ آخری حصہ ہے، اس میں ان مسند حدیثوں پر تنقید کی گئی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اصحاب وصحابیات سے مروی ہیں، کاتب نے اس نسخہ کے آخر میں تحریر کیا ہے کہ یہ نسخہ اس نے ۱۳۰۹ھ کے ایک مکتوبہ نسخے سے نقل کیا ہے، مگر اپنا نام نہیں لکھا ہے، یہ نسخہ اور اس کے اور سب حصے جن کا ذکر ہو چکا ہے،

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ والمنتظم ج ۷ ص ۸۳ وتدریب الراوی ص ۸۸ و ۸۹ و ۹۱ ورسالہ مستطرفہ ص ۱۲۲ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۲۶ (۳) فہرست خدا بخش خان لائبریری ص ۵۵۔

ایک ہی کاتب کے تحریر کردہ معلوم ہوتے ہیں،(۱) تیسری اور پانچویں جلدوں کے مخطوطے کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد میں بھی پائے جاتے ہیں، تیسری جلد ۱۳۱۰ھ کی لکھی ہوئی ہے، (۲) اسی طرح مکتبہ سندیہ میں بھی علل کا نسخہ ہے۔

۲۱- کتاب الاسخیاء: اس میں جود وسخاوت کی فضیلت اور اسخیا کے محامد ومحاسن کے متعلق حدیثیں اور بعض واقعات سنداً بیان کیے گئے ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ ۶۰۰ھ کا نسخ میں لکھا ہوا خدا بخش لائبریری میں موجود تھا،(۳) ۱۹۳۴ء میں مولانا سید وجاہت حسین صاحب استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ نے اس کو تصحیح ومقابلہ کے بعد حواشی ومقدمہ کے ساتھ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سے شائع کیا ہے، مقدمہ میں امام دارقطنی کے حالات وکمالات اور اس کتاب کے بارے میں مفید معلومات لکھے گئے ہیں۔

۲۲و۲۳- کتاب الالزامات والتتبع: صحیح کی اہمیت ومقبولیت مسلم ہے لیکن بعض حیثیتوں سے ان پر محدثین کی ایک جماعت نے کچھ ایرادات بھی کیے ہیں، ان لوگوں میں امام دارقطنی کا نام زیادہ ممتاز ہے، ان کی علل حدیث سے گہری واقفیت اور دقت نظر کا اہل فن کو اعتراف ہے، ان کے اعتراضات اور شکوک دو طرح کے ہیں، پہلے کو انھوں نے کتاب الالزامات میں ذکر کیا ہے، اس کے متعلق وہ خود تحریر فرماتے ہیں:

مما اخرجه البخاری ومسلم	امام بخاری ومسلم دونوں یا ان میں
او احدهما من حديث بعض	سے ایک بزرگ نے کسی تابعی کی
التابعين وتركا من حديثه	ایک حدیث کی تخریج کی ہے اور اسی
شبيها به ولم يخرجاه او من	تابعی کی دوسری حدیث کو چھوڑ دیا یا
حديث نظير له من التابعين	بعض ایسی حدیثوں کی تخریج نہیں کی

(۱) نوادر خدا بخش لائبریری ج ۱ ص ۹۳ تا ۹۵۔ (۲) فہرست کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد ج ۱ ص ۶۴۶ و ۶۴۷ (۳) فہرست کتب خانہ خدا بخش لائبریری جلد اول ص ۳۹۔

الثقات يلزم اخراجه على شرطهما ومذهبهما فيما نذكره انشاء الله.(۱)

ہے جو ثقہ تابعین سے مروی تھیں، حالانکہ ان حضرات کے اصول وشرائط کے مطابق ان کی تخریج لازمی تھی، انشاء اللہ آگے ہم اس پر گفتگو کریں گے۔

علامہ نووی لکھتے ہیں:

الزم الامام الحافظ ابوالحسن علي بن عمر الدارقطني رحمه الله وغيره البخاري ومسلما رضي الله عنهما اخراج احاديث تركا اخراجها مع ان اسانيدها اسانيد قد اخرجا لرواتها في صحيحهما بها وذكر الدارقطني وغيره ان جماعة من الصحابة رضي الله عنهم رووا عن رسول الله صلى الله عليه وسلم ورويت احاديثهم من وجوه محاح لا مطعن في ناقليها ولم

امام دارقطنی نے امام بخاری وامام مسلم پر یہ اعتراض کیا ہے کہ ان دونوں بزرگوں نے بہت سی ایسی حدیثیں چھوڑ دی ہیں جن کے راویوں کی سندوں سے خود انھوں نے صحیحین میں روایت کی ہے، امام دارقطنی وغیرہ کا بیان ہے کہ ان حضرات نے ایسی حدیثیں بھی نظر انداز کی ہیں جن کو صحابہ کی ایک جماعت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا ہے اور جو بعد میں صحیح طریقوں سے بیان کی گئی ہیں اور ان کے راویوں میں کسی قسم کا کوئی طعن بھی نہیں پایا جاتا حالانکہ ان لوگوں کے اصول ومذہب کے مطابق ان کی

(۱) دیباچہ کتاب الالزامات۔

يخرجا من احاديثهم شيئاً	تخریج لازم تھی۔
فليلزمهما اخراجها على	
مذهبيهما۔ (۱)	

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام دارقطنی نے اپنے اس رسالہ میں ان صحیح حدیثوں کو جمع کیا ہے جو صحیحین کی شرطوں کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں ہیں، اس حیثیت سے اس کی وہی نوعیت ہے جو حاکم کی المستدرک کی ہے۔

دوسرے رسالہ التتبع میں امام بخاری و مسلم پر نقد و تعقب کیا گیا ہے، صاحب کشف الظنون کا بیان ہے:

وهو ما اخرج في	یہ رسالہ صحیحین کی ان حدیثوں کا مجموعہ
الصحيحين وله علة۔ (۲)	ہے جن کے اندر علت پائی جاتی ہے۔

یعنی اس میں امام بخاری و مسلم کے اوہام و علل پر بحث و گفتگو کی گئی ہے، حافظ ابن حجرؒ نے ان حدیثوں کی جن کو امام دارقطنی نے موضوع بحث بنایا ہے، تعداد ایک سو دس بتائی ہے، ان میں بتیس حدیثیں متفق علیہ ہیں اور اٹھہتر صرف صحیح بخاری کی ہیں۔

عام طور سے علمائے فن نے امام دارقطنی کے اعتراضات کو کوئی اہمیت نہیں دی ہے، حافظ ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں کتاب التتبع کی ہر ہر حدیث پر مفصل اور محققانہ بحث کر کے امام دارقطنی کے اعتراضات کا جواب دیا ہے، امام نووی نے بھی شرحِ مسلم اور شرح بخاری کے مقدمہ میں ان شبہات کا ازالہ کیا ہے جن کو امام دارقطنی نے تحریر کیا ہے، اسی طرح علامہ عینی اور قسطلانی کی شروح بخاری میں بھی دارقطنی کے الزامات کا جواب دیا گیا ہے، ان محققین کے جوابات کا ماحصل یہ ہے کہ امام بخاری و مسلم کی کتابوں کو صحیح حدیثوں کا مجموعہ اس لیے کہا گیا ہے کہ ان کی سب حدیثیں صحیح اور منقح ہیں، باقی جو صحیح

(۱) مقدمہ مسلم نووی ص ۲۴ (۲) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۶۸۔

روایتیں ان میں شامل نہیں ہیں، اس کی وجہ سے ان پر کوئی الزام عائد نہیں ہوتا کیوں کہ ان دونوں کتابوں کا مقصد تمام صحیح حدیثوں کا حصر نہیں ہے۔

لیکن یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ ان حضرات نے امام دارقطنی کے جواب میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے، وہ تمام تر درست ہی ہے اور ان کے سارے اعتراضات بالکل ہی بے معنی ہیں، کیوں کہ جواب میں بعض جگہ تکلف سے بھی کام لیا گیا ہے، مولانا انور شاہ کشمیری فرماتے ہیں:

> ''امام دارقطنی نے سو سے زیادہ مقامات میں امام بخاری پر تعاقب کیا ہے لیکن ان کا نقد وکلام محض اسانید کے وصل وارسال تک محدود ہے، سوائے ایک جگہ یعنی (اذا جاء احدکم والامام یخطب فلیصل رکعتین ولیتجوز فیهما) کے، یہاں انھوں نے حدیث کے متن پر بھی کلام کیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ دارقطنی محدثین کے مرتب قاعدوں پر چلنے کے عادی ہیں اور اسی حیثیت سے وہ اعتراض کرتے ہیں لیکن امام بخاری کی شان اس سے بہت بلند ہے، وہ اپنی بصیرت، اجتہاد اور وجدان پر اعتماد کرتے ہیں، قاعدے تو ناواقفین اور عوام کے لئے بنائے گئے ہیں تا کہ غیر محدود کو محدود کیا جا سکے اور امام بخاری ومسلم کا مرتبہ سب سے بڑھ کر ہے۔''(۱)

امام دارقطنی کی ایرادات کے بے نتیجہ اور بلا وزن نہ ہونے کا ثبوت یہ بھی ہے کہ ان کی بنا پر صحیحین کی اس قسم کی حدیثوں کا قطعی الصحت ہونا محتمل قرار دیا گیا ہے، چنانچہ علامہ ابن صلاح لکھتے ہیں:

القول بان ما انفرد به	امام بخاری یا امام مسلم نے تنہا جن
البخاری او مسلم مندرج فی	حدیثوں کو بیان کیا ہے وہ بھی قطعی الصحت

(۱) مقدمہ فیض الباری ص ۵۷۔

قبيل مايقطع بصحته لتلقى	حدیثوں میں شامل ہیں کیوں کہ
الامة كل واحد من كتابيهما	امت میں ان دونوں کتابوں کو تلقی
بالقبول على الوجه الذي	بالقبول حاصل ہے جیسا کہ پہلے اس کی
فصلناه عن حالهما فيما	تفصیل گزر چکی ہے، بجز ان چند
سبق سوى احرف يسيرة	حدیثوں کے جن پر نقادان فن اور ائمہ
تكلم فيها بعض اهل النقد	حدیث جیسے دار قطنی وغیرہ نے کلام کیا
من الحفاظ كالدار قطني و	ہے اور یہ حدیثیں ماہرین فن کے
غيره وهي معروفة عند اهل	نزدیک مشہور و معروف ہیں۔
هذا الشان والله اعلم۔(۱)	

درحقیقت امام دارقطنی کے اعتراضات کی وہی حیثیت ہے جو حاکم صاحب مستدرک کے استدراکات کی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی نے ان کے متعلق لکھا ہے کہ

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص۱۴ و ۱۵ مگر علامہ ابن صلاح کے اس بیان کے پہلے حصہ یعنی بخاری یا مسلم کی حدیثوں کا قطعی الصحت ہونا جمہور کے نزدیک قابل تسلیم نہیں ہے، چنانچہ علامہ نووی لکھتے ہیں کہ ''جمہور علمائے محققین نے ابن صلاح کے قول سے اختلاف کیا ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اگر حدیث متواتر نہ ہو تو اس سے قطعیت کے بجائے صرف ظن کا فائدہ حاصل ہوگا'' البتہ حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن حجر اور مولانا انور شاہ کشمیری علامہ ابن صلاح کے ہمنوا ہیں شاہ صاحب لکھتے ہیں:

واختلفوا في ان احاديث	صحیحین کی حدیثوں کے مفید قطعی ہونے
الصحيحين جعل تفيد القطع ام	میں اختلاف ہے جمہور ان کو مفید قطعی نہیں
لا فالجمهور الى انها لا تفيد	مانتے لیکن حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان
القطع وذهب الحافظ الى انها	سے قطعیت کا فائدہ حاصل ہوتا ہے، حنفیہ

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

وہ ایک حیثیت سے صحیح اور دوسری حیثیت سے غلط ہیں،(۱) صحیح اس حیثیت سے ہیں کہ امام دار قطنی کی حدیثیں شیخین کے رجال اور شرائط کے مطابق ہیں لیکن غلط اس بنا پر ہیں کہ شیخین اسی حدیث کو ذکر کرتے ہیں جس کی صحت پر بحث مباحثے کے بعد ان کے شیوخ کا اجماع ہو گیا ہے اور مشائخ وائمہ حدیث نے اس کی صحت تسلیم کر لی ہے، پس صحیحین کی خصوصیت اور امتیاز یہ ہے کہ وہ صرف قاعدہ اور اصولوں سے حدیث کی صحت تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہر ہر حدیث کے وصل وانقطاع، رفع وارسال، شذوذ ونکارت وغیرہ پر مستقل طور سے بحث کر کے صحت کا فیصلہ صادر کرتے ہیں اور انہی حدیثوں کو صحیحین میں نقل کرتے ہیں جن کی صحت پر پہلے کے محدثین نے تحقیقات کے بعد اتفاق کر لیا ہے لیکن امام دار قطنی وغیرہ محض اصول وقواعد ہی کی بنا پر حدیث کو صحیح قرار دے دیتے ہیں۔

امام دار قطنی کے اعتراضات اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی دقتِ نظر، کثرتِ تدبر اور اخلاص ونیک نیتی کا ثبوت ضرور ہیں، امام بخاری کے ایک بڑے مداح مولانا عبدالسلام

(حاشیہ گزشتہ صفحہ کا بقیہ)

تفيد القطع واليه جنح شمس	میں امام سرخسی اور حنابلہ میں حافظ ابن
الائمة السرخسي من الحنفية	تیمیہ نیز شیخ عمرو بن صلاح کا رجحان اسی
والحافظ ابن تيمية من الحنابلة	جانب ہے، ان لوگوں کی تعداد اگرچہ کم
والشيخ عمرو بن صلاح وهؤلاء	ہے لیکن یہی رائے صحیح ہے..... پھر حافظ
وان كانوا اقل عددا الا ان رأيهم	ابن حجر نے تصریح کی ہے کہ یہ مفید قطعی
هو الرای ..... ثم صرح الحافظ	نظری ہوتی ہیں۔
رضي الله عنه ان افادتها القطع	
نظري (مقدمہ فیض الباری ص ۴۵)	

حاشیہ صفحہ ھذا (۱) حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۰۶ و ۱۰۷۔

مبارک پوری لکھتے ہیں:

> ''امام دارقطنی بڑے پایہ کے ناقد تسلیم کئے گئے ہیں، انھوں نے صحیح کو بلاتقلید احد حرفاً حرفاً جانچا اور بلاتردد دل کھول کر لیکن دیانت سے جو شکوک ان کے ذہن میں آئے سب کو رسالہ کی صورت میں جمع کیا، خواہ وہ شکوک متن سے لگاؤ رکھتے ہوں، سلسلۂ اسناد سے یا راویوں سے۔''(۱)

امام دارقطنی کے یہ دونوں رسالے کمیاب تھے اور عموماً ان کو ایک ہی کتاب خیال کیا جاتا ہے، حیدرآباد کے کتب خانہ آصفیہ اور بہار شریف کے مکتبہ علم وحکمت میں ان کے قلمی نسخے موجود ہیں، مولانا ابوسلمہ شفیع احمد بہاری استاذ مدرسہ عالیہ کلکتہ کی مہربانی سے بہار شریف کے نسخہ کی نقل دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں بھی ہے، یہ خود مولانا کے قلم سے شعبان المعظم ۱۳۵۶ھ میں نقل ہوا ہے لیکن اصل نسخہ کا سنہ تحریر معلوم نہیں ہوسکا، پہلا رسالہ بڑی تقطیع کے آٹھ اور دوسرا ۳۸/۲۷ صفحے پر مشتمل ہے، آخر میں ۱۳ صفحے کا ایک اور رسالہ بھی ان کے ساتھ شامل ہے، یہ امام دارقطنی کے معاصر ابومسعود محمد بن ابراہیم بن عبیداللہ دمشقی (۴۰۱ھ) کی تالیف ہے، انھوں نے امام دارقطنی کے بعض تعقبات کو صحیح تسلیم کیا ہے لیکن اکثر کو غلط اور بعض کو غور وفکر کی کمی کا نتیجہ قرار دیا ہے، ایک حدیث کے بارے میں امام دارقطنی نے لکھا ہے کہ اس کی امام مسلم نے تخریج کی ہے لیکن دمشقی کا بیان ہے کہ ان کی امام مسلم نے سرے سے تخریج ہی نہیں کی ہے،(۲) تلاش کے بعد دمشقی کا بیان صحیح معلوم ہوا۔

۲۴۔ **سنن دارقطنی:** یہ امام دارقطنی کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے، ذیل میں اس کی اہمیت اور خصوصیات بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سنن کی اہمیت اور کتب حدیث میں اس کا درجہ: صحاح ستہ کے بعد جو کتابیں شہرت وقبول اور وثوق واعتبار کے لحاظ سے ممتاز اور اہم مانی جاتی ہیں ان میں سنن دارقطنی بھی

---

(۱) سیرت البخاری ص ۹۶ (۲) رسالہ دمشقی قلمی ص ۵۵۔

ہے۔ بعض اہل علم نے اس کو تقریباً صحاح ستہ ہی کے ہم پایہ قرار دیا ہے، صاحب کشف الظنون لکھتے ہیں:

''فن حدیث میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں مگر علمائے سلف وخلف کا اتفاق ہے کہ قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ صحیح اور معتبر کتاب صحیح بخاری ہے، پھر صحیح مسلم اور موطا امام مالک ہیں، ان کے بعد امام ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دارقطنی کی کتابوں اور مشہور مسانید کا درجہ ہے۔''(۱)

صحاح ستہ میں تمام صحیح حدیثوں کا حصر واستقصا نہیں ہے، ان کے علاوہ جو کتابیں صحیح اور مستند حدیثوں کے لیے مشہور خیال کی جاتی ہیں ان میں سنن دارقطنی کا نام سرفہرست ہے، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

''صحیحین پر وہ صحیح اضافے مقبول ہیں جن کو امام ابوداود، ترمذی، نسائی، ابن خزیمہ اور دارقطنی وغیرہ میں سے کسی نے اپنی مشہور ومعتبر کتاب میں بیان کیا ہو اور اس کی صحت کی تصریح کی ہو۔''(۲)

یہی خیال علامہ نووی اور سیوطی کا بھی ہے، (۳) سیوطی اور امام بغوی نے اپنی کتابوں میں صحاح اور مستند کتب حدیث کی طرح سنن دارقطنی کی حدیثوں کی بھی تخریج کی ہے۔

مگر حقیقت یہ ہے کہ سنن دارقطنی کا درجہ صحاح سے کمتر ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے اس کو حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شمار کیا ہے، (۴) البتہ اس طبقہ کی کتابوں میں اس کو یک گونہ خصوصیت ضرور ہے، چنانچہ ابن صلاح، نووی اور سیوطی نے مصنفینِ صحاح کے بعد کے جن سات نامور محدثین کی تصنیفات کو عمدہ اور زیادہ نفع بخش بتایا ہے ان سب میں امام دارقطنی کا نام سرفہرست گنایا ہے، (۵) دراصل حدیثوں کی جمع

(۱) کشف الظنون ج ۱ص ۶۴۲ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱ (۳) تدریب الراوی ص ۳۰ و ۳۱ (۴) عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵ (۵) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲ و تدریب الراوی ص ۲۶۰۔

وترتیب کا زیادہ اہم اور مبارک زمانہ تیسری صدی ہجری کا ہے، اس عہد میں روایات کی چھان بین اور راویوں کے نقد وتحقیق کا جو اعلیٰ اور بلند معیار قائم کیا گیا، اس کی مثال بعد کے دور میں نہیں ملتی لیکن تیسری صدی ہجری کا یہ امتیاز مجموعی اعتبار سے ہے کیوں کہ اس کے بعد بھی حدیث کے ایسے مجموعے تیار کیے گئے جو صحاح ستہ سے کمتر ہونے کے باوجود اس دور کی دوسری کتابوں کے برابر یا ان سے بڑھ کر ہیں، سنن دار قطنی چوتھی صدی ہجری کی ایسی ہی اہم اور مشہور کتاب ہے جو بعض حیثیتوں سے صحاح کے بعد حدیث کی سب سے اہم کتاب ہے، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں ''دار قطنی کی یہ مشہور کتاب اس فن کی بہترین کتابوں میں ہے۔''(۱)

خصوصیات: سنن کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ امام دار قطنی کو کثرت وتعدد طرق میں بڑا کمال حاصل تھا، سنن میں اسانید وطرق کا انھوں نے استقصا کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب فرماتے ہیں کہ امام صاحب نے سنن کے شروع میں قلتین والی حدیث کے طرق واسانید میں مبالغہ سے کام لیا ہے، چنانچہ اس کی چون۵۴ سندیں بیان کی ہیں، اس سے ان کی قوتِ حفظ اور وسعتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔(۲)

اسی طرح دباغ میتہ کے سلسلے میں ستائیس۲۷ اور ماء بحر کے متعلق سولہ۱۶ سندوں اور طرق سے حدیث بیان کی ہے۔(۳)

۲۔ وہ فن جرح وتعدیل کے امام تھے، علل اور رجالِ حدیث پر ان کی نظر بڑی گہری تھی، اس لیے سنن نقد وجرح کے اقوال کا عمدہ اور مفید ذخیرہ ہے، امام دار قطنی نے حدیثوں کے اکثر طرق واسانید بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان پر مفصل کلام کر کے ان کی قوت وضعف کا فیصلہ، حدیث کے درجہ ومرتبہ کی تعیین، اس کے صحیح، مرفوع ومسند یا ضعیف، سقیم، موقوف، مرسل، غریب اور منکر ہونے کی تصریح اور ایک قسم کی متعدد حدیثوں میں مرجح

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۱۷ (۲) بستان المحدثین ص ۴۵ (۳) سنن دار قطنی ص ۱۵ تا ۱۷ و ۱۳ و ۱۴۔

اور اصح مافی الباب کی نشاندہی کی ہے، راویوں اور حدیثوں کے بیان کے فرق واختلاف، کمی بیشی، متابعت وعدم متابعت اور راوی کے متروک، مجہول، منکر، غیر ثابت، واضع، کذاب، سیٔ الحفظ، مضطرب الحدیث اور نا قابلِ حجت ہونے یا ثقہ وثابت، قوی وحجت اور عادل وضابط ہونے کی تصریح، ان کے تفرد، دوسرے سے عدم ملاقات وعدم سماع، شک، اضطراب، اختلاف اور حدیث کے متن یا سند میں وہم وخطا پر مفصل کلام کیا ہے اور اس بارے میں اہل علم اور ارباب فن کے اقوال بھی بیان کئے ہیں، اس طرح سنن ترمذی کی طرح اس سے بھی حدیث کا صحیح، حسن اور ضعیف ہونا معلوم ہو جاتا ہے، علامہ ابن صلاح نے اس کی اس خصوصیت کا ان الفاظ میں ذکر کیا ہے:

ونص الدارقطني في سننه على كثير من ذالك۔ (۱)	امام دارقطنی نے سنن میں اکثر حدیثوں کے حسن یا ضعیف ہونے کو واضح کر دیا ہے۔

۳- امام دارقطنی فقہ وخلاف کے ماہر تھے، اس لیے اس کتاب سے فقہی آرا ومذاہب اور اجتہادی مسائل بھی معلوم ہو جاتے ہیں۔

۴- راوی کے نام وکنیت، وطن ومسکن اور بعض مشکل وغریب الفاظ کی مختصر وضاحت اور تفسیری بحثیں بھی کی گئی ہیں۔

۵- روایت کے حسن وقبح کے ضمن میں بعض واقعات اور تاریخی حالات بھی زیر بحث آ گئے ہیں، مثلاً ایک جگہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے لیلۃ الجن میں شریک نہ ہونے کا ذکر ہے۔ (۲)

۶- سنن دارقطنی چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر کی تصنیف ہے، اس لیے اس کی سب سے اعلیٰ اور عمدہ سند خماسی ہے۔ (۳)

---

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۸ (۲) سنن دارقطنی ص ۲۸ (۳) بستان المحدثین ص ۴۵۔

سنن کے نسخے: امام دارقطنی سے جن لوگوں نے سنن کی روایت کی تھی ان کے نام یہ ہیں:

۱- ابوبکر محمد بن عبدالملک بن بشران، ۲- ابوطاہر محمد بن احمد بن محمد بن عبدالرحیم کاتب، ۳- ابومنصور محمد بن محمد توقانی، ۴- ابوبکر محمد بن احمد بن غالب برقانی (م ۴۲۵ھ)، ۵- ابوطیب طاہر بن عبداللہ بن طاہر طبری (م ۴۴۵ھ)، ۶- شریف ابوالحسن محمد بن علی بن عبداللہ بن عبدالصمد بن مہتدی باللہ (۱) (م ۴۶۵ھ)

اس طرح سنن کے چھ نسخے تھے مگر اول الذکر تین اشخاص کے نسخے زیادہ مقبول ہوئے، ہندوستان میں ابن بشران کا نسخہ متداول ہے، متداول نسخوں میں جو اختلاف پایا جاتا ہے وہ معمولی ہے، یعنی تقدیم وتاخیر یا بعض راویوں کے نسب ونسبت کی کمی وبیشی کا، کہیں کہیں الفاظ میں بھی قدرے اختلاف ہے لیکن نفس حدیث میں فرق واختلاف نہیں ہے، ابن عبدالرحیم کے نسخہ میں کتاب السبق درج نہیں ہے۔ (۲)

سنن کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، ۱۳۱۰ھ میں دہلی کے مطبع انصاری سے یہ ۵۵۴ صفحات میں شائع ہوئی ہے، متن کے ساتھ حاشیہ میں مولانا شمس الحق عظیم آبادی صاحب غایۃ المقصود عون المعبود کی تعلیقات بھی ہیں اور آخر میں مولانا حسین بن محسن انصاری یمانی کے دو مختصر رسالے ہیں، ایک میں شاذ ومعلل حدیثوں کی تحقیق اور ان کے درمیان فرق کی وضاحت اور دوسرے میں صرف داہنے ہاتھ سے مصافحہ کرنے کو مسنون ثابت کیا گیا ہے۔

سنن کے حواشی، تعلیقات اور زوائد: سنن دارقطنی کے ساتھ علمائے فن کے شغف واعتنا سے بھی اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

۱- علامہ بغوی اور حافظ سیوطی نے اس کی حدیثوں کی تخریج کی ہے۔

---

(۱) مقدمہ حاشیہ سنن دارقطنی از مولانا شمس الحق عظیم آبادی ص ۳و۴ (۲) بستان المحدثین ص ۴۵ واتحاف النبلاء ص ۹۲۔

۲- حافظ ابن حجر نے اتحاف المھرۃ باطراف العشرۃ میں اس کے اطراف لکھے ہیں۔

۳- ابوالفضل بن طاہر نے سنن کے غرائب وافراد کے اطراف حروف معجم کی ترتیب پر لکھے ہیں۔

۴- علامہ ابن ملقن اور عراقی نے اس کے رجال کی بحث وتحقیق کی ہے۔

۵- شیخ زین الدین قاسم بن قطلو بغا حنفی نے ایک جلد میں اس کے زوائد جمع کئے ہیں۔(۱)

۶- مولانا شمس الحق عظیم آبادی نے سنن کی مختصر شرح اور تعلیق لکھی ہے جو سنن کے ساتھ حاشیہ میں چھپی ہے، اس میں حدیثوں کی تحقیق وتنقید، ان کے علل، مصالح، مطالب اور بعض مشکل مقامات کو حل کیا گیا ہے اور ائمہ فقہ واجتہاد کے مذاہب ومسالک، راوی کے ناموں، کنیتوں اور بلاد وا ماکن کی وضاحت اور لغوی وتفسیری مباحث پر بھی ان فنون کی اہم کتابوں کے حوالہ سے بقدر ضرورت گفتگو کی گئی ہے، حواشی کی ابتدا میں سنن وصاحب سنن کا تعارف، اس کے نسخوں اور مؤلف کتاب تک اپنی سند کا سلسلہ بیان کیا گیا ہے۔

سنن پر اعتراض: اوپر سنن کی اہمیت اور بلند پائیگی پر مختصر اظہار خیال کیا گیا ہے، آخر میں اس پر ایک اعتراض کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے۔

سنن دار قطنی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس میں ضعیف، غریب، موضوع اور منکر حدیثیں بھی شامل ہیں، علامہ ابن عبدالہادی کا بیان ہے:

الدارقطني يجمع في كتابه غرائب السنن ويكثر فيه من رواية الاحاديث الضعيفة و المنكرة بل والموضوعة۔ (۲)	امام دار قطنی نے اپنی سنن میں غریب حدیثیں اور ضعیف ومنکر بلکہ موضوع روایتیں تک بھی کثرت سے جمع کی ہیں۔

(۱) تدریب الراوی ص ۲۹ والرسالۃ المستطرفہ ص ۱۳۹ و ۱۴۱ (۲) الصارم المنکی فی الرد علی السبکی ص ۱۲ طبع مصر۔

علامہ عینی لکھتے ہیں:

وقدروىٰ في مسنده احاديث سقيمة ومعلولة ومنكرة و غريبة وموضوعة.(١)	انھوں نے اپنی مسند (۲) میں سقیم، معلل، منکر، غریب اور موضوع حدیثیں بیان کی ہیں۔

اسی خیال کو علامہ زیلعی نے بھی نصب الرایہ میں نقل کیا ہے۔(۳)

لیکن یہ اعتراض اس وقت صحیح ہوتا جب سنن دارقطنی کو تمام تر صحیح، منتخب اور مستند حدیثوں کا مجموعہ مانا جاتا مگر اس کا دعویٰ تو خود امام دارقطنی نے بھی نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے جابجا سنن کے اندر احادیث کی نوعیت اور اس کی صحت وسقم کی حقیقت واضح کردی ہے، نیز علمائے فن نے بھی اس کو صحاح ستہ سے کمتر اور تیسرے طبقہ کی کتابوں میں شامل کیا ہے، اس طبقہ کی کتابوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی نے تحریر فرمایا ہے کہ یہ صحیح، حسن، ضعیف، معروف، منکر، غریب، شاذ، خطا وصواب، ثابت ومقلوب ہر قسم کی حدیثوں پر مشتمل ہیں۔(۴)

نیز شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں "اس طبقہ کے مصنفین نے دوسرے طبقہ کے مصنفین کی جیسی صحت کا التزام نہیں کیا ہے اور نہ ان کی کتابیں شہرت وقبول اور وثوق واعتبار کے لحاظ سے دوسرے طبقہ کی کتابوں کے برابر ہیں، تاہم دارقطنی علوم حدیث میں تبحر، ضبط ووثوق اور ثقاہت وعدالت سے متصف تھے لیکن ان کی کتابوں میں صحیح، حسن، ضعیف اور موضوع ہر قسم کی حدیثیں شامل ہیں اور ان کے کچھ رجال تو عدالت سے متصف ہیں لیکن بعض مستور ومجہول ہیں۔" (۵)

---

(۱) البنایہ فی شرح الہدایہ ج ۱ ص ۷۰۹ (۲) امام دارقطنی کی کتاب سنن کے نام سے مشہور ہے، معلوم نہیں علامہ عینی نے اس کو مسند کیوں لکھا ہے۔ (۳) نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۰ و ۳۵۶ (۴) حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۰۷ (۵) عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵۔

انصاف کی بات یہ ہے کہ خود صحاح ستہ بھی ضعیف حدیثوں سے خالی نہیں ہیں، اس لیے یہ اعتراض امام دارقطنی کی طرح دوسروں پر بھی عائد ہوسکتا ہے، علاوہ ازیں انھوں نے کثرتِ اسناد تعددِ طرق اور شواہد و متابعات وغیرہ کے خیال سے ہر طرح کی حدیثیں نقل کی ہیں مگر ان کی نوعیت و حقیقت بھی واضح کردی ہے، شواہد و متابعات وغیرہ کے لحاظ سے امام مسلم اور ارباب صحاح نے بھی ضعیف اور غریب حدیثیں نقل کی ہیں۔

رہا یہ شبہ کہ اس طرح کی حدیثوں کی سنن دارقطنی میں زیادتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ حدیثوں کا ضخیم مجموعہ ہے اور امام صاحب نے کثرت و تعددِ طرق اور متابعات و شواہد کو درج کرنے کا خاص طور پر اہتمام کیا ہے، اس لیے اس میں ضعیف و غریب حدیثوں کی تعداد نسبۃً زیادہ ہوگئی ہے، پھر بھی صحیح حدیثوں کے مقابلہ میں ان کی تعداد بہت کم ہے۔

اس توجیہ کے بعد نہ اس اعتراض کی کوئی اہمیت رہ جاتی ہے اور نہ سنن کے مرتبہ میں کوئی فرق آتا ہے۔

امام ابوسلیمان حمد خطابی

(متوفی ۳۸۸ھ)

نام ونسب: حمد نام، ابوسلیمان کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: حمد بن محمد بن ابراہیم بن خطاب۔(۱)

بعض ارباب سیر وتذکرہ نے ان کا نام احمد لکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، علامہ ذہبی نے اس کو وہم قرار دیا ہے اور علامہ مقدسی وابن خلکان لکھتے ہیں کہ ''ابوسلیمان کا نام احمد بھی بیان کیا گیا ہے لیکن صحیح حمد ہے، حاکم نے ابوالقاسم ظفر بن طاہر بن محمد بستی فقیہ سے اس بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے خود خطابی سے سنا ہے کہ میرا اصلی نام حمد ہے لیکن بعض لوگ احمد بھی کہتے ہیں، میں نے ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا۔(۲)

ولادت ووطن: وہ ماہ رجب ۳۱۹ھ میں کابل کے مشہور شہر بست میں جو غزنین اور ہرات کے درمیان واقع ہے پیدا ہوئے۔(۳)

نسبتیں: امام ابوسلیمان اپنے وطن کی نسبت سے بستی کہلاتے ہیں لیکن ان کی مشہور نسبت خطابی ہے، جو ان کے پردادا خطاب کے نام کی طرف ہے، بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امام صاحب کا خاندانی تعلق خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے بھائی زید بن خطاب سے ہے اور یہ نسبت اسی کی جانب ہے، مگر اکثر لوگوں کے نزدیک پہلا قول صحیح ہے۔(۴)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۲۲۳ (۲) ایضاً وکتاب الانساب مقدسی ص۴۹ وتاریخ ابن خلکان ج۱ ص۲۹۷

(۳) ایضاً وکتاب الانساب سمعانی ورق۸۱ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۲۲۳ وتاریخ ابن خلکان ج۱ ص۲۹۷ وکتاب الانساب سمعانی ورق۸۱۔

اساتذہ: ان کے اساتذہ وشیوخ کی تعداد زیادہ ہے، حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ انھوں نے بیشمار لوگوں سے حدیثیں سنیں لیکن متداول تذکروں میں چند ہی اساتذہ کا نام مذکور ہے۔

ابوبکر بن داسہ، ابوسعید بن اعرابی اور ابوالعباس اصم سے علم حدیث، ابوعلی بن ابی ہریرہ اور قفال شاسی سے فقہ وافتا اور ابوجعفر رزاد، ابوعلی اسماعیل صفار اور ابوعمر زاہد وغیرہ سے لغت وعربیت کی تحصیل کی۔

تلامذہ: امام خطابی کے بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوحامد اسفرائنی، ابوعبداللہ حاکم، ابومسعود حسین بن محمد کرابیسی، ابوذر عبد بن احمد ہروی، ابوعبید ہروی، عبدالغفار (۱) بن محمد فارسی، ابوالقاسم عبدالوہاب بن ابی سہل خطابی، ابونصر محمد ابن احمد بن سلیمان بلخی، ابوعمر ومحمد بن عبداللہ زرجاہی۔ (۲)

رحلت وسفر: امام خطابی کے زمانہ میں عراق، حجاز، خراسان اور ماوراء النہر وغیرہ دینی علوم خصوصاً حدیث وروایت کا مرکز تھے، انھوں نے علم وفن کی تکمیل اور احادیث کی تحصیل کے لیے ان سب مراکز کا سفر کیا، نیشاپور میں طویل عرصہ تک قیام کر کے وہ درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں مشغول رہے اور طلبہ وشائقین علوم کو فیض یاب بھی کیا۔ (۳)

جامعیت: امام خطابی بڑے جامع کمالات تھے، ان کو اپنے زمانہ کے تمام علوم میں کامل دستگاہ حاصل تھی، مورخین کا بیان ہے کہ وہ جامعیت کے اعتبار سے ابوعبید قاسم بن سلام کی طرح تھے، دونوں علم وادب، زہد وورع، درس وتدریس اور تصنیف وتالیف میں ممتاز تھے، علاوہ ازیں امام خطابی کو یہ امتیاز بھی حاصل تھا کہ وہ اچھے شاعر تھے۔ (۴)

اعتراف کمالات: مورخین نے ان کی جامعیت، وفور علم اور کمالات کا پوری طرح

(۱) بعض مورخین نے ان کا نام عبدالغافر لکھا ہے (۲) کتاب الانساب سمعانی ورق ۸۱ وتاریخ ابن خلکان ج ۱ص ۲۹۶ وطبقات الشافعیہ ج ۲ص ۲۱۸ (۳) کتاب الانساب ورق ۲۰۳ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۴ (۴) تاریخ ابن خلکان ج ۱ص ۲۹۷۔

اعتراف کیا ہے۔علامہ ذہبی نے ان کو علامہ، محقق اور علم کا خزانہ،سمعانی نے فاضل، کبیر الشان اور جلیل القدر لکھا ہے، حافظ ابن جوزی کا بیان ہے کہ ان کا علم نہایت وافر تھا اور ابن سمعانی کا بیان ہے کہ وہ علم میں عظیم حیثیت اور بلند مرتبہ کے مالک تھے، ابن عماد نے ان کو ان کے تمام معاصرین سے فائق قرار دیا ہے۔

حدیث میں درجہ: گو امام خطابی کو گوناگوں علوم میں کمال حاصل تھا لیکن ان کا اصلی اور امتیازی فن علم حدیث ہے، ان کا شمار اس فن کے ائمہ اور نامور محدثین میں کیا جاتا ہے، حفظ و ضبط، عدل و اتقان اور فہم ودرایت میں ان کا درجہ بلند تھا، علامہ ذہبی نے ان کو ثقہ وثبت، سمعانی نے حجت وصدوق اور علامہ ابن سبکی نے امام حدیث لکھا ہے۔(۱)

فقہ: فقہ واجتہاد کی معرفت میں بھی بے نظیر تھے، مورخین نے ان کو فقیہ لکھا ہے اور حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ ''وہ فقہائے مجتہدین میں تھے۔''

لغت وعربیت: لغت وعربیت، نحو وادب اور معانی وغیرہ میں بھی صاحب کمال تھے، حافظ ابن جوزی نے لغت ومعانی میں ان کی معرفت کا اور دوسرے مورخین نے ادب وعربیت میں مہارت کا ذکر کیا ہے۔(۲) اسی لیے ادباو نحاۃ اور اہل لغت کے حالات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی امام خطابی کا تذکرہ موجود ہے۔

شعروسخن: ان کو شعروسخن سے بھی دلچسپی تھی اور وہ خود مشق سخن بھی کر۔ نے تھے، چند اشعار درج ذیل ہیں:

کم معشر سلموا لم یؤذهم سبع　　　　وما نری بشرا لم یؤذه بشر

کتنے لوگ درندوں کے ضرر سے محفوظ رہتے ہیں، لیکن ہم نے آدمی کو آدمی کی اذیت سے محفوظ نہیں دیکھا۔

---

(۱) تاریخ ابن خلکان ج۱ص ۲۹۷ و کتاب الانساب ورق ۱۸۱، تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۳ والعبر ج ۳ ص ۳۹ والمنتظم ج ۶ ص ۳۹۷ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸ (۲) ایضاً۔

وماغمة الانسان فی شقة النویٰ ولکنها والله فی عدم الشکل

وانی غریب بین بست واهلها وان کان فیها اسرتی وبها اهل

انسان کی کلفت و پریشانی مسافرت اور غریب الوطنی میں نہیں ہے بلکہ ہم مذاق اور ہم جنسوں کے نہ ہونے میں ہے، اسی لیے میں بست اور اہل بست کے درمیان رہ کر بھی غریب الوطن ہوں، حالاں کہ یہ میرا وطن ہے اور یہاں میرے اہل وعیال اور اعزہ واقارب موجود ہیں۔

لعمرك مالحیاة وان حرصنا علیها غیر ریح مستعارة

وما للریح دائمة هبوب ولكن تارة تجری وتارة

زندگی جس پر ہم اس قدر ریجھے ہوئے ہیں، بخدا اس مستعار ہوا کی طرح ہے جو ہمیشہ نہیں چلتی بلکہ کبھی کبھی چلتی ہے۔

تغنم سکون الحادثات فانها وان سکنت عما قلیل تحرك

وبادر بایام السلامة انها رهون وهل للرهن عندك مترك

حوادث کے رکنے کو غنیمت سمجھو کیوں کہ یہ جلد ہی متحرک بھی ہو جاتے ہیں اور سکون وسلامتی کے دنوں کو غنیمت سمجھو کیوں کہ یہ تمہارے پاس رہن ہیں اور جو چیز رہن ہو وہ تمہارے پاس چھوڑی نہیں جا سکتی۔

تسامح ولاتستوف حقك كله وابق فلم یستقص قط کریم

ولاتغل فی شیء من الامر واقتصد كلا طرفی قصدالامور ذمیم (۱)

نرمی اور آسانی سے کام لو اور اپنا حق پورا لینے کے بجائے کچھ باقی رکھو کیوں کہ شریف آدمی کبھی آخری حد کو نہیں پہنچتا، کسی معاملہ میں غلو سے کام نہ لو بلکہ میانہ روی اختیار کرو کیوں کہ اعتدال کے دونوں سروں (افراط وتفریط) پر ذمیم ہوتا ہے۔

(۱) یتیمۃ الدہر ج ۴ ص ۳۲۲ و معجم الادباء ج ۲ ص ۸۴ تا ۸۶ و ج ۴ ص ۱۴۲ و ۱۴۳۔

ارض للناس جمیعا مثل ما ترضیٰ لنفسك

انما الناس جمیعا کلهم ابناء جنسك

فلهم نفس کنفسك ولهم حس کحسك (۱)

اپنے لیے جو کچھ پسند کرتے ہو وہی سب لوگوں کے لیے بھی پسند کرو، تمام لوگ

تمہاری ہی جنس کے ہیں، تمہاری طرح وہ بھی صاحب نفس واحساس ہیں۔

زہد واتقا: علمی کمالات کی طرح ورع وتقویٰ میں بھی ممتاز تھے، مورخین نے ان کے زہد واتقا کا ذکر کیا ہے۔

امامت ومرجعیت: ان گوناگوں کمالات اور مختلف النوع خصوصیات کی وجہ سے ان کی ذات لوگوں کا مرکز بن گئی تھی اور وہ امام ومقتدیٰ کہلاتے تھے، ابن سمعانی لکھتے ہیں کہ وہ لائق اقتدا اور ائمہ سنت وحدیث میں تھے۔(۲)

مسلک: امام خطابی گو خود اجتہادی بصیرت اور فقہی ژرف نگاہی میں ممتاز تھے تاہم وہ امام شافعی کے مسلک پر کاربند تھے۔

اخلاق وعادات: ان کے اخلاق وعادات کے ذکر سے کتابیں خاموش ہیں مگر ان کی سخاوت وفیاضی اور فہم ودانش کا اعتراف کیا گیا ہے، وہ اپنی کمائی کا بیشتر حصہ اپنے دوستوں اور نیک لوگوں پر خرچ کر ڈالتے تھے، ان سے متعدد حکیمانہ اقوال بھی منسوب ہیں اور ان کے شعروں میں بھی حکمت واخلاق اور فہم ودانائی کی باتیں ملتی ہیں۔

پیشہ: امام خطابی تجارت پیشہ تھے اور اپنے زہد وورع کی وجہ سے ہمیشہ حلال اور طیب رزق کماتے تھے۔

انتقال: مشہور اور صحیح قول کے مطابق بروز شنبہ ۶ ربیع الآخر ۳۸۸ھ کو وفات پائی، بعض مورخین نے ۱۶ ربیع الآخر اور بعض نے ربیع الاول کا مہینہ لکھا ہے، ایک قول کے مطابق ان

---

(۱) مقدمہ معالم السنن ص ۱۹ (۲) کتاب الانساب ورق ۲۰۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸۔

کی وفات ۳۸۶ھ میں ہوئی۔(۱)

تصنیفات: امام خطابی کو تصنیف وتالیف کا بڑا عمدہ ذوق تھا اور چوں کہ ان کو گوناگوں علوم سے مناسبت اور اشتغال تھا، اس لیے ان کتابوں کے موضوعات میں بڑا تنوع ہے، ان سے بیشمار کتابیں یادگار ہیں اور ان میں اکثر کتابیں بیش قیمت اور حسن تالیف اور دلکش طرز تصنیف کا نمونہ ہیں، ذیل میں ان کی تصنیفات کی فہرست اور بعض کے متعلق مختصر معلومات پیش کیے جاتے ہیں:

۱- کتاب الجہاد، ۲- کتاب شان الدعا یا بیان الدعا، ۳- کتاب الشجاج یا کتاب النجاح، ۴- کتاب شرح الادعیۃ الماثورہ، ۵- کتاب شرح دعوات لابی خزیمہ، ۶- کتاب العروس، ۷- کتاب العزلہ، ۸- کتاب الغنیہ عن الکلام واہلہ، ۹- کتاب اصلاح الغلط (بعض نے اس کا نام اصلاح غلط المحدثین لکھا ہے)

۱۰- کتاب تفسیر اسامی الرب عزوجل: غالبًا شرح الاسماء الحسنٰی اور شرح اسماء اللہ الحسنٰی بھی اسی کتاب کے نام ہیں، اس موضوع پر علمائے اسلام کی متعدد تصنیفات کی فہرست صاحب کشف الظنون نے تحریر کی ہے، امام خطابی کی تصنیف اہم کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔

۱۱- اعلام السنن: اسی کا نام اعلام الحدیث اور شرح البخاری بھی ہے، اس میں بخاری شریف کی حدیثوں کی شرح کی گئی ہے، امام صاحب جب سنن ابی داؤد کی شرح لکھ چکے تو اہل بلخ کی فرمائش پر انھوں نے بخاری شریف کی بھی ایک جلد میں شرح لکھی جو لطیف نکات اور مفید مطالب پر مشتمل ہے لیکن یہ معالم السنن کی طرح طویل نہیں ہے بلکہ اس میں اختصار سے کام لیا گیا ہے، امام محمد تمیمی اور ابوجعفر احمد بن سعید داؤدی نے اپنی شرحوں میں

(۱) کتاب الانساب ورق ۲۰۳ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۱۸ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۲ وبستان المحدثین ص ۱۲۳۔

ان چیزوں کا ذکر کیا ہے جن کو امام خطابی نے نظر انداز کر دیا ہے، ان کتابوں میں خطابی کے بعض مسامحات کا بھی ذکر ہے۔

اعلام السنن کا ایک نسخہ موصل کے جامع سلطان اویس میں ہے، داؤد چلپی نے مخطوطاتِ موصل کے ص ۹۴ پر اس کا ذکر کیا ہے، حلب کے مکتبہ شیخ محمد سلطان مرحوم میں اس کتاب کا نصفِ آخر موجود ہے جو ۴۸۷ھ کا لکھا ہوا ہے۔

۱۲-غریب الحدیث: اس کا شمار امام خطابی کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے، ان سے پہلے اور بعد میں اس فن میں متعدد کتابیں لکھی گئیں جن میں ابوعبید، ابن قتیبہ اور امام خطابی کی کتابیں بہت اہم اور بہتر خیال کی جاتی ہیں، بعض علماء کا خیال ہے کہ امام خطابی کی کتاب کا پایہ ان سب میں بلند ہے، انھوں نے ابن قتیبہ کی کتاب کا ذیل بھی لکھا ہے اور ان کی غلطیوں اور اوہام کی نشاندہی بھی کی ہے، ابوالحسن عبدالغافر نے ان سے اس کتاب کی روایت کی تھی، غالبًا یہ بیش قیمت اور اہم کتاب اب معدوم ہے۔

۱۳-معالم السنن: یہ ان کی سب سے اہم اور مشہور کتاب ہے، اس میں سنن ابی داؤد کی حدیثوں کی شرح، اس کے اہم مطالب کی توضیح اور اس کے مشکلات کو نہایت عالمانہ اور محققانہ انداز اور دلنشیں ودلکش پیرایہ میں حل کیا گیا ہے، اس کی چار جلدیں اعلام النبلا کے فاضل مصنف محمد راغب طباخ نے بعض مخطوطہ نسخوں کی مدد سے ایڈٹ کر کے مطبع علمیہ حلب سے ۱۳۵۱ھ و ۱۳۵۳ھ میں شائع کیا تھا اور اس کے شروع میں امام ابوداؤد اور امام خطابی کے حالات وکمالات بھی تحریر کیے ہیں، ان چاروں جلدوں کے صفحات کی مجموعی تعداد تقریبًا ڈیڑھ ہزار ہے، شہاب الدین ابومحمود احمد بن محمد بن ابراہیم مقدسی (م ۷۶۹ھ) نے عجالۃ العالم من کتاب المعالم کے نام سے اس کی تلخیص کی تھی،(۱) اس شرح کی بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:(۲)

---

(۱) کشف الظنون (۲) اس شرح کی خصوصیات پر راقم نے معارف کے تین نمبروں (دسمبر ۶۹ء تا فروری ۷۰ء) میں ایک مفصل مضمون لکھا ہے۔

۱- یہ سنن ابوداؤد کی سب سے اہم، مستند اور قدیم شرح ہے، اس کے بعد جو شرحیں لکھی گئیں وہ زیادہ تر اسی سے ماخوذ ہیں۔

۲- احادیث کی تشریح وتفسیر اور بحث وتحقیق کا معیار نہایت بلند اور طرز استدلال بہت دلکش اور دلنشیں ہے، جن چیزوں سے عموماً لوگ سرسری طور پر گذر جاتے ہیں، امام صاحب نے ان سے بڑے دقیق مسائل، گہرے معانی وحقائق اور دلچسپ نتائج ونکات مستنبط کیے ہیں اس ضمن میں احادیث کے اندر پیدا ہونے والے شکوک واعتراضات کا بھی بہت مفصل اور عالمانہ جواب دیا گیا ہے۔

۳- امام خطابی کا شمار ان علمائے اسلام میں ہوتا ہے جو شرعی احکام کے علل ومصالح بیان کرنے میں زیادہ ممتاز سمجھے جاتے ہیں، اس لیے انھوں نے معالم السنن میں حدیثوں کے اسرار وحکم بیان کرنے پر خاص توجہ کی ہے۔

۴- حدیثوں کے باہمی اختلاف وتضاد کو رفع کرنے اور ان میں جمع وتطبیق دینے کی پوری کوشش کی ہے۔

۵- امام خطابی کا پایہ جرح وتعدیل میں بھی نہایت بلند تھا، اس لیے معالم السنن میں حدیث کی فنی بحثوں اور اصول حدیث پر بڑی ماہرانہ گفتگو کی گئی ہے۔

۶- معالم السنن فقہی حیثیت سے بھی نہایت اہم کتاب خیال کی جاتی ہے، امام صاحب فقہ وخلاف میں ممتاز اور خود بھی صاحب تفقہ واجتہاد تھے، چنانچہ اس میں صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور اس زمانہ تک کے تمام ائمہ ومجتہدین کے آرا ومسالک کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور مختلف اقوال میں محاکمہ کرکے مرجح قول کی نشاندہی بھی کی گئی ہے، علاوہ ازیں بعض مسائل سے امام صاحب کی فقہی ژرف نگاہی اور اجتہادی بصیرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

۷- وہ لغت وعربیت میں بھی ممتاز تھے، اس لیے لغوی، نحوی وصرفی بحثیں کلام کی

بلاغت، طرز ادا اور اسلوب بیان کی بھی اس میں وضاحت کی گئی ہے۔

غرض حدیثوں کی تفسیر، ان کے مواقع استنباط، وجوہ معانی کی دلالت، مشکل الفاظ، دقیق متون کی شرح، فقہی مباحث، احکام و مسائل کے استنباط اور علما کے اقوال واختلافات کی تفصیل وغیرہ کے لحاظ سے یہ بے نظیر اور متعدد گوناگوں فوائد، مختلف النوع مباحث اور حدیث سے متعلق اہم تحقیقات پر مشتمل نہایت جامع و مدلل کتاب ہے۔

امام ابن جمیع

(متوفی ۴۰۲ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوالحسین کنیت، نسب نامہ یہ ہے: محمد بن احمد بن محمد بن احمد بن عبدالرحمٰن بن یحییٰ بن جمیع (۱)، اپنے جدامجد جمیع کے نام پر ابن جمیع کے لقب سے مشہور ہوئے۔

ولادت، خاندان ووطن: امام ابن جمیع کا قبیلۂ ازد کی مشہور شاخ غسان سے جو شام میں آباد تھی، خاندانی تعلق تھا اور وطن شام کا ایک شہر صیدا ہے، یہیں ۳۰۵ھ میں وہ پیدا ہوئے، علامہ سمعانی نے سنہ ولادت ۳۰۶ھ لکھا ہے۔ (۲)

وطن کی نسبت سے صیداوی اور صیدانی اور خاندان کی نسبت سے غسانی کہلاتے تھے۔

رحلت وسفر: اس عہد کے دستور کے مطابق امام ابن جمیع نے علم کی تحصیل اور احادیث کی طلب کے لیے مختلف اسلامی ملکوں اور شہروں جیسے دمشق، بغداد، مکہ، بصرہ، کوفہ، عراق، مصر اور فارس وغیرہ کا سفر کیا اور ان مرکزی مقامات کے علماء ومحدثین سے اکتسابِ فن کیا، کثرتِ سفر کی وجہ سے ابن جمیع ''الجوال'' اور ''ذوالرحلۃ الکثیرۃ'' یعنی بہت بڑے سیاح کہلاتے تھے۔ (۳)

اساتذہ: ابن جمیع کے چند نامور شیوخ کے نام یہ ہیں:

---

(۱) بستان المحدثین ص ۸۶ (۲) کتاب الانساب ورق ۳۵۸ (۳) ایضاً وبستان المحدثین ص ۸۶۔

ابوسعید بن الاعرابی، ابوالعباس بن عقدہ، ابوعبداللہ محاملی، ابوروق ہزانی۔

تلامذہ: بعض ممتاز شاگردوں کے نام یہ ہیں:

حافظ عبدالغنی بن سعید، تمام رازی (صاحب فوائد) محمد بن علی صوری، ابوسعد احمد بن محمد بن عبداللہ مالینی، ابونصر عبدالرحمٰن بن ابی عقیل الصوری، ابونصر حسین بن محمد بن احمد خطیب دمشقی اور حسن بن جمیع وغیرہ۔(۱)

حفظ وضبط اور حدیث میں درجہ ومرتبہ: ابن جمیع کے حفظ وضبط، عدالت وثقاہت اور حدیث میں بلند پائیگی کے علمائے فن اور محدثین معترف ہیں، الحافظ ان کا لقب تھا اور خطیب بغدادی وغیرہ نے ان کی توثیق وتعدیل کی ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ھو اسند من بقی من الشام ۔حدیث میں ان کے کمال اور رسوخ کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسند الشام و محدثہ یعنی شام کے محدث ومسند کے نام سے موسوم کئے جاتے تھے۔(۲)

مداومت عمل اور ذوق عبادت: ابن جمیع کے عام حالات وواقعات معلوم نہیں ہو سکے، اس لیے ان کی سیرت وکردار اور عام اوصاف وخصائل کے متعلق بھی کچھ نہیں لکھا جا سکتا، تاہم ان کے ذوق بندگی، کثرتِ عبادت اور معمولات وغیرہ میں اہتمام اور پابندی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اٹھارہ سال کی عمر سے انھوں نے مسلسل روزہ رکھنا شروع کیا تو کبھی عمر بھر ان کے روزے فوت نہ ہوئے اور نہ اس معمول میں کوئی فرق آیا۔(۳)

وفات: ۹۷ سال کی عمر میں ماہ رجب ۴۰۲ھ کو انتقال کیا (۴) لیکن علامہ سمعانی کا بیان ہے کہ ۳۷۴ھ کے بعد ان کا انتقال ہوا۔(۵)

مسند یا معجم: ابن جمیع کی صرف ایک تصنیف کا پتہ چلتا ہے، بعض لوگوں نے اس کا نام مسند اور بعض نے معجم بتایا ہے، غالباً اس میں مسند ومعجم دونوں کی خصوصیات موجود تھیں، اس کا مکمل

(۱) کتاب الانساب ورق ۳۵۸ وبستان المحدثین ص ۸۶ (۲) ایضاً والعبر ج ۳ ص ۸۰ (۳) العبر ج ۳ ص ۸۰ وبستان المحدثین ص ۸۶ (۴) ایضاً (۵) کتاب الانساب ورق ۳۵۸۔

قلمی نسخہ حافظ ابن حجر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ان کے قلم سے اس پر مفید حواشی بھی تحریر ہیں۔(۱) اس معجم کے ایک قدیم مستند اور نایاب نسخے کا ایک جز جو سات حدیثوں پر مشتمل ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ میں بھی ہے، اس کے خاتمہ کے ایک نوشتہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جس اصل نسخہ سے یہ نسخہ نقل کیا گیا ہے، اس سے بعد میں عبارت لفظ بلفظ ملا کر دیکھ لی گئی ہے، ایک اور کرم خوردہ عبارت سے پتہ چلتا ہے کہ اس نسخہ کا چند محدثین نے اپنے نسخوں سے بھی موازنہ کیا ہے یہ جز ۶۰۶ھ یا اس سے قبل کا نوشتہ ہے۔(۲)

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵ (۲) نوادر خدا بخش لائبریری، ص ۹۷ و ۹۸۔

امام ابوعبداللہ حاکم

(متوفی ۴۰۵ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ اور ابن بیع کنیت اور حاکم لقب ہے، پورا نسب نامہ یہ ہے:

محمد بن عبداللہ بن محمد بن حمدویہ بن نعیم بن حکم ۔(۱)

امام ابوعبداللہ کے اجداد میں کوئی بزرگ تجارتی کاروبار کرنے کی بنا پر بیع (بیوپاری) کہلاتے تھے، اس نسبت سے امام صاحب کو ابن بیع کہا جاتا ہے، منصب قضا پر فائز ہونے کی وجہ سے حاکم کے لقب سے ملقب کیے گئے،(۲) ابوالفدا نے ابن الحاکم لقب تحریر کیا ہے،(۳) یہ غالباً اس لیے کہ ان کے جد امجد کا نام حکم تھا ممکن ہے بعد میں ابن حذف ہوکر صرف حاکم رہ گیا ہو۔

ولادت: امام صاحب دوشنبہ ۳/ربیع الاول ۳۲۱ھ کو نیشاپور میں پیدا ہوئے۔(۴)

خاندان ووطن: امام صاحب کے مرزبوم ہونے کا فخر عراق عجم کے مشہور مردم خیز شہر نیشاپور کو حاصل ہے، اس لیے وہ نیشاپوری کہلاتے ہیں لیکن ضبی اور طہمانی کی نسبتوں سے ان کا عربی قبائل سے خاندانی تعلق ظاہر ہوتا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ" حاکم کی دادی سبطہ، عیسی بن عبدالرحمٰن ضبی کی صاحبزادی تھیں، طہمانی کی نسبت ابراہیم بن طہمان کی جانب ہے جو

(۱) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۳ و ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۴ والمنتظم ج ۷ ص ۲۷۴ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۷ والطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۴ (۲) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸۵ وبستان المحدثین ص ۴۲

(۳) تاریخ ابوالفدا ج ۲ ص ۴۴ (۴) الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۴ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۰۔

صاحب فضل و کمال تھے۔(۱)

امام صاحب ایک علمی خانوادے کے چشم و چراغ تھے، ان کے والد اور ماموں علم وفن کے دلدادہ تھے، ان دونوں بزرگوں کے فیضِ توجہ سے وہ بچپن ہی میں علم وفن کی تحصیل میں مشغول ہوگئے تھے اور سب سے پہلے اپنے والد ماجد سے اکتسابِ فیض کیا، ان کے والد بزرگوار کو امام مسلم کو دیکھنے کا شرف بھی حاصل ہے۔(۲)

اساتذہ: مورخین کا بیان ہے کہ امام صاحب کو تقریباً دو ہزار فضلا اور محدثین سے استفادہ کرنے کا موقع ملا تھا، خاص نیشاپور کے اساتذہ کی تعداد ایک ہزار بتائی جاتی ہے، اپنے والد کے علاوہ جن ممتاز محدثین سے انھوں نے حدیثوں کی روایت کی ہے ان کے نام یہ ہیں:

ابن ابی سبرہ، ابن درستویہ، ابو حامد بن حسنویہ مقری، ابو سہل بن زیاد، ابوبکر احمد بن سلمان نجاد، حسن بن یعقوب بخاری، ابو علی حسین بن علی الحافظ نیشاپوری، ابو صالح خلف بن محمد بن اسماعیل خیام، ابو محمود دعلج بن احمد سجزی، ابو محمد عبدالرحمٰن بن حمدان جلاب، ابو عمرو عثمان بن محمد بن سماک، علی بن محمد بن عقبہ شیبانی، ابو العباس محمد بن احمد بن محبوب التاجر محبوبی، ابو جعفر محمد بن صالح بن ہانی، محمد بن عبداللہ صفار اصبہانی، ابو جعفر محمد بن علی بن رحم شیبانی، محمد بن علی بن عمر، ابو نصر محمد بن محمد بن یوسف، ابو العباس محمد بن یعقوب الاصم، ابو عبداللہ محمد بن یعقوب بن الاخرم شیبانی۔

فقہ کی تحصیل اس زمانہ کے مشہور فقہا، ابو سہل محمد بن سلیمان صعلوکی، ابو علی بن ابی ہریرہ، ابو الولید حسان بن محمد اور ابوبکر احمد بن اسحاق ضبی وغیرہ سے کی، قرأت کا فن محمد بن ابو منصور صرام ابن امام، علی بن علی نقار کوفی اور ابو عیسیٰ بکار بغدادی وغیرہ قراء سے سیکھا اور تصوف و اسرارِ دین کی تکمیل کے لیے ابو عمرو بن نجید، ابو الحسن بوشنجی، ابو سعید احمد بن یعقوب ثقفی، ابو نصر صفار، ابو القاسم رازی جعفر بن نصیر، ابو عمرو الزجاجی، جعفر بن ابراہیم خدا شیخ

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۴۶ (۲) ایضاً، الطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵۔

ابو عثمان مغربی اور ابو عمر بن محمد بن جعفر خلدی وغیرہ مشائخ وصوفیہ کی صحبت اختیار کی۔(۱)

تلامذہ: امام حاکم کے بعض مشہور تلامذہ کے نام حسب ذیل ہیں:

ابوذر ہروی، ابوصالح موذن، ابویعلیٰ خلیلی، ابوبکر احمد بن حسین بیہقی، ابوبکر احمد بن علی بن خلف شیرازی، ابوعثمان اسماعیل بن عبدالرحمٰن صابونی، زکی عبدالحمید بجیری، ابوالقاسم بن عبداللہ ابن احمد ازہری، ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری، عثمان بن محمد جحی، ابوالفتح محمد بن احمد بن ابی الفوارس، محمد بن احمد بن یعقوب، ابوبکر محمد بن علی بن اسماعیل قفال شاسی اور ابوالعلا محمد بن یعقوب واسطی۔(۲)

ان کے شیوخ میں امام ابوالحسن دارقطنی، احمد بن ابوعثمان حیری اور ابواسحاق مزکی نے بھی ان سے سماع کیا تھا، امام دارقطنی سے ان کی برابر مصاحبت اور ہم نشینی رہتی تھی، خطیب بغدادی ایک واسطہ سے حاکم کے شاگرد ہیں۔

شوق علم: امام حاکم بچپن ہی میں تعلیم وتعلم میں مشغول ہوگئے تھے اور نو سال کی عمر میں باقاعدہ حدیث کا سماع کیا، علم سے شغف کا یہ حال تھا کہ ان کو اپنے سے کمتر اور کمسن لوگوں سے بھی روایت کرنے میں کسی طرح کا عار نہ ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کے اساتذہ کی تعداد بے شمار ہے۔

رحلت وسفر: اپنے علمی ذوق کی تسکین کے لیے انھوں نے سب سے پہلے اپنے وطن نیشاپور کے جو اس وقت علمائے فن اور محدثین کا مرکز بنا ہوا تھا، اربابِ کمال کی جانب رجوع کیا، بیس سال کے ہوئے تو دوسرے علمی شہروں اور مراکز حدیث کا رخ کیا اور عراق، بغداد، مکہ، کوفہ، مرو، بخارٰی، ماوراء النہر، ہمدان اور اصبہان وغیرہ تشریف لے گئے، اسفار کی کثرت کی وجہ سے مورخین ان کے بارے میں لکھتے ہیں کہ طاف الآفاق، رحل الکثیر، بغداد دو بار گئے۔

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۲، الطبقات الکبرٰی ج ۳ ص ۶۵ وکتاب الانساب ورق ۱۰۰، کذب المفتری ص ۲۲۹ (۲) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۳۔

تھے پہلی بار عین شباب کے زمانہ میں اور دوسری دفعہ گئے تو ان کا سن زیادہ ہو چکا تھا۔(۱)

حدیث وروایت میں کمال وامتیاز: علم حدیث میں غیر معمولی کمال وامتیاز کی بنا پر وہ الحافظ الکبیر اور امام المحدثین وغیرہ القاب سے یاد کئے جاتے تھے، ابو حازم عبدوی کا بیان ہے کہ ''حاکم اپنے زمانہ میں محدثین کے امام تھے'' یافعی لکھتے ہیں ''حدیث اور اس کے متعلق علوم کی معرفت میں ان کو بڑی مہارت حاصل تھی'' علامہ ذہبی فرماتے ہیں ''نہ صرف خراسان بلکہ ساری دنیا میں اقلیم حدیث کی تاجداری ان پر ختم ہوگئی'' علامہ ابن صلاح اور حافظ نووی نے صحاح ستہ کے مصنفین کے بعد جن سات محدثین کو نہایت صاحب کمال قرار دیا ہے، ان میں امام دارقطنی کے بعد دوسرا نام حاکم ہی کا بتایا ہے، ان کے زمانہ کے جن چار محدثین کو خصوصیت سے سرآمد روزگار سمجھا جاتا تھا، ان میں ایک یہ بھی تھے، عبدالغافر کہتے ہیں وہ اپنے زمانہ میں اہل حدیث کے امام اور فنِ حدیث سے بخوبی واقف تھے۔

حفظ وثقاہت: حدیث میں ان کے کمال کا اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت پر تمام ائمہ فن اور محدثین کا اتفاق ہے، اہل سیر نے الحافظ الکبیر من اہل الحفظ اور من اکابر حفاظ الحدیث وغیرہ کہہ کر ان کے حافظہ کی توثیق کی ہے، ابوعبدالرحمن سلمی کا بیان ہے کہ میں نے امام دارقطنی سے حاکم اور ابن مندہ کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے فرمایا کہ ابن بیع حافظہ میں زیادہ مستند اور اتقن ہیں۔

کلامی مذہب: کلام وعقائد میں اشاعرہ کے ہمنوا تھے، ابن سبکی نے ان کے اشعری المذہب ہونے کی تصریح کی ہے اور علامہ ابن عساکر نے تبیین میں اشاعرہ کے دوسرے طبقہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اس طبقہ میں ان لوگوں کے ترجمے درج ہیں جو امام ابوالحسن اشعری کے تلامذہ کے صحبت یافتہ اور ان کے اصول پر کاربند تھے۔

تدین وتقویٰ: وہ زہد واتقا اور دیانت وامانت میں ممتاز تھے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ

(۱) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۳۔

"حاکم متدین، امین، صاحب حزم وورع اور اللہ کی جانب مائل ومتوجہ رہتے تھے۔"(۱) حج بیت اللہ سے بھی مشرف ہوئے تھے، تصوف سے اشتغال اور اکابرِ صوفیہ ومشائخ سے وابستگی بھی ان کے تدین کا ثبوت ہے۔

سیاسی واجتماعی مشاغل: پہلے گذر چکا ہے کہ امام صاحب عہدۂ قضا پر متمکن ہونے کی بنا پر حاکم کہلاتے تھے، بعض مورخین نے ان کونسا کا لیکن اکثر نے نیشاپور کا قاضی بتایا ہے، یہ ۳۵۹ھ کا واقعہ ہے، اس زمانہ میں دولت سامانیہ کی طرف سے نیشاپور میں ابوالنصر محمد بن عبدالجبار عتبی کی ولایت قائم تھی، امام صاحب محکمۂ قضا کے فرائض سے اس قدر خوش اسلوبی کے ساتھ عہدہ برآ ہوئے کہ دوبارہ ان کو جرجان کا عہدۂ قضا پیش کیا گیا لیکن انھوں نے اس کو قبول نہیں کیا مگر بعض مورخین نے ان کے جرجان کے قاضی مقرر کیے جانے کی تصریح کی ہے۔

امام صاحب پر دولت سامانیہ اور اس کے امراو حکام کو بڑا اعتماد تھا، امیر ابوالحسن ان سے مشورے طلب کرتا تھا اور بنی بویہ کے پاس سفارت کے لیے بھیجتا تھا، امام صاحب نے بنی بویہ اور سامانی حکومت کے درمیان سفارتی فرائض بڑی اچھی طرح انجام دیے۔

ان کو ملی واجتماعی کاموں سے بھی یک گونہ دلچسپی تھی، ایک زمانہ میں مدرسہ دارالسنت کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری انہی کے سپرد تھی، ان کے استاذ احمد بن اسحاق ضبی نے اپنی وفات کے بعد مدرسہ کے امور ومعاملات کی نگرانی اور اوقاف کی تولیت واہتمام کے بارے میں ان کو وصیت کی تھی۔(۲)

مقبولیت ومرجعیت: امام صاحب اپنے گوناگوں کمالات کی وجہ سے مسلمانوں کے مقتدا وامام اور ان کی عقیدت وتوجہ کا مرکز بن گئے تھے اور خواص وعوام سب میں یکساں مقبول اور

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج۱۱ ص۳۵۵ (۲) تاریخ ابن خلکان ج۲ ص۲۸۵ والطبقات الکبریٰ ج۳ ص۶۵ وتبیین کذب المفتری ص۲۲۹ وتذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۲۴۶۔

ہر دلعزیز تھے، علامہ ابن سبکی کا بیان ہے کہ ان کی عظمت شان، جلالت قدر اور امامت فن پر سب کا اتفاق ہے، وہ ان ائمۂ اعلام میں تھے جن کے ذریعہ اللہ نے اپنے دین مبین کی حفاظت کا کام لیا ہے، لوگ دور دراز سے ان کی خدمت میں آ کر اپنی علمی تشنگی بجھاتے تھے، وہ جس بزم میں پہنچ جاتے اس کی رونق بڑھ جاتی، لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے اور شایان شان استقبال کرتے، اکابر محدثین و نامور ائمہ فن کے مجمع میں بھی تشریف لے جاتے تو لوگوں کو اپنے علمی تبحر اور خوش کلامی سے متاثر کر لیتے تھے، عبدالغافر امام حاکم کی مدح وستائش میں نہایت رطب اللسان رہتے تھے، ان کا بیان ہے کہ ہمارے اساتذہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے اکثر فضلا و اربابِ کمال جیسے صعلوکی اور ابن فورک وغیرہ ان کو اپنے سے فائق اور مقدم سمجھتے تھے اور ان کے حفظ ومعرفتِ حدیث میں انفرادیت کی بنا پر ان کی فضیلت و برتری کے معترف اور ان کی عزت واحترام کا پورا خیال رکھتے تھے، ان کی تصنیفات، طرقِ حدیث میں ان کے علم ونظر، علمی مباحث وامالی وغیرہ میں ان کے تصرفات وکمالات کا جو جائزہ لے گا وہ ان کے فضل وکمال کا ضرور اعتراف کرے گا اور اس کو اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اپنے سے پہلے کے علماء پر بھی فوقیت رکھتے تھے، حاکم اپنے کمالات کی وجہ سے اس بلند مقام پر فائز تھے، جہاں پہنچنا دوسروں کے لیے ممکن نہیں تھا، وہ اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے، ان کی موت سے جو خلا ہوا ہے وہ پر نہیں ہو سکتا۔(۱)

وفات: امام صاحب نے اپنے وطن نیشاپور میں منگل یا بدھ ۳/صفر ۴۰۵ھ کو دفعۃً انتقال کیا، حمام سے غسل کر کے نکل رہے تھے اور صرف تہبند باندھے ہوئے تھے کہ ایک آہ کھینچی اور روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی، عصر بعد تجہیز وتکفین کی گئی، قاضی ابوبکر حیری نے جنازہ کی نماز پڑھائی، خلیل بن عبداللہ نے ارشاد میں ۴۰۳ھ سنہ وفات لکھا ہے لیکن علامہ ابن سبکی وغیرہ

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ ص ۳۸۵ والطبقات الکبریٰ ج ۳ ص ۶۵ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۶۔

نے اس کی تردید کی ہے۔

حسن بن اشعث قرشی نے خواب دیکھا کہ حاکم نہایت اچھی وضع قطع میں ایک گھوڑے پر سوار ہوکر کہہ رہے ہیں کہ مجھے نجات مل گئی، میں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ حدیث کی تحریر وکتابت کی وجہ سے اللہ نے مجھ کو نجات دی ہے۔(۱)

تصنیفات: امام ابوعبداللہ حاکم کی تصنیفات کیت وکیفیت دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتی ہیں، ان کا خود بیان ہے کہ ''میں نے زمزم کا پانی پی کر خدا سے حسن تصنیف کی دعا کی تھی، ان کی دعا مقبول ہوئی، اربابِ سیر کا اتفاق ہے کہ تصنیفی حیثیت سے ان کا مرتبہ نہایت بلند تھا، سعد بن علی زنجانی سے جب چار ہم عصر محدثین کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے ہر ایک کی جدا جدا خصوصیات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان سب میں حاکم سب سے بہتر تصنیف والے تھے، علامہ ابن خلکان فرماتے ہیں کہ ''حاکم نے علوم حدیث میں بے نظیر تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں'' سمعانی کا بیان ہے کہ انھوں نے علوم حدیث اور دیگر فنون میں بڑی عمدہ کتابیں لکھیں، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ لکھتے ہیں ''حاکم را درفن تصنیف وترتیب دخل تمام بود۔''

ان کی تصنیفات کی تعداد کے بارے میں اختلاف ہے، بعض لوگوں نے پانچ سو، بعض نے ایک ہزار اور بعض نے ڈیڑھ ہزار جز کے بقدر تعداد بتائی ہے،(۲) لیکن قدما کی طرح ان کی بھی اکثر کتابیں اب معدوم اور ناپید ہیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱-الاربعین، ۲-الامالی، ۳-امالی العشیات، ۴-تراجم

---

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ۲ص ۳۸۵ والطبقات الکبریٰ ج ۳ص ۶۵ وتبیین کذب المفتری ص ۲۲۹ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۲۴۶ (۲) تاریخ ابن خلکان ج ۲ص ۲۸۵ والطبقات الکبریٰ ج ۳ص ۶۷ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ص ۲۴۸ وبستان المحدثین ص ۱۴۱۔

الشیوخ، ۵–تراجم المسند علی شرط الصحیحین۔ ۶–التلخیص، ۷–فضائل الامام الشافعی، ۸–فضائل العشرۃ المبشرۃ، ۹–فضائل فاطمہ، ۱۰–فوائد الخراسانیین، ۱۱–فوائد الشیوخ، ۱۲–فوائدالعراقیین، ۱۳–ماتفرد باخراجہ کل واحد من الامامین، ۱۴–کتاب المبتدا من اللآلی، ۱۵–مناقب الصدیق۔

۱۶- کتاب العلل: علل میں امام مسلم اور دارقطنی کی کتابیں اہم سمجھی جاتی ہیں، حاکم کی کتاب کا بھی ان ہی کے ساتھ نام لیا جاتا ہے، **۱۷-تفسیر القرآن**: علامہ سیوطی اور صاحبِ کشف الظنون نے تیسری اور چوتھی صدی ہجری کی اہم کتب تفسیر میں اس کو شمار کیا ہے، سیوطی لکھتے ہیں ''پھر ابن ابوحاتم، ابن ماجہ، حاکم، ابن مردویہ، ابن حبان اور ابن منذر وغیرہ کی تفسیریں ہیں، ان میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے آثار سنداً بیان کئے گئے ہیں۔''(۱)

۱۸- تخریج الصحیحین: اس کا نام المدخل الی معرفۃ الصحیحین بھی ہے اور غالباً حاکم نے رسالہ المدخل میں اسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''حجاز، عراق اور شام کے لوگ صحیح حدیثوں کی معرفت میں اہلِ خراسان کی برتری اور تقدم کے معترف ہیں، اس کی وجہ شیخین (بخاری ومسلم رحمہما اللہ) کی اس فن میں مہارت وانفرادیت ہے، اللہ ان دونوں بزرگوں کو اسلام کی اس خدمت کی جزائے خیر عطا کرے، میں نے ان کی کتابوں کے بارے میں ایک کتاب لکھی ہے، اس میں ان کی صحیح وسقیم حدیثوں کی متفق علیہ اور مختلف فیہ شرطوں کا ذکر ہے،(۲) اس کی ابتدا میں حدیثوں کی حفظ واشاعت کے بارے میں حدیثیں اور آثار اور جھوٹی حدیثیں گھڑنے کے متعلق وعیدیں بیان کی گئی ہیں، پھر ان لوگوں کے نام تحریر کئے گئے ہیں جن کا صحیحین یا ان میں سے کسی ایک

(۱) الاتقان ج ۲ ص ۱۹۰ (۲) المدخل الی علم الحدیث ص ۶۔

کے اندر ذکر ہے، اس کے بعد ان اشخاص کا ذکر ہے جن سے امام بخاری نے روایتیں کی یا سنی ہیں، حافظ محمد طاہر مقدسی نے اس کتاب کے اکثر مباحث الجمع بین رجال الصحیحین میں درج کئے ہیں۔

۱۹-مزکی الاخبار: معرفۃ علوم الحدیث کے بعض قلمی نسخوں میں اس کا نام کتاب المزکین لرواۃ الاخبار لکھا ہوا ہے، حاکم خود اس کے متعلق لکھتے ہیں "اس میں راویوں کے دس طبقوں کا ذکر ہے، ہر طبقہ میں ایک دور کے چار بلند پایہ رواۃ شامل کئے گئے ہیں، اس طرح کل چالیس راویانِ حدیث کا اس میں ذکر ملتا ہے، پہلے طبقہ میں حضرت ابوبکر وعمر، علی اور زید بن ثابت (رضی اللہ عنہم) کا ذکر ہے، کیوں کہ ان بزرگوں نے راویوں کی جرح وتعدیل اور روایات کی صحت وسقم کی بحث وتحقیق کی ہے، دسویں طبقہ میں ابواسحاق ابراہیم بن حمزہ اصبہانی، ابوعلی نیشاپوری، ابوبکر محمد بن عمر بن سالم بغدادی اور ابوالقاسم حمزہ بن علی کتانی مصری کا ذکر ہے۔(۱)

۲۰-کتاب الاکلیل: بعض مصنفین نے اس کا نام اکلیل فی الحدیث لکھا ہے، یہ کتاب انھوں نے بعض امرا کی فرمائش پر لکھی تھی، اس کے بعد انھوں نے اصول حدیث میں اپنی مشہور تصنیف المدخل الیٰ الاکلیل کے نام سے بھی ایک رسالہ لکھا، اس کے آخر میں وہی باتیں مذکور ہیں جو اکلیل میں بیان کی گئی ہیں، یعنی صحیح حدیثوں کے رموز وطبقات (۲) وغیرہ، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ "یہ بڑی مفید کتاب ہے اور مفسر (۳) کو اس کے بغیر چارہ نہیں، علامہ ابن عساکر نے حاکم کی ایک کتاب کا نام "الاکلیل فی دلائل النبوۃ" بھی بتایا ہے، غالبًا یہ کوئی اور کتاب ہوگی یا ممکن ہے نام میں تصحیف ہوگئی ہو۔

۲۱- المدخل الیٰ علم الحدیث: المدخل الیٰ معرفۃ الصحیح والسقیم من الاخبار اور

---

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص۵۲ (۲) کشف الظنون ج۱ص۱۳۵ (۳) مفسر کا لفظ یہاں کتابت کی غلطی معلوم ہوتا ہے صحیح محدث ہوگا۔

المدخل الیٰ علم الصحیح بھی اسی کے نام ہیں اور غالباً علامہ ابن صلاح اور صاحب کشف الظنون نے المدخل الیٰ اکلیل بھی اسی کا نام تحریر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کتاب الاکلیل کا مقدمہ ہے، خود امام صاحب کے بیان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں میں نے اس کو امیر مظفر کی استدعا پر کتاب الاکلیل کی صحیح وسقیم حدیثوں کی نشاندہی کے لیے لکھا تھا۔"(۱) اس میں پہلے علم اسناد وروایت کی اہمیت، محدثین کی فضیلت اور کتب حدیث کے بعض طبقات کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد صحیح حدیثوں کی دس قسمیں بیان کی گئی ہیں، ان میں پانچ قسمیں متفق علیہ اور پانچ مختلف فیہ ہیں، پھر نقد وجرح پر گفتگو کی گئی ہے اور آخر میں اکلیل کی حدیثوں کے متعلق ان امور کا ذکر ہے، جن سے ان کی صحت وضعف کا پتہ چل جاتا ہے لیکن حاکم نے اس میں متفق علیہ اور مختلف فیہ حدیثوں کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے، بعض علما نے اس پر اعتراضات بھی کیے ہیں، شیخ محمد راغب طباخ نے مطبع علمی حلب سے جمادی الاول ۱۳۵۱ھ میں اس مفید رسالہ کو شائع کیا ہے۔

۲۲۔ **تاریخ نیشاپور:** یہ بڑی ضخیم کتاب ہے، اس میں خطیب بغدادی کی تاریخ بغداد کی طرح علما ومشاہیر فن کے تراجم درج ہیں اور حوادث وواقعات کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، (۲) اسی لیے اس کا نام تاریخ علمائے نیشاپور بھی ہے، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں کہ "حاکم کے اس عظیم الشان کارنامہ کے سامنے نامور محدثین وفقہا کو سرنگوں ہوجانا پڑا جو اس کا بغور مطالعہ کرے گا اس کو ان کے گوناگوں کمالات اور مختلف علوم میں جامعیت کا پورا اندازہ ہوجائے گا۔" ابوالفضل بن فلکی ہمدانی فرماتے ہیں کہ "میرے نیشاپور کا سفر کرنے اور وہاں اقامت اختیار کرنے کی ایک وجہ حاکم کی اس تاریخ کو دیکھنا بھی تھا۔"

عبدالغافر بن اسماعیل فارسی نے اس کا ذیل لکھا تھا، اس میں ۵۱۸ھ تک وفات پانے والے لوگوں کا ذکر ہے اور علامہ ذہبی نے "مختصر تاریخ حاکم" کے نام سے اس کا

---

(۱) المدخل الیٰ علم الحدیث ص ۳۴ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۵۴۴۔

اختصار لکھا تھا۔(۱)

۲۳-معرفۃ علوم الحدیث: یہ علوم حدیث پر ایک اہم اور مفید کتاب ہے، امام حاکم کو اپنے زمانہ میں بدعتوں کی کثرت، سنن سے عام ناواقفیت اور حدیثوں کے ضبط وتحریر میں اہمال اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کی ترتیب وتصنیف کا خیال ہوا تھا۔'' (۲) اس سے پہلے علوم حدیث میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں، ان کی حیثیت متفرق اجزا کی تھی، ابو محمد حسن بن عبدالرحمٰن بن خلاد رامہرمزی (م۲۶۰ھ) کی کتاب المحدث الفاصل بین الراوی والواعی، اس موضوع کی پہلی باقاعدہ کتاب ہے لیکن اس میں مکمل استیعاب واستقصا نہیں کیا گیا تھا، (۳) حاکم کے بعد خطیب بغدادی اور علامہ ابن صلاح کی کتابیں فوائد ومعلومات کے لحاظ سے اہم ہیں لیکن حاکم کا شرف وتقدم مسلم ہے، مگر حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ''حاکم اپنی کتاب کی باقاعدہ ترتیب وتہذیب نہیں کر سکے۔'' (۴) لیکن یہ بیان محل نظر ہے، علامہ ابن خلدون رقمطراز ہیں کہ ''علوم حدیث میں لوگوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں لیکن اس فن کے یگانۂ روزگار ائمہ وعلمائے فحول میں ابوعبداللہ حاکم ہیں، ان کی کتابیں مشہور ہیں، انھوں نے اس فن کو باقاعدہ مرتب ومہذب کیا اور اس میں بعض انواع کا اضافہ کیا اور اس کے محاسن اچھی طرح منقح اور نمایاں کیے (۵) اور ملا چلپی لکھتے ہیں کہ ''اس فن کی جانب سب سے پہلے ابوعبداللہ حاکم نے اعتناء کیا، اس کے بعد علامہ ابن صلاح نے علوم الحدیث کے نام سے بڑی اہم اور قابل ذکر کتاب لکھی جو مقدمہ ابن صلاح کے نام سے مشہور ہے، اس میں انھوں نے بعض انواع کا مفید اضافہ کیا ہے لیکن حاکم کی حیثیت متقدم ومتبوع کی ہے اور ابن صلاح ان کے تابع ہیں انھوں نے اکثر چیزیں حاکم کے حوالہ سے لکھی ہیں۔'' (۶)

---

(۱) کشف الظنون ص ۲۳۴ (۲) مقدمہ حاکم ص او ۲ (۳) تدریب الراوی ص ۹ ونخبۃ الفکر فی شرح نزہۃ النظر ص ۳ (۴) تدریب الراوی ص ۹ ونخبۃ الفکر فی شرح نزہۃ النظر ص ۳ (۵) مقدمہ ابن خلدون ص ۳۸۵ (۶) کشف الظنون ج ۲ ص ۱۲۹۔

اس تفصیل سے ثابت ہوگیا کہ اس موضوع پر یہ دوشرح با قاعدہ اور پہلی مکمل و جامع کتاب ہے، جو پانچ اجزا اور باون انواع پر مشتمل ہے، اس میں مصنف نے حدیث کے اسناد و متون وغیرہ گوناگوں انواع واقسام اور راویوں کے مختلف درجات وطبقات، ان کے مراتب اور اصول حدیث کے مہمات مسائل پر سیر حاصل اور عمدہ بحثیں کی ہیں، ہر بحث کی تعریف، اہمیت، نوعیت اور ضرورت کو مثالوں سے واضح کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں متقدمین کے کاموں کا ایک حد تک ذکر بھی آ گیا ہے، ہر بحث میں پہلے احادیث وآثار سنداً بیان کئے گئے ہیں اور آخر میں ان سے مصنف نے جو حقائق اور معنی خیز نتائج اخذ کئے ہیں، ان کا ذکر ہے۔ ضمناً اکثر صحابہ وراویانِ حدیث کے بعض خصوصیات سنینِ وفات اور ان کے بارے میں دوسرے مختلف النوع معلومات بھی تحریر کئے گئے ہیں۔

معرفۃ علوم الحدیث کے قلمی نسخے یورپ، ترکی، مصر، شام اور ہندوستان کے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، ان سب کی مدد و مقابلہ وتصحیح کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات وعربی کے سابق صدر ڈاکٹر سید معظم حسین نے اس کو ایڈٹ کیا تھا جو ۱۹۳۵ء میں مصر سے دائرۃ المعارف حیدرآباد کے اہتمام میں شائع ہوا ہے، اس کے شروع میں فاضل مرتب نے ایک جامع ومبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے، اس میں مصنف کے حالات وکارنامے اور اصولِ حدیث کی امہاتِ کتب کا تذکرہ کیا گیا ہے اور حواشی میں نسخوں کے فرق واختلاف اور کمی بیشی کی تصریح کی ہے۔

حافظ ابونعیم اصبہانی نے اس پر مستخرج لکھا تھا اور علامہ طاہر جزائری نے توجیہ النظر میں اس کا ملخص شامل کیا ہے۔(۱)

۲۴- المستدرك على الصحيحين: یہ حاکم کی سب سے اہم اور شہرۂ آفاق کتاب ہے، ذیل میں اس کے متعلق ضروری معلومات پیش کیے جاتے ہیں:

---

(۱) مقدمہ مصحح۔

مستدرک کی تعریف: محدثین کی اصطلاح میں حدیث کی وہ کتابیں مستدرک کہلاتی ہیں جن میں ان حدیثوں کو نقل کیا جاتا ہے جو حدیث کی کسی اور کتاب کی شرط کے مطابق ہونے کے باوجود اس میں درج ہونے سے رہ گئی ہوں (۱) اس طرح کی حدیث کی جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں ابوعبداللہ حاکم کی المستدرک علی الصحیحین زیادہ مشہور و متداول ہے، جیسا کہ اس کے نام ہی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم پر مستدرک ہے، یعنی اس میں ان حدیثوں کو شامل کیا گیا ہے جو حاکم کے خیال میں صحیحین کے معیار و شرائط کے مطابق ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئی ہیں۔

مستدرک کی تالیف کی وجہ: حاکم نے مستدرک کے شروع میں اس کی جمع و تالیف کا سبب و مقصد اور ان حالات کا ذکر کیا ہے جو اس کی ترتیب و تصنیف کا باعث ہوئے تھے، وہ لکھتے ہیں:

> ''ائمہ حدیث میں ابوعبداللہ محمد اسماعیل جعفی ابوالحسین، مسلم بن حجاج قشیری نے صحیح حدیثوں کے دو نہایت عمدہ اور بیش قیمت مجموعے مرتب کئے ہیں، ان دونوں کتابوں کی چار دانگ عالم میں شہرت ہے لیکن دونوں بزرگوں میں سے کسی نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ بجز ان حدیثوں کے جن کی انھوں نے تخریج کی ہے اور کوئی حدیث صحیح نہیں ہے مگر ہمارے زمانہ کے بعض مبتدعین اور اہل اہوا جو محدثین پر سب و شتم کرنے میں بہت جری واقع ہوئے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ صحیح حدیثوں کی تعداد دس ہزار سے زیادہ نہیں ہے، رہے وہ اسانید جو ایک ہزار یا اس سے کچھ کم و بیش اجزا پر مشتمل ہیں سب کے سب سقیم اور غیر صحیح ہیں، اس صورت حال کے پیشِ نظر اس شہر کے کچھ اعیان و مشاہیر اہل علم نے مجھ سے خواہش کی کہ میں ایسی کتاب مرتب و مدون کروں جو ان حدیثوں پر مشتمل ہو جن کے اسانید اسی طرح کے .... ہوں جس طرح کے

(۱) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۴۷ و ۱۰۳۔

اسانید کو شیخین نے صحیح اور قابل احتجاج قرار دیا ہو اس لیے کہ جو حدیث علت قادحہ سے خالی ہو اس کو صحیح سے خارج کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں۔''(۱)

مستدرک کی اہمیت: مستدرک کا شمار حدیث کی مشہور اور اہم کتابوں میں ہوتا ہے اور بعض حیثیتوں سے اس کو بڑی اہمیت حاصل ہے، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی نے کتب حدیث کے تیسرے طبقہ میں اس کو محسوب کیا ہے، (۲) اس طبقہ میں مسند دارمی، سنن دار قطنی، مسند ابوداؤد طیالسی اور مصنف ابوبکر بن ابی شیبہ جیسی اہم اور بلند پایہ کتابیں ہیں، بعض محدثین نے اس کا پایہ صحیح ابن حبان کے قریب قریب بتایا ہے، (۳) اور اس کا نام بھی صحیح ابن خزیمہ اور صحیح ابن حبان کے ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے، حافظ ابن صلاح اور علامہ نووی نے صحاح کے بعد حدیث کی جن کتابوں کو زیادہ اہم، قابل اعتماد اور پر از منفعت قرار دیا ہے، ان میں امام دار قطنی کی سنن کے بعد اسی کا نام لیا ہے۔ (۴)

مستدرک کی حدیثوں کی نوعیتیں: اوپر حاکم کا جو بیان گذرا ہے، اس سے اور حاکم کی دوسری تصریحات سے مستدرک کی حدیثوں کی مندرجہ ذیل نوعیتوں کا پتہ چلتا ہے۔

۱- مستدرک میں شیخین (امام بخاری و امام مسلم) کی ان متروک حدیثوں کو جو ان کے معیار و شرائط کے مطابق ہیں جمع کیا گیا ہے۔

۲- دونوں بزرگوں میں سے صرف ایک کی متروک حدیثوں کو بھی درج کیا گیا ہے۔

۳- مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی شامل ہیں جو صحیحین کے اصول و شرائط کے مطابق تو نہیں ہیں لیکن امام حاکم کی تحقیق میں وہ صحیح اور علل واسقام سے پاک ہیں۔ (۵)

۴- حاکم کے (۶) بیان کے مطابق بعض ایسی حدیثیں بھی مستدرک میں ہیں

---

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۲ و ۳ (۲) عجالۂ نافعہ مع فوائد جامعہ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۸ (۴) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۹۲، تدریب الراوی ص ۳۰ و ۳۱ و ۲۶۰ (۵) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱ (۶) یہ حاکم کا خود بیان ہے ورنہ عام اہل فن نے تو مستدرک میں ضعیف اور موضوع حدیثوں کی کثیر تعداد بتائی ہے۔

جن پر کلام کیا گیا ہے اور وہ ان کے معیار و شرائط کے مطابق بھی نہیں ہیں لیکن انھوں نے ان کو شواہد و متابعات کی حیثیت سے یا اور کسی خاص اضطرار وغیرہ کی بناء پر نقل کیا ہے۔

حاکم نے مستدرک میں کہیں کہیں ایک مقدمہ کا حوالہ دیا ہے جس میں انھوں ان اصول وخصوصیات اور شرائط کا مفصل ذکر کیا تھا جن کو مستدرک کی تالیف و ترتیب میں مدنظر رکھا تھا لیکن یہ مقدمہ مستدرک کے مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں ہے، وہ یا تو محفوظ نہیں رہا یا حاکم نے اس کو مرتب ہی نہ کیا ہو اور اس بنا پر کہ اس کو لکھنے کا ارادہ تھا، اس کا حوالہ دے دیا ہو، اگر یہ مقدمہ موجود ہوتا تو اس سے مستدرک کے اصول و شرائط اور اس کی حدیثوں کی نوعیت اور خصوصیات معلوم کرنے میں بڑی آسانی ہوتی، جہاں انھوں نے اس کے حوالے دیے ہیں ان سے بھی مستدرک کی حدیثوں کی نوعیت اور خصوصیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، اس ذیل میں مستدرک کی حدیثوں کی بعض نوعیتیں ان حوالوں کی مدد سے لکھی جاتی ہیں۔

۵- مستدرک میں ایک صحابی کی حدیث دوسرے صحابی سے بشرطے کہ وہ صحیح طرق سے ثابت ہو درج کی جائے گی۔(۱)

۶- اگر کسی صحابی سے کسی ایک ہی معروف تابعی کی روایت کا پتہ چل سکا ہو تو اس کو بھی مستدرک میں بطور حجت پیش کیا جائے گا اور اس کو صحیح قرار دیا جائے گا۔(۲)

۷- ثقات کے تفرد اور اضافے کی تخریج بھی کی جائے گی، بشرطے کہ وہ مرتب کے خیال میں علتوں سے خالی ہوں کیوں کہ ثقہ کا اضافہ مقبول ہوتا ہے۔(۳)

۸- کسی موصول و مسند حدیث کو اگر ارسالاً اور موقوفاً بھی روایت کیا گیا ہو تو موصول و مسند حدیث کو محض دوسری حدیث کے وقف و ارسال کی وجہ سے نظر انداز نہیں کیا جائے گا، کیوں کہ ہمارے اصول اور قاعدے کے مطابق ایسی صورت میں مسند و موصول روایت کرنے والے کی حدیث قابل قبول ہوگی۔(۴)

---

(۱) المستدرک ج۱ ص ۱۱۸ و ۱۱۹ (۲) ایضاً ص ۲۳ (۳) ایضاً ص ۴۲ و ج ۲ ص ۵۸ (۴) ایضاً ج۱ ص ۱۷۲۔

۹- حلال وحرام کے متعلق احادیث میں زیادہ احتیاط اور سختی برتی جائے گی، مگر فضائلِ اعمال کے سلسلہ کی حدیثوں میں زیادہ سختی سے کام نہ لیا جائے گا، اس اصول کے متعلق انھوں نے کتاب الدعوات میں شیخین کی متروک حدیثوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ابوسعید عبدالرحمٰن بن مہدی کا یہ قول بھی تحریر کیا ہے کہ:

''ہم لوگ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حلال وحرام سے متعلق حدیثیں روایت کرتے ہیں تو اسانید ورجال کو پرکھنے میں زیادہ شدت برتتے ہیں اور پوری احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہیں مگر فضائلِ اعمال اور ثواب وعقاب، مباحات ودعوات سے متعلقہ روایات کے اسانید میں تساہل سے کام لیتے ہیں۔''(۱)

المدخل میں اس قول کے ساتھ امام احمدؒ کا بھی اسی طرح کا ایک قول نقل کیا ہے:

''جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرویات بیان کرتے ہیں تو حلال وحرام اور سنن واحکام کے سلسلہ میں تشدد سے اور فضائلِ اعمال اور غیر احکامی حدیثوں میں لینت اور نرمی سے کام لیتے ہیں۔''(۲)

تلاش وتفحص: امام ابوعبداللہ نے ان ہی اصول وشرائط کے مطابق مستدرک میں حدیثیں جمع کی ہیں اور جو حدیثیں ان کے بیان کے مطابق نہیں ہیں، ان کو نقل کرنے سے احتراز کیا ہے، چنانچہ کہیں کہیں مستدرک میں اس کی تصریح وتوضیح کی ہے، اس سے مستدرک کی جمع وتالیف اور ترتیب وتدوین میں ان کی تلاش ومحنت اور چھان بین کا پتہ چلتا ہے، بعض مواقع پر انھوں نے خود بھی اس تلاش وتحقیق کا ذکر کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میں نے مشہور حدیث ''من سئل عن علم فکتمه جیئ به یوم القیامة وقد الجم بلجام من نار۔ '' کے متعلق جو متعدد طرق واسانید سے مروی ہے، امام دارقطنی سے دریافت کیا کہ کیا عطار کی روایت کے متعدد اسناد

---

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۴۹۰ (۲) المدخل ص ۴۔

میں کوئی سند صحیح ہے، انھوں نے جواب دیا کہ نہیں، میں نے وجہ دریافت کی تو کہا کہ عطا نے حضرت ابو ہریرہؓ سے سماع نہیں کیا ہے لیکن جب میں نے اس کی مزید تحقیق کی تو متعدد لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ انھوں نے ابو ہریرہؓ سے عطاء کے سماع کا ذکر کیا ہے، اس سے ثابت ہوگیا کہ یہ حدیث صحیح سندوں سے مروی ہے اور اس میں کوئی سقم نہیں ہے، میری اس تحقیق کو امام دارقطنی نے بھی پسند کیا اور اس بارے میں وہ میرے معترف اور ہمنوا ہو گئے۔''(۱)

ایک جگہ لکھتے ہیں:

''زکوۃ کی تفسیر وتوضیح کرنے والی حدیثوں کی تخریج میں جس قدر ممکن ہوسکا ہے، میں نے اپنی غیر معمولی محنت وکاوش صرف کردی ہے اور ان کی صحت کے بارے میں خلفائے اربعہ، صحابہ اور تابعین کے صحیح اسناد، ان کے تعامل اور شہرت وقبول سے استدلال بھی مہیا کردیا ہے جو غور وفکر کرنے والوں کے لیے کافی ہے۔''(۲)

حاکم کی کاوش کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مستدرک میں ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن سے حدیث کی دوسری کتابیں خالی ہیں۔

مستدرک کے خصوصیات: مستدرک کے بعض اہم خصوصیات یہ ہیں:

۱۔ حاکم نے اس کی ترتیب، ابواب کی تبویب اور احادیث کے نقل وانتخاب میں حسن وموزونیت کے علاوہ بعض مقامات میں جدت واختراع سے بھی کام لیا ہے، اس سے ان کی محنت اور جانفشانی کا اندازہ ہوتا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک تلاش واجتہاد نے میری رسائی کی ہے میں نے خلفائے اربعہ کے فضائل سے متعلق وہ تمام حدیثیں جمع کردی ہیں جو صحیح سندوں سے مروی ہیں اور جن کو شیخین نے ترک کردیا ہے، پھر میں نے اس کتاب کے نظم وترتیب

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۱۰۱ (۲) المستدرک ج ۱ ص ۳۹۷۔

کے لحاظ سے یہ مناسب سمجھا کہ ان بزرگوں کے مناقب کے بعد دیگر صحابہ کے فضائل وفیات کی ترتیب پر جمع کروں۔"(۱)

عام محدثین کے برخلاف انھوں نے کتاب الفتن والملاحم کے بعد کتاب الاہوال کا بھی ایک علاحدہ باب علامہ ابن خزیمہ کے تتبع میں قائم کیا ہے، اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میرے مبلغ علم کے مطابق آخری زمانہ کے فتن کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جو کچھ مروی تھا، وہ سب میں نے اس کے اندر بہتر سندوں کے ساتھ بیان کردیا ہے، شیخین نے قیامت اور حشر ونشر کے اہوال کی حدیثیں کتاب الفتن ہی میں شامل کردی ہیں لیکن میں نے اس سلسلہ میں ابوبکر بن محمد بن اسحٰق بن خزیمہ کے انداز پر اس کو باب الفتن سے علاحدہ ذکر کیا ہے۔(۲)

امام بخاری وغیرہ محدثین نے کتاب البیوع میں متعدد مستقل ابواب مثلاً کتاب السلم، شفعہ اور اجارہ وغیرہ قائم کیے ہیں لیکن حاکم نے کتاب البیوع کے جامع عنوان ہی میں ان سب ابواب کو بھی جمع کردیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

"میں نے اسی کتاب (کتاب البیوع) کے ضمن میں ان کتب کو بھی درج کردیا ہے جن کے لیے امام بخاری نے کتاب البیوع کے آخر میں مستقل عنوانات قائم کیے ہیں، یہ وضاحت اس لیے کردی گئی تاکہ کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ میں نے کتاب البیوع کو ان ابواب سے خالی رکھا ہے۔"(۳)

فضائلِ صحابہ میں صرف صحابہ کے مناقب وفضائل ہی بیان کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان کے سنین اور مختصر حالات بھی تحریر کیے ہیں۔

۲- دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ امام بخاری وامام مسلم کی کتابوں کی بھی بعض

---

(۱) ایضاً ج ۳ ص ۱۸۰ (۲) المستدرک ج ۴ ص ۵۵۸ (۳) ایضاً ج ۲ ص ۲۵ و ۲۶۔

خصوصیات و اصول اور اس کے متعلق مفید معلومات اس سے معلوم ہو جاتے ہیں، مثلاً:

(الف) شیخین نے بعض غیر معلل حدیثوں کو نقل کرنے سے اس لیے احتراز کیا ہے کہ ان کے رواۃ میں کوئی راوی قلیل الروایت رہا ہو، چنانچہ ایک حدیث کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

''اس حدیث کے از اول تا آخر تمام رواۃ سے بجز یوسف بن ابی بردہ کے شیخین نے حجت قائم کی ہے اور جو کچھ اس سلسلہ میں مجھ کو معلوم ہوا ہے، وہ یہ کہ ان دونوں حضرات نے کسی جرح وضعف کی وجہ سے ان کو نہیں چھوڑا ہے بلکہ ان کی قلتِ روایت کی وجہ سے۔''(۱)

(ب) شیخین نے بعض صحیح حدیثوں کو کسی ایک راوی کے تفرد یا اس حدیث کے دوسرے رواۃ کی کسی مخالفت وعدم متابعت کی وجہ سے اس کو نظر انداز کر دیا ہے، حاکم اس کی مثال دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت عثمانؓ سے وضو کے متعلق جو حدیث مروی ہے، اس کے طرق کی تخریج پر شیخین نے بھی اتفاق کیا ہے لیکن ان کی روایات میں داڑھی کے تین بار خلال کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے، حالانکہ یہ بھی صحیح اسناد سے ثابت ہے اور ان دونوں بزرگوں نے عامر بن شقیق کے سوا اس کے تمام رواۃ سے حجت قائم کی ہے لیکن عامر کے متعلق مجھ کو کسی طعن کا کوئی علم نہیں۔''(۲)

(س) شیخین کے غیر معمولی حزم واحتیاط کی بنا پر روایت ترک کر دینے کا اصول بھی اس سے معلوم ہوتا ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

''یہ حدیث صحیح الاسناد ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے عبداللہ بن محمد بن عقیل ابن ابی طالب کے تفرد اور ان کی جانب سوء حفظ کی نسبت کی وجہ سے اس

(۱) المستدرک ج۱ ص ۳۲ (۲) ایضاً ص ۱۴۹۔

کی تخریج نہیں کی ہے مگر ہمارے ائمہ متقدمین کے نزدیک وہ ثقہ و مامون شخص ہیں۔"(۱)

(ج) شیخین کے کسی راوی سے استشہاد کا حال معلوم ہوتا ہے۔

(د) شیخین یا ان میں سے ایک کے بارے میں یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ انھوں نے حاکم کے کن کن رواۃ سے احتجاج کیا ہے۔

(ہ) حدیثوں کے شیخین کے شرائط کے مطابق ہونے کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حدیثوں کو انھوں نے مکمل یا مختصر صورت میں یا قدرے فرق و اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے، چنانچہ کتاب العلم کی ایک حدیث کے متعلق لکھتے ہیں:

"اس کو شیخین نے مفصل و مختصر دونوں طرح ذکر کیا ہے، میں نے اس کا اعادہ اس وجہ سے کیا ہے کہ اس کے سوا مجھے ان کے یہاں اجماع کی حجیت ثابت کرنے والی اور کوئی حدیث نہیں ملی، باقی ان ابواب میں اس موقع پر میں نے متعدد ایسی حدیثیں نقل کی ہیں جن کی ان لوگوں نے تخریج نہیں کی ہے۔"(۲)

۳۔ مستدرک میں فقہی مسائل سے کم تعرض کیا گیا ہے تاہم ان کے ذکر سے یکسر خالی نہیں ہے اور حاکم نے بعض فقہی اختلافات میں مرجح و اولیٰ کی نشاندہی بھی کی ہے، جس سے ان کی اجتہادی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴۔ مستدرک کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بعض حدیثوں کے مراجع و مصادر کی نشاندہی بھی کی ہے، اس سلسلہ میں جامع بخاری، صحیح مسلم، سنن ابی داؤد، سنن نسائی، مؤطا امام مالک، المبسوط امام شافعی اور صحیح ابن خزیمہ کے نام لیے ہیں لیکن بعض کتب و مسانید و وحدان کا نام لیے بغیر بھی ذکر کیا ہے۔

۵۔ بعض ابواب اور مضامین کی حدیثوں کو جمع کرنے میں بڑا اہتمام کیا ہے اور

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۱۷۱ و ۱۷۲ (۲) المستدرک ج ۱ ص ۱۱۳۔

بعض حدیثوں کے اسناد وطرق کو جمع کرنے میں بڑے استقصا سے کام لیا ہے، اسی لیے مستدرک میں بکثرت ایسی حدیثیں ہیں جن سے دوسری کتب حدیث خالی ہیں۔

٦- حدیثوں کی تصحیح وتصویب، ان کے قوی عزیز، ضعیف وشاذ اور غریب ہونے کی نشاندہی، وقف وارسال، رفع واتصال اور علوے اسناد کی تصریح، حفظ وضبط اور اتقان کے لحاظ سے اس کے اولیٰ واحسن ہونے اور علت وضعف اور سقم وعیب سے خالی ہونے کا ذکر، راویوں کی توثیق، دو روایتوں اور راویوں میں باہمی موازنہ، راوی کے شک ووہم، اس کے تفرد، مخالفت، عدم متابعت اور سماع ولقا یا عدم سماع بقا کی توضیح اور بعض حدیثوں کے بارے میں یہ بھی بتایا ہے کہ اس کو کس جگہ کس وقت اور کس ماہ وسنہ میں انھوں نے روایت کیا ہے، اسی طرح روایات کے شواہد ومتابعات، فنی مباحث کے متعلق علمائے جرح وتعدیل کے اقوال، روایات ورواۃ کی صحت وقوت یا ضعف وجرح کو واضح کر کے اس کے دلائل بھی بیان کیے ہیں اور حدیث کے مفہوم وغیرہ کے سلسلہ میں بھی مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں جن کو آگے لکھا جائے گا۔

طرز استدلال: مستدرک کے محاسن وخصوصیات کا اندازہ اس کے طرز استدلال سے بھی ہوتا ہے، لیکن اکثر دلائل خالص فنی نوعیت کے ہیں، اس لیے جب تک ان کا اصل پس منظر اور پوری تفصیل سامنے نہ ہو ان کو نقل کرنا نہ زیادہ مفید ہوگا اور نہ عام لوگوں کے لیے اس میں دلچسپی کا کوئی سامان ہے لیکن حاکم کے استدلال کی خصوصیت اور ان کے نقد ونظر کا اندازہ کرنے کے لیے یہاں ان کے ان انتقادات کا ذکر کیا جاتا ہے جو انھوں نے شیخین پر کیے ہیں، شیخین پر حاکم کے نقد وتبصرہ دو طرح کے ہیں، ایک تو وہ جن میں کسی حدیث کے بارے میں صرف شیخین کی عدم تخریج کا ذکر ہے، دوسرے وہ ہیں جن میں شیخین کے عدم تخریج کے وجوہ واسباب کا ذکر کرنے کے بعد ان پر تنقید کی گئی ہے، ان میں سے دوسری نوع کی بعض تنقیدیں یہاں درج کی جاتی ہیں:

''یہ حدیث صحیح اور ثقہ محدثین کے یہاں متداول ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اس لفظ کے ساتھ اس کی تخریج نہیں کی ہے، میرے خیال میں ان لوگوں نے اس کے راوی ہصان بن کاہل (یا کاہن) کی وجہ سے اس کو چھوڑ دیا ہے، کیوں کہ ان سے روایت کرنے والے معروف شخص محض حمید بن ہلال عدوی ہیں لیکن ابن ابی حاتم کا بیان ہے کہ ان سے قرہ بن خالد نے بھی روایت کیا ہے، علاوہ ازیں خود شیخین نے بھی بعض ثقہ لوگوں سے ایسی روایتوں کی تخریج کی ہے جن سے صرف ایک شخص نے روایت کیا ہے، اس اصول کے بموجب ان دونوں بزرگوں کو اسی جیسی دوسری حدیث کی تخریج بھی کرنی چاہیے تھی۔''(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''شیخین اجلح بن عبداللہ کندی کے ترک اور عدمِ احتجاج پر متفق ہیں اور ان سے ان کی ناراضگی کی وجہ محض عبداللہ بن بریدہ کی ایک حدیث کی روایت ہے، حالاں کہ اس میں تین ثقہ راویوں نے ان کی متابعت کی ہے، پس یہ حدیث صحیح ہے لیکن ان دونوں بزرگوں نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔''(۲)

امام دارقطنی نے بھی کتاب الالزامات علی الشیخین کے نام سے مستدرک ہی کی طرح ایک کتاب لکھی تھی، امام حاکم نے اس کے حوالہ سے بھی شیخین پر نقد کیا ہے، اس کی ایک مثال یہ ہے۔

''یہ صحیح حدیث ہے، اس میں کوئی علت نہیں پائی جاتی لیکن شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے کیوں کہ عروہ، کرز بن علقمہ سے روایت کرنے میں منفرد ہیں اور کرز بن علقمہ صحابی ہیں اور ان کی حدیث ائمہ کے مسانید میں درج ہے۔ میں نے علی بن عمر سے سنا ہے کہ امام بخاری ومسلم کے لیے کرز کی اس حدیث کی

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۸ (۲) ایضاً ج ۲ ص ۷۷۔

تخریج لازم تھی، کیوں کہ اس کو عروہ بن زبیر نے اور ان سے زہری وعبدالواحد جیسے اکابر نے روایت کیا ہے، امام ابوالحسن کے بیان کی واضح دلیل یہ ہے کہ شیخین عتبان ابن مالک جن کے گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھی تھی حدیث پر متفق ہیں، حالاں کہ ان سے روایت کرنے والے تنہا محمود بن ربیع ہیں۔''(۱)

حزم واحتیاط: امام حاکم کے اصول وشرائط اور بحث واستدلال سے مستدرک کی تالیف میں ان کی احتیاط کا بھی اندازہ ہوتا ہے، انھوں نے وہی احادیث وروایات نقل کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کے اصول ومعیار کے مطابق غیر معلل اور ضعف وسقم سے خالی ہیں، اس لیے حدیث نقل کرنے کے بعد عموماً انھوں نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے کہ وہ قدح وعلت اور سقم وعیب سے پاک ہے لیکن حاکم کا عام رجحان یہ ہے کہ کوئی صحیح اور غیر معلل حدیث چھوٹنے نہ پائے، اس لیے احتیاط کے باوجود بھی مستدرک میں لینت ومداہنت کو راہ مل گئی ہے، اس پر آگے مستقل بحث کی جائے گی۔

احادیث کے متعلق وضاحتیں: امام ابوعبداللہ حاکم نے احادیث کے بارے میں مختلف النوع وضاحتیں کی ہیں، ان سے احادیث کے متعلق مفید معلومات فراہم ہوتے ہیں، یہ وضاحتیں مختلف طرح کی ہیں۔

۱۔ کسی حدیث کے متداول ہونے یا کسی خاص مقام میں مروج ہونے کا ذکر۔

۲۔ بعض حدیثوں کے متعلق بتایا گیا ہے کہ وہ کسی خاص مسئلہ میں اصل وبنیاد اور حجت ودلیل ہیں۔

۳۔ بعض حدیثوں کے کسی باب میں نقل کرنے کی غرض وغایت بیان کی گئی ہے۔

۴۔ حاکم نے بعض حدیثوں کی اپنے زمانہ کے حالات کے لحاظ سے خاص اہمیت وضرورت واضح کی ہے، مثلاً احتکار کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:

---

(۱) المستدرک ج ۱ ص ۴۳۔

''عسرت اور تنگی کے موقع پر مسلمانوں کی مواسات سے احتراز کے زجر و توبیخ کے بارے میں جو اخبار و احادیث وارد ہیں، ان کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے، کیوں کہ اس وقت مسلمان ان ہی حالات سے دوچار ہیں۔''(۱)

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

''یہ چھ حدیثیں نہایت تلاش و جستجو کے بعد یہاں نقل کی گئی ہیں، گو یہ ہماری اس کتاب کی شرط کے موافق نہیں ہیں تاہم چوں کہ لوگ اس ضیق میں مبتلا ہیں (اللہ اس کو ختم کرے) اس لیے یہاں ہم نے ان کو نقل کر دیا ہے۔''(۲)

۵- انھوں نے کہیں کہیں ابواب کے شروع یا درمیان میں نوٹ لکھے ہیں جو بڑی اہمیت کے حامل ہیں مثلاً فضائلِ صحابہ کے ابواب کے شروع میں لکھتے ہیں:

''ہم نے صحابہ کے ذکر میں پہلے ان کے نسب و وفات کا ذکر کیا ہے، پھر ان کے مناقب میں وہ حدیثیں درج کی ہیں جو شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں لیکن انھوں نے ان کی تخریج نہیں کی، ہم کو اعتراف ہے کہ ہم اس باب میں محمد بن عمر واقدی اور ان کے جیسے لوگوں کی روایات سے صرف نظر نہیں کر سکے ہیں۔''(۳)

اصحابِ صفہ کے بیان میں حاکم نے ان کے متعلق روایات کی مدد سے ان کے ناموں کی مفصل فہرست دی ہے، ان کے طبقات وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے اشغال و معمولات اور امتیازی خصوصیات کے سلسلہ میں ان سے اصحابِ تصوف کے پہلو کو خاص طور پر نمایاں کیا ہے۔(۴)

مستدرک کی تلخیصات: جن علما نے مستدرک کے ساتھ اعتنا کیا ہے، ان میں علامہ ذہبی

---

(۱) المستدرک ج ۲ ص ۱۱ (۲) مستدرک ج ۲ ص ۱۳ (۳) ایضاً ج ۳ ص ۶۱ (۴) ایضاً کتاب الھجرۃ ص ۱۶ تا ۱۸۔

(م ۷۴۸ھ) کا نام زیادہ مشہور ہے، انھوں نے مستدرک کی تلخیص لکھی جو بہت مشہور ہے، اس کی اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جاسکتا کہ خود ان کی اور بعض دیگر علما کی رائے میں اس کو دیکھے بغیر مستدرک کی تصحیح پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں ذہبی نے طویل حدیثوں اور اسناد کا اختصار ہی نہیں کیا ہے بلکہ جابجا حاکم پر نقد و تعقب بھی کر کے احادیث کی تصحیح میں ان کے تساہل، روایتوں کے ضعف و نکارت اور وضع نیز راویوں کے جرح و سقم وغیرہ کو بھی واضح کیا ہے۔

علامہ ذہبی نے اپنی تلخیص میں بعض مواقع پر حاکم کے استدراک کی توثیق و تائید اور بعض مواقع پر سکوت اختیار کیا ہے، یہ بھی حاکم کی رائے سے اتفاق ہی ہے، رہا ان کا نقد و تعقب تو اس کی مختلف نوعیتیں ہیں:

(الف) حاکم نے کسی حدیث کو شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرائط کے مطابق بتایا ہے اور ذہبی نے اس کی تردید کی ہے۔

(ب) حاکم نے کسی حدیث کو دونوں بزرگوں کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے لیکن ذہبی کی تحقیق میں وہ صرف ایک ہی کی شرط کے مطابق ہے۔

(س) حاکم نے احادیث کی صحت اور رجال واسناد کی قوت کا ذکر کیا ہے اور ذہبی نے ان کا ضعف و وضع، جرح وقدح اور سقم و نکارت ثابت کیا ہے۔

اس میں شبہہ نہیں کہ ذہبی نے بڑی دقت نظر سے مستدرک کی تلخیص کی تھی اور ان کے نقد و تعقب کا زیادہ حصہ صحیح ہے لیکن کہیں کہیں اس میں بھی فروگذاشتیں ہیں مثلاً کسوف کے بیان میں ایک حدیث نقل کرنے کے بعد حاکم نے صرف اس قدر لکھا ہے کہ (ولم یخرجاہ) یعنی شیخین نے اس کی تخریج نہیں کی ہے، ذہبی نے اس پر یہ تنقید کی ہے:

واسنادہ حسن وما ھو علی شرط واحد منھما. (۱)	اس کے اسناد حسن ہیں لیکن وہ شیخین میں سے کسی کی شرط کے مطابق نہیں ہے

(۱) المستدرک کتاب الجمعۃ ج ۱ ص ۳۲۵۔

حالاں کہ حاکم نے یہاں سرے سے حدیث کے شیخین کی شرط کے مطابق ہونے کا ذکر ہی نہیں کیا ہے بلکہ صرف یہ لکھا ہے کہ انھوں نے اس کی تخریج نہیں کی تھی، اس بنا پر ذہبی کا یہ نقد صحیح نہیں ہے۔

مستدرک اور تلخیص کے مصححین نے بھی علامہ ذہبی کے نقد پر تعقب کیا ہے، مثلاً ایک جگہ حاکم نے ایک حدیث کو صحیح الاسناد قرار دیا ہے، اس پر نقد کرتے ہوئے ذہبی نے لکھا ہے:

عبدالرحمن لم یسمع من ابیہ وعبدالرحمن ومن بعدہ سوا بحجۃ۔	عبدالرحمٰن نے اپنے والد سے سماع نہیں کیا تھا اور عبدالرحمٰن اور ان کے مابعد کے راوی حجت نہیں۔

مصحح لکھتے ہیں:

"تقریب التہذیب میں عبدالرحمٰن کو ثقہ اور صغار تابعین میں بتایا گیا ہے، ان کا انتقال ۷۹ھ میں ہوا تھا، انھوں نے اپنے والد سے سماع کیا ہے لیکن بہت کم، اسی طرح عبدالرحمٰن کے صاحبزادے قاسم کے ترجمہ میں لکھا ہے کہ وہ ثقہ وعابد اور طبقہ رابعہ میں ہیں، پس ذہبی کا ان لوگوں کو مطلقاً عدمِ حجت قرار دینا کیسے صحیح ہوسکتا ہے۔"(۱)

ذہبی ایک جگہ ایک راوی ابوالصہباء کے متعلق لکھتے ہیں کہ "صحیح بخاری میں ان سے روایت نہیں کی گئی ہے گو واقعہ کے لحاظ سے یہ بات درست ہو لیکن علامہ ذہبی کا منشا حاکم پر نقد اور اس راوی کو ضعیف قرار دینا ہے، جو صحیح نہیں ہے، تقریب ہی کے حوالہ سے مصحح لکھتے ہیں کہ وہ طبقۂ رابعہ اور مقبول رواۃ میں ہیں۔(۲)

بعض مقامات پر اصل اور تلخیص میں معمولی فرق بھی ہے مثلاً روزے کے بیان

(۱) المستدرک مع تلخیص ج ۱ ص ۵۰۹ (۲) ایضاً ص ۵۲۵۔

میں حاکم نے ایک حدیث میں صرف ''وابتلت العروق'' لکھا تھا مگر ذہبی نے اس کو تلخیص میں ''وابتلت العروق بالماء'' لکھا ہے،(۱) ایک اور جگہ حاکم نے ''اغار'' لکھا تھا، ذہبی نے اس کو ''اغان'' کر دیا ہے،(۲) ایک جگہ حاکم نے ''ثنا یعقوب بن ابراہیم'' لکھا ہے، ذہبی نے اس کو بدل کر ''رواہ یعقوب الدورقی'' (۳) کر دیا ہے، گو یعقوب بن ابراہیم اور یعقوب الدورقی ایک ہی شخص ہیں لیکن اس تصرف سے اشتباہ ہوسکتا ہے، دوسرے ذہبی نے ثنا کو جو خود مختصر تھا رواہ کر دیا ہے۔

مستدرک کی یہ تلخیص بھی اس کے ساتھ چار ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔

۲- امام سیوطی (م ۹۱۱ھ) نے توضیح المستدرک فی تصحیح المستدرک لکھی تھی جو ایک جلد میں ناتمام ہے، اس میں بھی حدیثوں کی تلخیص ہے۔ (۴)

۳- مستدرک کی موضوع حدیثوں کو بھی ایک جز میں جمع کیا گیا تھا جو تقریباً ایک سو حدیثوں پر مشتمل ہے،(۵) بعض لوگوں نے اس کو بھی ذہبی کی تصنیف بتایا ہے۔

مستدرک کے قلمی نسخے متعدد کتب خانوں میں موجود ہیں، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے جس کے اسلامی علوم وفنون کی خدمت اور علمائے اسلام کی بیش قیمت اور کمیاب کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں کارنامے اظہر من الشمس ہیں، اس شہرۂ آفاق کتاب کو بھی اس کے کئی مخطوطات کی مدد سے چار ضخیم جلدوں میں شائع کیا تھا، پہلی جلد ۱۳۳۴ھ اور باقی جلدیں بالترتیب ۱۳۴۰ھ تا ۱۳۴۲ھ میں تصحیح و تحشیہ کے بعد شائع کی ہیں۔

فاضل مصحح نے مستدرک اور تلخیص پر کہیں کہیں مختصر مگر مفید نوٹ لکھے ہیں، مستدرک کی اشاعت کے بعد دارالمصنفین کے سابق رفیق اور مشہور صاحب علم و قلم مولانا ابوالجلال ندوی نے اس پر ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا، اس میں مستدرک کے ناشرین کو بعض

---

(۱) المستدرک مع تلخیص ج ۱ص ۴۲۲ (۲) ایضاً ج ۲ص ۳ (۳) ایضاً ج ۱ص ۱۱۵ (۴) کشف الظنون ج ۲ص ۴۲۷ (۵) ایضاً۔

مشورے دیے تھے، اس کے جواب میں دائرۃ المعارف کے رکن مولانا ہاشم ندوی کا مضمون بھی اسی زمانہ میں چھپا تھا۔(۱)

صحیح مستدرک اور حاکم پر بعض اعتراضات کا جائزہ: حاکم اور ان کی مستدرک پر چند اعتراضات بھی کیے گئے ہیں، ان میں سے بعض تو غلط ہیں اور بعض اگرچہ غلط نہیں ہیں تاہم وہ بحث و تنقیح طلب ضرور ہیں، اس لیے مستدرک کی اہمیت و خصوصیت بیان کرنے کے بعد ان کا جائزہ لینا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

امام حاکم اور ان کی مستدرک پر سب سے مشہور الزام تساہل کا ہے، اس سلسلہ میں چند اور ضمنی الزامات بھی عائد کیے گئے ہیں، گو ان کا اصل تعلق بھی تساہل ہی سے ہے لیکن ان پر علاحدہ علاحدہ اور مستقلاً گفتگو کرنا زیادہ مفید و مناسب ہوگا۔

مستدرک اور صحیحین: پہلے گذر چکا ہے کہ مستدرک کی تالیف کا مقصد صحیحین کی ان متروک حدیثوں کو جمع و مدون کرنا ہے جو حاکم کے خیال میں ان کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کے باوجود ان میں شامل نہیں کی گئیں، اس سلسلہ میں بحث طلب امر یہ ہے کہ حاکم نے جن حدیثوں کے صحیحین کی شرطوں کے مطابق صحیح ہونے کا دعویٰ کیا ہے وہ واقع میں صحیح ہیں یا نہیں۔

۱- ابوسعید مالینی کا بیان ہے کہ "میں نے مستدرک کا مطالعہ کیا تو مجھ کو اس کی ایک حدیث بھی شیخین کے شرائط کے مطابق نہیں ملی۔"(۲)

۲- دوسرے علمائے فن کے نزدیک مستدرک کی تمام حدیثیں تو نہیں متعدد ایسی ضرور ہیں جن کے متعلق حاکم کا یہ دعویٰ خلاف واقعہ ہے کہ وہ شیخین کی شرائط کے مطابق صحیح ہیں، ابراہیم بن محمد ارموی کا یہ بیان اکثر کتابوں میں مذکور ہے کہ:

---

(۱) پہلا مضمون معارف کے جولائی و اگست ۲۶ء کے دوسرا نومبر دسمبر ۲۶ء کے شماروں میں شائع ہوا تھا

(۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۴۲۔

''ابو عبداللہ حاکم نے مستدرک میں بہت سی ایسی حدیثیں جمع کی ہیں
جن کے بارے میں گو ان کا خیال ہے کہ وہ شیخین کی حدیثوں کی طرح صحیح ہیں
جیسے من کنت مولاہ الخ اور حدیث طیر وغیرہ لیکن علمائے کبار نے اس سلسلہ
میں حاکم کو غلط ٹھہرایا ہے اور ان پر سخت نکیر کی ہے۔''(۱)

پہلی رائے کو عام طور پر حقیقت سے بعید اور زیادتی پر محمول کیا گیا ہے، علامہ ذہبی نے اس کی نہایت پرزور تردید کی ہے، ان کی تردید اس لیے قابل لحاظ ہے کہ انھوں نے مستدرک کا دقت نظر سے مطالعہ کیا ہے اور اس کی تلخیص لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''مستدرک کے متعلق مالینی کی رائے سراسر زیادتی، صریح ناانصافی اور سخت
غلو پر مبنی ہے، انصاف کی بات یہ ہے کہ مستدرک کا تقریباً نصف حصہ ایسی حدیثوں پر
مشتمل ہے جو شیخین یا کسی ایک بزرگ کے شرائط کے مطابق ہے، البتہ اس کے
چوتھائی حصہ میں ایسی حدیثیں ہیں جن کے اسناد تو بظاہر صحیح ہیں لیکن وہ شیخین کی
شرطوں کے مطابق نہیں ہیں، بقیہ چوتھائی حصے میں ضعیف ومنکر بلکہ موضوع حدیثیں
بھی شامل ہیں، میں نے اپنی تلخیص میں ان کی تصریح وتنبیہ کی ہے۔''(۲)

اس سے دوسری رائے رکھنے والوں کی تائید ہوتی ہے یعنی مستدرک کی بعض حدیثوں کے بارے میں حاکم کا دعویٰ صحیح نہیں ہے لیکن اکثر کے متعلق صحیح ہے۔

اس مسئلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے بہت مناسب اور حقیقت پسندانہ توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں:

حاکم نے صحیحین پر مستدرک لکھا ہے، اس کی حدیثوں کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی شرطوں کے مطابق ہیں لیکن انھوں نے ان کی تخریج نہیں کی ہے، میں نے

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۴۳۔ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۹ و بستان المحدثین ص ۴۲۔

جب مستدرک کا تتبع اور چھان بین کی تو معلوم ہوا کہ ایک حیثیت سے حاکم کا بیان صحیح ہے لیکن دوسری حیثیت سے صحیح نہیں ہے، اس کی تفصیل وتوجیہ یہ ہے۔

مستدرک میں ایسی حدیثیں ہیں جو شیخین کے رجال واسناد اوران کی شرائطِ صحت واتصال کے مطابق ہیں، اس پہلو سے حاکم کا شیخین پر استدراک صحیح ہے لیکن دوسرے پہلو سے صحیح نہیں ہے کیوں کہ شیخین اسی حدیث کا ذکر کرتے ہیں جس کی صحت پر ان کے شیوخ نے نقد وجرح کر کے اجماع کرلیا ہو، امام مسلم فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی صحیح میں وہی حدیثیں لکھی ہیں جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے لیکن مستدرک کی اکثر متفرد حدیثیں ایسی ہیں جو شیخین کے زمانہ کے شیوخ اور محدثین پر مخفی اور مستور رہ گئی تھیں، گو بعد میں ان کی شہرت ہوگئی ہو یا ایسی حدیثیں ہیں جن کے رجال کے بارے میں محدثین نے اختلاف کیا ہے کیوں کہ شیخین محض قاعدہ واصول سے حدیث کی صحت تسلیم نہیں کرتے بلکہ اپنے شیوخ کی طرح احادیث کے وصل وانقطاع وغیرہ کی باقاعدہ بحث وتحقیق کرتے ہیں اور اس میں انھوں نے اس قدر شدت برتی ہے کہ صحت واستناد کا مسئلہ پوری طرح ظاہر ہوگیا ہے، اس کے برخلاف امام حاکم کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ صرف محدثین کے عام قواعد وضوابط پر اعتماد کر کے حدیثوں کو صحیح قرار دیتے ہیں، مثلاً یہ قاعدہ کہ ثقہ راوی کی زیادتی مقبول ہوتی ہے، یا جب اہلِ فن وصل وارسال یا وقف ورفع میں مختلف الرائے ہوں تو اس راوی کا قول حجت مانا جائے گا، جس کے بیان میں اضافہ ہو اور اس نے اس کو یاد رکھا ہو، یہ حقیقت ہے کہ محدثین کے یہاں احادیث کی تصحیح اور جانچ کے اس معیار کی بنا پر خرابی اور خلل پیدا ہوا ہے اور اسی حیثیت سے شیخین اور حاکم کے یہاں فرق پایا جاتا ہے، واللہ اعلم۔(۱)

علامہ زیلعی حنفی کا بھی ایک بصیرت افروز بیان اس سلسلہ میں قابل غور ہے، وہ جہر یا بسملہ کی حدیثوں پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

(۱) حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۱۰۶ و ۱۰۷۔

"کسی شخص کے بارے میں مجرد کلام سے اس کی حدیث کو ساقط نہیں قرار دیا جاسکتا کیوں کہ اس طرح تو سنت وحدیث کا بیشتر سرمایہ ہی متروک ہو جائے گا، اس لیے کہ جرح وکلام سے اس شخص کے علاوہ جس کو خود اللہ نے معصوم ومحفوظ بنادیا ہو کوئی شخص بھی محفوظ نہیں ہے، صحیحین تک میں ایسے لوگوں کی روایتوں کی تخریج کی گئی ہے جن پر کلام کیا گیا ہے، جیسے جعفر بن سلیمان ضبعی، حارث بن عبدالایادی، ایمن بن نابل حبشی، خالد بن مخلد قطوانی، سوید بن سعید حرثانی اور یونس بن اسحٰق سبیعی وغیرہ لیکن شیخین نے ایسے متکلم فیہ لوگوں کی ان ہی روایات کی تخریج کی ہے جن کی متابعت بھی کی گئی ہے اور جن کے شواہد ظاہر و باہر ہیں اور جن کی اصل معروف ومعلوم ہے لیکن اس طرح کے راویوں کے تفرد کو نہیں بیان کیا اور قبول کیا ہے، خصوصاً ایسے مواقع پر جہاں ان راویوں نے ثقات کی مخالفت کی ہے، جیسے امام مسلم نے ابواویس کی حدیث "قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی" کی اس لیے تخریج کی ہے کہ وہ اس کو بیان کرنے میں متفرد نہیں ہیں بلکہ دوسرے ثقہ وثابت رواۃ مالک، شعبہ اور ابن عیینہ نے بھی اس کو بیان کیا ہے، اس لیے یہ حدیث متابع ہوگئی ہے، یہ علامت صحیحین پر استدراک کرنے والوں کے یہاں بھی راہ پاگئی ہے، اس لیے ان کے استدراک میں تساہل پایا جاتا ہے، ان لوگوں میں سب سے زیادہ تساہل ابوعبداللہ حاکم نے مستدرک میں کیا ہے، وہ جن کی حدیثوں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ شیخین کی یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہیں ان میں یہ علت موجود ہوتی ہے، صحیحین میں کسی راوی کی روایت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ راوی جس حدیث میں بھی پایا جائے وہ حدیث صحیحین کی شرط کے مطابق ہو جائے گی، حاکم عموماً ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں جس کے رواۃ کی وجہ سے صحیحین میں اس کی تخریج نہیں کی گئی ہے،

اب اگر اس طرح کی کوئی حدیث حضرت عکرمہؒ سے مروی ہو اور انھوں نے اس کو حضرت ابن عباسؓ سے بیان کیا ہو تو محض اس بنا پر کہ شیخین نے بھی عکرمہ سے ابن عباسؓ کے مرویات کی تخریج کی ہے، اس لیے اس کو بھی صحیحین کے شرائط کے مطابق قرار دیا جائے تو یہ سراسر تساہل ہے، اسی طرح وہ ایسی حدیث بھی نقل کرتے ہیں جس کے بعض رجال بخاری کے اور بعض مسلم کے ہوتے ہیں اور وہ ان کو شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیتے ہیں جو تساہل ہے یا کبھی ایسی حدیث بیان کرتے ہیں جس میں کوئی ایسا راوی ہوتا ہے جس سے شیخین نے اس کی وہ روایت کی ہے جس کو اس نے اپنے کسی خاص استاذ اور متعین شیخ سے سنا ہے کیوں کہ راوی کا اپنے خاص استاذ سے زیادہ اہم تعلق ہوتا ہے اور وہ اس کی حدیث کے حفظ وضبط میں مشہور ہوتا ہے لیکن وہی راوی جب اپنے دوسرے شیخ سے کوئی روایت کرتا ہے تو اس کی شیخین تخریج نہیں کرتے کیوں کہ اس شیخ سے روایت کرنے میں وہ ضعیف، غیر ضابط اور غیر مشہور یا اسی قسم کی کوئی اور وجہ مانع ہوتی ہے لیکن حاکم نے اس راوی کی ایسی حدیثیں بھی جن کو اس نے اپنے مخصوص ومتعین شیخ کے بجائے کسی اور شیخ سے بیان کیا ہے، تخریج کی ہے اور کہا ہے کہ روایت شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے، یہ بھی ان کے تساہل ہی کا نتیجہ ہے، کیوں کہ شیخین اس راوی پر صرف اس صورت میں اعتماد کرتے ہیں جب اس نے حدیث کو اپنے مخصوص ومتعین شیخ سے روایت کیا ہو مگر جب وہ اپنے دوسرے شیوخ سے روایت کرتا ہے تو اس پر اعتماد نہیں کرتے، مثلاً انھوں نے خالد بن مخلد قطوانی کی ایک حدیث کی جس کو انھوں نے سلیمان بن بلال سے روایت کیا ہے، تخریج کی ہے لیکن ان کی اس روایت کی تخریج نہیں کی ہے جس کو انھوں نے عبداللہ بن مثنی کے واسطہ سے روایت کیا ہے، کیوں کہ خالد، ابن مثنی

سے روایت کرنے میں معروف نہیں ہیں ایسی صورت میں اگر کوئی شخص خالد کی
اس روایت کے بارے میں جو وہ ابن مثنی سے بیان کریں یہ کہے کہ وہ شیخین یا ان
میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق ہے تو یقیناً تساہل کہا جائے گا، اسی طرح حاکم
ایسی حدیث بھی بیان کرتے ہیں جس کے اسناد میں کوئی راوی ضعف یا کذب سے
متہم ہوتا ہے، مگر اس کے اکثر رجال صحیح وقوی ہوتے ہیں، اس کے باوجود وہ اس
کے متعلق بھی کہہ دیتے ہیں کہ وہ شیخین یا ان میں سے کسی ایک کی شرط کے مطابق
ہے، یہ بھی سخت قسم کا تساہل ہے، جو شخص مستدرک کا بغور مطالعہ کرے گا اس پر یہ
سب باتیں جو ہم نے بیان کی ہیں خود منکشف ہو جائیں گی۔" (۱)

علامہ زیلعی حنفی نے جو کچھ لکھا ہے، اس کی مثالیں ضرور مستدرک میں ملتی ہیں لیکن ایسے بعض مواقع پر جن کا ذکر زیلعی نے کیا ہے، حاکم نے خود بھی تصریح کر دی ہے، مثلاً جس سند کے تمام رجال صحیح ہوں اور کوئی ایک راوی ضعیف ہو اس کے بارے میں حاکم نے یہ بتا دیا ہے کہ شیخین نے اس حدیث کو فلاں راوی کی وجہ سے ترک کر دیا ہے، پھر انھوں نے اس راوی کو صحیح وضابطہ قرار دینے کی کوشش کی ہے، یا اس کے بارے میں علمائے جرح وتعدیل کا اختلاف بیان کر کے لکھ دیا ہے کہ اگر اس کا قوی ہونا ثابت ہو جائے تو یہ روایت بالکل صحیح ہوگی، یہی حال دوسری مثالوں کا ہے، حاکم نے عموماً شیخین کی عدم تخریج کے اسباب بھی بیان کر دیئے ہیں، جن سے ان کے استدراکات کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ زیلعی کی اکثر مثالیں صحیح ہیں۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ شیخین کے متعلق حاکم کے سب دعوے خواہ صحیح نہ ہوں لیکن سب غلط بھی نہیں ہیں، حافظ ذہبی نے اپنی تلخیص میں غلط دعووں کی وضاحت کے ساتھ صحیح کی توثیق بھی کی ہے اور جن کے بارے میں سکوت اختیار کیا ہے، اس سے بھی حاکم کی

(۱) نصب الرایہ جلد اول ص ۳۴۲ طبع جدید۔

تصویب ظاہر ہوتی ہے۔

ضعیف وموضوع حدیثیں: دوسرا ضمنی اعتراض یہ ہے کہ مستدرک میں ضعیف اور موضوع حدیثیں بھی ہیں، چنانچہ علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ مستدرک میں ایسی حدیثیں بھی ہیں جو شرائطِ صحت کے خلاف ہیں، بلکہ موضوع حدیثیں بھی ہیں جو اس کے شایانِ شان نہیں۔''(۱)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''گو حاکم حدیث میں امام ۔۔۔وق تھے، تاہم انھوں نے مستدرک میں ساقط حدیثوں کی بھی تصحیح کردی ہے۔''

اوپر ان کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ مستدرک کا تقریباً چوتھائی حصہ منکر و واہی اور موضوع حدیثوں پر مشتمل ہے، انھوں نے تلخیص میں بھی حدیث کا ضعف ونکارت اور وضع دکھایا ہے اور حاکم کی موضوع حدیثوں کو ایک مستقل جز میں جمع کیا گیا تھا جو تقریباً ایک سو حدیثوں پر مشتمل تھا، حافظ ابن جوزی نے بھی ان کی ساٹھ موضوع حدیثوں کا ذکر کیا ہے گو اس کو محدثین نے مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا ہے، اکثر تذکرہ نگاروں نے مستدرک کی ضعیف وموضوع حدیثوں کی مثال دیتے ہوئے "من کنت مولاہ فعلی مولاہ" اور ''حدیث طیر'' وغیرہ کو پیش کیا ہے، شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے اس کا شمار حدیث کے تیسرے طبقہ کی کتابوں میں کیا ہے اور اس طبقہ کے متعلق ان کا اور ان کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا یہ بیان ہے کہ:

> ''اگرچہ کتابوں کے مؤلفین علوم حدیث میں ماہر، ثقہ اور ضبط وعدالت کی صفات سے متصف تھے لیکن ان میں صحیح، حسن اور ضعیف ہر قسم کی حدیثیں پائی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۹۔

جاتی ہیں، بلکہ ان کی بعض حدیثیں موضوع بھی ہیں، گو ان کے اکثر رواۃ عدالت کی صفت سے متصف تھے تاہم بعض مستور اور مجہول الحال ہیں۔"(۱)

ان سب بیانات سے مستدرک میں ضعیف ومنکر بلکہ موضوع حدیثوں کا بھی یقینی طور پر پایا جانا ثابت ہوجاتا ہے لیکن موضوع حدیثوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے، حافظ ابن جوزی نے ساٹھ حدیثوں کی نشاندہی کی ہے لیکن ان میں سے اکثر کو محدثین نے تسلیم نہیں کیا ہے، رہی ضعیف حدیثیں تو وہ موضوع کے ساتھ شامل ہوکر چوتھائی حصہ کے بقدر ہوں گی، ضعیف حدیثوں سے کوئی کتاب بھی خالی نہیں ہے لیکن مستدرک میں ان کی تعداد اس لیے زیادہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ خود ضخیم کتاب ہے اور اس کی ضخامت کے اعتبار سے یہ تعداد زیادہ نہیں، اس کا زیادہ حصہ جیسا کہ ذہبی کے بیان سے ظاہر ہے، صحیح حدیثوں پر مشتمل ہے، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں:

"مستدرک میں جو نہایت ضخیم کتاب ہے، صحیحین کی متروک حدیثوں کو شامل کیا گیا ہے، گو اس کی بعض حدیثوں کے بارے میں کلام کیا گیا ہے لیکن اس کا بڑا حصہ صحیح ہے۔"(۲)

گو مستدرک کی ضعیف وموضوع حدیثوں کی وجہ سے اس کا پایہ گھٹ ضرور گیا ہے، تاہم ان سے حاکم کے علوئے مقام اور عظمتِ شان میں فرق نہیں آتا، علامہ ابن حجر لکھتے ہیں:

"حاکم کا درجہ ومرتبہ نہایت بلند ہے، وہ کسی طرح ضعفا میں شمار کیے جانے کے مستحق نہیں ہیں، ان کی جانب سے یہ معذرت کی جائے گی کہ مستدرک ان کے آخر عمر کی تصنیف ہے، جب ان کی حالت متغیر ہوگئی تھی اور اس وقت ان پر ذہول ونسیان بھی طاری رہتا تھا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے اس میں بعض

(۱) عجالہ نافعہ مع فوائد جامعہ ص ۵ (۲) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۰۔

ایسے راویوں کو بھی صحیح قرار دے دیا ہے اور ان لوگوں کی حدیثیں بھی درج کر لی ہیں جن کا وہ اپنی کتاب الضعفا میں تذکرہ کر چکے ہیں اور جن کے ناقابلِ حجت ہونے اور جن کی حدیثوں کے ترک کر دینے کا فیصلہ کر چکے تھے، مثلاً عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کی ایک حدیث کی تخریج کی ہے، حالاں کہ ان کا ضعفا میں تذکرہ کیا ہے اور ان کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے اپنے والد کے واسطہ سے ایسی موضوع حدیثیں بیان کی ہیں جن کا ضعف و وضع غور و تامل کرنے والے اہل فن سے مخفی اور پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔''(۱)

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ حاکم نے مستدرک کی بعض حدیثوں کو ضعیف سمجھنے کے باوجود شواہد و متابعات کی حیثیت سے یا اور کسی مصلحت کی بنا پر نقل کیا ہے اور ایسے مواقع پر انھوں نے ان اسباب کی صراحت بھی کر دی ہے جو ضعیف حدیث کی روایت ذکر کرنے کا باعث ہوئے ہیں، علامہ سیوطی فرماتے ہیں:

وربما اورد فيه مالم يصح عنده منبها علىٰ ذلك (۲)	بعض اوقات وہ غیر صحیح روایت لائے ہیں مگر اس کے متعلق تنبیہ کر دی ہے۔

یہ بھی ہے کہ حاکم خود صاحب فن تھے، ان کی تحقیق میں بعض حدیثیں اور رواۃ قوی و صحیح تھے لیکن بعض دوسرے اہل فن نے ان کو ساقط الاعتبار قرار دیا ہے۔

تساہل کا الزام: اب تک جن الزامات کا ذکر کیا گیا ہے وہ بھی دراصل تساہل ہی کے تحت آتے ہیں لیکن اب اس کا مستقل طور سے ذکر کیا جاتا ہے، پہلے جو باتیں نقل کی گئی ہیں ان کے علاوہ بعض مزید تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

علامہ ابن صلاح کا مشہور بیان ہے۔

هو واسع الخطوفي شرط	وہ صحیح روایت کے شرائط کے بارے

---

(۱) لسان المیزان تذکرہ حاکم (۲) تدریب الراوی ص ۳۱۔

الصحیح، متساھل فی القضاء. (۱)	میں بڑے توسع پسند اور صحیح حکم لگانے میں نہایت متساہل تھے۔

علامہ زیلعی کا بیان ہے کہ:

فالحاکم عرف تساھله وتصحیحه بالاحادیث الضعیفة بل الموضوعة. (۲)	پس حاکم کا تساہل اور ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کی تصحیح مشہور ومعروف ہے۔

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

''حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اسی طرح مشہور ہے جس طرح علامہ ابن جوزی کا تضعیف حدیث میں تساہل مشہور ہے، شیخ الاسلام علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ان دونوں کے تساہل نے ان کی کتابوں کا فائدہ معدوم کر دیا ہے۔(۳)

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ محدثین کے نزدیک حاکم کا تساہل مشہور و مسلم ہے مگر یہ بحث توضیح و تنقیح طلب ہے۔

حاکم پر جس شد و مد کے ساتھ یہ الزام عائد کیا گیا ہے، اس سے بظاہر حاکم کا احادیث میں زیادہ غیر محتاط و مداہن ہونا ثابت ہوتا ہے جو صحیح نہیں ہے اور نہ تساہل کا یہ مطلب ہے کہ انھوں نے رطب و یابس ہر قسم کی روایات بلا تحقیق و تفتیش نقل کر دی ہیں، ان کی تلاش و تفحص، حزم و احتیاط اور احکامی روایتوں میں شدت کا ذکر پہلے آ چکا ہے، ان کا بلند پایہ محدث اور علوم حدیث میں ماہر ہونا مسلم ہے، روایات کے قبول و رد کے اصول و ضوابط کی وہ پابندی بھی کرتے تھے اور ان کے بارے میں غیر محتاط نہ تھے البتہ جہاں انھوں نے ان اصولوں کو ترک کیا ہے، اس کی صراحت کر دی ہے، جرح و تعدیل حاکم کا خاص فن تھا، اس

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱ (۲) نصب الرایۃ ص ۳۶۰ (۳) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۷۔

میں انھوں نے ایسی مہتم بالشان کتابیں لکھی ہیں جن کے حوالوں سے رجال کی کوئی کتاب خالی نہیں ہے، ان باتوں سے ان کے حزم واحتیاط کا پتہ چلتا ہے، اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

''حدیث کے طالب علم کو محدث کے حالات کی بحث وتفتیش کرنی ضروری ہے، اس کو سب سے پہلے محدث کے متعلق یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ عقیدہ توحید کو مانتا اور انبیاء علیہم السلام کی اطاعت کا پابند ہے یا نہیں؟ پھر یہ بھی غور کرنا چاہیے کہ وہ صاحب ہوئی تو نہیں ہے جو لوگوں کو اپنی خواہشات کے مطابق دعوت دیتا ہے کیوں کہ داعی بدعت کی حدیث قبول نہ کرنے پر ائمہ مسلمین کا اجماع ہے، اس کے بعد سن وسال کو معلوم کرنے کی ضرورت ہے تا کہ یہ پتہ چل سکے کہ اس کا اپنے ان شیوخ سے جن سے وہ حدیثیں روایت کرتا ہے، سماع ممکن ہے یا نہیں، کیوں کہ ہم نے ایسے شیوخ دیکھے ہیں جنھوں نے اپنے شیوخ سے ایسے سن میں حدیثیں بیان کی ہیں جس سن میں ان کی ان شیوخ سے ملاقات ممکن ہی نہیں۔''(۱)

اسی کتاب میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''صحیح حدیث کی معرفت مجرد روایت سے نہیں ہوتی بلکہ اس کو عقل وفہم، حفظ وضبط اور کثرتِ سماع وغیرہ سے معلوم کیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں اہلِ علم ومعرفت کے مذاکرہ سے بڑھ کر کوئی چیز معاون نہیں ہے، اسی سے مخفی علت ظاہر ہوتی ہے پس جب اس طرح کی کوئی حدیث صحیح اسانید سے پائی جائے اور وہ شیخین کی کتابوں میں مروی نہ ہو تو ایسی صورت میں حدیث کے طالب علم کو اس کی تحقیق اور کرید کرنا نیز اس کی معرفت رکھنے والوں سے مذاکرہ لازم ہے تا کہ اس

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۵ و ۱۶۔

کی علت کا پتہ چل سکے۔"

جس امام کے یہ خیالات ہوں اور جس کا روایات کے رد و قبول میں یہ معیار ہو، اس کو غیر محتاط یا حاطب اللیل کس طرح کہا جا سکتا ہے، اس لیے ان کے تساہل کا صرف یہی مطلب ہو سکتا ہے کہ دوسرے محدثین نے جو غیر معمولی تشدد روا رکھا تھا اور جس کے نتیجہ میں بے شمار صحیح حدیثیں ان کے معیار پر پوری نہ اتریں اور نہ ان کے انتخاب میں آسکیں۔ حاکم نے اس طرح کا تشدد اس لیے روا نہیں رکھا تاکہ کوئی صحیح و ثابت حدیث محفوظ ہونے سے نہ رہ جائے، اسی نیک جذبہ نے ان کے یہاں قدرے نرمی اور مداہنت پیدا کر دی ہے، اس لیے حدیث کی تصحیح میں حاکم کا تساہل اگرچہ مسلم ہے لیکن اس کی نوعیت وہ نہیں ہے جو غلو و اغراق کی وجہ سے اس کو دے دی گئی ہے۔

حاکم کے تساہل کے چند اسباب تھے جن کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے:

۱- خود ان کا یہ بیان گذر چکا ہے کہ مستدرک منکرین حدیث، اہل اہوا اور مبتدعین کے اس الزام اور مغالطہ کے جواب میں لکھی گئی ہے کہ صحیح حدیثوں کی تعداد بہت کم ہے، حاکم نے اس شبہہ کی تردید میں یہ بھی لکھا ہے کہ صحیح حدیثیں صرف صحیحین ہی میں منحصر نہیں ہیں، جیسا کہ خود شیخین نے بھی اس کی صراحت کی ہے اور ابن صلاح، نووی اور دوسرے اساطینِ فن کا بھی بیان ہے، اس بنا پر حاکم نے یہ کوشش کی ہے کہ وہ اپنے علم و امکان بھر زیادہ سے زیادہ صحیح روایات کا مجموعہ مرتب کر دیں اس کی وجہ سے مستدرک میں تساہل ہو گیا ہے۔

۲- حاکم نے حدیثوں کی تائید و توثیق کے لیے کثرت سے شواہد و متابعات نقل کیے ہیں، ان میں اور فضائلِ اعمال کی حدیثوں میں انھوں نے زیادہ شدت اور احتیاط نہیں برتی ہے، چنانچہ مستدرک کی اس قسم کی حدیثوں میں زیادہ تساہل پایا جاتا ہے۔

۳- حافظ ابن حجر وغیرہ نے لکھا ہے کہ مستدرک حاکم کے آخر عمر کی تصنیف ہے، اس زمانہ میں ان کی صحت دگرگوں ہو چلی تھی، ان کو نظر ثانی اور حک و اصلاح کا موقع بھی

نہیں ملا تھا، اس لیے مستدرک میں تساہل زیادہ پایا جاتا ہے، حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ''حاکم کے یہاں تساہل کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے کتاب کا مسودہ تو مکمل کر لیا تھا لیکن اس کی تنقیح نہیں کر سکے تھے، مستدرک کے چھ جزوں میں صرف ڈیڑھ جز تک مجھ کو حاکم کا املا ملا ہے، بقیہ اجزا کی حاکم کی بطریقِ اجازت روایت کی گئی ہے اور ان اجزا میں ان جزوں کے مقابلہ میں جن کا حاکم نے خود املا کرایا ہے، زیادہ تساہل پایا جاتا ہے۔(۱)

حاکم کا تساہل تو متعارف و مسلم ہے لیکن اس الزام سے بعض اکابر محدثین بھی بری نہیں ہیں، چنانچہ بعض محدثین کے نزدیک تساہل کے اعتبار سے صحیح ابن حبان بھی مستدرک ہی کے لگ بھگ ہے، ابن خزیمہ کی عظمتِ شان میں کس کو کلام ہو سکتا ہے، ان کا اور ان کی صحیح کا پایہ ان دونوں سے بہت بلند ہے لیکن علامہ سخاوی لکھتے ہیں:

وكم في كتاب ابن خزيمة	ابن خزیمہ کی کتاب میں کتنی ایسی
ايضاً من حديث محكوم منه	حدیثیں ہیں جن کی صحت کا حکم لگایا گیا
بصحته وهو لا يرتقي عن	ہے، حالاں کہ وہ حسن کے مرتبہ سے
رتبة الحسن۔(۲)	اوپر کی نہیں ہیں۔

امام دارقطنی اور امام ترمذی پر بھی (اول الذکر حاکم کے استاذ اور موخر الذکر امام بخاریؒ کے ممتاز شاگرد اور ائمہ صحاح میں ہیں) یہی الزام عائد کیا گیا ہے، علامہ ذہبی جیسے نقادِ فن کا بیان ہے:

ان العلماء لا يعتدون بتصحيح	علمائے فن ترمذی اور حاکم کی تصحیح کو زیادہ
الترمذي ولا الحاكم۔ (۳)	قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔

علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۴۲۷ وتدریب الراوی ص ۳۱ (۲) فتح المغیث ص ۱۴ (۳) الرسالۃ المستطرفۃ ص ۲۰۔

حتی قیل ان تصحیحه دون تصحیح الترمذی والدار قطنی۔(۱)	یہاں تک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح امام ترمذی ودار قطنی کی تصحیح سے بھی کم تر ہے۔

حافظ سخاوی کہتے ہیں:

بل وفیما صححه الترمذی من ذالك جملة مع انه ممن یفرق بین الصحیح والحسن۔(۲)	بلکہ امام ترمذی کی تصحیح میں بھی تساہل کا بڑا حصہ شامل ہے، حالاں کہ وہ ان لوگوں میں ہیں جو صحیح وحسن میں امتیاز کرنے والے ہیں۔

اسی طرح ضیاء مقدسی، ابن عوانہ، ابن سکن اور جارود وغیرہ نامور محدثین کی تفصیلات اگرچہ صحیح کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں لیکن ایک جماعت نے ان پر بھی انصافاً یا تعصباً نقد کیا اور تساہل کا الزام لگایا ہے۔(۳)

اس لیے جس طرح ان ائمہ کی تصنیفات کی خامیوں کی وجہ سے ان کے جلالتِ قدر میں کوئی شبہہ نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح حاکم کی عظمت میں بھی ان کے تساہل کی بنا پر کلام نہیں کیا جاسکتا۔

حاکم کی تصحیح کا حکم: حاکم کا تساہل تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کی توثیق وتصحیح کا کیا حکم ہوگا؟ محدثین اور علمائے فن کے نزدیک چند صورتوں کو چھوڑ کر عام طور پر حاکم کی تصحیح کا لحاظ کیا جائے گا، یہ مستثنیٰ صورتیں حسب ذیل ہیں:

(الف) جس حدیث کی حاکم نے توثیق کی ہو وہ کسی دوسری صحیح وثابت حدیث کے خلاف ہو، علامہ زیلعی جہر بالبسملہ کے بیان میں لکھتے ہیں:

وتصحیح الحاکم لایعتد به	حاکم کی تصحیح کا اعتبار نہیں کیا جائے گا،

(۱) نصب الرایہ ج۱ص ۳۵۳ (۲) فتح المغیث ص ۱۴ (۳) فتح المغیث ص ۱۴۔

سیما فی هذا الموضع فقد	خصوصاً اس مقام پر، کیوں کہ ان کا
عرف تساهله فی ذالك	تساہل یہاں معروف ومعلوم ہے......
وتوثیق الحاکم لا یعارض	اور حاکم کی توثیق کو اگر وہ صحیح وثابت
مایثبت فی الصحیح خلافه	حدیث کے خلاف ہو، اس کے معارض
لما عرف من تساهله۔ (۱)	نہیں قرار دیا جائے گا، کیوں کہ ان کا
	تساہل معروف ہے۔

زیلعی کے اس بیان سے حاکم کی تصحیح کا سرے سے نا قابلِ اعتبار ہونا ثابت نہیں ہوتا کیوں کہ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

حتیٰ قیل ان تصحیحه دون	یہاں تک کہا گیا ہے کہ حاکم کی تصحیح کا
تصحیح الترمذی والدار	درجہ امام ترمذی اور دارقطنی کی تصحیح سے
قطنی بل تصحیحه کتحسین	کم تر ہے، بلکہ ان کی تصحیح کی حیثیت
الترمذی واما ابن خزیمه	امام ترمذی کی تحسین کی طرح ہے،
وابن حبان فتصحیحهما	رہے ابن خزیمہ اور ابن حبان تو ان کی
ارجح من تصحیح الحاکم	تصحیح بلا اختلاف حاکم کی تصحیح سے راجح
بلانزاع۔(۲)	ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زیلعی کے نزدیک حاکم کی تصحیح بالکل ساقط اور نا قابل اعتبار نہیں ہے، بلکہ جب وہ صحیح حدیث کے معارض ہوتو نا قابل اعتبار ہوگی۔

(ب) حاکم نے جس حدیث کی تصحیح کی ہو اگر اس کے بارے میں دوسرے محدثین کا فیصلہ اس کے برعکس ہوتو حاکم کی تصحیح کا لحاظ نہیں ہوگا، علامہ ابن صلاح فرماتے ہیں کہ حاکم کی تصحیح کا اسی وقت اعتبار کیا جائے گا جب کہ اس کے بارے میں دوسرے ائمہ کی

(۱) نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۴۴ (۲) نصب الرایہ ج ۱ ص ۳۵۴۔

اس کے خلاف کوئی تصریح موجود نہ ہو۔

(س) جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو اس میں ضعیف کر دینے والی کوئی علت موجود ہو، ابن صلاح اور نووی نے اس کی تصریح کی ہے۔

ان صورتوں کے سوا حاکم کی تصحیح کو معتبر اور حجت سمجھا جائے گا، البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ان کی تصحیح کے بارے میں کس قسم کا حکم لگایا جائے گا، ابن صلاح اور حافظ نووی کے نزدیک اس کو حسن پر محمول کیا جائے گا، ابن صلاح فرماتے ہیں:

فالاولیٰ ان نتوسط فی امره فنقول ماحکم بصحته ولم نجد ذالك فيه لغيره من الأئمة ان لم يكن من قبيل الصحيح فهو من قبيل الحسن يحتج به ويعمل به الا ان تظهر فيه علة توجب ضعفه.(۱)	ہمارے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارے میں بیچ کی راہ اختیار کرنا زیادہ مناسب ہے پس جس حدیث کے صحیح ہونے کا انھوں نے فیصلہ کیا ہو اور اس میں دوسرے ائمہ کی کوئی تصریح موجود نہ ہو اس کے بارے میں ہم یہ کہیں گے کہ اگر وہ صحیح کے قبیل سے نہیں ہے تو حسن کے قبیل سے ہے، اس کو لائق حجت اور قابل اعتماد سمجھا جائے گا، بشرطے کہ اس میں کوئی ایسی علت نہ ہو جو ضعف کی موجب ہو۔

نووی لکھتے ہیں:

فماصححه ولم نجد فيه لغيره من المعتدين	جس حدیث کی حاکم نے تصحیح کی ہو اور اس کی صحت یا ضعف کے متعلق

(۱) مقدمہ ابن صلاح ص ۱۱۔

تصحيحا و لاتضعيفا حكمنا بانه حسن الا ان يظهر فيه علة توجب ضعفه.(۱)	دوسرے معتبر محدثین کی تصریح موجود نہ ہوتو ہم اس کو حسن قرار دیں گے، بشرطے کہ اس کو ضعیف قرار دینے والی علت موجود نہ ہو۔

زیلعی کے اوپر کے بیان میں بل تصحيحه كتحسين الترمذی سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ جزائری نے محدث ابن صلاح کے بیان "وان لم يكن من قبيل الصحيح فهو من قبيل الحسن" کا دوسرا مفہوم بتایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ:

''جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں اور دوسرے محدثین کا اس کے بارے میں کوئی فیصلہ موجود نہ ہوتو اس کو احتیاطاً صحیح وحسن کے درمیان دائر سمجھا جائے گا لیکن لوگوں نے ان کے بیان کا یہ مطلب لیا ہے کہ اس پر محض حسن کا حکم لگایا جائے گا۔''(۲)

لیکن متاخرین کے نزدیک حاکم کی تصحیح کے بارے میں اقتضائے حال کے مطابق حکم لگایا جائے گا، جزائری کا بیان ہے کہ:

''اکثر محدثین کی رائے یہ ہے کہ جس حدیث کی تصحیح میں حاکم منفرد ہوں اس کے متعلق بحث وتحقیق کی جائے گی اور اس پر اس کے اقتضائے حال کے مطابق صحت یا حسن یا ضعف کا حکم لگایا جائے گا۔''(۳)

بدر بن جماعہ سے بھی یہی منقول ہے اور عراقی، سخاوی (۴) اور سیوطی وغیرہ نے بھی اس کی تائید کی ہے، علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

''صحیح طریقہ یہ ہے کہ حاکم کی تصحیح کی تحقیق کر کے اس کے اعتبار سے

---

(۱) تدریب الراوی ص ۳۱ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۸ (۳) ایضاً (۴) الفیہ ص ۷ وفتح المغیث ص ۱۳ و ۱۴۔

حسن، صحیح یا ضعیف ہونے کا حکم لگایا جائے، عراقی نے بھی اس کی موافقت کی ہے اور کہا ہے کہ اس پر محض حسن ہی کا حکم نہیں لگایا جائے گا۔" (۱)

مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری لکھتے ہیں:

"غالباً ابن صلاح نے یہ مسلک اس لیے اختیار کیا ہے کہ ان کے خیال میں اب لوگ تصحیح کے اہل نہیں رہے، اس لیے اس کا قصہ ہی ختم ہوگیا جو درست نہیں ہے، تصحیح کا معاملہ ختم نہیں ہوا ہے، بلکہ اب بھی اگر کسی شخص میں اس کی اہلیت موجود ہو اور اس میں اس کے اوصاف وشرائط موجود ہوں تو وہ تصحیح کا فیصلہ کرسکتا ہے۔" (۲)

باقی رہی حضرت شاہ عبدالعزیز دہلوی کی یہ تحریر کہ:

"ذہبی نے یہ کہا ہے کہ کسی شخص کو میری تلخیصات وتعقبات دیکھے بغیر حاکم کی تصحیح سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔" (۳)

اور

"محدثین کا فیصلہ یہ ہے کہ ذہبی کی تلخیص دیکھے بغیر مستدرک حاکم پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔" (۴)

اوپر کے بیانات کے معارض نہیں ہے اور نہ اس سے حاکم کی تصحیح کا مطلقاً باطل ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

رفض وتشیع کا الزام: امام ابوعبداللہ حاکم پر سب سے بڑا الزام رفض وتشیع کا عائد کیا گیا ہے، اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔ محمد بن طاہر روایت کرتے ہیں کہ میں نے ابواسماعیل انصاری سے حاکم کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا کہ "وہ حدیث میں ثقہ مگر سخت رافضی تھے۔" (۵)

(۱) تدریب الراوی ص ۱۳۱ (۲) مقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۷۸ (۳) بستان المحدثین ص ۱۴۱ (۴) ایضاً ص ۱۴۳ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۷۔

۲- دوسری جماعت ان کے رفض کی نفی وتردید کرتی ہے لیکن وہ بھی ان کو شیعیت سے متہم کرتی ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں، وہ شیعیت میں ضرور مشہور تھے لیکن شیخین کے مسئلہ میں تعرض نہیں کرتے تھے، ابو اسماعیل انصاری کا قول خلافِ انصاف ہے، درحقیقت حاکم رافضی نہ تھے، بلکہ شیعی تھے۔''(۱)

مگر خود ابن طاہر کے بیان سے جنھوں نے حاکم کے رافضی ہونے کی ابو اسماعیل سے روایت کی ہے، رفض کا کوئی پتہ نہیں چلتا، چنانچہ وہ کہتے ہیں حاکم اندرونی طور (۲) سے تو شیعوں سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن خلافت وتقدیم کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے۔(۳)

حاکم کی شیعیت کے بارے میں سب سے مشہور روایت وہ ہے جس کو خطیب بغدادی نے اور ان کے حوالہ سے بعض دوسرے اربابِ سیر وتذکرہ نے نقل کیا ہے کہ:

''حاکم ثقہ تھے مگر تشیع کی جانب میلان رکھتے تھے، مجھ سے ابراہیم بن محمد ارموی نے جو ایک صاحبِ علم اور صالح شخص تھے بیان کیا کہ حاکم نے ایسی حدیثیں جمع کی ہیں جن کے بارے میں ان کا گمان ہے کہ وہ صحیحین کے شرائط کے مطابق ہیں اس لیے شیخین پر ان کی تخریج ضروری تھی، چنانچہ اسی قسم کی حدیثوں میں حدیث طیر اور من کنت مولاہ فعلی مولاہ بھی ہیں جو حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب میں وارد ہیں اور ان کی وجہ سے محدثین نے ان پر نکیر وملامت کی ہے۔''(۴)

اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ حاکم پر رفض کا الزام صحیح نہیں ہے بلکہ سراسر

---

(۱) میزان الاعتدال ج ۳ ص ۸۵ (۲) یہاں اس بیان پر کوئی تبصرہ کرنا مقصود نہیں ورنہ کسی کے باطن کے متعلق اس قسم کا فیصلہ کرنا بجائے خود کتنا درست اور مقتضائے انصاف ہے، فقہا کا عام قاعدہ یہ ہے کہ نحن نحکم بالظاہر (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۸ (۴) تاریخ بغداد ج ۵ ص ۴۷۴۔

بے بنیاد ہے، علامہ ذہبی کے مذکورہ بالا بیان کے علاوہ دوسرے بیانات سے بھی جو آگے نقل کیے جائیں گے اس کی پوری تردید ہوتی ہے، علامہ ابن سبکی نے بھی اس کی پرزور تردید کی ہے، یہ الزام محض ابواسماعیل انصاری سے مروی ہے، بعض دوسرے محدثین کے متعلق بھی ان کے اس قسم کے غیر معروف اور منفرد اقوال مروی ہیں جن کو محققین اور ناقدین فن نے خلاف واقعہ اور مطرود قرار دیا ہے، حاکم پر بھی ان کے الزام کی یہی نوعیت ہے، اس لیے اس پر کسی بحث کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

البتہ شیعیت کا الزام بظاہر قوی معلوم ہوتا ہے، اس لیے اس کا یہاں مفصل جائزہ لیا جاتا ہے:

جن لوگوں نے حاکم پر شیعیت کا الزام عائد کیا ہے، ان کے اقوال کا جائزہ لینے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حاکم کی شیعیت کا خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کے سب وشتم یا حضرت علیؓ کی تفضیل اور خلافت میں ان کی تقدیم سے کوئی تعلق نہیں تھا، ابن طاہر جیسے مخالف شخص کو بھی اعتراف ہے کہ تقدیم وخلافت کے مسئلہ میں وہ تسنن کا اظہار کرتے تھے۔

حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ فرماتے ہیں:

> ''بعض علما سے منقول ہے کہ ان کے تشیع کا مطلب یہ ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؓ کی فضیلت (۱) کے قائل تھے جو اسلاف کی ایک جماعت کا بھی مذہب ہے۔'' (۲)

اس لیے یہ امر بھی مسلم ہے کہ امام ابوعبداللہ حاکم حضرت علیؓ کو نہ شیخین سے افضل مانتے تھے اور نہ ان کو ان بزرگوں کے مقابلہ میں خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے اس لیے اب صرف دو چیزیں لائق بحث رہ جاتی ہیں۔

---

(۱) حضرت شاہ صاحبؒ کا یہ بیان محل نظر ہے، آئندہ مباحث سے اس کی تردید ہو جائے گی (۲) بستان المحدثین ص ۱۴۱۔

۱- پہلی چیز حضرت علیؓ کی محبت وعقیدت میں غیر معمولی غلو وافراط ہے، جس کا ثبوت خطیب کی روایت میں ملتا ہے کہ حاکم نے حضرت علیؓ کے فضائل ومناقب میں ضعیف وموضوع حدیثیں روایت کی ہیں۔

۲- دوسری چیز حضرت امیر معاویہؓ سے ان کی برہمی ہے، چنانچہ علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

> ''ان کا حضرت علیؓ کے مخالفین سے انحراف اگرچہ کھلا ہوا ہے لیکن وہ شیخین کو ہر حال میں فائق ومعظم سمجھتے تھے، اس لیے وہ شیعی ضرور تھے لیکن رافضی نہیں تھے۔''(۱)

اور ابن طاہر کا یہ بیان نقل کیا ہے:

> ''حاکم حضرت امیر معاویہؓ اور ان کی اولاد سے برگشتہ تھے اور اس کا اظہار بھی کرتے تھے اور اس کے متعلق کوئی معذرت نہیں کرتے تھے۔(۲)

ابن عماد کا بیان ہے کہ:

> ''علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ حاکم خلفائے ثلاثہ خصوصاً شیخین کی پوری تعظیم کرتے تھے، البتہ حضرت معاویہؓ کے بارے میں انھوں نے کلام کیا ہے، اس کی وجہ سے ان کو زدوکوب بھی کیا گیا تھا۔''(۳)

حافظ ابن جوزی اور علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

> ''ابوعبدالرحمٰن سلمی کا بیان ہے کہ ابوعبداللہ بن کرام کے اصحاب نے حاکم کو عبث تنگ کر رکھا تھا، ان کا منبر توڑ ڈالا تھا اور ان کے لیے گھر سے نکلنا اور مسجد میں جانا تک دشوار کر دیا تھا، میں نے یہ حالت دیکھ کر ان سے کہا کہ اگر آپ حضرت امیر معاویہؓ کے مناقب میں کسی حدیث کی تخریج یا املا کرا دیں تو

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۴۸ (۲) ایضاً (۳) شذرات الذہب ج ۳ ص ۱۷۷۔

اس مشقت وابتلا سے آپ کو چھٹکارا مل جائے، حاکم نے اس کے جواب میں تین
دفعہ کہا کہ مجھ سے یہ نہیں ہوسکتا۔''(۱)

جہاں تک حضرت علیؓ کی محبت میں افراط وغلو کا معاملہ ہے تو اس کو اعتراض وملامت یا شیعیت کی بنیاد قرار دینا صحیح نہیں ہے، بہت سے اکابر اور ائمہ اسلام کو حضرت علیؓ اور اہل بیت کی محبت میں غلو رہا ہے، اس لیے حاکم کا غلو اسی وقت قابل اعتراض ہوسکتا ہے جب دوسرے صحابہ کی عظمت وجلالت کا انھوں نے پاس ولحاظ رکھا نہ ہو، یا وہ حضرت علیؓ کو اجلۂ صحابہ پر فضیلت دیتے ہوں لیکن خود حاکم کو شیعی قرار دینے والوں کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ وہ شیخین کی تنقیص نہیں کرتے تھے بلکہ عام اہل سنت کے عقیدہ کے مطابق وہ ان کو حضرت علیؓ سے افضل اور خلافت کے لیے اقدم وانسب سمجھتے تھے، اس لیے ان کا غلو نہ قابلِ اعتراض ہے اور نہ شیعیت کا ثبوت، حاکم کے حالات وواقعات زندگی اور تصنیفات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ انھوں نے خلفائے ثلاثہ پر حضرت علیؓ کو ترجیح دی، یا کم از کم ان بزرگوں کی کوئی تنقیص کی ہے لیکن اس بارے میں علامہ ابن سبکی کے ان اصولوں کی رہنمائی میں فیصلہ زیادہ مناسب ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اگر کسی شخص کو طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے یا اس پر کوئی الزام عائد کیا جائے تو انصاف پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ سب سے پہلے اس کے شیوخ واساتذہ اور رفقا وتلامذہ وغیرہ کے متعلق بحث وتفتیش کی جائے، اس کے بعد اس کے ماحول اور ان حالات کا جائزہ لیا جائے جن میں اس کی نشوونما ہوئی ہے، پھر ان معاصرین، ہم وطنوں اور اعزہ واقربا کے اقوال وآرا معلوم کیے جائیں جو اس کے حالات وواقعات زندگی سے زیادہ واقف اور باخبر ہوتے ہیں، معاصرین کے متعلق اس کی تحقیق ضرور کرلینی چاہیے کہ ان کے متہم شخص سے تعلقات کی

(۱) المنتظم ج ۷ ص ۲۷۵ والبدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۵۵۔

نوعیت کیا تھی؟ وہ اس کے موافق، حمایتی اور دوست تھے، یا معاند ومخالف اور معترض ونکتہ چیں یا بالکل غیر جانبدار لیکن غیر جانب دار بہت کم ہوتے ہیں۔

ان اصولوں کی روشنی میں امام حاکم کے تشیع وتفضیلِ علیؓ کے الزام پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے، یہ تو مسلم ہے کہ وہ جلیل القدر محدث تھے، ان کی اس حیثیت میں ان کے مخالفین کو بھی کوئی کلام نہیں اور محدثین میں ایسے عقائد شاذ ونادر ہی ہوتے ہیں۔

اس کے بعد حاکم کے ان شیوخ پر غور کیا جائے جن سے انھوں نے علم وفن کی تحصیل کی ہے، خصوصاً ان لوگوں کو دیکھا جائے جن سے ان کو زیادہ تعلق اور قربت رہی ہے، تو معلوم ہوگا کہ ان کے شیوخ میں اکابر اہل سنت اور ایسے لوگ ہیں جو عقائد میں امام ابوالحسن اشعری سے وابستہ تھے جیسے ابوبکر بن اسحٰق ضبعی، ابوبکر بن فورک اور ابوسہل صعلوکی وغیرہ، یہی وہ لوگ ہیں جن سے حاکم کی مجالست تھی اور اصول ودیانات وغیرہ میں مباحثے اور مجادلے رہتے تھے۔

اسی طرح حاکم نے اپنی تاریخ میں اہل سنت کے جو تراجم لکھے ہیں، ان میں ان کی پوری توصیف وتعریف کی گئی ہے کہیں بھی ان کے عقائد پر طنز وتعریض نہیں ہے۔

اس کے علاوہ ابن عساکر نے ان کو ان اشاعرہ کے زمرہ میں شامل کیا ہے جو اہلِ رفض وتشیع کو مبتدع کہتے اور ان کے عقائد سے تبریٰ ظاہر کرتے ہیں یہ چیزیں حاکم پر لگائے جانے والے الزام کو مشکوک بنا دیتی ہیں، آگے جو تفصیلات بیان کی جائیں گی ان سے یہ شکوک وشبہات سراسر یقین واذعان میں تبدیل ہو جائیں گے اور پوری طرح ثابت ہو جائے گا کہ حاکم کا دامن رفض وتشیع کے الزام سے بالکل پاک ہے۔(۱)

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۷، ۶۸۔

آگے علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں:

''حاکم کے اندر تشیع کی جانب میلان کا ذکر کیا جاتا ہے، اگر یہ شریعت کے مطلوب واقتضا سے بھی بڑھ کر رہا ہوتو بھی یہ اس حد وانتہا کو نہیں پہنچا ہوا تھا کہ وہ شیخین کی مذمت وتنقیص کرتے رہے ہوں یا حضرت علیؓ کو ان سے افضل مانتے رہے ہوں بلکہ میں تو اس کو بھی بالکل بعید سمجھتا ہوں کہ وہ حضرت عثمانؓ پر حضرت علیؓ کو فوقیت دیتے رہے ہوں کیوں کہ میری نظر سے ان کی کتاب الاربعین میں ایک باب خلفائے ثلاثہ کی عظمت وتفضیل پر گذرا ہے، اس میں انھوں نے جملہ صحابہ کے مقابلہ میں ان ہی تینوں حضرات کی عظمت کا خصوصیت سے تذکرہ کیا ہے، اسی طرح مستدرک میں انھوں نے حضرت علیؓ سے پہلے حضرت عثمان کا ذکر کیا ہے اور اس میں حضرت عائشہؓ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اول حجر حمله النبی صلی الله علیه وآله وسلم لبناء المسجد ثم حمل ابوبکر حجرا آخر ثم حمل عمر ثم حمل عثمان حجرا آخر فقلت یارسول الله الا تری الی هؤلاء کیف یساعدونك فقال یاعائشة هؤلاء الخلفاء من بعدی.	مسجد (نبوی) کی تعمیر کے لیے پہلا پتھر خود آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا پھر دوسرا حضرت ابوبکرؓ نے، تیسرا حضرت عمرؓ نے اور چوتھا پتھر حضرت عثمانؓ نے رکھا، میں نے کہا اے اللہ کے رسول دیکھئے کس طرح یہ لوگ آپ کی معاونت کررہے ہیں، آپ نے فرمایا اے عائشہ یہی لوگ میرے بعد میرے خلفا اور جانشین ہوں گے۔

گو اس روایت کی صحت میں علامہ ذہبیؒ وغیرہ نے کلام کیا ہے لیکن قابل غور امر صرف یہ ہے کہ جو شخص اعتراضات کی پرواہ کیے بغیر ایسی حدیث کی تخریج

کر سکتا ہے جو خلفائے ثلاثہ کی خلافت کے متعلق تقریباً ایک منصوص اور قطعی امر کی حیثیت رکھتی ہے، کیا اس کے بارے میں رفض و تشیع کا گمان کیا جا سکتا ہے؟

حضرت عثمانؓ کے فضائل میں انھوں نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ:

عن جابر بن عبدالله رضی الله عنهما قال بينما نحن في بيت ابن حشفة في نفر من المهاجرين فيهم ابوبكر وعمر وعثمان وعلي وطلحة والزبير وعبدالرحمان بن عوف وسعد بن ابي وقاص رضي الله عنهم فقال رسول الله ﷺ لينهض كل رجل منكم الى كفؤه فنهض النبي ﷺ الى عثمان فاعتنقه وقال انت وليي في الدنيا والآخرة.

حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ مہاجرین کی ایک جماعت کے ساتھ جس میں حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، طلحہ، زبیر، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد ابن ابی وقاص رضی اللہ عنہم تھے، ابن حشفہ کے گھر میں تھے (اس موقع) پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر شخص کو اپنے ہمسر کے ساتھ ہو جانا چاہیے اور آپ نے خود حضرت عثمانؓ کے ساتھ ہو کر ان سے معانقہ کیا اور فرمایا کہ تم میرے دنیا و آخرت میں ولی ہو۔

اس حدیث میں بھی کلام کیا گیا ہے، حاکم نے ان کے علاوہ اور بھی متعدد حدیثیں حضرت عثمانؓ کی فضیلت میں بیان کی ہیں، جن میں سے بعض کو صحیح مانا گیا ہے اور بعض پر استدراک واعتراض کیا گیا ہے، اسی طرح حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عمرو بن عاصؓ وغیرہ کے فضائل ومناقب کی حدیثیں بھی جمع کی ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی جانب میلان اور عقیدت میں وہ ایسے غلو واغراق سے کام نہیں لیتے تھے، جو بدعت

یا دوسرے صحابہ کے سب وشتم کا باعث ہو۔(۱)

غرض حاکم کا حضرت علیؓ کے بارے میں غالی ومفرط ہونا اولاً تو ثابت ہی نہیں ہے اور اگر کسی درجہ میں ثابت بھی ہو جائے جب بھی قابل اعتراض اور موجب تشیع نہیں ہے کیوں کہ:

۱- انھوں نے خلفائے اربعہ کا جہاں ایک ساتھ تذکرہ کیا ہے، وہاں اسی ترتیب کے مطابق کیا ہے جو اہل سنت نے ان بزرگوں کے درمیان قائم کی ہے، چنانچہ مستدرک کے فضائل صحابہ کے ابواب میں یہی ترتیب ہے، یعنی پہلے بالترتیب خلفائے ثلاثہ کا اور ان کے بعد حضرت علیؓ کا تذکرہ ہے۔

ایک جگہ معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

النوع السابع من هذا العلم معرفة الصحابة على مراتبهم۔	اس علم وفن کی ساتویں نوع صحابہ کرام کے مراتب کے لحاظ سے ان کی معرفت ہے۔

اس نوع میں انھوں نے مراتب ہی کے اعتبار سے صحابہ کے بارہ طبقوں کا ذکر کیا ہے، پہلے طبقہ میں خلفائے اربعہ کے نام اس ترتیب کے ساتھ لیے ہیں۔

فاولهم قوم اسلموا بمكة مثل ابي بكر وعمر وعثمان وعلي وغيرهم رضي الله عنهم۔(۲)	اول طبقہ میں وہ لوگ ہیں جو مکہ میں اسلام لائے جیسے ابوبکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ وغیرہ

محدثین کے سنین اور عمروں کے بیان میں بھی انھوں نے خلفائے ثلاثہ کے بعد حضرت علیؓ کا سنہ وفات تحریر کیا ہے۔(۳)

۲- عام اہل سنت کی طرح حاکم بھی ان چاروں بزرگوں کو خلیفہ برحق سمجھتے تھے

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۰ و ۷۱ (۲) معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۲ (۳) ایضاً ص ۲۰۲ و ۲۰۳۔

اور اپنی تصنیفات میں خلفا کی حیثیت سے ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

۳- ان بزرگوں کے مناقب میں جو حدیثیں اور آثار جمع کئے ہیں ان سے بھی ان کی وہی فضیلت وعظمت اور ان کا وہی درجہ ومرتبہ ثابت ہوتا ہے جو عام امت نے ان کو دیا ہے، یعنی حضرت ابوبکر متفقہ طور پر امت میں سب سے برگزیدہ وبرتر ہیں، حاکم نے بھی احادیث وآثار سے یہی ثابت کیا ہے، یہاں تک کہ خود جناب امیرؓ کے ایسے اقوال نقل کئے ہیں جن سے حضرت ابوبکرؓ کا سب سے فائق وبرتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں جناب امیرؓ کی تاخیر اور آپ کی آزردگی کا مسئلہ آج تک امت کے درمیان بحث ونزاع کا موضوع بنا ہوا ہے لیکن حاکم جناب امیرؓ ہی کی زبانی اس کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قال علي والزبير ماغضبنا	حضرت علیؓ اور حضرت زبیرؓ فرماتے ہیں
الالانا قد اخرنا عن	کہ ہم کو غصہ اس وجہ سے تھا کہ ہم
المشاورة وانا نرى ابابكر	لوگوں کو مشورہ میں نظر انداز کیا گیا تھا،
احق الناس بها بعد رسول	ورنہ ہم لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ
الله صلى الله عليه وسلم	وسلم کے بعد حضرت ابوبکرؓ ہی کو سب
انه لصاحب الغاروثاني	سے زیادہ خلافت کا مستحق سمجھتے تھے، وہ
اثنين وانا نعلم بشرفه	غار میں آپ کے ساتھ اور دو میں کے
وكبره ولقد امره رسول الله	دوسرے تھے ہم کو ان کا فضل وشرف
صلى الله عليه وسلم	خوب معلوم ہے، رسول اللہ صلی اللہ
بالصلوة بالناس وهو	علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں ان کو حکم دیا
حي۔(۱)	تھا کہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔

(۱) المستدرک ج۳ص۶۶و۶۷۔

جہاں تک شیخین کی عظمت کا معاملہ ہے، اس میں معترضین کو بھی اعتراف ہے کہ حاکم نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے، البتہ حضرت عثمانؓ کا معاملہ ضرور مختلف فیہ ہے حالاں کہ یہ بھی خلاف واقعہ ہے، حاکم حضرت عثمان غنیؓ کو تیسرا اور برحق خلیفہ مانتے تھے اور ان کے قتل کو ناحق سمجھتے تھے، معرفۃ علوم الحدیث میں لکھتے ہیں:

قتل عثمان بن عفان رضی الله عنه صبرا۔ (۱) — حضرت عثمان مظلوم قتل کیے گئے تھے۔

خلافت میں حضرت عثمانؓ کی ترتیب کے متعلق جو اشارات بعض حدیثوں میں ملتے ہیں وہ مستدرک میں بھی ہیں ابن سبکی نے اس قسم کی دو حدیثیں مستدرک سے نقل کی ہیں یہاں دو اور روایتیں ملاحظہ ہوں:

''حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات ایک صالح شخص نے خواب دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور ابوبکرؓ سے حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؓ سے حضرت عثمانؓ جڑ گئے، راوی حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ جب ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے اٹھے تو یہ بات چیت کر رہے تھے کہ صالح آدمی سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں اور جڑ جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے امور کے ذمہ دار ہوں گے۔'' (۲)

دوسری حدیث حضرت انس بن مالک کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''بنی مصطلق کے لوگوں نے مجھ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا کہ ہم لوگ آپ کے بعد کس کو صدقات دیں، آپ نے فرمایا کہ حضرت ابوبکرؓ کو، ان لوگوں نے کہا جا کر پوچھو ابوبکرؓ کے بعد کس کو

(۱) معرفۃ علوم الحدیث ص ۲۰۳ (۲) مستدرک ج ۳ ص ۷۱ و ۷۲۔

ہم دیں گے، آپ نے حضرت عمرؓ کا نام لیا، تیسری دفعہ پھر بھیجا تو آپ نے فرمایا
کہ حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ کو دینا۔" (۱)

اسی طرح حاکم نے حضرت علیؓ کے مناقب میں جو روایتیں نقل کی ہیں ان سے خلفائے ثلاثہ اور عام صحابہ کی کوئی تنقیص نہیں ہوتی۔

عام محدثین کی طرح حاکم کا بھی یہ مسلک ہے کہ صحابہ کرام کی عدالت میں طعن اوران کی تنقیص کرنے والے کی روایت قبول نہیں کی جائے گی، مذاہب محدثین کی معرفت کے بیان میں لکھتے ہیں:

"علی بن مدینی فرماتے ہیں کہ ابو اسرائیل ملائی کا پایہ حدیث میں بلند
نہیں تھا کیوں کہ وہ حضرت عثمانؓ کا برائی کے ساتھ ذکر کرتے تھے۔"

اسی طرح علی بن حسین سے روایت ہے کہ حسین نے سدی کے یہاں جانا اس لیے ترک کر دیا تھا کہ وہ شیخین کو سب وشتم کرتے تھے۔ (۲)

درحقیقت متقدمین کے نزدیک حاکم صحابہ کے معاملہ میں جادۂ حق اور مسلک اعتدال سے منحرف نہیں تھے جن لوگوں نے ان کو شیعی قرار دیا ہے، انھوں نے بھی اس کے ثبوت میں کوئی واقعہ یا ان کی تصنیفات سے کوئی مثال نہیں پیش کی ہے، رہیں وہ دونوں روایتیں جو صاحب مستدرک کے رفض وتشیع کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں، تو ان سے بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

پہلی حدیث یعنی "من کنت مولاہ فعلي مولاہ" کی حاکم نے تین طرق سے تخریج کی ہے، اور سب کی تصحیح وتصویب کی ہے، (۳) امام ترمذی نے اپنی جامع میں، امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں اور امام احمد نے مسند میں بھی اس حدیث کی تخریج کی ہے، ان کے علاوہ طبرانی نے معجم میں ضیاء مقدسی نے مختارہ میں اور امام نسائی نے خصائص علیؓ میں

(۱) المستدرک ج ۳ ص ۷۷ (۲) معرفۃ علوم الحدیث ص ۱۳۷ (۳) ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۰۹ و ۱۱۰۔

اس کی تخریج کی ہے گو حاکم کے بعض رجال پر کلام کیا گیا ہے اور ان کی روایتوں میں بعض ایسے اضافے ہیں جو صحاح اور مسند احمد بن حنبل میں نہیں ہیں، تاہم روایت کے جس حصہ کو قابل بحث، وجہ اعتراض اور شیعیت کی بنیاد قرار دیا گیا ہے، یعنی "من كنت مولاه فعلى مولاه" وہ سب میں مشترک ہے، اسی لیے اکثر محدثین نے اس حدیث کو ضعیف اور بے اصل نہیں قرار دیا ہے، علامہ ذہبی نے جنھوں نے مستدرک کی تلخیص میں جا بجا حاکم پر نقد و تعقب کیا ہے اور اسی باب یعنی فضائل علیؓ کی متعدد ضعیف و واہی حدیثوں پر تنبیہ کی ہے، جس میں بعض جگہ ان کا لہجہ بہت تیز و تند ہو گیا ہے مثلاً:

العجب من الحاكم وجرأته في تصحيح هذا وامثاله من البواطيل۔(۱)	حاکم پر اور ان کی ایسی اور اس جیسی باطل حدیثوں کی تصحیح کی جرأت پر سخت حیرت ہے۔

لیکن زیر بحث روایت کے صرف ایک طریق کے ایک راوی محمد کے علاوہ انھوں نے کسی پر کلام نہیں کیا ہے (۲) اور تذکرہ میں اس صراحت کے باوجود کہ مستدرک میں غیر صحیح حدیثیں پائی جاتی ہیں، اس حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

واما حديث من كنت مولاه الخ فله طرق جيدة وقد افردت ذالك۔ (۳)	رہی حدیث من كنت مولاه الخ تو اس کے طرق جید ہیں اور میں نے اس کے لیے علاحدہ رسالہ لکھا ہے۔

ذہبی نے میزان الاعتدال میں اور حافظ ابن حجر نے لسان المیزان میں، مستدرک میں حاکم کی ساقط روایات کی تصریح کی ہے لیکن اس حدیث کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، ضعاف و موضوعات میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے، علامہ سیوطیؒ نے اس کو حدیث حسن قرار دیا ہے۔ (۴) البتہ امام ترمذی نے اس کو غریب بتایا

(۱) تلخیص مستدرک ج ۳ ص ۱۲۷ (۲) ایضاً ص ۱۱۰ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۵ (۴) الجامع الصغیر ج ۲ ص ۵۵۔

ہے، مولانا عبدالرحمٰن محدث مبارک پوری لکھتے ہیں:

''امام ترمذی نے اس کو حدیث حسن غریب بتایا ہے لیکن امام احمد، نسائی اور ضیاء نے بھی اس کی تخریج کی ہے، اس باب میں امام احمدؒ نے حضرت بریدہؓ سے اور انھوں نے اور ابن ماجہ نے براء بن عازبؓ سے امام ابن ماجہ نے سعدؓ بن ابی وقاص سے اور امام احمدؒ نے حضرت علیؓ سے روایتیں کی ہیں۔''(۱)

اور علامہ اسماعیل بن محمد عجلونی (م ۱۱۶۲ھ) نے تو اس کے متعلق یہاں تک لکھا ہے کہ:

''حدیث من كنت مولاه کی امام طبرانی، احمد اور ضیاء نے مختارہ میں زید بن ارقم، حضرت علی اور تیں صحابہ سے اس لفظ "اللهم وال من والاه وعاد من عاداه" کے ساتھ تخریج کی ہے، پس یہ حدیث مشہور یا متواتر ہے۔''(۲)

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ بعض علمائے فن اور محدثین نے اس روایت کی تضعیف کی ہے، علامہ زیلعی نے اس کے ضعیف ہونے کی نصب الرایہ میں صاف تصریح کی ہے، تاہم یہ حدیث چاہے صحیح ہو یا ضعیف و موضوع، مجرد اس کو نقل کرنے کی بنا پر حاکم کو شیعی قرار دینا یا ان کو مطعون کرنا سراسر زیادتی اور ناانصافی ہے جب مستدرک میں اور بھی ضعیف و موضوع حدیثیں موجود ہیں اور ان کی بنیاد پر حاکم کے عقیدہ و مسلک کے بارے میں کوئی خاص رائے نہیں قائم کی گئی ہے، یہاں تک کہ خود خلفائے ثلاثہ اور دیگر صحابہ کرام کے مناقب میں بھی کمزور اور ساقط روایتیں درج ہیں لیکن ان کی بنیاد پر کسی نے حاکم پر ان بزرگوں کی عقیدت میں غلو و افراط کا الزام عائد نہیں کیا ہے، اس لیے اس روایت کو ان کے عقیدہ و مسلک کی بنیاد اور حضرت علیؓ کی محبت میں بے جا افراط و غلو کی دلیل کس طرح ثابت

(۱) جامع ترمذی مع شرح تحفۃ الاحوذی ج ۴ ص ۳۲۶ و ۳۲۷ (۲) کشف الخفا ومزیل الالباس ج ۲ ص ۲۷۴۔

کیا جاسکتا ہے، پھر جب اس کی تخریج متعدد ائمہ کبار نے کی ہے اور اس کی وجہ سے ان کو رفض وتشیع سے متہم نہیں کیا گیا تو آخر حاکم ہی کو ہدف طعن اور شیعی قرار دینے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

اگر اس حدیث کی حجیت یقینی اور مسلم بھی مان لی جائے جب بھی اس کے مفہوم سے رفض وشیعیت کی کوئی تائید نہیں ہوسکتی، عربی زبان میں مولیٰ کا لفظ کئی معنوں میں آتا ہے اور جیسا کہ شارحین نے لکھا ہے یہاں مولیٰ اور ولی کا لفظ دوست اور ساتھی کے معنیٰ میں ہے، ملا علی قاری کا بیان ہے کہ من کنت مولاہ الخ من کنت تولاہ کے مفہوم میں ہے، یعنی یہ ولی سے ہے جو عدو کا ضد ہے اور اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''میں جس سے محبت کرتا ہوں علی بھی اس سے محبت کرتے ہیں۔'' دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''جو مجھ سے محبت کرتا ہے اس سے علی بھی محبت کرتے ہیں۔''(۱) پہلے مفہوم کی تائید ان حدیثوں سے بھی ہوتی ہے، جن میں حضرت علیؓ سے محبت کرنے والے کو مومن اور بغض ونفرت کرنے والے کو منافق کہا گیا ہے۔

دوسرے اس قسم کے الفاظ بعض اور صحابہ کرام کے بارے میں بھی حدیثوں میں آئے ہیں، خود حاکم نے حضرت عثمانؓ کے متعلق ایک روایت نقل کی ہے جو پہلے گذر چکی ہے کہ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کو دنیا وآخرت دونوں میں اپنا ولی بتایا ہے، اس طرح یہ حضرت علیؓ کی کوئی ایسی اہم اور خاص خصوصیت نہیں ہے جس میں دوسرے صحابہ شریک نہ ہوں۔

تیسرے بریدہ اسلمیؓ اور عمران بن حصین کی حدیثوں سے جو مستدرک اور مذکورہ بالا کتابوں میں مذکور ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جناب امیرؓ کے متعلق یہ الفاظ ایک خاص موقع پر فرمائے تھے، جب بعض لوگوں نے ان کے کسی طرز عمل سے آزردہ ہوکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی شکایت کی تھی، اس پر آپؐ نے ناگواری ظاہر فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ ''علیؓ سے بغض ونفرت کا اظہار کرکے تم لوگ مجھ سے نفرت کا اظہار کررہے ہو، کیوں کہ جس کا میں دوست ہوں علیؓ بھی اس کے دوست ہیں۔''

---

(۱) تحفۃ الاحوذی مع جامع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۶۔

اس واقعہ کی روشنی میں یہ حدیث صحیح ہو یا ضعیف، اس سے شیعیت کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔

رہی دوسری حدیث تو اس کو حاکم نے دو طرق سے مستدرک میں نقل کر کے صحیح اور شیخین کے شرائط کے مطابق قرار دیا ہے، بلکہ پہلے طریق کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے ان کے تیس شاگردوں نے روایت کیا ہے اور یہ حضرت علیؓ، ابوسعید خدریؓ اور سفینہؓ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے،(۱) ''حدیث طیر'' کا معرفۃ علوم الحدیث میں بھی انھوں نے ذکر کیا ہے لیکن وہاں اس کی صحت وسقم کے بارے میں کوئی رائے نہیں ظاہر کی ہے۔

''حدیث طیر'' کو حاکم کے علاوہ امام ترمذی نے اپنی جامع (۲) میں اور امام نسائی نے خصائصِ علیؓ (۳) میں نقل کیا ہے۔

حاکم کی دونوں روایتوں میں ایسی تفصیلات اور اضافے ہیں جو امام ترمذی وغیرہ کی روایتوں میں نہیں ہیں، حاکم کے مقابلہ میں امام ترمذی ونسائی کی حدیثیں بہت مختصر ہیں، مسئلہ کی وضاحت وتنقیح کے خیال سے یہاں ترمذی کی روایت نقل کی جاتی ہے۔

عن انس بن مالك رضی الله عنه كان عندالنبی صلی الله عليه وسلم طير فقال	حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک چڑیا تھی، آپ نے فرمایا کہ

(۱) ملاحظہ ہو المستدرک ج ۳ ص ۱۳۰ تا ۱۳۲ (۲) تحفۃ الاحوذی مع ترمذی ج ۴ ص ۳۲۸ (۳) یہ رسالہ ۱۳۰۸ھ میں مصر سے شائع ہوا ہے، اس میں یہ حدیث موجود نہیں ہے لیکن مولوی سید اولاد حسین صاحب نے جو نواب رام پور کے مصاحب خاص وواعظِ دربار تھے، خصائصِ مرتضوی کے نام سے اس کا اردو ترجمہ کیا تھا جو محلہ جوہری لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس میں حدیث طیر کا متن اور اردو ترجمہ موجود ہے، ملاحظہ ہو خصائص مرتضوی ص ۴۔

اللھم ائتنی باحب خلقك	اے اللہ تو اس شخص کو میرے پاس بھیج
الیك یاکل معی ھذا الطیر	دے جو تیرے نزدیک، تیری مخلوق
فجاء علی فاکل معه.	میں سب سے زیادہ محبوب ہے تاکہ وہ
	میرے ساتھ یہ چڑیا کھائے، چنانچہ
	حضرت علیؓ تشریف لائے اور انھوں
	نے آپ کے ساتھ اس کو تناول فرمایا۔

امام نسائی کی روایت میں ہے کہ پہلے ابوبکرؓ پھر حضرت عمرؓ تشریف لائے، مگر ان کو باریابی کی اجازت نہیں ملی، تیسری دفعہ جب پھر حضرت علیؓ تشریف لائے تو آپ نے اجازت مرحمت فرمائی، حاکم کی دونوں حدیثیں نہایت طویل ہیں، ان کا ملخص اور ماحصل یہ ہے کہ آں حضورؐ کی دعا "اللھم ائتنی الخ" سن کر حضرت انسؓ نے دعا کی کہ اے اللہ! یہ محبوب بندہ قبیلہ انصار کا کوئی آدمی ہو، چنانچہ جب دو دفعہ حضرت علیؓ ہی تشریف لائے تو حضرت انسؓ نے یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ضرورت سے تشریف لے گئے ہیں مگر جب تیسری دفعہ بھی حضرت علیؓ ہی آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان کو لو آؤ، تم ہی پر موقوف نہیں ہے، ہر شخص کو اپنی قوم سے محبت ہوتی ہے۔

امام ترمذیؒ نے اپنی روایت کے متعلق فرمایا ہے کہ:

ھذا حدیث غریب لانعرفه	یہ حدیث غریب ہے، سدی سے صرف
من حدیث السدی الامن ھذا	اسی سند اور طریق سے ان کی حدیث کا
الوجه وقدروی ھذا الحدیث	ہم کو علم ہے حالانکہ یہ حضرت انسؓ سے
من غیر وجه عن انس.	متعدد وجوہ وطرق سے مروی ہے۔

علامہ ذہبی تلخیص میں حدیث طیر کے پہلے طریق کے بارے میں لکھتے ہیں:

ابن عیاض لااعرفه ولقد	ابن عیاض کے بارے میں مجھ کو

کنت زمانا طویلاً اظن ان حدیث الطیر لم یجسر الحاکم ان یودعه فی مستدرکه فلما علقت هذا الکتاب رأیت الهول من الموضوعات التی فیه فاذا حدیث الطیر بالنسبة الیها سماء قال وقدرواه عن انس جماعة اکثر من ثلاثین نفسا ثم صحت الروایة عن علی وابی سعید وسفینة۔ (۱)	واقفیت نہیں ہے، میرا ایک زمانہ تک خیال تھا کہ حاکم نے حدیث طیر کو مستدرک میں نقل کرنے کی جسارت نہ کی ہوگی لیکن جب میں نے یہ تعلیق لکھی تو مجھ کو ایسی ہولناک موضوع حدیثیں اس میں ملیں جن کے مقابلہ میں حدیث طیر بلند پایہ ہے، کیوں کہ اس کے متعلق خود حاکم نے کہا ہے کہ اس کو حضرت انسؓ سے تیس سے زیادہ اشخاص نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ یہ حضرت علیؓ، ابوسعیدؓ اور سفینہؓ سے بھی صحت کے ساتھ مروی ہے۔

اور دوسرے طریق کے ایک راوی ابراہیم بن ثابت کو ساقط قرار دیا ہے۔ (۲)

تذکرہ میں اس حدیث کے متعلق ذہبی کا رویہ مزید نرم ہو گیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

واما حدیث الطیر فله طرق کثیرة جدا افردتها بمصنف وبمجموعها یوجب ان یکون الحدیث لهٗ اصل۔ (۳)	رہی حدیث طیر تو یہ بکثرت طرق سے مروی ہے، میں نے ان سب کو ایک مستقل رسالہ میں جمع کیا ہے، ان سب کے مجموعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ بے اصل نہیں ہے۔

(۱) تلخیص مع مستدرک ج ۳ ص ۱۳۱ (۲) ایضاً ص ۱۳۲ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۲۵۔

ذہبی کے ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو حدیث طیر کے ضعیف یا موضوع ہونے کے بارے میں شرح صدر نہیں تھا اور امام ترمذی نے اگرچہ اس کو غریب بتایا ہے تاہم انھوں نے اس کے کثرتِ طرق وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک بھی یہ موضوع اور ضعیف نہیں ہے۔

لیکن عام علما نے حدیث طیر کو صحیح تسلیم نہیں کیا ہے جیسا کہ حاکم پر ان کے اعتراضات سے ظاہر ہوتا ہے، البتہ بعض کے نزدیک ضعیف ہے اور بعض کے نزدیک موضوع، علامہ ابن سبکی نے پہلے قول کو ترجیح دی ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''حدیث طیر پر وضع کا الزام لگانا صحیح نہیں ہے، ہمارے دوست حافظ صلاح الدین خلیل بن کیکلد علائی نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کے متعلق صحیح فیصلہ یہ ہے کہ اس کے بعض طرق حسن کے درجہ تک پہنچ جاتے ہیں، یا زیادہ سے زیادہ اس کو ضعیف کہہ سکتے ہیں لیکن اس کے تمام طرق کا موضوع ہونا ثابت نہیں ہوتا، انھوں نے اس کی سند کے تمام رجال کو بجز احمد بن عیاض کے، ثقہ ومعرف بتایا ہے لیکن میری نظر سے ان کی جرح یا توثیق کے بارے میں کوئی قول نہیں گذرا ہے۔''(۱)

علامہ زیلعی نے بھی جن کی رائے آگے نقل کی جائے گی، اس کو ضعیف ہی قرار دیا ہے۔

لیکن جن لوگوں نے اس کو موضوع قرار دیا ہے، ان کی تعداد زیادہ ہے، علامہ ابن جوزی نے اس کو موضوعات میں شمار کیا ہے، وہ اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

> ''حاکم نے حدیث طیر کو صحیح بتایا ہے لیکن ابن ناصر کہتے ہیں کہ یہ موضوع ہے اور اہل کوفہ میں سے ساقط الاعتبار قسم کے لوگوں نے کچھ مشہور اور کچھ مجہول

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷۱ و ۷۲۔

راویوں کے واسطہ سے اس کو حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کیا ہے۔"(۱)

علامہ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے۔(۲)

علامہ شوکانی فرماتے ہیں:

قال فی المختصر له طرق كثيرة كلها ضعيفة وقد ذكره ابن جوزی فی الموضوعات واما الحاكم فاخرجه فی المستدرك وصححه واعترض عليه كثير من اهل العلم ومن اراد استيفاء البحث فلينظر ترجمة الحاكم فی النبلاء(۳)	مختصر میں کہا گیا ہے کہ اس کے بہت سے طرق ہیں جو سب ضعیف ہیں اور علامہ ابن جوزی نے اس کا موضوعات میں تذکرہ کیا ہے مگر حاکم نے مستدرک میں اس کی تخریج کر کے اسے صحیح قرار دیا ہے اس کی وجہ سے اکثر علما نے ان پر اعتراضات کئے ہیں جس کو اس کی مفصل بحث دیکھنی ہو وہ سیر النبلا (۴) میں حاکم کا ترجمہ دیکھے۔

علامہ محمد بن طاہر پٹنی نے بھی اس کو موضوع بتایا ہے۔(۵)

حاکم نے مستدرک میں اس کی صحت ثابت کرنے کے لیے کثرتِ طرق کا سہارا لیا ہے مگر علامہ زیلعی فرماتے ہیں:

وكم من حديث كثرت رواته وتعددت طرقه وهو حديث	کتنی حدیثیں ایسی ہیں جن کے رواۃ زیادہ اور طرق متعدد ہوتے ہیں لیکن وہ

(۱) المنتظم ج ۷ ص ۲۷۵ (۲) البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۳۵۵ (۳) الفوائد المجموعہ فی الاحادیث الموضوعہ ص ۲۰۸ (۴) افسوس ہے کہ سیر النبلا کی یہ جلد ہماری نظر سے نہیں گذری (۵) تذکرۃ الموضوعات ص ۹۵، ۹۶۔

ضعیف کحدیث الطیر وحدیث الحاجم والمحجوم وحدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ.(۱)

حدیثیں ضعیف ہوتی ہیں حدیثِ طیر، حدیث حاجم ومحجوم اور حدیث من کنت مولاہ فعلی مولاہ.

امام دارقطنی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب ان کے سامنے اس حدیث کا ذکر کیا گیا تو انھوں نے مستدرک اور حاکم پر اظہار نکیر کیا، خود حاکم کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بعد میں اس حدیث کو موضوع سمجھ کر مستدرک سے خارج کردیا تھا، ابومحمد بن سمرقندی کا بیان ہے کہ حاکم کو 'حدیث طیر' کے متعلق جب امام دارقطنی کی نکیر وملامت کی اطلاع ہوئی تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کردیا''(۲)

علامہ ذہبی کے ایک بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں:

''حاکم شاگرد ابوعبدالرحمٰن شاذیاجی کہتے ہیں کہ سید ابوالحسن کی مجلس میں ہم لوگوں نے حاکم سے حدیث طیر کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ''یہ صحیح نہیں ہے کیوں کہ اگر اس کو صحیح مانا جائے تو رسول اللہ کے بعد کوئی شخص حضرت علیؓ سے افضل نہ ہوگا، مگر میرا خیال ہے کہ اس کے متعلق بعد میں حاکم کی رائے بدل گئی تھی اور انھوں نے اس کو مستدرک میں شامل کردیا تھا، اس طرح یہ حدیث مستدرک میں باقی رہ گئی۔''(۳)

بہرحال حاکم نے چاہے حدیث طیر کو مستدرک سے خارج کیا ہو یا نہ کیا ہو، اس کا موضوع اور باطل ہونا اکثر علمائے فن اور محدثین کے نزدیک مسلم ہے۔

---

(۱) نصب الرایہ ج۱ص۳۶۰ (۲) طبقات الشافعیہ ج۳ص۶۸ (۳) دیکھو تذکرۃ الحفاظ ج۳ص۲۴۵، علامہ ابن سبکی لکھتے ہیں' ہمارے استاذ علامہ ذہبی کا بیان درست اور بجا ہے، مستدرک میں حدیث طیر کا رہ جانا تسامح کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، پہلے تو میں نے خیال کیا کہ ممکن ہے (بقیہ اگلے صفحہ پر)

گو محدثین اور اصحاب فن کے نزدیک اس حدیث کا موضوع ہونا مسلم ہے لیکن اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے جب بھی اس سے شیعیت کی تائید نہیں ہوتی کیوں کہ اس سے حضرت علیؓ کا علی الاطلاق سب سے افضل و برتر ہونا یقینی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔

شافعیت میں غلو اور تعصب کا الزام: امام حاکم شافعی المذہب تھے، ان پر الزامات کی فہرست میں ایک الزام یہ بھی ہے کہ ان کو اس مذہب میں بے جا غلو اور تعصب تھا لیکن اس

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) حاکم کے تخریج نہ کرنے کے باوجود اس حدیث کو مستدرک میں شامل کر دیا گیا ہو، اس لیے میں نے اس کی تحقیق کے لیے مستدرک کے قدیم نسخوں کا جائزہ لیا لیکن مجھ کو اس سلسلہ میں شرح صدر نہ ہوا مگر جب امام دار قطنی کے استدراک و نکیر سے حاکم نے مطلع ہونے کے بعد اس کو خارج نہیں کیا تو خیال ہوا کہ ممکن ہے حاکم نے اس کی پہلے تخریج کی ہو اور بعد میں خارج کر دیا ہو لیکن بعض نسخوں میں یہ صحیح رہ گئی ہو، اگر یہ ثابت ہو جائے تو دونوں روایتیں درست ہو جائیں گی اور صورت واقعہ یہ ہوگی کہ حاکم نے اس حدیث کی تخریج کی تھی، مگر جب ان کو اس کا باطل ہونا قطعیت کے ساتھ معلوم ہو گیا تو انھوں نے اس کو مستدرک سے خارج کر دیا، جیسا کہ اس روایت سے جس کی سندوں کو ذہبی نے صحیح قرار دیا ہے، معلوم ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود بعض نسخوں میں یہ حدیث یا تو کتاب کے مشتہر اور شائع ہو جانے کی وجہ سے باقی رہ گئی ہو یا حاکم کے مخالفین اور نکتہ چینوں نے اس کو اس میں شامل کر دیا ہو (طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۷) علامہ ابن سبکی نے مخالفین کے بارے میں جس شبہہ کا اظہار کیا ہے، وہ بے بنیاد نہیں ہے، خود ابن طاہر کا بیان ہے کہ میں نے حاکم کے قلم سے ایک ضخیم مجموعہ میں حدیث طیر دیکھی تو اس کو تعجب کی وجہ سے نقل کر لیا ممکن ہے اسی طرح بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس حدیث کو نقل کیا ہو، اس طرح سے اس کو عام شہرت ہو گئی ہو اور جن لوگوں کو حاکم کی بعد کی رائے کی اطلاع نہ ہو سکی ہو انھوں نے یہ سمجھ کر کہ یہ حدیث مستدرک میں شامل ہے اور مستدرک کے بعض نسخوں میں یہ حدیث موجود تھی، اس لیے جامعین و مرتبین سے عدم امتیاز کی بنا پر تسامح ہو گیا، اس طرح وہ مستدرک کے متداول نسخوں میں بھی باقی رہ گئی ہے۔ "ض"

الزام کا ان کے سوانح نگاروں نے ذکر نہیں کیا ہے، اس کو مشہور عالم اور ندوۃ المصنفین دہلی کے سابق رفیق مولانا عبدالرشید نعمانی نے زیادہ شدومد سے لکھا ہے، وہ اپنی ایک عربی تصنیف ماتمس الیه الحاجة لمن یطالع سنن ابن ماجہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''علامہ ابن صلاح نے ائمہ خمسہ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی) کے بعد جن اکابر محدثین کا ذکر کیا ہے، یعنی دارقطنی، حاکم، عبدالغنی بن سعید مصری ابونعیم اصبہانی اوران کے بعد کے طبقہ میں ابن عبدالبر، بیہقی اور خطیب، یہ سب کے سب عبدالغنی بن سعید اور ابن عبدالبر کے علاوہ ائمہ شافعیہ میں ہیں اوران لوگوں کو اس مذہب کے بارے میں شدید تعصب تھا۔''

حافظ ابن جوزی المنتظم میں لکھتے ہیں:

''.......... اسماعیل بن ابوالفضل قومسی اصبہانی سے یہ کہتے ہوئے سنا گیا ہے کہ وہ تین محدثین کو ان کے سخت تعصب اور انصاف کی کمی کی وجہ سے ناپسند کرتے تھے۔ ۱-حاکم ابوعبداللہ۔ ۲-ابونعیم اصبہانی۔ ۳-ابوبکر خطیب، اسماعیل نے بالکل صحیح کہا ہے، وہ ثقہ وصدوق اور کبار محدثین میں تھے، ان کو رجال ومتون کی اچھی اور عمدہ معرفت حاصل تھی اور وہ بڑے متدین تھے۔(۱)

مولانا نے آگے چل کر ان محدثین میں سے بعض کے تعصب کی مزید وضاحت کی ہے لیکن حاکم کے متعلق یہاں صرف اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے مگر حاکم کے رسالہ المدخل الی علم الحدیث پر ان کا ایک طویل مضمون ماہنامہ برہان دہلی کے کئی نمبروں میں شائع ہوا ہے، اس میں المدخل کے بعض مختصر مباحث کی توضیح وتفصیل کے علاوہ اس پر نقد وتعقب بھی کیا گیا ہے، اس مضمون کے شروع میں کسی قدر تفصیل اور تیز لہجہ میں اس الزام کا اعادہ کیا گیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

---

(۱) ماتمس الیه الحاجة ص۱۳ بحوالہ المنتظم ج۸ ص۲۶۹۔

''حاکم کی تصانیف کے مطالعہ کے وقت دو باتیں پیش نظر رہنی چاہئیں،
اولاً ان کا نقد و نظر میں تساہل، ثانیاً تعصب، ان کا تساہل تو ایک متعارف چیز ہے،
مگر تعصب پر ممکن ہے، ظاہر بینوں کو یقین نہ آئے لیکن یہ صرف ہمارا بیان نہیں
بلکہ ائمہ فن کی تصریح ہے، حافظ عبدالرحمٰن بن جوزی نے بسند صحیح حافظ اسماعیل بن
ابی الفضل قومسی کا یہ قول نقل کیا ہے،(۱) المدخل میں بھی ائمہ احناف کا جس
طریقہ پر ذکر کیا ہے، اس سے حافظ اسماعیل کے بیان کی توثیق ہو جاتی ہے، ضعفا
سے روایت کے باب میں جہاں ائمہ کا نام لیا ہے، امام مالک کا ذکر اس عظمت
شان کے ساتھ کیا ہے "وهذا مالك بن انس امام اهل الحجاز
بلا مدافعة۔ اسی طرح امام شافعی کا نام لینے کے بعد لکھتے ہیں: "وهو الامام
لاهل الحجاز بعد مالك۔" لیکن امام ابوحنیفہ: اور صاحبین کے صرف نام
بتانے پر اکتفا کی ہے، چنانچہ تحریر ہے "وهذا ابوحنيفة ثم بعده
ابويوسف يعقوب بن ابراهيم القاضي ومحمد بن الحسن
الشيباني اور ابوعصمہ نوح بن ابی مریم پر جو امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں سے ہیں
اور فقہا میں خاص امتیاز رکھتے ہیں، وضع حدیث کا الزام لگایا ہے اور ایک مجہول
شخص کے بیان سے استدلال کیا ہے۔''(۲)

مذکورہ بالا دونوں تحریروں کا تجزیہ کرنے سے حاکم کے تعصب کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں:

۱- رسالہ المدخل میں حاکم نے امام مالک اور امام شافعی کا جس عظمتِ شان کے ساتھ ذکر کیا ہے اس عظمت کے ساتھ امام ابوحنیفہ کا نہیں کیا ہے۔

---

(۱) یہ بیان پہلی تحریر میں گذر چکا ہے، اس لیے اس کو یہاں حذف کر دیا گیا ہے (۲) ماہنامہ برہان فروری ۱۹۴۲ء ص ۱۰۴ و ۱۰۵۔

۲- حاکم نے امام ابوحنیفہ کے ایک شاگرد ابوعصمہ نوح ابن ابی مریم پر جو فقہ میں امتیاز رکھتے تھے، ایک مجہول شخص کے بیان پر اعتماد کر کے وضع حدیث کا الزام لگایا ہے۔

پہلا تجزیہ یقیناً صحیح ہے، المدخل میں حاکم نے ان ائمہ کا اسی حیثیت سے ذکر کیا ہے،(۱) لیکن غالباً اس کو امام اعظم کی تنقیص اور شافعیت میں غلو و تعصب کا نتیجہ قرار دینا صحیح نہیں ہے، کیوں کہ

۱- امام اعظم کے بارے میں معتدل محدثین کو اگر چہ پوری طرح تسلیم تھا کہ فقہ و اجتہاد میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا لیکن حدیث میں وہ ان کا پایہ زیادہ بلند نہیں مانتے تھے، بلکہ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ روایت وحدیث کے معاملہ میں وہ ضعیف اور کمتر تھے (۲) یہ خیال خواہ تمام تر غلط یا سراسر غلط فہمی پر مبنی ہو لیکن واقعہ یہی ہے، ان کے مقابلہ میں وہ ائمہ ثلاثہ خصوصاً امام مالک اور امام احمد کو حدیث میں نہایت بلند پایہ اور عالی مرتبہ سمجھتے تھے، اسی لیے محدثین ائمہ ثلاثہ سے امام اعظم کے مقابلہ میں زیادہ قریب بھی ہیں اور ان کے زیادہ ہم نوا بھی اور وہ ان ائمہ کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اس عظمت کے ساتھ امام ابوحنیفہؒ کا نہیں کرتے لیکن محض اس بنا پر محدثین کی پوری جماعت کو امام اعظم کا مخالف و معاند اور ان ائمہ کا بیجا ہمنوا اور حمایتی نہیں قرار دیا جا سکتا، اس لیے حاکم کا بھی ان ائمہ کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا اس عظمت شان کے ساتھ ذکر نہ کرنا جس عظمت شان کے ساتھ کرنا چاہیے، درحقیقت شافعیت میں غلو اور تعصب کا نتیجہ نہیں ہے۔

۲- حاکم عام محدثین کے برخلاف امام ابوحنیفہؒ کو صرف فقہ و اجتہاد ہی میں امام اور بلند پایہ نہیں سمجھتے تھے بلکہ حدیث و روایت میں بھی ان کی اہمیت کے قائل تھے چنانچہ یہاں بھی سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے امام مالک اور امام شافعی کی طرح ان

---

(۱) المدخل ص ۵۔ (۲) اس کے متعلق مفصل بحث کے لیے راقم کا مضمون ''کیا امام دارقطنی امام ابوحنیفہ سے تعصب رکھتے تھے'' مطبوعہ معارف ستمبر ۶۹ء ملاحظہ کیجئے۔

کا اور صاحبین کا بھی ذکر ائمہ محدثین ہی کی حیثیت سے کیا ہے، جیسا کہ ابتداءً "فمن الائمة الماضين" اور صاحبین کا نام لینے کے بعد وکذالك من بعد هما من ائمة المسلمين" سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو ان بزرگوں کی امامت فن اور معرفتِ حدیث سے انکار نہیں تھا لیکن امام شافعی اور امام مالک کے ساتھ انھوں نے جو توصیف و تکریم کا انداز اختیار کیا ہے اس کا غالباً سبب یہ ہے کہ ان کو بالاتفاق محدثین کی جماعت بھی حدیث و روایت میں امام سمجھتی تھی لیکن امام ابوحنیفہ کا معاملہ اس سے کچھ مختلف ہے۔

حاکم کے نزدیک حدیث میں امام ابوحنیفہ کی اہمیت اور درجہ کا اندازہ خود مولانا عبدالرشید نعمانی صاحب کی اس تحریر سے بھی ہوتا ہے:

> "حاکم اپنے مستدرک میں امام ابوحنیفہ سے استشہاد بھی کرتے ہیں اور ان کو ائمہ اسلام میں بھی شمار کرتے ہیں، انھوں نے ان کا اپنی کتاب معرفۃ علوم الحدیث کی انچاسویں نوع میں ان مشہور ثقہ ائمہ تابعین و تبع تابعین میں ذکر کیا ہے جن کی حدیثیں حفظ و مذاکرہ اور تبرک کے لیے لکھی جاتی ہیں اور جن کا مشرق و مغرب میں شہرہ ہے۔"(۱)

۳- حاکم شافعی المذہب تھے، اس لیے ظاہر ہے کہ ان کو غلو، جیسا کہ مولانا نے بھی لکھا ہے، اسی مذہب میں ہوگا لیکن یہ بھی قابل غور ہے کہ انھوں نے امام مالک کا جس عظمت شان کے ساتھ ذکر کیا ہے، اس عظمت شان کے ساتھ امام شافعی کا ذکر نہیں کیا ہے، ایسی صورت میں ان پر اگر کوئی الزام عائد ہو سکتا ہے تو وہ مالکیت میں غلو کا نہ کہ شافعیت میں، حقیقت یہ ہے کہ حدیث و روایت میں امام مالک کا درجہ امام شافعی سے بڑھ کر تھا، اس لیے حاکم نے اپنے امام مذہب کے مقابلہ میں ان کا اگر زیادہ عظمتِ شان کے ساتھ ذکر کیا ہے تو یہ دراصل ان کے تعصب کا نہیں بلکہ انصاف پسندی کا نتیجہ ہے۔

---

(۱) ماتمس اليه الحاجة لمن يطالع سنن ابن ماجہ ص ۳۲۔

۴۔ اس عبارت میں جس طرح انھوں نے امام اعظم اور صاحبین کے ناموں کے ساتھ امام وغیرہ کا لفظ نہیں لکھا ہے، اسی طرح کتاب کے دوسرے مقامات ومباحث میں حدیث وروایت کے کئی اساطین واکابر جیسے امام احمد، امام بخاری اور امام مسلم وغیرہ کا صرف سادہ نام دیدیا ہے اور عموماً عربی مصنفین کا یہی قاعدہ بھی ہے۔

ان تمام باتوں کے باوجود یہ صحیح ہے کہ حاکم کو امام مالک اور امام شافعی کی طرح امام اعظم اور صاحبین کا بھی اسی تعریف وتکریم کے ساتھ ذکر کرنا چاہیے تھا ممکن ہے انھوں نے ایسا کیا ہو مگر بعد میں جب حق پسندی کی جگہ عصبیت نے لے لی ہو تو ناقلین نے اسے حذف کردیا ہو۔

رہا دوسرا جز تو واقعہ کے اعتبار سے وہ بھی صحیح ہے، حاکم نے ابوعصمہ کے متعلق المدخل میں یہ ضرور لکھا ہے کہ:

> ''بعض لوگوں نے ثواب کے خیال سے بھی حدیثیں وضع کیں، ان لوگوں نے خود ہی بیان کیا ہے کہ انھوں نے لوگوں کو فضائل اعمال کی دعوت وتلقین کرنے کے لیے ایسا کیا جیسے ابوعصمہ نوح بن ابی مریم مروزی، محمد بن عکاشہ کرمانی، احمد بن عبداللہ جوباری، محمد بن قاسم طائکانی اور مامون بن عبداللہ ہروی وغیرہ۔ میں نے محمد بن یونس مقری سے، انھوں نے جعفر بن احمد بن نصر سے اور انھوں نے ابوعمارہ مروزی سے یہ کہتے ہوئے سنا کہ ابوعصمہ سے کہا گیا کہ آپ کو عکرمہ کی وہ حدیث کیسے ملی ہے، جس کو انھوں نے عباسؓ سے قرآن کے فضائل کے سلسلہ میں روایت کیا ہے، تو انھوں نے کہا کہ میں نے لوگوں کو قرآن سے بے نیاز اور روگرداں ہو کر امام ابوحنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کے مغازی میں مشغول پایا تو ثواب کے خیال سے یہ حدیث وضع کرلی۔''(۱)

(۱) المدخل ص ۱۹، ۲۰، شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ نوح کا یہ بیان نقل (بقیہ اگلے صفحہ پر)

مگر ابوعصمہ کے متعلق حاکم کی یہ منفرد رائے نہیں ہے، کم وبیش تمام ائمہ جرح وتعدیل نے ان کو غیر ضابط، منکر الحدیث اور وضاع وکذاب تک کہا ہے، ان کے بارے میں سب سے نرم رائے ابن عدی کی ہے، مگر وہ کہتے ہیں ہم نے ان سے جو روایتیں کی ہیں وہ سب عموماً ایسی ہیں جن میں ان کی متابعت نہیں کی گئی ہے لیکن ان کے ضعف کے باوجود ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی اور سب سے سخت رائے ابن مبارک کی ہے وہ ان پر نکیر کرتے، ان کی حدیثوں کو ناپسند کرتے اور انھیں وضعی اور جعلی قرار دیتے تھے، ایک بار وکیع سے انھوں نے فرمایا کہ ہمارے یہاں ایک شیخ ہیں، ان کا نام ابوعصمہ ہے، یہ اسی طرح حدیثیں وضع کرتے ہیں جس طرح معلیٰ بن ہلال کرتے تھے۔

ابوعصمہ کے متعلق ذیل میں متعدد نقادانِ فن کے اقوال اور جرحیں درج کی جاتی ہیں:

امام احمد: وہ حدیث میں بلند پایہ نہ تھے، بلکہ منکر حدیثیں بیان کرتے تھے۔

یحییٰ ابن معین: نہ حدیث میں ان کی کوئی اہمیت ہے اور نہ ان کی حدیثیں لکھی جائیں گی۔

وکیع: ان کا کیا اعتبار؟ ابن مبارک ان سے روایت نہیں کرتے۔

امام بخاری: ان کی حدیثیں غیر صحیح اور وہ منکر الحدیث وذاہب الحدیث ہیں۔

ابوحاتم: دولابی، امام مسلم اور امام دارقطنی: متروک الحدیث۔

ابوزرعہ: ضعیف الحدیث۔

امام نسائی: ابوعصمہ غیر ثقہ وغیر مامون اور ساقط الحدیث ہیں، ان سے حدیث نہیں لکھی جائے گی۔

(گزشتہ صفحہ کا بقیہ) کرنے کے بعد لکھتے ہیں "وایں عذر اوبدتر از گناہ است زیرا کہ احادیث صحیحہ کہ در فضائلِ قرآن وارد شدہ برائے ترغیب کافی بودہ" ملاحظہ ہو (عجالہ نافعہ مع فوائد ص ۲۵)

جوزجانی: ساقط الحدیث

ابن حبان: ابوعصمہ سندوں کو الٹ پلٹ دیتے تھے اور ثقہ لوگوں کی جانب منسوب کرکے حدیثیں بیان کرتے تھے، وہ کسی حال میں بھی اعتبار واحتجاج کے لائق نہیں، ان کا لقب اگرچہ جامع تھا، مگر وہ صدق کے سوا ہر چیز کے جامع رہے ہوں گے۔

ابن عیینہ وابوعلی نیشاپوری: وہ کذاب تھے۔

خلیلی: ان کے ضعف پر محدثین کا اجماع ہے۔

ساجی: متروک الحدیث ہیں، ان کے پاس باطل حدیثیں ہوتھیں۔

ابوسعید النقاش: انھوں نے موضوعات کی روایت کی ہے۔

حافظ ذہبی وابن عماد: متروک الحدیث، ذہبی نے ان کی بعض ضعیف اور واہی حدیثوں کی مثالیں بھی دی ہیں۔

حافظ ابن حجر: لوگوں نے حدیث میں ان کو کاذب قرار دیا ہے، انھوں نے زہری اور ابن منکدر کو ضرور پایا تھا، مگر ان سے حدیثیں بیان کرنے میں تدلیس سے کام لیتے تھے، ابن مبارک نے ان کی ایک طویل حدیث کو بے اصل قرار دیا ہے، واقعتہ اس میں وضع کے آثار وعلامات بالکل ظاہر وواضح ہیں، ابوجعفر طبری نے اپنی تاریخ کی ابتدا میں بدء الخلق کے سلسلہ میں اس کا ذکر کیا ہے اور اس کی عدم صحت کی جانب اشارہ بھی کیا ہے۔

علامہ ذہبی اور حافظ ابن حجر نے حاکم کا مذکورہ بالا بیان بلانقد وتبصرہ نقل کیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک حاکم کا بیان قابل اعتراض نہیں ہے۔ (۱)

ائمہ جرح وتعدیل کے ان متفقہ آرا واقوال کے بعد یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ

---

(۱) ائمہ جرح وتعدیل کے ان بیانات کے لیے میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۴۵ تہذیب التہذیب ج ۱۰ ص ۴۸۷ تا ۴۸۹ تقریب التہذیب ص ۲۶۴، خلاصہ تذہیب ص ۴۰۵ العبر ج ۱ ص ۲۶۴ تاریخ الصغیر امام بخاری اور کتاب الضعفاء والمتروکین امام نسائی ملاحظہ ہو۔

امام حاکم نے بربنائے تعصب نوح کو واضع حدیث قرار دیا ہے، اگر ان کی روایت مجہول شخص کے واسطہ سے بھی ہو تو ان آرا کی موجودگی میں اس کے صحیح ہونے میں کیا شبہہ ہوسکتا ہے، آخر ابن حجر اور ذہبی نے بھی تو حاکم کے بیان پر کوئی ردوکد نہیں کیا ہے اسی طرح مولانا عبدالحلیم چشتی نے جو اس دور کے مشہور فاضل اور اچھے اہل قلم ہیں، ابوعصمہ نوح بن ابی مریم کے ضعیف و متروک ہونے کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

> ابوعصمہ نوح نے امام زہری، ثابت بنانی، یحییٰ بن سعید انصاری اور ابن ابی لیلیٰ وغیرہم سے حدیث پڑھی اور ان سے شعبہ اور عبداللہ بن مبارک رحمہما اللہ راوی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک یہ ثقہ تھے لیکن اور محدثین کی نظر میں متروک ہیں ان پر زہد کا بڑا اغلبہ تھا.......... حافظ ذہبی کتاب العبر میں لکھتے ہیں......... وھو متروك الحديث .... (فوائد جامعہ برعجالہ نافعہ ص ۵۲۴ و ۵۲۵)

مولانا عبدالرشید صاحب نے اپنے خیال کی تائید و توثیق میں اسماعیل بن ابوالفضل قومسی کا ایک بیان بھی نقل کیا ہے جس کا صرف حافظ ابن جوزی جیسے متشدد شخص نے المنتظم میں خطیب بغدادی کے تذکرہ میں ذکر کیا ہے لیکن ان تمام سوانح نگاروں کے اقوال کے مقابلہ میں اس شاذ اور منفرد قول کی اہمیت ہوسکتی ہے؟ جنھوں نے حاکم کے مفصل ترجمے لکھے اور ان پر عائد کیے جانے والے الزامات گنائے، مگر اس الزام کا ذکر تک نہیں کیا، مولانا کو چاہیے تھا کہ وہ دیگر ائمہ اور ناقلین خصوصاً حاکم کے اساتذہ، تلامذہ اور معاصرین وغیرہ کے اقوال سے ثبوت اور سندیں پیش کرتے یا پھر احکام و مسائل میں حاکم کے غلو و تعصب کی مثالیں بیان کرتے تو ممکن ہے، ''ظاہر بینوں'' کو بھی حاکم کے تعصب کا یقین ہوجاتا۔

مستدرک کے بعض مقامات میں حاکم نے ضرور شافعی مذہب کی تائید و حمایت کی

ہے لیکن اس کا غلو و تعصب سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا، بلکہ اسی طرح کے بعض مواقع پر انھوں نے امام شافعیؒ کے بجائے بعض دوسرے ائمہ جیسے ابن خزیمہ وغیرہ سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے ظاہر ہے کسی کے اپنے فقہی مسلک کی ترجیح اور اپنے امام مذہب کی تائید کو اس کے غلو و تعصب پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔

امام ابوالقاسم تمّام رازی

(متوفی ۴۱۴ھ)

نام ونسب: تمام نام، ابوالقاسم کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: تمام بن محمد بن عبداللہ بن جعفر بن عبداللہ بن جنید۔(۱)

ولادت، خاندان اور وطن: امام ابوالقاسم تمام کا اصل آبائی وطن رے تھا لیکن اسلامی عہد میں ان کا خاندان دمشق میں آباد ہوگیا تھا، یہیں وہ ۳۳۰ھ میں پیدا ہوئے، اسی لیے رازی اور دمشقی کہلاتے ہیں، بجلی کی نسبت سے بھی مشہور ہیں، کیوں کہ ان کے خاندان کا عرب کے مشہور قبیلہ بجیلہ سے ولا کا تعلق تھا، ان کے والد بزرگوار ابوالحسین محمد بھی بلند پایہ محدث تھے۔(۲)

اساتذہ: اپنے والد ماجد کے علاوہ جن محدثین سے ان کو شرف تلمذ حاصل ہے، ان کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن احمد بن حزام، ابوعلی احمد بن محمد بن فضالہ، ابومیمون بن راشد، ابویعقوب اذرعی، ابوعلی حسن بن حبیب حصائری،(۳) خثیمہ بن سلیمان طرابلسی، محمد بن حمید جوار بی وغیرہ۔

ابوعمرو بن العلاء،(۴) علی غلام سباک سے فن قرأت کی تحصیل کی تھی۔

---

(۱) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۴۲ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۳۵۸ (۳) شاہ عبدالعزیز صاحب نے حسن بن حلت حضائری لکھا ہے (بستان ص ۹۲) (۴) حافظ ذہبی نے ان کا نام علی احمد بن عثمان علام لکھا ہے۔

تلامذہ: ان کے تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن (۱) میدانی، ابوعلی اہوازی، احمد بن عبدالرحمٰن طرائفی، احمد بن محمد عتیقی، حسن بن علی الباد، عبدالعزیز بن احمد کتانی اور عبدالوہاب کلابی وغیرہ۔ (۲)

حفظ وضبط: وہ حفظِ حدیث میں بے نظیر تھے، ابوبکر حداد کا بیان ہے کہ حفظ وروایت میں ہم نے ان سے زیادہ جامع اور باکمال شخص نہیں دیکھا، عبدالعزیز کتانی فرماتے ہیں کہ اہلِ شام کی روایتوں کے یہ سب سے بڑے اور اچھے حافظ وضابط تھے۔

ثقاہت: ان کی عدالت وثقاہت بھی مسلم ہے، کتانی نے اس کا اعتراف کیا ہے، حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ وہ ثقہ ومامون تھے۔

علل واسماء الرجال میں مہارت: علل اور رجال حدیث کے ماہر تھے، اہوازی کا بیان ہے کہ تمام فن حدیث میں متبحر، علل سے واقف اور رجال کی معرفت میں بڑا درخور رکھتے تھے، میں نے ایسا ماہر فن نہیں دیکھا۔ (۳)

حدیث میں درجہ: ان تصریحات سے حدیث میں ان کی اہمیت وعظمت کا اندازہ ہوتا ہے، علمائے فن نے ان کو عارف وعالم بالحدیث اور محدث الشام وغیرہ کہا ہے۔

وفات: چوراسی سال کی عمر میں ۳ رمحرم الحرام ۴۱۴ھ کو انتقال کیا۔ (۴)

تصنیفات: ان کی صرف ایک ہی کتاب فوائد کا نام معلوم ہوسکا ہے، یہ تیس جزوں پر مشتمل تھی۔ (۵)

---

(۱) ذہبی نے ابوالحسن کے بجائے ابوالحسین لکھا ہے (تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۸) (۲) تاریخ ابن عساکر ج ۳ ص ۳۴۲ وتذکرہ ج ۳ ص ۲۵۸ وبستان المحدثین ص ۹۲ (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) الرسالۃ المستطرفہ ص ۷۹۔

☆☆☆

امام ابوبکر بن مردویہ الکبیر اصبہانی

(م ۴۱۶ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن موسیٰ بن مردویہ بن فورک۔(۱)

اپنے دادا مردویہ کے نام پر ابن مردویہ کے لقب سے معروف ہیں، الکبیر بھی ان کے نام کا جز ہے، کیوں کہ ان کے پوتے ابوبکر احمد بن محمد بھی ابن مردویہ کے لقب سے مشہور ہیں اور ان کو ابن مردویہ الصغیر کہا جاتا ہے، ابن مردویہ صغیر کی اپنے دادا ابن مردویہ کبیر سے ملاقات نہیں ہوئی تھی، ان کا انتقال ۴۹۸ھ میں ہوا۔

ولادت ووطن: ۳۲۳ھ میں اصبہان میں پیدا ہوئے۔(۲)

اساتذہ: بعض اساتذہ وشیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوسہل بن زیاد القطان، احمد بن عبداللہ بن دلیل، احمد بن عیسیٰ خفاف، احمد بن محمد بن عاصم کرمانی، اسحاق بن محمد بن علی کوفی، اسماعیل خطبی، محمد بن احمد بن علی اسواری، محمد عبداللہ بن علم الصفار، محمد بن علی بن دحیم شیبانی اور میمون بن اسحاق خراسانی۔

تلامذہ: ابن مردویہ کبیر کے ممتاز شاگردوں کے نام حسب ذیل ہیں۔

ابوعبداللہ ثقفی، ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن مندہ، عبدالوہاب بن مندہ، ابوالخیر محمد بن احمد ردا، ابوبکر محمد بن حسن، ابومنصور محمد بن سکرویہ، ابومطیع محمد بن عبدالواحد مصری۔(۳)

---

(۱) المنتظم ج ۷ ص ۲۹۴ والبدایہ ج ۱۲ ص ۸ (۲) تذکرہ ج ۳ ص ۲۵۳ (۳) ایضاً۔

سفر: حدیث کی تحصیل اور علوم وفنون کی تکمیل کے لیے ان کے عراق وغیرہ تشریف لے جانے کا ذکر ملتا ہے۔

حدیث میں درجہ: حدیث میں بلند مرتبت تھے، علامہ ذہبی کا بیان ہے کہ وہ اس فن کے ممتاز ماہر اور رجال کی اچھی پرکھ رکھتے تھے، ابن عماد کا بیان ہے کہ وہ حدیث میں ماہر اور اس کے واقف کار تھے، ان کا حفظ واتقان اور ضبط وثقاہت بھی مسلم ہے، حافظ ذہبی نے الحافظ الثبت لکھا ہے۔(۱)

وفات: مشہور روایت کے مطابق ۲۴ رمضان ۴۱۶ھ کو انتقال ہوا (۲) لیکن ابن اثیر، ابن جوزی اور ابن کثیر نے ۴۱۰ھ سنہ وفات تحریر کیا ہے۔(۳)

تصنیفات: ابن مردویہ کی حسب ذیل تصنیفات کا علم ہوسکا ہے۔

۱۔ المستخرج علی جامع الصحیح البخاری۔ ۲۔ تفسیر ابن مردویہ۔ ۳۔ تاریخ اصبہان۔(۴)

☆☆☆

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۵۳ وشذرات الذہب ج ۳ ص ۱۹۰ (۲) تذکرہ وبستان المحدثین (۳) تاریخ ابن اثیر ج ۹ ص ۱۰۸، المنتظم ج ۷ ص ۲۹۴، البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۸ (۴) مولانا عبدالحلیم چشتی نے غلطی سے ان کی ایک تصنیف الجامع المختصر فی الطب کا ذکر کیا ہے، فوائد جامعہ ص ۸۴ حالانکہ یہ احمد بن عبدالرحمٰن مندویہ اصبہانی کی تصنیف ہے، دیکھیے کشف الظنون ج ۱ ص ۳۸۵۔

امام ابوبکر احمد بن محمد برقانی خوارزمی

(متوفی ۴۲۵ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابوبکر کنیت اور نسب نامہ یہ ہے: احمد بن محمد بن احمد بن غالب۔

ولادت ووطن: امام ابوبکر برقانی ۳۳۶ھ میں خوارزم کے نواح کے ایک گاؤں برقان میں پیدا ہوئے، اسی لیے برقانی اور خوارزمی کی نسبتوں سے مشہور ہیں، برقان دریائے جیحون کے مشرقی ساحل پر ایک زرخیز اور شاداب مقام تھا پھر ویران ہوگیا(۱) اور امام برقانی نے دریائے بغداد میں سکونت اختیار کرلی اور اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔

اساتذہ: ان کے شیوخ کی تعداد بے شمار ہے، بعض کے نام یہ ہیں:

ابن نحاس مصری، ابواحمد الحافظ، ابوبحر بن کوثر البربھاری، ابوبکر احمد بن ابراہیم اسماعیلی، احمد بن ابراہیم بن حباب، احمد بن جعفر بن سلمہ، ابوالعباس احمد بن محمد بن حمدان نیشاپوری، ابوبکر ابن ابی الحدید، ابوبکر بن مالک قطیعی، ابومحمد بن ماسی، ابومنصور ازہری، ابوسہیل بشر بن احمد، ابومحمد عبدالغنی ابن سعید ازدی مصری، عبداللہ بن احمد بن صدیق، عبداللہ بن عمر بن علک، ابوالحسن علی بن عمر دارقطنی، ابوعلی محمد بن احمد بن حسین بن صواف، ابوعمرو محمد بن احمد بن حمدان، محمد بن جعفر بن ہثیم بندار، ابوالفضل محمد بن عبداللہ بن خمیرویہ، محمد بن علی حسانی، ابوصخر محمد بن مالک، السعدی، ابوحاتم محمد بن یعقوب۔ (۲)

تلامذہ: ان کے تلامذہ میں ابواسحاق شیرازی، امام بیہقی اور خطیب جیسے مشاہیر شامل ہیں،

(۱) کتاب الانساب ورق ۷۵ ومعجم البلدان ج ۲ ص ۱۳۱ (۲) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۳ و ۳۷۴، کتاب الانساب ورق ۷۵ وتذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۷۴ والطبقات الکبری ج ۲ ص ۱۹۔

چند اور شاگردوں کے نام یہ ہیں:

ابوطاہر احمد بن حسن کرجی، ابوعبداللہ صوری، ابوالفضل بن خیرون، ابوالقاسم بن ابوالعلاء ابوالمعالی ثابت بن بندار مقری، ابومسعود سلیمان بن ابراہیم الحافظ، ابویعلی محمد بن احمد العبدی البصری، ابوالفضل محمد بن عبدالسلام شافعی انصاری۔ (۱)

رحلت وسماع حدیث کی ابتدا: ۳۵۰ھ کے بعد انھوں نے حدیث کے سماع کی ابتدا کی اور اس کے بعد بغداد، جرجان، ہرات، دمشق، مصر، اسفرائن، مرو اور نیشاپور وغیرہ تشریف لے گئے اور ان مقامات کے اکابر شیوخ سے کسب فیض کیا، علم وفن کے اس قدر شوقین تھے کہ اس کے لیے ہر قسم کی صعوبت اور مشقت برداشت کرتے تھے، اسفرائن میں صرف ایک درہم ان کے پاس تھا، اسی پر پورا مہینہ گذار دیا، اور تیس جز کے بقدر حدیثیں لکھیں۔ (۲)

حفظ وثقاہت: امام برقانی احادیث کے حافظ اور نہایت عادل وضابط شخص تھے، خطیب کا بیان ہے کہ وہ ثقہ، متورع، متقن، متثبت اور ذی فہم تھے، ہمارے شیوخ میں ان سے زیادہ ثقہ وثابت شخص کوئی نہیں تھا، میں نے ازہری سے دریافت کیا کہ کیا آپ نے برقانی سے بڑھ کر متقن کسی شخص کو دیکھا ہے، انھوں نے جواب دیا نہیں، ابوالولید باجی فرماتے ہیں کہ وہ ثقہ حافظ تھے، ذہبی، ابن عساکر، ابن سبکی، اسنوی اور ابن عماد وغیرہ۔ نے ان کو الحافظ الکبیر اور الحافظ الامام وغیرہ لکھا ہے۔ (۳)

فن حدیث میں امتیاز اور اس سے غیر معمولی اشتغال: امام برقانی۔ نے اس فن کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا تھا، ان کا خود بیان ہے کہ مجھ کو اس فن سے اس قدر غیر معمولی لگاؤ ہو گیا تھا کہ اور چیزوں کی طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا، اسی لیے ان کا کتب خانہ حدیث کے کتابوں کا دفتر بن گیا تھا اور ان کو بیشمار حدیثیں بھی ازبر تھیں، خطیب کا بیان ہے کہ وہ کثیر الحدیث تھے، اس سے اس فن میں ان کی عظمت اور بلند پائیگی کا اندازہ ہوتا ہے، تمام مورخین نے حدیث میں ان کی فہم وبصیرت، ژرف نگاہی اور علم ونظر کی وسعت کا اعتراف

(۱) تذکرہ ج ۳ ص ۲۷۴ وانساب سمعانی ورق ۷۵ (۲) ایضاً والعبر ج ۳ ص ۱۵۶ (۳) حوالہ سابقہ۔

کیا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ برقانی حدیث کی اچھی فہم وبصیرت رکھتے تھے، ابن عساکر اور سمعانی کا بیان ہے کہ وہ حدیث کی فہم ومعرفت میں ممتاز تھے، ابواسحاق شیرازی فرماتے ہیں کہ جب وہ اس فن کی جانب متوجہ ہوئے تو اس کے امام بن گئے، ذہبی نے ان کو شیخ بغداد اور شیخ المحدثین کا لقب دیا ہے، ازہری کا بیان ہے کہ برقانی امام حدیث ہیں اور ان کی وفات کے بعد اس فن کی عظمت شان باقی نہیں رہے گی۔(۱)

تفسیر وقرآنیات: قرآن مجید کے حافظ اور علوم قرآنی کے واقف کار تھے۔(۲)

فقہ: فقہ کے ماہر اور ممتاز فقیہ تھے، حدیث سے پہلے اس فن کی تحصیل شروع کی تھی اور اس موضوع پر بعض کتابیں بھی لکھیں، خطیب نے عارف بالفقہ، ابن کثیر نے عالم بالفقہ اور ذہبی نے شیخ الفقہا لکھا ہے، ابوبکر اسمعیلی اپنے پاس آنے والے طلبہ کے سامنے ایک ورق خود پڑھنے کے بعد ان سے پڑھواتے تھے لیکن برقانی کے سامنے دو ورق پڑھتے اور فرماتے کہ تم لوگوں پر ان کو اس لیے ترجیح دیتا ہوں کہ یہ فقیہ بھی ہیں، فقہ واجتہاد میں امام شافعی کے مذہب سے وابستہ تھے۔(۳)

نحو وعربیت: وہ عربی ادب اور علم نحو میں اچھی دسترس رکھتے تھے۔(۴)

شعر وسخن: شعر وسخن کا ذوق تھا اور کبھی کبھی اشعار کہتے تھے، خطیب نے ان کے آٹھ اشعار نقل کیے ہیں، (۵) ان کے شعروں سے بھی حدیث سے ان کی مناسبت کا پتہ چلتا ہے۔

ورع وتقویٰ: ان گوناگوں علمی کمالات کے ساتھ ہی وہ نہایت متدین اور بڑے عبادت گذار بھی تھے، خطیب کا بیان ہے کہ وہ صاحب ورع وتقویٰ تھے، میں نے محمد بن یحییٰ کرمانی فقیہ سے سنا ہے کہ محدثین کی جماعت میں برقانی سے زیادہ عبادت کرنے والا نہیں

---

(۱) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۳۶ (۲) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۴ و ۳۷۵ وتاریخ ابن عساکر ج ۱ ص ۶۰۳ تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۷۴ و ۲۷۵ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۱۹ (۳) ایضاً (۴) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۵، ۳۷۶ (۵) ایضاً۔

دیکھا، ابن سبکی فرماتے ہیں کہ وہ مجموعہ فضائل اور عابد شخص تھے۔(۱)

وفات: یکم رجب ۴۲۵ھ کو بدھ کے دن انتقال ہوا اور پنجشنبہ کو تدفین ہوئی، ابوعلی بن ابی موسیٰ ہاشمی نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور بغداد کے مقبرہ جامع میں باب سکہ خرقی کے قریب دفن کیے گئے۔

محمد بن علی صوری کا بیان ہے کہ میں برقانی کی وفات سے چار روز پہلے ان کی عیادت کے لیے گیا تو انھوں نے کہا آج ۲۶ رجمادی الاخریٰ ہے، میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ رجب کا چاند ہونے کے بعد میرا خاتمہ ہو، کیوں کہ ایک روایت میں ہے کہ (ان اللّٰہ عتقاء من النار) ممکن ہے اللہ کی رحمت سے میں بھی اس زمرہ میں شامل ہو جاؤں، یہ بات انھوں نے سنیچر کو کہی تھی اور اللہ کی شان دیکھئے کہ بدھ کو رجب کا چاند ہونے کے بعد ان کا انتقال ہوا۔(۲)

تصنیفات: برقانی نے علم حدیث میں کئی مفید کتابیں لکھیں، تذکرہ نگاروں نے ان کو کثیر التصانیف بتایا ہے اور لکھا ہے کہ وفات کے وقت تک وہ تصنیف وتالیف اور علمی اشغال میں منہمک رہے، ان کی تصنیفات میں مسند مشہور ہے جو مسند خوارزمی کہلاتی ہے، مسند خوارزمی دراصل صحیحین کی حدیثوں پر مشتمل اور مستخرج ہے،(۳) حمیدی نے اپنی الجمع بین الصحیحین کے نقل میں اس کی حدیثوں پر اعتماد کیا ہے، اس کا ایک قلمی نسخہ ۱۱۷۸ھ کا لکھا ہوا دارالعلوم اسلامیہ پشاور کے اور ایک یحییٰ بن ناصر کے ہاتھ کا لکھا ہوا جرمنی کے کتب خانہ میں ہے۔(۴)

مسند کے علاوہ انھوں نے امام ثوری، شعبہ، ایوب، سعید، عبداللہ بن عمر، عبدالملک بن عمیر، بیان بن بشر اور مطر الوراق کی حدیثوں کے جمع وتالیف کا کام انجام دیا۔(۵)

---

(۱) تاریخ بغداد ج ۴ ص ۳۷۵ (۲) ایضاً ۳۷۶ و ۳۷۵ (۳) ایضاً والرسالۃ المستطرفۃ ص ۲۷ (۴) لباب المعارف فہرست دار العلوم پشاور ص ۵۲ ومقدمہ تحفۃ الاحوذی ص ۱۶۵ (۵) تاریخ بغداد وتاریخ ابن عساکر وتذکرہ ذہبی۔

امام ابونعیم اصفہانی

(متوفی ۴۳۰ھ)

نام ونسب: احمد نام، ابونعیم کنیت اور نسب نامہ یہ ہے، احمد بن عبداللہ بن احمد بن اسحاق بن موسیٰ بن وائل بن مہران۔

ولادت: رجب ۳۳۶ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے، ایک روایت ۳۳۴ھ کی بھی ہے۔

خاندان: گوعجم نژاد تھے تاہم ان کے خاندان کو خانوادہ نبوت سے ولاء کا شرف حاصل ہے، ان کے جد اعلیٰ مہران کو اس خاندان میں سب سے پہلے مسلمان ہونے کا فخر حاصل ہوا، یہ عبداللہ ابن معاویہ بن عبداللہ بن جعفر بن ابوطالب کے مولیٰ تھے، ابونعیم کے والد عبداللہ علم وفن کے بڑے دلدادہ تھے، انھوں نے اپنے فرزند کو نہایت کم سنی ہی میں تحصیل علم اور سماع حدیث کے مقدس اور بابرکت مشغلہ میں لگا دیا تھا، چنانچہ ۳۴۴ھ میں ابونعیم نے جب کہ سات یا آٹھ ہی سال کے تھے، احادیث کا باقاعدہ سماع شروع کر دیا تھا، ان کے نانا محمد بن یوسف بناء مشہور زاہد اور ممتاز صوفی تھے۔(۱)

اساتذہ: ابونعیم کے اساتذہ اور تلامذہ دونوں کی فہرست بڑی طویل ہے، ارباب سیر کا بیان ہے کہ انھوں نے بیشمار فضلا سے اور بے شمار فضلا نے ان سے استفادہ کیا تھا، حافظ ذہبی ان کے چند شیوخ کا نام گنانے کے بعد لکھتے ہیں:

وخلائق بخراسان والعراق	(ان کے علاوہ) انھوں نے خراسان
فاكثر وتهياء له من لقى	وعراق کے بے شمار لوگوں سے کسب

(۱) تاریخ ابن خلکان ج ا ص ۴۵ و تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷ و ۸۔

الکبار مالم یقع حافظ.(۱)

فیض کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ ان کو جس قدر اکابر شیوخ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس سے اور محدثین محروم ہیں۔

ابونعیم کو یہ خصوصیت بھی حاصل تھی کہ چھ سال کی عمر ہی میں بعض مشہور و معتبر محدثین نے تبرکاً ان کو اجازتِ حدیث مرحمت کر دی تھی۔ (۲) حافظ ذہبی اور علامہ ابن سبکی نے لکھا ہے کہ شام کے خیثمہ بن سلیمان بغداد کے جعفر خالدی اور ابوسہل بن زیاد، واسط کے عبداللہ بن عمر بن شوذب اور نیشاپور کے ابوالعباس اصم نے ان کو اجازت عطا کی تھی۔ (۳)

ان حضرات کے علاوہ ابونعیم نے مندرجہ ذیل شیوخ سے بھی روایت کی ہے۔

ابراہیم بن عبداللہ ابوالعریم کوفی، ابواحمد محمد بن احمد بن عسال، ابوبحر بن کوثی، ابوبکر آجری، ابوبکر جعانی، ابوبکر بن خلاد نصیبی، ابوبکر بن ہیثم بندار، ابوشیخ بن حیان، ابوعلی بن صواف، ابوالقاسم طبرانی، ابومحمد بن فارس، احمد بن بندار عشار، احمد بن حسن مکی، احمد بن محمد قصار، احمد بن معبد سمسار، حبیب قزاز، عبداللہ بن جعفر جابری، عبداللہ بن حسن بن بندار فاروق بن عبدالکبیر خطابی۔ (۴)

تلامذہ: معاصرین واقران کے علاوہ ان کے تلامذہ کی فہرست میں بے شمار ایسے لوگ بھی تھے جو سن وسال میں ان سے بڑے اور مدتوں پہلے فوت ہو چکے تھے، ابوعبدالرحمٰن سلمی نے جو اکابر صوفیہ میں اور ابونعیم سے معمر تھے، طبقات الصوفیہ میں ایک شخص کے واسطہ سے ان سے روایت کی ہے چند تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر خطیب (یہ نہایت مخصوص تلامذہ میں تھے) ابوبکر بن علی ذکوانی، ابوسعید مالینی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲ (۲) بستان المحدثین ص ۴۳ (۳) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷ (۴) ایضاً۔

ابوصالح موذن، ابوعلی المقری، ابوعلی وحشی، ابوالفضل احمد الحداد، ابوعلی حسن بن احمد حداد، سلیمان بن ابراہیم، قاضی عبدالسلام بن احمد کوشیار بن لیالیروز جیلی، ابوبکر محمد بن ابراہیم عطار، ابومنصور محمد بن عبداللہ شروطی، ابوسعید محمد بن محمد بن مطرز، ہبۃ اللہ بن محمد شیرازی، یوسف بن حسن تفکری۔ (۱)

رحلت وسفر: ان کے شیوخ مختلف اسلامی ملکوں اور شہروں سے تعلق رکھتے تھے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے عراق، حجاز، خراسان، شام، بغداد، واسط، نیشاپور، مکہ، بصرہ اور کوفہ وغیرہ کا سفر کیا ہوگا۔

حفظ وضبط اور ثقاہت: ابونعیم کے حفظ وضبط اور ثقاہت وعدالت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مورخین اور ارباب سیر نے ان کو الحافظ المشہور، الحافظ الکبیر اور من اکابر الحفاظ الثقات وغیرہ لکھا ہے، خطیب کا بیان ہے کہ ابونعیم اور ابوحازم عبدوی ہی کے لیے حفظ کا لفظ مطلقاً بولا جاسکتا ہے، ابن مردویہ فرماتے ہیں کہ اس وقت روئے زمین پر ابونعیم سے بڑا حافظ ومسند کوئی نہیں، وہ حافظ الدنیا ہیں، ابن سبکی تحریر فرماتے ہیں کہ وہ حفظ وضبط میں مرتبہ کمال پر فائز تھے۔ (۲)

ابونعیم صدق وثقاہت میں بھی بلند پایہ تھے، حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ ان کے بارے میں جو کچھ کلام کیا گیا ہے اس کی کوئی دلیل وبنیاد نہیں بلکہ اس کی تمامتر وجہ وہ مخاصمت ہے جو ان کے اور ابن مندہ کے درمیان تھی۔ (۳)

حدیث میں درجہ ومرتبہ: وہ فن حدیث میں بڑا درخور رکھتے تھے، علمائے سیر نے ان کو محدث العصر اور من اعلام المحدثین والرواۃ کے لقب سے موسوم کیا ہے، ابن نجاد کا بیان ہے کہ "وہ محدثین کے سرتاج اور اعلام دین میں تھے" حدیث کی جمع وروایت کی طرح اس کی

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۸ (۲) ایضاً وتاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵ (۳) میزان الاعتدال ج ۱ ص ۵۲۔

معرفت و درایت میں بھی شہرت و امتیاز رکھتے تھے، ابن سبکی کا بیان ہے کہ "وہ ان ممتاز لوگوں میں تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے روایت میں علو کے ساتھ درایت میں بھی حد کمال پر فائز کیا تھا،" حافظ ذہبی لکھتے ہیں "وہ علوئے اسناد، حفظ حدیث اور جملہ فنون حدیث میں تبحر کے لحاظ سے پوری دنیا میں ممتاز تھے۔" ابن عساکر فرماتے ہیں کہ "ابونعیم جمع و معرفتِ حدیث میں یکتا اور فضائل و کمالات کا مجموعہ تھے۔" (۱)

فقہ و تصوف میں بلند پائیگی: حدیث کے علاوہ فقہ و تصوف میں بھی جامع کمال تھے (۲) اور مسلکاً شافعی تھے، تصوف و سلوک سے ان کی دلچسپی خاندانی تھی، ان کے نانا محمد بن یوسف کے متعلق پہلے گذر چکا ہے کہ وہ مشہور اہل اللہ اور اکابر صوفیہ میں تھے، ابونعیم کو بھی اس میں کمال حاصل تھا، اس پر ان کی شہرۂ آفاق کتاب حلیۃ الاولیا شاہد ہے۔

عقیدہ: عقائد میں اشاعرہ کے ہم نوا تھے، حافظ ابن عساکر نے تبیین میں دوسرے طبقہ میں ان کا ذکر کیا ہے، (۳) حافظ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ وہ اشعری مذہب کی جانب شدید میلان رکھتے تھے۔ (۴)

شہرت و مقبولیت اور مجلس درس کی وسعت: ابونعیم کے علمی کمالات اور غیر معمولی فنی شہرت نے ان کی ذات کو مرجع خلائق بنا دیا تھا، اس لیے ان کی مجلس درس بڑی وسیع تھی، لوگ دور دراز کا سفر کر کے ان کے پاس آتے، طلبہ کا جم غفیر ہر وقت استفادہ کے لیے موجود رہتا تھا، ہم عصر لوگوں کے علاوہ وہ لوگ بھی ان سے استفادہ کرنے کے لیے آتے تھے جو عمر میں ان سے بڑے تھے، ابن مردویہ کا بیان ہے کہ وہ ان فضلائے روزگار میں تھے جن کے پاس لوگ قصد و ارادہ سے سفر کر کے آتے اور مستفید ہوتے تھے، شاہ عبدالعزیز صاحب

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۱ و ۲۹۲ و ۲۹۳ وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷ و ۸ وتبیین کذب المفتری ص ۲۴۶ والعبر ج ۳ ص ۱۷۰ (۲) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۷ (۳) تبیین کذب المفتری ص ۲۴۶ (۴) المنتظم ج ۸ ص ۱۰۰۔

لکھتے ہیں کہ جب ان کی مجلس درس آراستہ ہوتی تو ارباب فن اور محدثین عجز و نیاز کے ساتھ ان کے دولت کدہ پر حاضر ہو کر بڑی رغبت اور مکمل انہماک کے ساتھ اکتساب فیض کرتے تھے کیوں کہ ان کے علوے اسناد جودتِ حفظ اور وفورِ علم کا چرچا تھا۔

درس کا سلسلہ صبح سے شروع ہو کر ظہر کے وقت تک جاری رہتا تھا اور مجلس درس ہمیشہ طلبہ و مستفیدین سے معمور رہتی تھی، روزانہ باری باری ایک شخص قرأت کرتا تھا، ظہر کے وقت جب مجلس برخاست ہوتی اور وہ گھر آنے لگتے تو شائقین راستے میں بھی ایک جزء کے بقدر پڑھ لیتے تھے، اس سے ان کو کوئی آزردگی اور ناگواری نہیں ہوتی تھی، کیوں کہ علم حدیث سے ان کا اشتغال اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ بقول حافظ ذہبی۔

لم یکن لہ غداء سوی التسمیع و التصنیف۔ (۱)	حدیثیں سنا اور سنانا اور ان کی جمع و تالیف ہی ان کی غذا تھی۔

ابونعیم کے خلاف شورش و ہیجان: اس زمانہ میں حنابلہ کا زور واثر بہت بڑھ گیا تھا، ان کی سخت گیری اور تشدد کے بعض واقعات بھی تاریخوں میں مذکور ہیں، ان کے اور اشاعرہ کے درمیان سخت کشمکش اور آویزش رہتی تھی، اوپر گذر چکا ہے کہ ابونعیم کا میلان اشعریت کی جانب تھا، اس کے نتیجہ میں ان کے خلاف شورش و ہنگامہ برپا ہوا اور ان کو شدائد و محن سے دوچار ہونا پڑا، محمد بن عبدالجبار فرسانی کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ابوبکر بن ابوعلی معدل کی مجلس درس میں ایک شخص نے کہا کہ ابونعیم کی صحبت میں جانے والوں کو یہاں سے اٹھ جانا چاہیے کیوں کہ وہ اپنے اعتقادات کی وجہ سے ان لوگوں میں غیر مقبول اور مبغوض تھے۔

ابونعیم کے خلاف اس قدر ہیجان برپا ہو گیا تھا کہ اہل صفہان نے ان کا جامع مسجد میں داخلہ تک بند کر دیا تھا، (۲) حنابلہ کی شدت پسندی کے علاوہ اس کا یہ سبب بھی ہو سکتا

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۲ و بستان المحدثین ص ۴۴ (۲) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳، ۲۹۴ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۹۔

ہے کہ ابونعیم کے فضل و کمال اور غیر معمولی شہرت و مقبولیت نے ان کی ذات کو محسود و مبغوض بنادیا ہو۔

وفات: ۹۴ رسال کی عمر میں محرم الحرام ۴۳۰ھ میں انتقال کیا، ابن خلکان نے محرم کے بجائے صفر کا مہینہ لکھا ہے، تاریخ وفات ۱۸، ۲۰ اور بعض نے ۲۱ محرم الحرام لکھی ہے، ظہر کے بعد تجہیز و تکفین ہوئی۔(۱)

تصنیفات: ابونعیم سے بے شمار کتابیں یادگار رہیں، جن کتابوں کے نام معلوم ہوسکے وہ یہ ہیں:

۱- کتاب الاربعین ۲- تثبیت الرؤیا، ۳- جزء فضل سورۃ الاخلاص، ۴- کتاب حرمۃ المساجد، ۵- رسائل مختصرہ، ۶- ریاضۃ المتعلمین یا ریاض المتعلم، ۷- کتاب الریاضۃ والادب، ۸- کتاب صفۃ الجنۃ، ۹- کتاب الطب یا کتاب الطب النبوی، ۱۰- طرق حدیث (ان اللہ تسعا و تسعین اسما)، ۱۱- عمل الیوم واللیلہ (۲)، ۱۲- کتاب الفتن (۳)، ۱۳- کتاب فضائل الخلفاء، ۱۴- کتاب فضائل الصحابہ، ۱۵- فضل السواک، ۱۶- کتاب فضل العالم العفیف، ۱۷- کتاب الفوائد، ۱۸- کتاب مختصر الاستیعاب، ۱۹- کتاب المستخرج علی البخاری، ۲۰- کتاب المعتقد، ۲۱- کتاب معرفۃ الصحابہ، ۲۲- کتاب معجم الشیوخ: ۳ جلدوں پر مشتمل تھی، ۲۳- کتاب معجم الصحابہ: حافظ ابن کثیر کے پاس اس کا ایک نسخہ خود مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔(۴)

۲۴- کتاب علوم الحدیث: حاکم کی اصول حدیث میں مشہور تصنیف کتاب معرفۃ علوم الحدیث پر مستخرج ہے۔

۲۵- کتاب المستخرج علی التوحید: علامہ ابن خزیمہ کی مشہور کتاب التوحید

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۳، ۲۹۴ و طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۹ و تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۵ و المنتظم ج ۸ ص ۱۰۰ (۲) امام نسائی اور ان کے شاگرد ابن سنی کی بھی اس نام کی کتابیں ہیں (۳) کتاب الفتن والملاحم کے نام سے امام ابوعبداللہ نعیم بن حماد خزاعی کی کتاب بہت مشہور ہے (۴) البدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۴۵۔

والصفات پر مستخرج ہے۔

۲۶- کتاب المہدی: اس میں امام مہدی کے اوصاف وخصائص اور ان کے خروج کی حقیقت وغیرہ کا ذکر ہے، حافظ ابن قیم کی بھی اس نام کی ایک کتاب ہے۔(۱)

۲۷- کتاب تاریخ اصبہان: اصبہان کی تاریخ میں کئی کتابیں لکھی گئی ہیں، یہ ان سب میں زیادہ اہم اور مشہور سمجھی جاتی ہے، اس کے قلمی نسخے مکتبہ شیخ الاسلام مدینہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد مکتبہ سندیہ اور کتب خانہ رام پور میں موجود ہیں، رام پور کا مخطوطہ مکتبہ سندیہ کے مخطوطہ سے منقول ہے۔(۲)

یہ غیر مطبوعہ کتابوں کے نام تھے، ذیل میں مطبوعہ کتابوں کا مختصر تعارف اور ان کی خصوصیات درج ہیں۔

۲۸- دلائل النبوۃ: اس کتاب میں وہ تمام واقعات وروایات سنداً بیان کی گئی ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص وکمالات اور فضائل ومکارم نیز دلائلِ نبوت اور معجزات وغیرہ سے متعلق ہیں، پہلے قرآن مجید کی روشنی میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف وخصوصیات بیان کیے گئے ہیں اور تائید میں روایات بھی پیش کی گئی ہیں، پھر آپ کے حسب ونسب کی فضیلت اور قدیم کتابوں اور انبیا کے صحیفوں میں آپ کے بارے میں جو پیشینگوئیاں ہیں ان کو ذکر کیا ہے اور اس کے بعد آپ کی ولادت سے وفات تک کے تمام حیرت انگیز واقعات اور معجزات اور آپ کی پیشنگوئیاں اور امورِ غیب سے متعلق خبروں کا مفصل ذکر ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ قرآن مجید اور خود آپ کی پاکیزہ زندگی اور عمدہ سیرت واخلاق تھے، ان دونوں کی حیرت انگیز تاثیر نے بے شمار لوگوں کے قلوب کو مسخر کر کے ان کو حلقہ بگوش اسلام کر دیا تھا، امام ابونعیم نے اس طور پر ایمان لانے

(۱) روضات الجنات ص ۷۶ وکشف الظنون ج ۲ ص ۳۰۴ (۲) تذکرۃ النوادر ص ۸۳۔

والے متعدد افراد کے مکمل واقعات تحریر کیے ہیں، اس حیثیت سے یہ صرف دلائل و معجزات نبوی ہی کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ عہد نبوی کے مختلف النوع اہم واقعات و حالات اور بعض غزوات و سرایا کا مکمل مرقع بھی ہے، مصنف نے بعض واقعات کی تفصیل اور ان کے دلائل وعلائم کی نوعیت وغیرہ بھی بیان کر دی ہے اور بعض شبہات و اشکالات کو بھی رفع کیا ہے، آخر میں بعض مشہور انبیائے کرام اور رسول اللہ صلی اللہ وسلم کے معجزات کا تقابلی حیثیت سے ذکر کیا گیا ہے، اس میں بعض جلیل القدر انبیاء کے خاص اور اہم معجزات کا تذکرہ کرنے کے بعد دکھایا گیا ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اسی نوعیت کے معجزات عطا کیے گئے تھے۔ گوفنی حیثیت سے اس کی تمام حدیثوں اور روایتوں کا معیار یکساں نہیں ہے، تاہم اس کا شمار معتبر کتابوں میں ہوتا ہے اور اس کے اکثر اہم واقعات حدیث وسیر کی کتابوں میں موجود ہیں۔

دلائل النبوۃ کا پہلا ایڈیشن ۱۳۲۰ھ میں اور دوسرا زیادہ جامع اور مکمل صورت میں ۱۳۶۹ھ مطابق ۱۹۵۰ء میں دائرۃ المعارف حیدر آباد سے شائع ہوا ہے، اس کی ترتیب وتصحیح میں بعض قلمی نسخوں کے علاوہ حدیث، سیر و تاریخ اور اسماء الرجال کی مشہور کتابوں سے بھی مدد لی گئی ہے۔

۲۹- حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء: یہ ابونعیم کی سب سے مشہور و مقبول عمدہ اور بے نظیر کتاب ہے، علامہ ابن خاکان نے اس کو بہترین اور صاحب کشف الظنون نے عمدہ اور معتبر کتاب بتایا ہے، حافظ ذہبی کا بیان ہے کہ ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی، علامہ ذہبی نے اس کو عدیم النظیر کتاب بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ مصنف کی زندگی ہی میں اس کو پوری شہرت اور غیر معمولی حسنِ قبول و اعتبار حاصل ہو گیا تھا اور یہ اسی زمانہ میں جب نیشاپور پہنچی تو لوگوں نے چار سو دینار میں اسے خریدا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ اسلامیات میں ایسی نادر اور بے مثال کتاب نہیں لکھی گئی، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ اس سے مصنف کی وسعت نظر، ان کے شیوخ کی کثرت اور مخارج وطرق حدیث سے پوری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ان اقوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ طبقات صوفیہ میں یہ نہایت اہم اور عمدہ کتاب ہے، اس سے پہلے جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کو ایسی شہرت وقبولیت نصیب نہیں ہوئی، بعد کی کتابوں میں حافظ ابن جوزی کی صفوۃ الصفوہ گو اہم اور مشہور کتاب ہے لیکن دراصل اس کی بنیاد و ماخذ یہی ہے۔

حلیۃ الاولیاء میں ان صحابہ کرم، تابعین عظام، تبع تابعین اور مابعد کے ائمہ اعلام ومتقین کا ذکر ہے جو زہد ونسک اور معرفت وتصوف میں ممتاز اور صاحب کمال تھے، مصنف نے ان بزرگوں کے فضائل ومناقب خصوصاً ان کے زہد ونسک سے متعلق واقعات وحکایات جمع کر کے ان کا تصوف میں درجہ ومرتبہ بھی دکھایا ہے اور ان سے مروی حدیثیں اور ان کے عارفانہ اقوال وملفوظات بھی درج کیے ہیں، پہلے خلفائے اربعہ اور بقیہ صحابہ مبشرہ اور ان کے بعد دوسرے عارف وزاہد صحابہ کرام کا تذکرہ ہے، پھر اصحاب صفہ اور عابدہ وزاہدہ صحابیات کا علاحدہ علاحدہ ذکر ہے، صحابہ کے بعد تابعین وتبع تابعین وغیرہ کا تذکرہ کیا گیا ہے، شروع میں ایک مقدمہ ہے، اس میں اولیاء اللہ کے فضائل ومحامد، ان کے اوصاف وکمالات اور تصوف کی حقیقت وغیرہ پر لطیف بحث ہے، اصحاب فن نے اس کے طول اسناد، روایات وحکایات کے تکرار اور موضوع سے غیر متعلق بعض چیزوں کے ذکر کیے جانے پر نقد کیا ہے(۱)، اس میں امام ابوحنیفہؒ کا تذکرہ شامل نہ کیے جانے کی وجہ سے ان پر تعصب کا الزام عائد کیا گیا ہے، علاوہ ازیں یہ صحیح، حسن، ضعیف اور بعض موضوع روایتوں پر بھی مشتمل ہے۔ (مستطرفہ ص ۱۱۵)

حلیۃ الاولیاء کی اہمیت اس سے بھی ظاہر ہے کہ بعد میں لکھی جانے والی اکثر کتابوں کا یہی ماخذ ہے اور اس کے زوائد ومختصرات بھی لکھے گئے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱- ابوالحسن نورالدین ہیثمی نے حدیث کی متعدد کتابوں کی طرح اس کے زوائد

(۱) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۵۲ و ۴۵۳۔

بھی ایک ضخیم جلد میں جمع کئے تھے۔(۱)

۲- ابوالفرج عبدالرحمٰن بن علی جوزی (م ۵۹۷ھ) نے صفوۃ الصفوہ کے نام سے اس کا نہایت عمدہ اختصار اس طرح کیا ہے کہ وہ مستقل کتاب ہوگئی ہے، اس میں انھوں نے ابونعیم پر نقد و تعقب بھی کیا ہے، اس کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے، اس کا بھی احاسن المحاسن کے نام سے اختصار کیا گیا تھا۔(۲)

۳-محمد بن حسن شافعی (م ۷۷۶ھ) نے مجمع الاخبار فی مناقب الاخیار کے نام سے اختصار کیا اس میں نہ حلیہ کی طرح زیادہ طوالت ہے اور نہ صفوہ کی طرح زیادہ اختصار، اس کی ترتیب میں حلیہ کا تتبع کیا گیا ہے اور بعض تراجم کا اضافہ بھی ہے۔

ابن مرزوق ابوالمعالی سعد بن علی وراق خطیری (م ۵۲۸ھ) نے بھی مختصرات لکھے تھے۔(۳)

ابونعیم پر بعض اعتراضات: امام ابونعیم پر بعض اعتراضات بھی کئے گئے ہیں گو یہ زیادہ اہم نہیں ہیں، تاہم ان کا ذکر کیا جاتا ہے، ان پر سب سے اہم اعتراض تساہل کا عائد کیا گیا ہے، خطیب بغدادی لکھتے ہیں کہ "میں ان میں تساہل کی بعض چیزیں پاتا ہوں، جیسے اجازت کے سلسلہ میں ان کا تساہل اور مسموع کو مجاز سے ممیز وواضح نہ کرنا۔ عبدالعزیز نخشبی کا بیان ہے کہ "ابوبکر بن خلاد سے حارث بن ابی اسامہ کی مکمل مسند کا سماع نہ کرنے کے باوجود وہ اس کے تمام حصوں کی روایت کرتے تھے۔" (۴) حافظ ذہبی نے ان بیانات کا جائزہ لے کر ان کی مکمل تردید کی ہے۔(۵)

۲- ابونعیم پر ان کے معاصر اور بلند پایہ محدث امام ابوعبداللہ بن مندہ نے سخت

(۱) تدریب الراوی ص ۲۹ والمستطرفہ ص ۱۴۱ (۲) کشف الظنون ج ۱ ص ۴۵۲ و ۴۵۳ (۳) کشف الظنون ج ۲ ص ۳۸۱ و ۴۰۹ (۴) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۴ و ۲۹۵ والمنتظم ج ۸ ص ۱۰۰ والبدایہ والنہایہ ج ۱۲ ص ۴۵ (۵) تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۲۹۴۔

تنقیدیں کی ہیں لیکن محدثین اور علمائے فن نے ان کو معاصرت پر جو منافرت کی اصلی بنیاد ہے، محمول کر کے ان کو نا قابل اعتنا قرار دیا ہے، علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

''ان دونوں بزرگوں میں باہم رنجش تھی، اس لیے ابونعیم پر ابن مندہ کی تنقید لائق التفات نہیں ہو سکتی، وہ ان علمائے اعلام اور ثقہ و معتبر لوگوں میں تھے جن پر دلیل و حجت کے بغیر ہی کلام کیا گیا ہے، غالباً ابن مندہ کی تنقید کی وجہ یہ ہے کہ خود ابونعیم نے بھی ان پر تنقید کی ہے۔''(۱)

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

''گو ابن مندہ کے اعتراضات نہایت سخت ہیں مگر ان دونوں میں کسی کی بات بھی دوسرے کے حق میں قابل قبول نہیں ہو سکتی، دونوں کے اعتبار و وثوق میں کلام نہیں لیکن معاصرین کی ایک دوسرے پر نکتہ چینی قابل اعتنا نہیں ہوتی کیوں کہ وہ حسد وعداوت پر مبنی ہوتی ہے، انبیا و صدیقین کے علاوہ کسی زمانہ کے لوگ بھی اس فتنہ سے محفوظ نہیں رہے۔

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّكَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (۲)

خداوندا: تو ایمان والوں کے لیے ہمارے دلوں میں کھوٹ نہ بنائیو، خداوندا: تو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

۳- صاحب روضات الجنات نے شیعیت کو بھی ان کی جانب منسوب کیا ہے(۳) لیکن اس بیان میں وہ منفرد ہیں، علاوہ ازیں وہ خود بھی اسی مسلک سے وابستہ تھے، اس لیے ان کا بیان صحیح نہیں ہو سکتا، ابونعیم کی کتابوں سے بھی اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی۔

---

(۱) میزان الاعتدال ج ۱ ص ۲۵۲ (۲) لسان المیزان ج ۱ ص ۲۰۱ و ۲۰۲ (۳) روضات ص ۷۶۔

☆☆☆

ابو محمد حسن خلاّل

(م۴۳۹ھ)

نام ونسب: حسن نام، ابو محمد کنیت اور خلاّل لقب ہے، نسب نامہ یوں ہے: حسن بن محمد بن حسن بن علی۔(۱)

ولادت: ۳۵۲ھ میں پیدا ہوئے۔

وطن: دارالسلام بغداد کو ان کے مولد ومنشا ہونے کا فخر حاصل ہے، شروع میں ان کا قیام یہاں کے ایک مشہور اور بڑے محلہ نہر القلائین میں تھا لیکن بعد میں باب البصرہ میں منتقل ہوگئے تھے۔(۲)

اساتذہ: خلاّل کے مشہور شیوخ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر بن شاذان، ابوبکر قطیعی، ابوبکر وراق، ابوالحسن بن لوٴ لوٴ وراق، ابوالحسین بن مظفر ابوسعید حرقی، ابوعبداللہ بن عسکری، ابوعمر بن حیویہ، ابوالفتح قواس، ابوحفص عمر بن محمد زیات، ابوعلی محمد بن احمد عطشی۔

تلامذہ: بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبکر خطیب، ابوالحسین بن طیوری، ابوسعید احمد بن طیوری، جعفر بن احمد سراج، جعفر بن محسن سلماسی، علی بن احمد دینوری اور معمر بن ابی عمامہ الواعظ وغیرہ۔(۳)

حفظ وثقاہت: خلاّل حدیث کی معرفت، اس کے حفظ وضبط اور عدالت وثقاہت میں

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۳ ص۳۰۷ والمنتظم ج۸ ص۱۳۲ وبستان المحدثین ص۹۵ (۲) ایضاً (۳) ایضاً۔

ممتاز تھے، خطیب کا بیان ہے کہ ہم نے خلال سے روایتیں نقل کی ہیں، وہ ثقہ وضابط اور معرفتِ حدیث میں ممتاز تھے، ابن جوزی لکھتے ہیں وہ ثقہ اور عادل تھے اور حدیث کے معاملہ میں واقف کار اور بیدار مغز تھے، محمد بن علی صوری سے مروی ہے کہ میری آنکھوں نے عبدالغنی بن سعید کے بعد ابو محمد خلال بغدادی سے بڑھ کر حدیثوں کا حافظ نہیں دیکھا، شاہ عبدالعزیز صاحب لکھتے ہیں کہ:

''درحفظ حدیث سرآمد ابنائے روزگار بود۔''	وہ اپنے زمانہ کے لوگوں میں حفظ حدیث کے لحاظ سے نہایت فائق وبرتر تھے۔(۱)

وفات: ۸۷رسال کی عمر میں جمادی الاولیٰ ۴۳۹ھ میں خلال کی وفات ہوئی اور باب حرب کے مقبرہ میں دفن کئے گئے۔(۲)

تصنیفات: ۱- خلال کی تصنیفات میں ان کی مسند زیادہ مشہور ہے، یہ دراصل صحیحین پر مستخرج ہے۔(۳)

حافظ ذہبی لکھتے ہیں:

خرج المسند علی الصحیحین وجمع ابوابا وتراجم کثیرة.(٤)	خلال نے صحیحین پر مستخرج لکھی اور بیشمار ابواب وتراجم جمع کئے۔

۲- کرامت اولیا: شاہ عبدالعزیز صاحب نے خلال کی تصنیفات میں اس کا بھی ذکر کیا ہے۔(۵)

---

(۱) تذکرۃ الحفاظ ج۳ص ۳۰۷ والمنتظم ج۸ص ۱۳۲ وبستان المحدثین ص ۹۵ (۲) ایضاً (۳) الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۷ (۴) العبر ج۳ص ۱۸۹ (۵) بستان المحدثین ص ۹۵۔

امام ابوعبداللہ قضاعی

(المتوفی ۴۵۴ھ)

نام ونسب: محمد نام، ابوعبداللہ کنیت، شہاب الدین لقب اور نسب نامہ یہ ہے: محمد بن سلامہ بن جعفر بن علی بن حکمون بن ابراہیم بن محمد بن مسلم۔(۱)

وطن وخاندان: قبیلہ بنوقضاعہ سے جو معد بن عدنان یا حمیر کی شاخ ہے خاندانی تعلق اور مصر وطن تھا، خاندان کی نسبت سے قضاعی کہلاتے تھے، سمعانی کا بیان ہے کہ اس نسبت سے بے شمار لوگ مشہور ہیں، متاخرین میں امام ابوعبداللہ قضاعی کا نام قابل ذکر ہے۔(۲)

اساتذہ وشیوخ: امام قضاعی کے چند اساتذہ کے نام یہ ہیں:

ابوالحسن بن جہضم، ابوعبداللہ تمیمی، ابومحمد بن نحاس، احمد بن بربال، احمد بن عمر جیری، ابومسلم محمد بن احمد کاتب۔(۳)

تلامذہ: ان سے استفادہ کرنے والوں میں ابوبکر خطیب، ابونصر بن ماکولا اور حمیدی صاحب الجمع بین الصحیحین جیسے مشاہیر ارباب کمال کے علاوہ ابوعبداللہ رازی، سہیل بن بشر اسفراینی، ابوسعد عبدالجلیل نیشاپوری اور محمد بن برکات سعید وغیرہ شامل ہیں، سمعانی کہتے ہیں، ابوبکر محمد بن عبدالباقی انصاری نے امام قضاعی سے اجازۃً روایت کی ہے۔(۴)

رحلت وسفر: طلب علم کے لیے ان کے سفر کا حال معلوم نہیں ہوسکا لیکن وہ مصریوں کے سفیر کی حیثیت سے روم تشریف لے گئے تھے، ابن سبکی لکھتے ہیں کہ یہ عجیب لطف کی بات

---

(۱) طبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۳ (۲) ایضاً وکتاب انساب ورق ۴۵۷ (۳) ایضاً (۴) ایضاً وطبقات الشافعیہ ج ۳ ص ۶۳۔

ہے کہ اس سفر میں ان کی قسطنطنیہ میں ایک شیخ سے ملاقات ہوئی، ان سے انھوں نے سماع وروایت کی۔(۱)

حدیث: علمائے سیر نے لکھا ہے کہ وہ صاحب کمال محدث تھے، سلفی کا بیان ہے کہ وہ ثقات واثبات میں تھے۔(۲)

فقہ: فقہ میں زیادہ دستگاہ رکھتے تھے، ان کا فقہائے شافعیہ میں شمار ہوتا ہے، فقہ میں کمال کی بنا پر وہ عہدہ قضا پر فائز تھے۔

تاریخ وتراجم: حدیث وفقہ کی طرح تاریخ وطبقات اور رجال پر بھی اچھی نظر تھی، ان فنون میں ان سے بعض کتابیں یادگار ہیں۔

فضل وکمال: ابن ماکولا کا یہ بیان تمام ارباب سیر نے ذکر کیا ہے کہ وہ متعدد علوم میں جامع تھے، میں نے مصر میں ان کے پایہ کا کوئی شخص نہیں دیکھا۔(۳)

عہدہ قضا: اپنے فضل وکمال کی وجہ سے وہ مصر کے قاضی مقرر کیے گئے اور پھر ترقی کر کے قاضی القضاۃ ہو گئے۔

امامت ومقبولیت: علمائے انساب وطبقات نے ان کو امام لکھا ہے اور ابن سبکی نے مرضی الجملہ کہا ہے، اس سے ان کی مقبولیت ومحبوبیت کا اندازہ ہوتا ہے۔(۴)

مسلک: اوپر گذر چکا ہے کہ وہ فقہائے شافعیہ میں تھے، ابن سبکی نے اسی حیثیت سے طبقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

وفات: انھوں نے ۴۵۴ھ میں داعی اجل کو لبیک کہا، ابن خلکان نے ۱۶/ ذوقعدہ اور سیوطی نے ۱۷/ ذوقعدہ تاریخ وفات لکھی ہے، مگر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے ذی الحجہ کا مہینہ بتایا ہے، وفات مصر میں جمعرات کو ہوئی اور جمعہ کے دن عصر بعد مصلی نجار میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔(۵)

---

(۱) طبقات سبکی وابن خلکان ج ۲ ص ۲۴۳ (۲) ایضاً (۳) ایضاً (۴) ایضاً (۵) ابن خلکان ج ۲ ص ۲۴۴ وحسن المحاضرہ ج ۱ ص ۱۶۹ وبستان المحدثین ص ۸۴۔

تصنیفات: امام قضاعی کی بعض کتابوں کے نام یہ ہیں:

شہاب الاخبار: اس کا پورا نام شہاب الاخبار فی الحکم والامثال والآداب من الاحادیث النبویہ ہے، یہ کتاب مسند قضاعی اور الشہاب المواعظ والآداب کے نام سے بھی موسوم ہے۔ اس میں حکم وامثال، وصایا وآداب اور مواعظ وغیرہ سے متعلق ایک ہزار چھوٹی چھوٹی حدیثیں بلاسند نقل کی گئی ہیں اور خاتمہ میں ادعیہ کے متعلق دوسو کلمات حدیث درج کئے گئے ہیں، یہ کتاب دس جزوں پر مشتمل اور کلمات حدیث پر مرتب کی گئی تھی لیکن حروف میں ترتیب کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے، اس عمدہ اور لطیف کتاب کی کئی شرحیں اور خلاصے لکھے گئے ہیں اور بعض علمانے تو بعینہ اسی طرز پر اپنی کتابیں مرتب کی ہیں، ان کتابوں میں فردوس الاخبار دیلمی، مشارق الانوار صغانی اور جامع صغیر سیوطی بہت مشہور ہیں، شرحوں اور مختصرات کے نام یہ ہیں:

۱- شیخ نجم الدین الغیطی، محمد بن احمد بن اسکندری (م۹۸۴ھ) نے شہاب کا خلاصہ کیا۔

۲- ابن اثیر نے ضوء الشہاب کے نام سے مختصر لکھا۔

۳- امام حسن بن محمد صغانی (م۶۵۰ھ) نے مشارق کی طرح کشف الحجاب عن احادیث الشہاب کے نام سے بھی اس کی عمدہ ترتیب کی۔

۴- امام سیوطی نے جامع صغیر کی ترتیب پر ایک اور کتاب اسعاف الطلاب بترتیب الشہاب کے نام سے لکھی جو اس کا خلاصہ تھی۔

۵- ابوالمظفر محمد بن اسعد معروف بابن حکیم حنفی (م۵۶۷ھ) نے شہاب کی شرح کی۔

۶- شیخ عبدالرؤف مناوی نے ایک مزوج شرح لکھی، اس کا نام رفع النقاب عن کتاب الشہاب ہے، امینی نے اسعان الطلاب بشرح ترتیب الشہاب نام بتایا ہے لیکن بعض

فہرستوں میں اسعاف الطلاب بترتیب الشہاب بھی نام درج ہے۔

۷- وحشی محمد بن حسین موصلی کی شرح کا ابراہیم بن عبدالرحمٰن وادیاسی (۵۷۰ھ) نے خلاصہ کیا۔

۸- استاد ابوالقاسم بن ابراہیم وراق عالی نے بھی ایک شرح لکھی۔

۹- ایک شرح کا نام حل الشہاب ہے۔

۱۰- صاحب کشف الظنون نے ایک اور شرح کا بھی ذکر کیا ہے مگر اس کا اور شارح کا نام نہیں لکھا ہے۔(۱) شہاب کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیویہ مصر میں ہے۔(۲)

۲- خطط مصر: اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں، پہلی کتاب ابوعمر محمد بن یوسف کندی کی اور دوسری قضاعی کی بتائی جاتی ہے۔

۳- دستور الحکم۔

۴- مختصر التاریخ: یہ تراجم القضاعی کے نام سے بھی مشہور اور پانچ جزوں پر مشتمل ہے اس میں مصنف نے ابتدا سے اپنے دور تک کے حالات اختصار کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔

۵- کتاب الانباء عن الانبیاء وتواریخ الخلفا: نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں انبیا وخلفا کے حالات وواقعات درج ہوں گے۔

۶- کتاب مناقب الشافعی واخبارہ۔

۷- معجم الشیوخ۔

---

(۱) کشف الظنون ج ۲ ص ۲۷ والرسالۃ المستطرفہ ص ۶۴ (۲) فہرست کتب خانہ خدیویہ مصر ج ۱ ص ۳۶۷۔

گلستان حدیث کے مہکتے گلاب

کیا ہی شاندار اور قابل رشک زندگیاں تھیں ان جلیل القدر اور قسمت کے دھنی انسانوں کی!...... کہ جنہوں نے اپنی زندگی کا محور و مرکز حدیث رسول مقبول ﷺ کو بنائے رکھا۔ ان کی صبحیں اور شامیں قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ کی دلنواز صداؤں میں بسر ہوتیں۔ رسول اللہ سے عملی محبت کا ثبوت یہ ہوتا کہ ان کو آپ کے فرامین بمعہ سند سینکڑوں، ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں حفظ ہوتے۔ دنیا ان کے حافظے سے انگشت بدنداں تھی، وہ حدیث رسول کی تلاش و جستجو میں قریہ قریہ بستی بستی چلے پھرتے، جہاں سے حدیث رسول اور فرمانِ رسول، حکم رسول ملتا تحقیق تفتیش کے بعد اسے محفوظ کر لیتے اور امت محمدیہ تک آپ کے فرامین پہنچانے کا بندوبست کرتے۔ یوں جستجوئے حدیث میں ان کی زندگیاں گزر جاتیں اور وہ امت محمد کے ہاتھوں میں فرامین رسول کا گرانقدر مجموعہ دے کر اگلے جہان جا پہنچتے۔ ان کی زندگیوں کا لمحہ لمحہ اس شعر کا مصداق ہوتا:

ما ہرچہ خواندہ ایم فراموش کردہ ایم
اِلّا حدیث یار را تکرار می کنیم

گلشن حدیث کے ان مہکتے گلابوں کی خوشبو سے امت محمدیہ کے ہر ہر فرد کی سانسیں مہکی ہوئی ہیں۔ ان رجال عظیم کی زندگیاں کیسے اور کن عظیم کاموں میں گزریں۔ انہوں نے آقائے دو جہاں سے عملی محبت کا ثبوت دیتے ہوئے خدمت حدیث کے لیے کیسے کیسے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ محدثین کرام کی زندگیوں کے روشن مگر پردہ اخفا میں سنہرے گوشوں کو آشکار کرنے اور آپ کے سامنے پیش کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

محمد طاہر نقاش

دار الابلاغ
کتاب و سنت کی اشاعت کا مثالی ادارہ
DARULIBLAGH